رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ فروری ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۵ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریبًا اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اول

(عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ)

یعنی آغازِ اسلام سے لے کر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۹۵ صفحے قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صدسالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- للعہ

تاریخِ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ / ۷۴۹ء سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ / ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ،

قیمت عہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ،

ضخامت :- ۳۳۲ صفحے

قیمت :- عہ

"منیجر"

"منیجر"

کہ ایک سیکولر حکومت میں کسی فرقہ کی عبادت گاہیں کہاں تک محفوظ ہیں، اگر بابری مسجد مسلمانوں کو واپس نہ کی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مذہب محفوظ نہیں ہے، اس کے بعد حکومت کس منہ سے دنیا کے سامنے اپنے غیر مذہبی ہونے کا دعویٰ کر سکے گی، اگر الیکشن کے مصالح کی بنا پر حکومت نے اس معاملہ میں کمزوری دکھائی تو فرقہ پرست اس کو لے ڈوبیں گے۔

کانپور کی مسجد کا واقعہ جو صرف ایک غسل خانہ کا معاملہ تھا، ابھی بھولا نہ ہوگا، مذہب کے معاملہ میں آج بھی مسلمانوں کے جذبات وہی ہیں، اور مسلمان کیا کوئی فرقہ بھی اس طرح اپنی عبادت گاہ کی توہین گوارا نہیں کر سکتا اور نہ اس کی ایک چپہ زمین چھوڑ سکتا ہے، تاہم مسلمانوں کو حکومت کے اعتماد پر اس وقت تک صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے جب تک اس سے مایوسی نہ ہو جائے، لیکن حکومت کی غفلت پر ماتم کے ساتھ اس کی خوشی بھی ہے کہ بعض منصف مزاج اور حق پرست ہندوؤں نے بڑی جرأت اور سچائی کے ساتھ حکومت کی غفلت اور فرقہ پرستوں کی زیادتیوں کا اعتراف کیا ہے، خصوصاً فیض آباد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے صدر اکشے برہمچاری نے جو اجودھیا کے ایک مندر کے پجاری بھی ہیں، جس اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے وہ ہم سب کے لیے قابل تقلید نمونہ اور اس کا ثبوت ہے کہ اس اندھیر نگری میں سچائی کا چراغ گل نہیں ہو گیا ہے، اور اس سے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ فرقہ پرستوں کی شر انگیزی کامیاب نہ ہوگی اور مسلمانوں کی مسجد ان کو واپس ملے گی۔

گئی گذری حالت میں بھی مذہب میں اتنی طاقت ہے کہ آج بھی وہ قومیں جن کو مذہب سے عملاً کوئی تعلق نہیں ہے، بعض موقع پر حصول مقصد کے لیے مذہب کو وسیلہ بنانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، چنانچہ کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کے لیے سیاسی تدابیر کے ساتھ مذہب کے نام سے بھی کام لیا جا رہا ہے، ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا جب ترکوں کے ساتھ عالم اسلامی کی ہمدردی کو ختم کرنے کے لیے ان کی بے دینی کے افسانے اتنے مشہور کیے گئے کہ معلوم ہوتا تھا، ان کو اسلام سے کوئی علاقہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے، (اب تو جناب ٹنڈن جی موقع بے موقع ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبیت کے خلاف استعمال کرتے رہتے ہیں)

شذرات

ہندوستان کی تاریخ میں بالآخر وہ مبارک دن بھی آگیا کہ آزاد و عوامی جمہوریہ قائم ہوگئی، اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان مکمل طور سے خود مختار ملک بن گیا، اس تاریخی واقعہ پر جس قدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے، لیکن آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں لاتی ہے، جمہوریت کا قیام ترقی کی راہ کا ایک مرحلہ ہے، آخری منزل نہیں، حصول مقصد کا ذریعہ ہے، اصل مقصد نہیں، اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ترقی کے راستہ کی رکاوٹیں دور ہوگئیں، لیکن منزل مقصود تک پہنچنا ابھی باقی ہے، آزادی اور جمہوریت کا صرف یہ مقصد نہیں ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار کا قصہ ختم اور خود ہندوستانیوں کو اپنے ملک پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا، بلکہ حقیقی جمہوریت یہ ہے کہ ملک ترقی کے راستہ پر گامزن اور امن و خوشحالی عام ہو، ہر طبقہ اور ہر شخص مطمئن اور جمہوریت کی نعمتوں اور برکتوں کو محسوس کرے

آزادی اور جمہوریت خدا کی نعمت و امانت ہے، جو انہی قوموں کے سپرد ہوتی ہے جو اس کا حق ادا [illegible] اور اس کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہیں، ان کا سب سے بڑا حق بلا امتیاز ملک کے ہر باشندے کے ساتھ عدل و انصاف ہے، جب تک یہ حق ادا ہوتا رہے گا حکومت بھی باقی رہے گی، ورنہ واپس لے لی جائیگی، عدل کا لازمی نتیجہ سکون و اطمینان، امن و خوشحالی اور ترقی ہے اور بے انصافی کا بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار [illegible] حیثیت سے بھی حکومت کا [illegible] ایسے ملکی امور کو حقیقی جمہوریت بنانا حکومت [illegible] وطن کا فرض ہے۔

بابری مسجد کے معاملہ [illegible] مسلمانوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود ابھی تک اس کی کوئی توجہ نہیں [illegible] اگر اس معاملہ میں اس نے غفلت برتی تو کوئی مسجد بھی محفوظ نہ رہ جائے گی اور مسجد [illegible] یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اصول کا سوال ہے

مقالات

کیا اقبال فرقہ پرست شاعر تھے؟

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت اور اسلامی نظام کی دعوت سے اقبال کا مقصد

آخر میں سب سے بڑا اعتراض یہ رہ جاتا ہے کہ اقبال نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کی ہے، اور دنیا کو اس کے قبول کرنے اور اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعوت دی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ واقتدار چاہتے تھے،

یہ اعتراض موجودہ مذاق کے لحاظ سے بظاہر وقیع معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ صحیح نہیں، اس بارہ میں اقبال کے نقطۂ نظر اور ان کے مقصد ومنشار کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے،

اس میں شبہہ نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت بھی کی ہے اور دنیا کو اسلامی نظام قبول کرنے کی دعوت بھی دی ہے، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان تھے، اور ان کا مذہب اسلام تھا، اس لئے وہ ساری دنیا سے اس کو منوانا .... اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کا غلبہ واقتدار چاہتے تھے

لیکن جب کمیونزم کے مقابلہ کے لیے مذہب کی امداد کی ضرورت پیش آئی تو بے دین ترک دفعۃً مذہبی بنا دیے گئے اور ان کی مذہبیت کی خبریں آنے لگیں، حالانکہ ترک من حیث القوم کبھی بے دین تھے، اور نہ آج پوری قوم بیدار ہوگئی ہے۔ مذہب میں ان کی بے اعتدالیاں زیادہ تر انقلاب کے اثرات اور برسر حکومت طبقہ کی مغرب زدگی کا نتیجہ تھیں جس سے کوئی ملک بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ جس قدر زمانہ گذرتا جاتا ہے اور انقلاب کے اثرات کم ہوتے جاتے ہیں، مذہب اپنی جگہ لیتا جاتا ہے جس کی تصدیق اخبارات کے علاوہ دوسرے معتبر ذرائع سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ اس سال چھ ہزار ترک حج کے لیے آئے تھے، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے ایک خط میں جو مدینہ منورہ سے لکھا تھا ترکوں کی مذہبی حالت کے متعلق اپنے تاثرات تحریر کیے تھے۔ یہ خط بہت دیر میں پہنچا، تاہم اسکے بعض حصے ناظرین معارف تک پہنچانے کے لائق ہیں، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

انشاء اللہ امسال کا حج بہت اچھا رہا چار لاکھ حاجیوں کا شمار اخبارات میں چھپا تھا جس میں فلپائن اور نائجیریا تک کے حاجی تھے، ۱۵ ہزار ہندوستان کے ۱۴ ہزار پاکستان کے ۱۲ ہزار مصر کے اور اسی کے قریب جاوی ہوں گے، امسال ترک بھی بہت آئے تھے، چھ ہزار کے قریب تھے۔ ان کو دیکھکر بڑی خوشی ہوئی، انکی بے دینی کی نسبت جتنی خبریں ہندوستان میں پڑھی تھیں، سب غلط معلوم ہوئیں، تمام اقوام عالم میں سب سے زیادہ میں نے انکو باادب سنجیدہ اور متین پایا، اور حرم کا خاص احترام ان کے قلوب میں پایا، ان میں بعض نقشبندی شیوخ بھی تھے، سب کے چہروں پر ماشاء اللہ داڑھی تھی، ورنہ داڑھی تو اب عالم اسلام کے چہرہ سے غائب نظر آتی ہے، نجدیوں اور مصری عالموں تک کے چہرے صاف تھے۔

یہ وہی ترک ہیں جنکے متعلق عام شہرت تھی کہ انھوں نے حج بند کر دیا ہے، یہ بھی واضح رہے کہ ترکی کی آبادی پورے دو کروڑ بھی نہیں ہے اسلیے آبادی کے تناسب سے ترک حجاج کی تعداد ہندوستانی حجاج سے کچھ ہی کم ہوئی پاکستان کے حاجیوں سے زیادہ تھی، اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں نہ صرف مذہب بلکہ تصوف کا سلسلہ بھی قائم ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو مذاہب جس قدر قدیم ہین، ان کی تعلیمات اتنی ہی محدود ہین، اور جس قدر انسانیت ترقی کرتی گئی ہے، اتنی ہی نئے مذاہب کی تعلیمات مین وسعت اور گہرائی آتی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت کے ابتدائی دور مین انسانون کی عقلین سادہ اور ضروریات محدود تھین، اس لئے اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جو مذاہب آئے تو وہ بھی سادہ اور محدود تھے، ان کو زیادہ تر خدا اور بندے کے تعلق یعنی عقائد و عبادات سے بحث تھی، یا کچھ موٹی موٹی اخلاقی تعلیمات تھین، اُن کو انسانون کی دنیاوی زندگی سے بہت کم علاقہ تھا، اس لئے تمام پرانے مذاہب مین یا دنیاوی اور مادی زندگی کے قوانین سرے سے ہی نہین ہین، اور اگر کسی مذہب مین ہین بھی تو بہت محدود اور ناکمل شکل مین، ان کے مقابلہ مین اسلام چونکہ انسانی عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے زمانہ کا مذہب ہے، اس لئے اس کی تعلیمات تمام گذشتہ مذاہب سے زیادہ جامع اور مکمل ہین، مثلاً گذشتہ مذاہب خاص خاص قومون کی ہدایت و رہنمائی کے لئے آئے تھے، ایک خاص زمانہ تک کے لئے تھے، ان کا مقصد عموماً صرف اخلاقی اصلاح تک محدود تھا، اس لئے ان کی تعلیمات بھی اُنہی تک محدود تھین، اُن کے مقابلہ مین اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ ساری دنیا کی ہدایت و رہنمائی اور ابد تک کے لئے آیا ہے، اور اس کا مقصد زندگی کے کسی خاص شعبہ اور خاص پہلو کی نہین، بلکہ پورے نظام زندگی کی ہدایت و اصلاح ہے، جس سے دین و دنیا کا کوئی شعبہ بھی مستثنیٰ نہین اسلئے اس کی تعلیمات دنیوی اور اُخروی تمام ضروریات پر حاوی ہین، یہ جامعیت و ہمہ گیری اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تعلیمات مین نہین ہے، ان کی تفصیلی بحث نہ ہمارا مقصد ہے، اور نہ اس مختصر مضمون مین اس کی گنجایش ہے، لیکن اس کے بغیر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی نظام کے قیام کی دعوت کے بارہ مین اقبال کا نقطۂ نظر معلوم نہین ہو سکتا، اور اصل اعتراض باقی رہ جاتا ہے، اس کے علاوہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور سے بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس کا ازالہ بھی ضروری ہے، اس لئے اس کے اہم پہلوؤن پر مختصراً نگاہ ڈالنا ضروری ہے،

اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی خالی نہین ہے، اور ان مین بہت سی تعلیمات

بلکہ اس لئے اسلامی اصولون کی دعوت دیتے تھے کہ اُن کے نزدیک انھی کے ذریعہ انسانیت کی فلاح اور موجودہ دور کی تمام مشکلات و مسائل کا حل ہو سکتا تھا،

اس سے دوسرے مذہبون کی تنقیص لازم نہین آتی، اس لئے کہ جیسا کہ قرآن مجید مین بار بار کہا گیا ہے اسلام کوئی نیا مذہب نہین ہے، بلکہ وہی دین فطرت ہے جس کی تعلیم خدا کے تمام سچے پیغمبر شروع سے اب تک دیتے چلے آئے ہین، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اسلام، ان مذاہب کی اصلاح شدہ اور ان کی آخری تکمیلی شکل ہے، اسی لئے اسلام نے خدا کے تمام سچے پیغمبرون اور ان کی لائی ہوئی الہامی کتابون کی تصدیق کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے، اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہین ہو سکتا، گویا اسلام تمام سچے مذاہب کا مصدق اور اُن کی اچھی تعلیمات کا مجموعہ ہے، مذاہب کی اصلاح سے یہ مراد ہے کہ پرانے مذاہب کی تعلیمات مین امتداد زمانہ اور انسانی تصرفات سے جو تبدیلیان ہوگئی تھین جن سے اُن کی ہدایت کی روشنی دھم پڑ گئی تھی اسلام نے ان آمیزشون اور تغیرات کو دور کرکے اُن کی تعلیمات کو اصلی شکل مین جلوہ گر کر دیا، اور تکمیل کا یہ مطلب ہے کہ تمام گذشتہ مذاہب اپنے زمانہ کے انسانون کے درجۂ ارتقاء اور اُن کی ضروریات و حالات کے مطابق تھے، اس لئے اُن کی تعلیمات بھی سادہ اور محدود اور عموماً صرف موٹی موٹی اخلاقی اور روحانی امور پر مشتمل تھین جو ترقی یافتہ انسانی زندگی کی ہدایت کیلئے کافی نہین، اسلام نے گذشتہ مذاہب کی اصلاح کے ساتھ، انسانون کیلئے ایک جامع اور مکمل دستور العمل بھی بنا دیا، اس کو تمثیل سے یون بھی کہا جا سکتا ہے کہ مذہب [illegible] کی تعلیم و تہذیب کا [illegible] نصاب ہے، اور نصاب پڑھنے والے کی عمر عقل و فہم کے مطابق ہوتا ہے اور اس مین تغیر و ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اسلئے مذہبی نصاب بھی انسانی عقل و شعور کی ترقی اور اسکی ضروریات کے لحاظ سے بدلتا رہا اور مذہب اسلام انسانی عقل و فہم کے بلوغ اور اسکی ترقی کا آخری تکمیلی نصاب ہے اسلئے وہ تمام گذشتہ مذہبی نصابون سے زیادہ جامع اور مکمل ہے پرانے نصاب یعنی گذشتہ سچے مذاہب بھی برحق اور اپنے اپنے زمانہ کے لئے ضروری اور مفید تھے لیکن وہ انسانی ترقی کی ضروریات کا ساتھ نہین دے سکتے تھے اور اسلام کے بعد ان کی ضرورت اس لئے باقی نہین رہی کہ اسلام ان سب کی اچھی تعلیمات کا جامع ہے،

کو سنا کر عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی تعلیم دی ہے، حدیثون مین اس قسم کی بکثرت تعلیمات ہین، مثلاً

آپس مین ایک دوسرے سے کینہ اور حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے روگردانی

کرو، اور خدا کے سب بندے مل کر بھائی بھائی بن جاؤ" (بخاری)

"ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے" (ابو داؤد)

"عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ قومون کو سیاہ قومون پر اور سیاہ قومون کو سرخ

قومون پر کوئی نفضیلت نہین مگر خدا ترسی کی بنا پر" (مسند احمد بن حنبل)

تمام انسانون کو ایک دوسرے کے ساتھ لطف و محبت اور رحم و کرم کی تلقین ہو کہ تم (انسان)

زمین والون پر رحم کرو، تو آسمان والا (خدا) تم پر رحم کرے گا" (مستدرک حاکم) اسی مفہوم کی دوسری حدیث

ہے کہ جو بندون پر رحم نہین کرتا، اس پر خدا رحم نہین کرتا،، (بخاری)

ترمذی مین ہے کہ جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسرون کے پسند کرو تب مسلمان بنو گے"

ان تعلیمات مین مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہین اور اس مین کافر و مسلمان سب برابر ہین، قرآن مجید

نے دشمنون کے ساتھ بھی عدل و انصاف کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے،

کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، ہر حال مین انصاف کرو کہ یہ بات تقوی کے قریب ہے (سورہ مائدہ)

اس سے زیادہ عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے؟

اس کی دوسری تدبیر یہ کی کہ انسانی اخوت کی بنیاد نسل اور وطن کے بجائے افکار و تصورات کے اشتراک

رکھی، اس حقیقت کو اب بڑے بڑے مفکرین و مدبرین مانتے ہین کہ عالمگیر انسانی اخوت کا ذریعہ

ن مین افکار و تصورات کا اشتراک اور مقاصد اور نصب العین کی وحدت ہے، جس کو ان الفاظ مین بھی کہا

سکتا ہے، کہ جب تک انسانی فلاح و سعادت کے اساسی اصولوں اور اُن کے بنیادی حقوق کو

م قومین نہ مان لین گی، اس وقت تک نہ ان مین اتحاد ہو سکتا ہے اور نہ امن و امان کا قیام ممکن ہے

مشترک ہین، گو اسلام کی ان تعلیمات کو بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اور جو اعتدال و توازن اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات مین ہے، وہ کسی مذہب مین نہین ہے لیکن اس زمانہ مین کسی نظام اور کسی قانون کے نقص و کمال اور عیب و ہنر کا خواہ وہ دنیاوی ہو یا مذہبی معیار یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اس نے انسان کی دنیاوی زندگی کے مسائل اور مشکلات کا کیا حل پیش کیا ہے، دنیا کی موجودہ مشکلات نے اس سوال کو اور زیادہ اہم بنا دیا ہے، اس لئے آیندہ سطور مین اسی پہلو اور نقطۂ نظر سے اسلامی نظام پر تبصرہ کیا جائیگا،

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ دین کامل ہے، اور ابد تک کے لئے آیا ہے، اور اس کا بنانے والا علیم و خبیر ہے، جس کی نگاہ سے حال و مستقبل کوئی زمانہ بھی پوشیدہ نہین ہے لیکن اصول ارتقا بھی اسی کا بنایا ہوا ہے، اور یہ اس کے علم مین تھا کہ زمانہ کی رفتار اور ترقی کے ساتھ انسانون کی ضروریات بدلتی اور بڑھتی رہینگی، اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہین گے، اس لئے اپنے جامع اور مکمل قانون کے باوجود اسلام نے نئے مسائل مین علما، کو اجتہاد کی اجازت دی یعنی ان مسائل مین جو عہد رسالت مین موجود نہین تھے، اور جن کے متعلق قرآن و حدیث مین احکام نہین ہین، اسلام کی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے نئے قوانین کے بنانے اور پرانے فقہی جزئیات مین ضرورت کے مطابق ترمیم کرنے کا اختیار دیا، چنانچہ عہد فاروقی مین اور اس کے بعد بھی جب اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ نئے مسائل پیدا ہوئے، تو اس قسم کے بہت سے نئے قوانین بنائے گئے، اس اصول سے اسلام کا دامن ہر زمانہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے وسیع ہو گیا، لیکن یہ کام انہی علما کا ہو جن مین علم و اجتہاد کے ساتھ تقویٰ و دیانت کا بھی اجتماع ہو، اس تمہید کے بعد موجودہ اہم مسائل پر نگاہ ڈالی جاتی ہے، ان مین سب سے زیادہ اہم، پیچیدہ اور مشکل مسئلہ سیاسی اور معاشی کشمکش کا ہے، جس نے دنیا کا امن و امان خطرہ مین ڈال دیا ہے،

ان دونون مسئلون کا اصل اور بنیادی سبب نسلی اور جغرافی قوم و وطن پرستی اور لادینی سیاست ہے، یعنی ہر قوم تمام اخلاقی پابندیون سے آزاد ہو کر صرف اپنی قوم کی سیاسی اور معاشی برتری چاہتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ قومون کی کشمکش اور بدامنی ہے، اس کا حل اسلام نے ایک تو یہ کیا ہے کہ نسلی اور جغرافی گروہ بندی

حرام ہے، جس میں خدا اور بندوں کے حقوق نہ ادا کئے گئے ہوں، لیکن اگر ان حقوق کو ادا کیا جائے تو غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہی نہیں ہو سکتی،

سرمایہ داری کی اصلاح اور اسکی خرابیوں کو دور کرنے کی اسلام نے قانونی اور اخلاقی دونوں شکلیں اختیار کی ہیں، ان پر تفصیلی بحث بہت طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نے دولت میں خدا، رسول، ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین، پڑوسی اور دوسرے تمام ضرورتمند اور اہل حاجت کا حق رکھا ہے، اور اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے کہ

کے لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم،

یعنی تاکہ دولت محض چند دولت مندوں میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ گردش کرتی رہے،

اقتصادی ناہمواری اور معاشی کشمکش کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند دولتمندوں خواہ وہ اشخاص ہوں یا طبقات گھر کر رہ جاتی ہے، اگر وہ تمام طبقوں میں پھیلا دی جائے تو خود بخود اقتصادی ناہمواری ختم ہو جائے گی، اس لئے اسلامی مالیات کے اس بنیادی اصول پر عمل کرنے سے ساری دنیا کی اقتصادی گتھی سلجھ سکتی ہے، اسلامی تعلیمات کی دو حیثیتیں یا دو درجے ہیں، ایک قانونی جس کو اصطلاح میں شریعت کہتے ہیں، دوسرے اخلاقی جس کو احسان سے تعبیر کرتے ہیں، شریعت کے قوانین کی پابندی ہر مسلمان پر ضروری ہے یعنی جو اس سے سرتابی کرے گا، حکومت اس سے بجبر منوائے گی لیکن کچھ اخلاقی تعلیمات ایسی ہیں جن کی حیثیت قانون کی تو نہیں ہے یعنی حکومت ان کی پابندی پر مجبور نہ کرے گی، لیکن ان پر عمل کے بغیر کوئی مسلمان مومن کامل نہیں ہو سکتا، اسلام نے ان دو طریقوں سے سرمایہ داری کی خرابیوں کی اصلاح کی ہے، اور اس کے لئے قانونی شکلیں یہ اختیار کیں،

(۱) ہر مسلمان کی املاک میں اسکے مرنے کے بعد وراثت جاری کی جس سے اشخاص کی دولت ہمیشہ تقسیم ہوتی رہے گی (۲) زمین کو حکومت کی ملک قرار دیا جس سے جاگیرداری کا انسداد ہو گیا (۳) سونا چاندی

اس کی تدبیرین بھی ہوتی رہتی ہین، پرانی جمعیۃ الاقوام اور نیا ادارہ اقوام متحدہ (یواین او) سب اسی کی تدبیرین ہین، لیکن انہیں سے کوئی بھی قومی اور وطنی خود غرضی سے پاک نہین، اور وہ صرف بڑی قومون کا آلۂ کار ہین، اس لئے ان کے ذریعہ اصل مقصد مین کامیابی نہین ہو سکتی، لیگ آف نیشنز کا حشر سب کو معلوم ہے، جغرافی و نسلی قومیت اور وطنیت کے تصور کے ساتھ انسانی فلاح کی کوئی تدبیر کبھی کامیاب نہین ہو سکتی، اس کا صحیح علاج عالمگیر انسانی اخوت و مساوات ہے، جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، بقول اقبال

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود | اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام | جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

جب تک قومون مین قومی اور وطنی تفریق قائم رہے گی، اس وقت تک قومی اور نسلی تفوق و برتری کا جذبہ بھی باقی رہے گا،

معاشی کشمکش کا اصل سبب بھی در اصل یہی تفریق ہے، اس لئے اس کا علاج بھی انسانی اخوت و مساوات ہے، جب ہر قوم دوسری قوم کو اپنے برابر سمجھنے لگے گی، اور اپنے تفوق و امتیاز کے لئے دوسرون کے حقوق غصب نہ کرے گی، تو معاشی کشمکش بھی نہ پیدا ہو گی، اس اصولی علاج کے علاوہ اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا متوازن بنایا ہے کہ اگر اس پر صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے تو نہ غیر معمولی ثروت ایک شخص یا ایک طبقہ کے پاس جمع ہو گی، جسے سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ غربت و افلاس پیدا ہو گا جو معاشی کشمکش کا اصل سبب ہے، اس لئے اسلامی نظام معاشیات مین غیر معمولی ناہمواری کا امکان ہی نہین ہے کہ ایک شخص تو قارون بن جائے، اور دوسرے کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہو، اس موقع پر اس کی تصریح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام نے ذاتی املاک اور جائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی دولت کو منع نہین کیا ہے، بلکہ اس کی خرابیان دور کر کے اس کی اصلاح کر دی ہے، اسلام مین صرف وہ سرمایہ داری

کے معذور، ناکارہ اور اپاہج لوگوں کے روزینے اور اندھوں کی رہنمائی، اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے آدمی مقرر تھے[۵۰]، اسلامی بیت المال میں نادار لوگوں کے قرض کی ادائگی کی بھی ایک مد ہے،

یہ تو سرمایہ داری کی اصلاح کی قانونی شکلیں اور سرمایہ داروں کی دولت میں غریبوں کے قانونی حقوق ہیں، اس کے علاوہ اسلام نے اس کے اخلاقی طریقے بھی اختیار کئے، چنانچہ ایک طرف تو اس نے جائز طریقہ سے کسب دولت کی ممانعت نہیں کی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے، دوسری طرف دولت کی محبت اور اس کو خزانہ بنانے کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ کلام مجید اور احادیث نبوی میں اسکی بڑی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات اور خیرات کی بڑی تاکید ہے، اور دولتمندوں پر اتنی اخلاقی ذمہ داریاں عائد کردی ہیں، کہ اگر وہ ان کو پوری کریں، تو دولت مشکل ہی سے جمع ہو سکتی ہے، یا کم از کم کوئی انسان ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا، ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ جو شخص خود شکم سیر ہو کر سوئے، اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے، تو وہ مومن نہیں ہے[۵۱]، اس کے علاوہ دولت کی برائیوں کی اصلاح اور افلاس و غربت کو مٹانے کے متعلق بہت سے احکام اور تعلیمات ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کی اس مختصر بحث میں گنجایش نہیں ہے،

اسی کے ساتھ گداگری اور مفت خوری کے تدارک کیلئے اسلام نے تندرست دمیوں کو گداگری کی ممانعت اور قوت بازو کے ذریعہ معاش پیدا کرنے کی تاکید کی ہے، اور توانا و تندرست آدمیوں کے لئے صدقہ لینا ناجائز قرار دیا، ترمذی میں ہے کہ صحیح و تندرست اور غیر محتاج کے لئے صدقہ لینا جائز نہیں ہے[۵۳]،

مختلف پیرایوں میں صدقہ و خیرات سے بچنے کی تعلیم دی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ صدقہ لوگوں کے ہاتھ کا میل ہے[۵۴]، ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ اوپر کا ہاتھ یعنی دینے والا نیچے کے ہاتھ یعنی لینے والے سے بہتر ہے[۵۵]،

---

[۵۰] تاریخ الخلفا ص ۲۲۴ و طبری ج ۸ ص ۱۲۰۱، [۵۲] مشکوٰۃ و ادب المفرد امام بخاری [۵۳] ترمذی کتاب الزکاۃ [۵۴] مسلم کتاب الزکاۃ، باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقہ [۵۵] بخاری کتاب الزکاۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ،

نقد سکہ سونا چاندی اور ان کے زیورات اور ہر قسم کے تجارتی مال پر مسلمانوں کے لئے زکاۃ فرض کی، جس کی شرحیں مختلف ہیں (۴) زرعی پیداوار میں مسلمانوں پر زکوٰۃ جس کو عشر کہتے ہیں، فرض کی، اور غیر مسلموں پر خراج مقرر کیا (۵) تجارتی مال کی برآمد پر عشور یعنی چنگی اور ڈیوٹی لگائی (۶) معدنیات اور زمین کے تمام دفینوں میں پانچواں حصہ حکومت کا قرار دیا (۷) اسی طریقہ سے مال غنیمت میں خمس مقرر کیا، (۸) سود کو جو سرمایہ داری کا بڑا ذریعہ ہے، حرام مطلق قرار دیا (۹) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی اور اس قسم کی تمام دوسری ناجائز تجارتوں کو جن سے سرمایہ داری کو ترقی ہوتی ہے، اور عوام کو نقصان پہنچتا ہے، حرام قرار دیا،

یہ وہ قوانین ہیں جن کی پابندی ہر ہر مسلمان قانوناً مجبور ہے اور ان ٹیکسوں کو حکومت وصول کرے گی، ان میں سے صدقات وزکواۃ کی آمدنی کے مصارف میں بڑا مصرف غربا و مساکین ہیں، صدقات کا مصرف خود قرآن پاک نے متعین کر دیا ہے جن میں فقراء و مساکین بھی ہیں، انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ زکواۃ کے متعلق بخاری میں ہے کہ

تؤخذ من اغنیائهم وترد علی	یعنی دولتمندوں سے وصول کی جائے گی
فقرائهم،	اور غربا میں تقسیم کی جائے گی،

چنانچہ بیت المال کی زکواۃ وصدقات کی آمدنی کا ایک حصہ غربا، ومساکین کے لئے مخصوص ہوگا، جو بلا امتیاز مسلم وغیر مسلم تمام حاجتمندوں میں صرف کیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں معذور ومجبور یہودیوں اور عیسائیوں کے روزینے بھی بیت المال سے مقرر کر دیئے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک کلام مجید کی اس آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ میں فقرا سے مراد مسلمان اور مساکین سے مراد اہل کتاب ہیں (کتاب الخراج امام ابو یوسف) یہ طریقہ بنی امیہ کے زمانہ میں بھی جن کی حکومت خالص دنیاوی تھی، جاری رہا، چنانچہ ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں پوری اسلامی قلمرو

حدیث میں مخفی صدقہ کے بڑے فضائل ہیں، مسلم میں ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے، جو اس طرح دیا جائے کہ داہنے ہاتھ سے دیا جائے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو[1]،

نمایش کے لئے صدقہ دینے صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے، طعنہ دینے ایذا پہنچانے اور ان تمام طریقوں کی جس سے غریبوں کی خودداری مجروح ہوتی ہو، بڑی مذمت ہے،

غرض اسلام نے ہر پہلو سے سرمایہ اور غربت دونوں کی اصلاح اور برائیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے اگر ان تمام قوانین اور تعلیمات پر پورا عمل کیا جائے، تو نہ غیر معمولی سرمایہ داری پیدا ہوسکتی ہے اور نہ کوئی غریب ننگا بھوکا رہ سکتا ہے، خلفائے راشدین کے مقدس دور کا ذکر نہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں جنھوں نے اسلامی نظام حکومت کے احیار کی کوشش کی تھی، اور اُن کو کل دو سال اس کا موقع ملا تھا، ملک میں اتنی آسودہ حالی پیدا ہوگئی کہ اسلامی مملکت میں صدقہ لینے والے نہیں ملتے تھے، اور غربا و مساکین خود صدقہ ادا کرنے کے لائق ہوگئے تھے[2]،

لیکن بہتر سے بہتر قوانین اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بغیر عمل کے بالکل بے کار ہے، اور عمل کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ وعظ و پند اور تعلیم و تلقین کے ذریعہ لوگوں میں عمل کی روح پیدا کی جائے، دوسرے یہ کہ نہ ماننے والوں کو جبر و قوت سے منوایا جائے، پہلی صورت صالح اور سلیم الفطرت انسانوں کے لئے ہے عام لوگوں کیلئے قانونی مواخذہ کا خوف ضروری ہے، ورنہ دنیا کا کوئی نظام بھی قائم نہیں رہ سکتا، اسلئے اسلام نے ان دونوں طریقوں کو اختیار کیا، اور دوسرے طریقہ کے لئے قوت نافذہ یعنی حکومت ضروری ہے اقبال نے اسی نقطۂ نظر سے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دی ہے، مسلمانوں کو بھی انھوں نے اسی لئے مخاطب کیا ہے، کہ پہلے خود ان میں عمل کی روح پیدا کی جائے، پھر اُن کو نمونۂ عمل بنا کر اُن کے ذریعہ اسلامی نظام کا احیا کیا جائے۔

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفار الصدقہ [2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی ص ۸۵،

گداگری کی سخت مذمت کی ہے کہ "جو شخص ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا" [۱] یعنی وہ دنیا میں گداگری کرکے اپنے چہرہ کی رونق، آبرو کھو چکا ہے،

اور محنت مزدوری کرکے پیٹ پالنے والے کو صدقہ لینے والے سے بہتر قرار دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قسم ہو اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا رسی لیکر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے کہیں بہتر ہے، کہ وہ کسی سے بھیک مانگے جس کو اختیار ہو کہ دے یا نہ دے، [۲]

ایک مرتبہ ایک حاجتمند صحابی نے آپ سے خیرات مانگی، آپنے اُن سے پوچھا تمھارے پاس کچھ ہو؟ انھوں نے جواب دیا، ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے آپنے اس کو منگا کر خود نیلام فرمایا، اور اس کی قیمت سے سائل کو ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر بیچو، انھوں نے اس پر عمل کیا، اُن کی محنت میں خدا نے اتنی برکت دی کہ اُن کو پھر کبھی احتیاج نہیں ہوئی، [۳]

لیکن اگر ان تدبیروں کے بعد بھی کچھ معذور و مجبور اشخاص صدقہ و خیرات کے مستحق باقی رہ جائیں تو اُن کو بھی عزت نفس و خودداری قائم رکھنے کی تعلیم ہے، حدیث میں ہو کہ مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک لقمہ دو لقمے دیکر لوٹا دیتے ہیں، بلکہ مسکین وہ ہی جو احتیاج کے باوجود سوال کرنے سے حجاب کرتا ہو اور لوگوں سے گڑ گڑا کر نہیں مانگتا، [۴]

غیور و خوددار محتاجوں کی خود قرآن نے مدح کی ہے، کہ وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ناواقف لوگ اُن کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہیں، اور تم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کو بشرہ سے پہچانتے ہو، یہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، (بقرہ - ۳۷)

غریبوں کو ذلت نفس سے بچانے کے لئے دولتمندوں کو حکم دیا، کہ اگر تم علانیہ صدقہ دو تو بھی بہتر ہے لیکن فقراء کو چھپا کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، (بقرہ ۳۷)

[۱] ایضاً بعض ان کی مسلم، [۲] ایضاً کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلہ [۳] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ [۴] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ لا یسئلون الناس الحافا

حکومت ہے،

مذہبی حکومت کے متعلق غلط فہمی کا سبب

مذہبی حکومت کے متعلق ایک عام غلط فہمی ہو اور اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جس مین دوسرے مذہب والون کے کوئی حقوق اور اُن کے لئے عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کی کوئی گنجایش نہ ہو، کم از کم اسلام کی مذہبی حکومت کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے، اس کی تفصیل آیندہ بیان کیجائے گی۔

درحقیقت یہ غلط فہمی یورپ کی پھیلائی ہوئی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو کہ عیسائی مذہب کی بنیاد ترک دنیا پر ہے جس مین حکومت کی کوئی گنجایش نہین ہے، اس لئے اس مین حکومت کا کوئی آئین بھی نہین ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی غلط تفسیر نے کہ "جو قیصر کا حصہ ہو سو قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے، سو خدا کو دو" عیسائی مذہب مین اور بھی دین و دنیا مین علٰحدگی پیدا کر دی لیکن سیاست سے مذہب کی بے دخلی کا اصل سبب یہ ہو کہ گو عیسائی مذہب مین حکومت کی گنجایش نہین ہے لیکن قرون وسطیٰ مین کلیسا کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ حکومت پر بھی غالب آگیا تھا، اور اس کی حیثیت کنگ میکر کی ہوگئی تھی اور ارباب کلیسا جس کو چاہتے تھے تخت پر بٹھاتے تھے، اور جس کو چاہتے تھے، اتار دیتے تھے، اور چونکہ اُن کے اس حکومت کا کوئی مذہبی قانون نہین تھا، اور وہ خالص دنیا دار اور مذہبی روح سے بالکل خالی تھے اسلئے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے وہ سب کچھ کرتے تھے، جو دنیاوی بادشاہ اپنی حکومت کی بقا کے لئے کر سکتے ہین، بلکہ ان کی سفاکیان اور عیش پرستیان اُن سے بھی بڑھ گئی تھین جس پر یورپ کے قرون وسطیٰ کی تاریخ شاہد ہے؛ اس سے ہر تاریخ دان واقف ہو، اس کا نتیجہ کلیسا کے خلاف بغاوت کی شکل مین ظاہر ہوا اور بڑی خونریز معرکہ آرائیون کے بعد کلیسا کی قوت اور اس کا اقتدار ختم ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا، جب یورپ مین علم و عقل کی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی، اس لئے کلیسا کا اقتدار ختم ہونے کے بعد ارباب کلیسا کی غلطیون اور اُن کی زیادتیون کی سزا مین نہ صرف مذہب کو سیاست سے خارج کر دیا گیا، بلکہ سرے سے

لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اقبال کی حکومت الٰہیہ کا تصور زمین کے کسی خطہ مین مسلمان قوم کی سیاسی حکومت نہین، بلکہ صحیح اسلامی حکومت ہی جس کا نظام قرآنی قوانینُ احکام اور احادیث نبوی پر مبنی ہو، ورنہ دنیا مین مسلمانون کی سیاسی حکومتون کی تو آج بھی کمی نہین، اس کے لئے نئی دعوت کی کیا ضرورت تھی، اقبال نے اسلامی حکومت کے اصلی تصور کو خود اپنی نظم حکومت الٰہیہ مین واضح کیا ہے،

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام او را نہ او کس را غلام

بندۂ حق مرد آزاد است و بس ملک و آئینش خدا داد است و بس

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

عقل خود بین غافل از بہبود غیر سود خود بیند نہ بیند سود غیر

وحی حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

بندۂ حق یعنی حکومت الٰہیہ کا حکمران یا خلیفہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہوتا ہے، نہ خود وہ کسی کا غلام ہوتا ہے، اور نہ کسی دوسرے کو غلام بناتا ہے، وہ ایک آزاد انسان ہوتا ہے، اس کا ملک اور اس کے آئین و قوانین سب خدا کا عطیہ ہوتے ہین، اس کی رسم و راہ اس کا دین و مذہب اس کے آئین و قوانین، اس کی برائی و بھلائی، اس کی تلخی و شیرینی، سب منجانب اللہ ہوتی ہے، اس لئے کہ عقل خود بین مین یہ خرابی ہے، کہ اس کی نظر ہمیشہ اپنے فائدہ پر رہتی ہے، خواہ وہ شخصی ہو یا قومی اس کے مقابلہ مین خدا کی وحی کی نظر سارے انسانون کے فائدہ پر رہتی ہے، اور وہ سب کے سود و بہبود کو دیکھتی ہے (اس لئے وحی الٰہی کے ذریعہ جو قانون اور نظام حکومت بنے گا اس مین ساری دنیا کی بھلائی کا لحاظ ہوگا،) وہ صلح ہو یا جنگ ہر حالت مین عدل و انصاف پر قائم رہتی ہے، اس کے میل جول اور جدائی مین کسی کا خوف اور کسی کی رعایت نہین ہوتی،

ان اشعار خصوصاً پانچوین شعر سے ظاہر ہے کہ اقبال کی حکومت الٰہیہ کا مقصد قرآنی احکام کے مطابق

پنے ذاتی مفاد کے لئے جو بے عنوانیاں کرتے تھے، وہی برسرِ حکومت طبقہ اپنے اقتدار اور اپنے قومی و وطنی مفاد کیلئے دوسری قومون
ساتھ کرنے لگا، اور اس کے جواز کے لئے وطنیت و قومیت کے بت تراشے گئے، چنانچہ اسی زمانہ مین
یشیا پر یورپ کی یلغار شروع ہوئی، اور انہی جمہوری حکومتون نے اس کے بڑے حصہ کو اپنا غلام بنالیا، ا
پنے سیاسی و اقتصادی مفاد کے لئے انھون نے جس طرح مشرقی ملکون کو لوٹا، اور اہلِ مشرق کو ذلیل و خوار
لیا اس سے ہر تاریخ دان واقف ہے،

لیکن اہلِ مغرب اپنے جلو مین ایک دلفریب تمدن اور نئے علوم کی فوج بھی لائے تھے، اس سے
مشرقی ممالک اس قدر مرعوب و مسحور ہوئے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی مین فخریہ اُن کی تقلید کرنے لگے، چنانچہ جمہوریت
کی برکتون کا غلغلہ بھی سارے مشرق مین پھیل گیا، اور اس کے بعد یہان بھی جو نئے نظامِ حکومت قائم ہوئے
اُن کی بنیاد جمہوریت پر رکھی گئی، لیکن درحقیقت موجودہ جمہوری حکومتین جمہوریت کی روح سے بالکل خالی ہین
ان مین اور شخصی حکومتون مین صرف یہ فرق ہے کہ شخصی حکمران اپنے ذاتی فائدہ اور اقتدار کے لئے اپنی رعایا پر
جو زیادتیان کرتے تھے، جمہوری حکومتین وہی زیادتیان اپنے قومی مفاد کے لئے دوسری قومون پر کرنے لگین،
جس پر مشرق کی تاریخ شاہد ہے، اقبال نے مختلف پیرایون مین اس نام نہاد جمہوریت کی پردہ دری کی ہے،

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردون مین نہین غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا مین پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاحِ رعایاتِ حقوق — طبِ مغرب مین مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الامان — یہ بھی اک سرمایہ دارون کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو
آہ اے نادان قفس کو آشیان سمجھا ہے تو

ایک دوسری نظم مین جمہوریت کے چہرہ سے اس طرح نقاب اٹھائی ہے،

مذہب ہی کی وقعت جاتی رہی، لیکن اسلام میں جیسا کہ اوپر بھی لکھا گیا ہے، دین و دنیا الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، اور اس کے نزدیک جسم و روح سے مل کر کامل انسان بنتا ہے اس لئے اس کی تعلیمات بھی ان دونوں کی ضروریات پر حاوی ہیں، اور اس میں دینی و اخلاقی تعلیمات کے ساتھ حکومت کا بھی پورا آئین موجود ہے، اقبال نے ان واقعات کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ۔۔۔ سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں ۔۔۔ کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا ۔۔۔ چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دولت و دین میں جس دم جدائی ۔۔۔ ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی ۔۔۔ دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا ۔۔۔ بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

سیاست سے مذہب کی علیحدگی کے بعد اگرچہ حکومتیں کلیسا کے اقتدار سے آزاد ہوگئیں، لیکن ان میں شخصی حکومتوں کی تمام خرابیاں موجود تھیں، اور اربابِ کلیسا مذہب کے نام پر جو مظالم کرتے تھے، وہ اب سیاست کے نام سے ہونے لگیں، جب یہ شخصی استبداد حد سے بڑھ گیا، تو اس کے خلاف بھی عوامی اور جمہوری تحریکیں شروع ہوئیں، جس کا نتیجہ انقلاب فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا، اس وقت سے یورپ میں شخصی حکومتوں کے بجائے جمہوری نظام کا آغاز ہوا، گو جمہوری اور عوامی حکومت کی اصطلاح بظاہر بڑی دلفریب ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ جمہوریت نے شخصی استبداد کا خاتمہ کر دیا، لیکن جمہوریت کے قیام کے بعد شخصی استبداد کے بجائے [illegible] استبداد شروع ہو گیا، اور شخصی حکمران

ں ہوگا، وہ ذاتی مفاد اور قومی غرض سے خالی نہین ہوسکتا، اس لئے اس سے تمام انسانون کے
قہ عدل وانصاف کی توقع نہین کیجا سکتی، جس کا تجربہ صدیون سے ہورہا ہے، اور حکومت الٰہیہ کا
ام اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب نے نہین پیش کیا ہے جس کی بنیاد تمامتر عدل وانصاف پر ہے، اور
ں مین نہ صرف محکوم قومون بلکہ عالم انسانیت کے حقوق متعین اور محفوظ ہین،

لیکن جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، کلیسا کی استبدادی اور تنگ نظر حکومت نے سارے یورپ کو
ہبی حکومت کا مخالف بنا دیا، اور پھر اس کے ذریعہ یہ مخالفت ساری دنیا مین پھیل گئی، اور مغربی قومون
وصًا انگریزون نے اسلام کی مذہبی حکومت کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ
نام کیا، اور بعض مسلمان بادشاہون بالخصوص عجمی فرمانرواؤن کے غیر اسلامی اعمال نے ان کو بدنام
ینے کا اور زیادہ موقع دے دیا، لیکن جو لوگ اُن کے اعمال و افعال سے اسلام پر اعتراضات کرتے ہین
، اس فرق کو بھول جاتے ہین کہ اسلامی حکومت اور مسلمان حکومت اور مسلمان فرمانروا دو الگ
رین ہین[1]، مسلمان فرمانرواؤن کے ذاتی اعمال سے اسلامی قوانین کا قیاس کرنا صحیح نہین اور اُن کے
ے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہین ہے، ایسے سلاطین وحکمران، نہ اسلام کے صحیح نمایندے تھے،
نہ اس کا نظام حکومت اسلامی تھا، اُن کا مذہب ضرور اسلام تھا لیکن انکی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکومت
ں اُن کی ملکی اور قومی روایات اور آئین و قوانین کا زیادہ اثر تھا، اور مسلمانون کے پرسنل لا اور بعض
ھرے ظاہری اسلامی اثرات کو چھوڑ کر ان کا نظام حکومت خالص دنیاوی تھا، ایسی حالت مین
ن کو اسلامی حکومت کہنا اور اُن کے اعمال کی ذمہ داری اسلامی قوانین پر ڈالنا کسی طرح صحیح نہین
،، بلکہ جن ملکون مین عجمی قومون کے ذریعہ اسلام پہنچا، وہ بھی اصلی شکل مین نہین تھا، اور اس مین بہت سے

[1] مسلمان حکومتون کو مجازًا تو اس لحاظ سے اسلامی کہہ سکتے ہین، کہ اُن کے فرمانروا مسلمان ہین، لیکن اُن پر حقیقی
لامی حکومت کا اطلاق صحیح نہین ہوگا،

وائے بر دستور جمہور فرنگ مردہ تر شد مردہ از صور فرنگ

حقہ بازان چون سپہر گرد گرد از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد

شاطران این گنج ور آن رنج بر ہر زمان اندر کمین یک دگر

فاش باید گفت سرّ دلبران

ما متاع و این ہمہ سوداگران

ان اشعار کی صداقت پر ایشیا و افریقہ کی گذشتہ دو تین صدیون کی تاریخ شاہد ہے، ایشیائی ملکون اور قومون کی غلامی اور ان کی تباہی اسی دورِ جمہوریت کا زرین کارنامہ ہے، جمہوریت کے بانی اول فرانس کے ہاتھون شمالی افریقہ کے مسلمانون پر اور جمہوریت کے نام بر طانیہ کے ہاتھون تمام ایشیائی ملکون پر جو کچھ گذری، اور اب تک گذر رہی ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے،

اس کا ایک سبب تو وہی نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت ہے، جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے دوسرا سبب لادینی سیاست ہے، درحقیقت جو سیاست مذہب یعنی اخلاق روحانیت اور خوفِ خدا سے خالی ہوگی وہ کبھی دوسرون کے ساتھ انصاف نہیں برت سکتی،

غیر حق چون ناہی و آمر شود زور ور بر ناتوان قاہر شود

زیر گردون آمری از قاہری است آمری از ماسوی اللہ کافری است

قاہر آمر کہ باشد پختہ کار از قوانین گردِ خود بندد حصار

جرۂ شاہین تیز چنگ و زود گیر صعوہ را در کارہا گیرد مشیر

قاہری را شرع و دستورے دہد بے بصیرت سرمہ با کورے دہد

حاصل آئین و دستور ملوک دہ خدایان فربہ دہقان چو دوک

ان کا علاج صرف قوانین خداوندی کے مطابق حکومت ہے، جو قانون محض انسانی عقل و تجربہ

جن کے ذریعہ یورپ مین علم و فن اور تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی،

اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اسلامی تعلیمات کے اصل حامل و مبلغ عرب تھے اس لئے عجم کی نو مسلم اقوام کے مقابلہ مین ان مین اسلامی تعلیم کا زیادہ اثر تھا، یہی وجہ ہے کہ جن ملکون مین ان کی حکومت رہی، یا جہان اُن کے ذریعہ اسلام پہنچا، ان ملکون کی کایا پلٹ گئی اور وہ ان کے حُسن عمل اور اُن کے عدل و مساوات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے، چنانچہ جن ملکون مین اسلام کی حکومت کبھی قائم نہین ہوئی اور صرف عرب مبلغین کے قدم پہنچ گئے، وہان بھی اسلام کی روشنی پھیل گئی، جزائر شرق الہند یعنی انڈونیشیا اور چین مین کبھی اسلام کی تلوار نہین پہنچی، لیکن آج پورا انڈونیشیا مسلمان ہے، اور چین مین چھ کروڑ مسلمان ہین، خود ہندوستان مین مالابار کے سارے ساحلی علاقہ مین عرب مبلغین کے ذریعہ اسلام پھیلا،

یہ ایک ضمنی بات تھی جو درمیان مین آگئی، اصل مقصود یہ کہنا تھا کہ جن حکومتون کو اسلامی کہا جاتا ہے، اور جن حکمرانون کے ذاتی اعمال کو اسلامی سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، وہ حکومتین اور وہ حکمران دراصل اسلامی نہین بلکہ خالص دنیاوی ہین، اُن کو اسلامی نظام حکومت اور اس کے قوانین پر عمل سے کوئی تعلق نہین تھا، اس لئے اُن کے اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہین ہے، اسلامی حکومت وہ ہے جس کا نظام قرآن و حدیث کے احکام کے مطابق ہو جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، جس مین بلا امتیاز مذہب و ملت رعایا کے ہر طبقہ اور ہر فرد کے ساتھ انصاف برتا جائے، اُن کے تمام حقوق محفوظ ہون، اور وہ اپنے کو اپنی ملکی و قومی حکومت سے زیادہ محفوظ سمجھین، اور نہ صرف حکومت بلکہ ہر مسلمان اُن کے حقوق کا محافظ و نگہبان ہو، یہ کوئی خیالی آئیڈیل نہین، بلکہ تاریخی واقعہ ہے خلفائے راشدین کے زمانہ مین شام کے یہودیون اور عیسائیون مصر کے قبطیون شمالی افریقہ کے بربر اور ایران کے مجوسیون کو اسلامی حکومت پر اپنی ملکی حکومت سے زیادہ اعتماد تھا جس کے واقعات تاریخون مین موجود ہین،

اسلامی حکومت نے غیر مسلمون کو جو حقوق دیئے ہین، اس سے زیادہ اس دور ترقی مین بھی تصور مین

عجمی خیالات و عقائد شامل ہو گئے تھے، ایسی حالت مین اُن سے خالص اسلامی قوانین پر عمل کی توقع ہی نہین کیجا سکتی تھی، یہ بھی اسلام کا بڑا احسان ہے کہ اس نے بہت سی پرانی خونخوار قومون کو مہذب بنا دیا، اس سلسلہ مین یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ایسے بادشاہون کا طرزِ عمل خود مسلمانون کے ساتھ کیا تھا، جہان اُن کے اقتدار اور حکومت کے مفاد کا سوال آجاتا تھا، وہ اُن کے لئے بھی ایک جابر و ظالم فرمانروا بنجاتے تھے، ایسے حکمرانون کی تاریخ خود مسلمانون کے ساتھ جنگ و خونریزی اور وحشت و بربریت سے بھری ہوئی ہے، چنانچہ اسلامی ملکون اور اُن کی حکومتون کے زوال کا ایک بڑا سبب اُن کی خانہ جنگی بھی ہے، تاریخی بحث مین پڑنے کا یہ موقع نہین، اس سے ہر لکھا پڑھا شخص واقف ہے، کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ مسلمان مسلمان کا گلا کاٹتے، اور اُن کو محکوم بناتے رہین، درحقیقت یہ سب کے سب دنیاوی بادشاہ تھے، اور اُن کی حکومتین بھی خالص دنیاوی تھین اور اُن کے پیشِ نظر ذاتی مفاد تھا، اور وہ اسلام کے نام کو بھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے تھے، اگر ان مین اسلامی تعلیم کا کچھ بھی اثر ہوتا، تو وہ آپس مین لڑلڑا کر اس طرح مسلمانون کو تباہ نہ کرتے، لیکن ہر حکومت مین بعض فرمانروا ذاتی حیثیت سے صالح اور دیندار بھی تھے، اور انھون نے بڑے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی، اور علم و فن تہذیب و تمدن اور انسانیت اور بعض حیثیتون سے مذہب کی بھی خدمت انجام دی، خود ہندوستان کے بہت سے صالح مسلمان سلاطین کے زرّین کارنامے ہماری نگاہون کے سامنے ہین، لیکن ان کی حکومت بھی خالص اسلامی نہین تھی

بلکہ عجمی فرمانرواؤن کے مقابلہ مین عرب حکمران نسبتًہ بہتر تھے، گو خلافتِ راشدہ کے بعد اُنکی حکومت بھی خالص اسلامی نہین رہ گئی تھی، پھر بھی اُن مین اسلامی تعلیمات کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا، اس لئے جب تک خلافت کی باگ عرب خلفاء کے ہاتھون مین رہی، اور وہ عجمی قومون کے اثرات سے بالکل مغلوب نہین ہو گئے، اُن کی دنیاوی حکومت بھی اسلامی اثر سے یکسر خالی نہین ہوئی بنی امیہ دمشق خلافتِ عباسیہ کا ابتدائی دور اور اسپین کی اموی حکومت اس کی شاہد ہین، جنھون نے انسانیت کی بڑی خدمت انجام دی، اور

اس بحث مین جو باتین لکھی گئی ہین، اُن کے جواب مین یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی سچا مذہب بھی انسانی حقوق کے احترام، عدل و انصاف، امن و صلح کی تعلیم، اور ظلم و جور فتنہ و شر اور دوسرون کی حق تلفی وغیرہ کی ممانعت اور اس قبیل کی دوسری اخلاقی تعلیمات سے خالی نہین ہے اور اُن کے ذریعہ بھی عدل کے ساتھ حکومت کی جا سکتی ہے، اس سے انکار نہین، اسی لئے کسی حکمران قوم کی تاریخ بھی صالح اور عادل حکمرانون سے خالی نہین ہے،

لیکن اصل بحث محض اخلاقی تعلیمات کی نہین، بلکہ اُن کی قانونی حیثیت کی ہے، قانونی حیثیت اور قوتِ نافذہ کے بغیر محض اخلاقی تعلیم کافی نہین ہے، اس لئے کہ اخلاقی تعلیم پر عمل اشخاص کی ذاتی صلاحیت اور سلامتِ طبع پر موقوف ہے، مثلاً ایک صالح حکمران تو اخلاقی تعلیمات پر عمل کرتا ہے لیکن جو حکمران ایسا نہین ہے، اس کو مجبور کرنے والی کوئی قوت ہونی چاہئے، یہ قوت آئین و قوانین کی ہی

اسلامی نظام کی یہی خصوصیت ہے کہ اس کا پورا آئین اور اس کے قوانین موجود ہین جن کی پابندی اخلاقی تعلیمات کی طرح ذاتی صلاحیت پر موقوف نہین، بلکہ اس کا نفاذ اور اُن پر عمل قانونی فرض ہے، اس کے جواب مین یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اسلامی حکمران اُن پر عمل نہین کرتا، اس کو مجبور کرنے والی کونسی قوت ہے جس کی مثالین تاریخ مین موجود ہین اس کا جواب اوپر گذر چکا ہے کہ وہ صحیح اسلامی حکمران ہی نہین جو اسلامی قوانین کا پابند نہ ہو اور وہ اسلامی حکومت نہین جسمین اسلامی قوانین کا نفاذ نہ ہو اور اس بحث کا مقصد صحیح اسلامی حکومت ہے، درحقیقت خالص دنیاوی اور مادی فوائد کے لحاظ سے بھی اسلامی تعلیمات ایسی صداقتون پر مبنی ہین جن پر عمل کے بغیر انسانون کو مادی فلاح اور دنیاوی امن و سکون بھی حاصل نہین ہو سکتا چنانچہ آج انسانی حقوق کے احترام، عالمگیر انسانی اخوت و محبت، معاشی مساوات اور امن و صلح کی آوازین ہر ملک سے بلند ہو رہی ہین، اور جن باتون کو دنیا آج نہین مانتی، ان کے کل ماننے پر مجبور ہو گی، اسلام کے نام سے نہ سہی دوسرے نامون سے سہی، اصل مقصد نام نہین، بلکہ کام اور نتیجہ ہے، اگر دنیاوی معاملات

نہین آسکتے، ان کی تفصیل کی اس مختصر مضمون مین گنجایش نہین ہے، مختصر یہ ہے کہ اسلام مین غیر مسلم رعا
کو وہ تمام حقوق حاصل ہین جن کو آج کل شہری حقوق کہا جاتا ہے، چند بنیادی حقوق یہ ہین،

اُن کی جان و مال خواہ وہ کسی شکل مین ہو، عزت و آبرو، مذہب، عبادتگا ہین، محفوظ رہین
اُن کو اپنے مذہبی مراسم کے ادا کرنے اور اپنے معاشرتی قوانین پر عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل رہے گ
اُن کے مذہبی نظام مین کوئی مداخلت نہ کیجائے گی، اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو کو مسلمانون کی جا
و مال اور عزت و آبرو کے برابر سمجھا جائے گا، اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے گا، یا اس کے مال
آبرو کو کوئی نقصان پہنچائے گا، تو قصاص مین قتل کیا جائے اور مالی نقصان اور بے عزتی کرنے کی سزا پائیگا

حکومت کے عہدون مین تو اُن کے حقوق کی تصریح نہین ہے، لیکن دولتِ بنی امیہ بنی عباس
دولتِ فاطمیہ مصر اور اسپین کی اموی حکومتون مین چند بڑے ذمہ دار عہدون مثلاً صوبہ داری، فوج
کی سپہ سالاری اور سفارت کو چھوڑ کر جن مین علم دین سے واقفیت ضروری ہے، باقی دوسرے عاملانہ عہدون
خصوصاً مالیات کے شعبہ مین ذمی بڑے بڑے عہدون پر مامور تھے، اور انکو ہر قسم کی ترقی کے مواقع حاصل تھے،

فقہ کی تمام کتابون مین اسلام کے دوسرے قوانین کی طرح حقوق الذمیین کا بھی باب ہوتا ہے،
خصوصاً قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج مین اُن کے حقوق کی پوری تفصیل درج ہے[1]، علامہ شبلی نے بھی
اردو مین اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس مین ذمیون کے حقوق کی پوری تفصیل ہے، اور ان
اعتراضات کا بھی جواب دیا گیا ہے، جو اس سلسلہ مین کئے جاتے ہین،

ممکن ہے نئے مسائل و حالات کی روشنی مین ان قوانین مین ترمیم اور بعض نئے قوانین کی ضرورت ہو
تو جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اس کا دروازہ بند نہین ہے، اور علمائے مجتہدین اس کام کو کر سکتے ہین،

---

[1] یہ کتاب ہارون رشید نے اسلامی قانون خراج پر لکھوائی تھی لیکن اس مین ذمیون کے حقوق کی بھی پوری تفصیل
درج ہے، جس پر عباسی دور مین عمل درآمد ہوتا تھا،

۲- آپکے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے میرے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہین کیا ہے، اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو مین آپ کو دوستانہ مشورہ دیتا ہون کہ آپ اس طرف بھی توجہ کرین، کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتین خود بخود اس کی سمجھ مین آجائین گی، (رسالہ ماہ نو اگست ۱۹۴۹ء)

ان سطور مین انھون نے اپنے کلام کے متعلق اس قسم کے تمام اعتراضات کا جواب دیدیا، تاہم اس سے انکار نہین کہ اقبال انسان تھے، اُن سے غلطی بھی ہوسکتی ہے، اور ان کی بعض تعلیمات مین اختلاف کی گنجایش نکل سکتی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے وہ بلا اختلافِ مذہب وملت تمام قومون کے لئے درسِ حیات ہین، اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ تو اقبال کے معترضین کا جواب تھا، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اپنے نفس اور اپنی ذات پر خدا کے قوانین کی حکومت قائم کئے بغیر سیاسی حکومتِ الٰہیہ وجود مین نہین آسکتی، یعنی جب تک مسلمان اپنے اعمال اور اپنی انفرادی زندگی مین خدا کے احکام کے پابند نہ ہون گے، اور ان کی زندگی اسلامی سانچہ مین نہ ڈھل جائے گی، اس وقت تک حکومتِ الٰہیہ کا قیام ممکن ہی نہین ہے، اور جب وہ خود نمونۂ عمل بن جائین گے، تو دنیا خود بخود اسلامی نظام کی طرف کھنچے گی اور بغیر کسی دعوت و تبلیغ کے حکومتِ الٰہیہ قائم ہو جائے گی،

مذہبی عقیدہ و تعلیم اصولِ فطرت اور تاریخی واقعہ ہر لحاظ سے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی یہی ترتیب اور یہی ایک شکل ہے اس بارہ مین قرآن مجید کا وعدہ یہ ہے،

"اللہ تعالیٰ نے اُن لوگون سے جو ایمان لائے، اور عمل صالح کئے، یہ وعدہ کیا ہے کہ روئے زمین پر اُن کو اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے والون کو خلیفہ بنایا تھا"

یعنی استخلاف فی الارض ایمان وعمل صالح کے ساتھ مشروط ہے،

اصولِ فطرت یہ ہے کہ عملی نمونہ کے بغیر کوئی تعلیم اور کوئی دعوت خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی کامیاب نہین ہوسکتی، اور ہر دعوت کے لئے ضروری ہے کہ داعی کی پوری زندگی خود دعوت کا عملی نمونہ ہو، اس لئے

ہی کی حد تک صحیح اسلامی اصولون پر دنیا کا عمل ہو جائے تو کم از کم مخلوقِ خدا کو دنیا مین تو امن وسکون حاصل ہو جائے گا،

اس لئے اقبال کی دعوت درحقیقت انسانی فلاح وسعادت کی دعوت ہے جس مین تمام برحق اور الہامی مذاہب کی اصولی تعلیمات شامل ہین، انھون نے شاعری کے علاوہ اپنی کتابون اور تحریرون مین بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے، خیال آتا ہے کہ اسرارِ خودی کے انگریزی مترجم ڈاکٹر نکلسن یا کسی دوسرے ریویونگار کے اعتراض پر انھون نے یہی جواب دیا تھا کہ اُن کے نزدیک انسانون کی نجات اور اُن کے تمام مشکلات کا حل اسلام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اس وقت ان کا اصل جواب سامنے نہین ہے، اس لئے اُن کے صحیح الفاظ نقل نہین کئے جا سکتے، مگر اس کا مفہوم قریب یہی تھا،

پروفیسر آل احمد سرور نے اُن کی بعض تعلیمات اور اشعار کے متعلق اپنے کچھ شکوک اور اعتراضات لکھ بھیجے تھے، اُن کے جواب مین انھون نے لکھا تھا،

آپ کے دل مین جو باتین پیدا ہوئین، اُن کا جواب بہت طویل ہے، اور مین بحالتِ موجودہ طویل خط لکھنے سے قاصر ہون، اگر مین کبھی علی گڈھ حاضر ہوا، یا آپ کبھی لاہور تشریف لائے، تو انشاء اللہ زبانی گفتگو ہوگی، سردست مین دو چار باتین عرض کرتا ہون،

۱- میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہین رکھتے، میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے، جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے، میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے، اگر آپ پورے غور و توجہ سے یہ مطالعہ کرین تو ممکن ہے آپ انھی نتائج تک پہنچین جن تک مین پہنچا ہون، یہ ممکن ہے آپ کا ریویو مجھ سے مختلف ہو، یا آپ خود دین اسلام کے حقائق ہی کو ناقص تصور کرین اس، دوسری صورت مین دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہین کیا ہے،

ہندوستان مین توپ کی تاریخ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

(۳)

عہد جہانگیری اکبر کی پچاس سالہ حکومت کے باعث ملک مین امن و امان اور خوشحالی کا دورہ تھا، سلطنت کے کسی حصہ مین کوئی جنگ درپیش نہ تھی، اس لئے جہانگیر جب تخت نشین ہوا، تو اس کو سوائے عیش و عشرت کے دوسرا کام نہ تھا، اس لئے اس کے عہد مین فوجی تنظیم وہی رہی، جو اکبر کی قائم کردہ تھی اور جس مین کوئی تبدیلی نہین ہوئی، مگر توپ خانہ مین جو ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعض معمولی بغاوتون کے فرو کرنے کے لئے جو فوجین گئین اُن مین توپون کی تعداد اس عہد کے لحاظ سے کہین زیادہ تھی، تزک جہانگیری مین بنگالہ کے زمیندار عثمان کی بغاوت کے متعلق ہے،

درین حالت عبد السلام پسر معظم خان با جمعے	اس حالت مین عبد السلام پسر معظم خان
از بند ہاے درگاہ کہ مجموعہ سی صد سوارہ و	شاہی ملازمون کی ایک جماعت لے کر
چہار صد توپچی باشند میرسند[۱]	جس مین تین سو سوار توپچی تھے، پہنچی،

اسی طرح قلعہ کانگڑا کے فتح کے لئے جب راجہ بکرماجیت کو بھیجا گیا، تو ایک بڑا توپ خانہ بھی اسکے ساتھ تھا، اقبال نامہ مین ہے،

---

[۱] تزک جہانگیری ص ۹۴، جشن ہفتم علی گڈھ،

مسلمان جب تک اپنی انفرادی زندگی مین اسلامی تعلیمات کا مثالی نمونہ نہ پیش نہ کرین گے، اس وقت تک محض زبان سے اُن کی دعوت بے نتیجہ اور بے اثر رہے گی، لیکن اگر وہ اپنے عمل سے ثابت کر دین کہ اسلام ہی ہر حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہے، تو دنیا خود بخود اس سے متاثر ہوگی، اور بغیر دعوت کے اس کی طرف کھنچ آئے گی، ع

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہین جاتی

اور یہ اصول نہ صرف اسلام اور حکومتِ الٰہیہ بلکہ دنیا کی ہر تعلیم اور ہر نظام کے لئے یکسان ہے، چنانچہ اگر آج نسلی و جغرافی قومیت و وطنیت کے جذبات سے بلند ہو کر صحیح جمہوری اصولون پر عمل کیا جائے تو دنیا صحیح جمہوری نظام کو قبول کرے گی اور اگر وہ واقعی مشکلات کا حل اور اپنے مصائب کا علاج چاہتی ہے، یہ علاج جس نظام میں ہوگا اسکو وہ بلا تامل قبول کرے گی، اس لئے اگر مسلمانون کا یہ دعویٰ ہے کہ انسانیت کے امراض کا علاج اسلامی نظام مین ہے اور یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے تو انھین عمل سے اس کا ثبوت دینا چاہئے،

تاریخی حیثیت سے بھی اسلامی نظام کی تبلیغ اور اس کی کامیابی کی بھی یہی ترتیب ہے، اسلام کے ظہور کے ساتھ حکومتِ الٰہیہ نہین قائم ہوگئی تھی، بلکہ پہلے برسوں تک اور پھر ابتدائی مدنی زندگی مین ان مین عمل کی روح پیدا کی گئی، اور جب وہ نمونہ عمل بن گئے، اس وقت حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد پڑی، اور جب خلفاے راشدین کے زمانہ مین اس کا مکمل مثالی نمونہ قائم ہوا، اس وقت خود بخود دوسری قومین اس نظام کو قبول کرنے لگین، اس لئے اسلامی نظام کے دعوت کی کامیابی اور ناکامی مسلمانون کے عمل پر منحصر ہے،

تیار ہوئی ہے، جس مین ۳۰ نال بندوق بیک وقت ایک فلیتہ سے سر ہوتی ہے[۱]،

دھول دہان نظام شاہی توپون مین سے ایک توپ "دھول دہان" تھی، اس کو دیکھ کر شاہجہان نے سلطان محمد کو حکم دیا کہ اسی طرح کی دوسری توپ ڈھالی جاے، چنانچہ سلطان محمد بن عبدالغفور دہلوی نے اس کو ڈھالا، اس کی خصوصیت یہ تھی، کہ اس مین دوسری دھاتون کے علاوہ دو من چھ سیر چاندی اور ۲۵ سیر سونا بھی لگایا گیا تھا، اس کی مزدوری پر ۲۳۵ روپیے خرچ ہوئے،

عہد عالمگیری عالمگیر کی ساری عمر چونکہ جنگون مین گذری، اس لئے فوجی ضروریات کے لحاظ سے توپخانہ کی جس قدر اُس کو ضرورت تھی، اس کے پیش رو بادشاہون مین سے اکبر کے بعد کسی کو نہین پیش آئی اس نے توپخانہ کو اعلیٰ پیمانہ پر پہنچانے کے لئے باہر سے بہت سے ماہرین فن کی خدمات حاصل کی گئی ہین،

مینڈھا توپ ان مین سے ایک محمد حسین عرب تھا، جو اعلیٰ درجہ کی توپین تیار کرتا تھا، اس کی بنائی ہوئی بعض توپین آج بھی موجود ہین، اُن مین سے ایک توپ دولت آباد مین چینی محل کے پاس قلعہ کے دروازہ کے نزدیک ایک برج پر رکھی ہوئی ہے، اس کا اصلی نام "قلعہ شکن" ہے۔ مگر آج کل اسکو "مینڈھا توپ" اس لئے کہتے ہین کہ اس کا سر مینڈھے کی طرح ہے، اس توپ کے سیدھے جانب گولہ کے صدمہ سے گڈھا پڑ گیا ہے، اس کا طول ۱۰ فیٹ ½ ۲ انچ، کان کے پاس کا دور سات فیٹ دو انچ، دہانے کا دور پورے پانچ فیٹ ہے، اور دہانہ ایک فٹ دو انچ کا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس کا گولہ ایک منی ہوگا، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

نَصرٌ مِّنَ اللّٰہِ فتح قریب وبشّر المؤمنین فاللہ خیر حافظا ابوالمظفر محی الدین

محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، توپ قلعہ شکن، عمل محمد حسین عرب"

اس زمانہ مین گولہ اندازون مین ہندوستانی اور ترکی کے علاوہ بعض ڈچ بھی ملازم تھے، چنانچہ

[۱] نظام فوج مصنفہ ارون صاحب لندن ص ۱۳۰،

دو دویست سوار برقنداز و پانصد نفر توپچی	دوسو سوار برق انداز اور پانصد توپچی پیادہ
پیادہ سواے جمعیتے کہ بیشتر تعین شدہ بودند	اُن لوگون کے علاوہ جو پہلے سے مقرر ہوئے
بخدمت تسخیر قلعہ کانگڑا دستوری یافتہ تبغا	تھے، قلعہ کانگڑہ فتح کرنے کے لئے مامور ہوئے
خلعت وشمشیر سرفراز گردید[۱]	خلعت اور تلوار عطا کرکے سرفراز کئے گئے،

آگرہ مین ایک توپ تھی جس کا نام ظفر بخش تھا، اس کے بنانے والے کا نام استاد سلطان محمد ہو، اس کا وزن ۳۶۴ من چھ سیر مین پاؤ تھا، اس توپ پر کندہ تھا "الفقیر سلطان محمد بن عبد الغفور دہلوی ۱۰۳۶ھ شعر

فتح دکن کرد بلطف اللہ شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ[۲]"

شاہجہان جب ۱۰۳۷ھ مین سریر آراے سلطنت ہوا، تو مغلیہ سلطنت عروج پر تھی، اس عہد مین جنگ قندھار اور حملۂ دکن کے سوا کوئی جنگ قابلِ ذکر نہین ہے، قندھار مین جو توپین استعمال ہوئین، وہ کچھ زیادہ بڑی نہ تھین، چنانچہ اورنگ زیب کے خطوط مین جو شاہجہان کے نام مین، اس کا بار بار تذکرہ آتا ہے[۳]، داراشکوہ جب قندھار جانے لگا ہے، تو دو توپین، غالباً چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاہور مین چھوڑ گیا تھا، اُن مین سے ایک کا نام فتح مبارک اور دوسری کا کشور تھا، دہلی سے دو توپین اور روانہ کی گئی تھین، مریم قلعہ کشا، اس کا طول ۲۴ فیٹ تھا، اس مین اسی فی صدی تانبا، اور باقی ٹین تھا،

ایک توپ "جہان کشا" تھی، اس کا طول ۱۷ فیٹ دور ۱۵ فیٹ اور دہانہ ایک فیٹ سے زیادہ تھا، یہ ڈھاکہ مین ڈھالی گئی ۲۰ جمادی الآخر جلوس (یعنی ۱۰۶۳ھ) اس پر کندہ ہے،

ارغن اکبر کے عہد مین جو مشین گن تیار ہوئی تھی، اس مین اس زمانہ مین بڑی بڑی ترقی ہوئی، چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو ۱۶۶۹ھ مین ہندوستان آیا ہو، اپنے ایک خط مین لکھا ہے، کہ ارغن نامی ایک ایسی مشین

[۱] اقبال نامہ ص ۱۱۱ کلکتہ [۲] تعمیر تاج محل قلمی کتب خانہ سلیم پور (لکھنو) لیکن شبلی منزل مین جو قلمی نسخہ ہو، اس مین ۱۰۳۶ھ ہے، [۳] لیکن ڈاکٹر برنیر لکھتا ہو کہ اس جنگ مین اورنگزیب نے انگریزی فرانسیسی جرمنی، پرتگیزی توپین استعمال کین لیکن اس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہین ہوتی،

"ابو المظفر محی الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۵ھ گولہ ۲۵ سیر عمل متھرا داس ابن رام جی (اسیر قلعہ!) توپ ریز"[۵۱]

اس عہد کا مشہور سیاح ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ ایک جنگ میں عالمگیر کی فوج میں ستر بڑی توپیں تھیں، اُن میں سے بعض کو ۲۱ جوڑی بیل کھینچتے تھے، اور سڑک خراب ہونے کی صورت میں ہاتھی استعمال کرتے تھے،

خاص قسم کی چھوٹی چھوٹی پیتل کی خوبصورت توپیں گاڑیوں میں بادشاہ کے ساتھ جلوس میں چلتی تھیں، اُن کو دو گھوڑے کھینچتے تھے، یہ توپیں دراصل زنبال قسم کی ہوتی تھیں، مگر بادشاہ کے ساتھ رہنے کے سبب سے اُن کا نام آخر میں حاضر رکاب رکھا گیا،[۵۲]

ہوائی توپ اسی زمانہ میں ایک اور دلچسپ توپ ایجاد ہوئی تھی، اس کا نام ہوائی توپ تھا قلعۂ دندان کی فتح کے موقع پر یہ توپ یاقوت شیدی نے سیواجی کی جنگ میں استعمال کی تھی، اس توپ کو درخت یا مچان پر رکھ کر فیر کرتے تھے، خافی خان لکھتا ہے:۔

"توپہائے ہوائی بہم رسانیدہ بر درختہا بستہ وقت شب طرف دندان آتش می داد"

آگے چل کر پھر ایک جگہ لکھتا ہے۔

"از زون توپہائے ہوائی و دیگر فراہم آورد،"[۵۳]

اس وقت تک گولے اور گولیاں پتھر اور لوہے کی مستعمل تھیں، مگر اس عہد میں شیشے کا بھی استعمال شروع ہو گیا تھا، حافظ محمد امین خان گورنر گجرات متوفی ۱۰۹۳ھ کے مال و اسباب کا جب جائزہ لیا گیا ہی تو اس میں ایک من سیسہ بھی تھا، تاریخ عالمگیری میں ہے:۔

"خسرو بیگ چیلہ، حافظ محمد امین خان مرحوم کا مال و اسباب احمد آباد سے لے کر حضور میں۔

---

[۵۱] تعمیر تاج محل قلمی کتب خانہ سلیم پور لکھنؤ [۵۲] سفر نامہ برنیر، [۵۳] منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۲۶،

ایک ڈچ انجینیر جس کا تعلق توپخانہ سے تھا پندرہ سولہ سال تک ملازم رہا سیواجی سے جنگ کے بعد جب راجہ جے سنگھ واپس آیا، تو اس کی سفارش سے رخصت لیکر ۱۶۶۷ء مین اپنے وطن واپس چلا گیا[۵]

دھول دہان اس وقت تک کوئی شہادت ایسی نہین ملی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ خود ہندوستانیون نے اس فن کی جانب کتنی توجہ کی، دولت آباد کے ایک برج پر ایک توپ لکڑی کی گاڑی پر رکھی ہوئی ہے، اس کا نام "دھول دھان" ہے، یہ بیجاپوری توپ ملک میدان کے قریب قریب ہے، اس کا طول ۱۹ فیٹ دس انچ، کان کے پاس کا دور ½۵ فیٹ، دہانہ کا دور چار فیٹ آٹھ انچ ہے،

یہ ایک ہندو منگل سنگھ کی بنائی ہوئی ہے، اندازاً اس توپ کا وزن دو سو پچانوے من ہے، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

"عمل منگل سنگھ ولد رگھناتھ کشن داس ولد منسنگ جی، توپ دھول دہان بابت
جوڑا کڑہ، طوب، تب در، سری درگ،
ساع ۲۰ ۲۹۵

یہ تحریر مرہٹی زبان مین ہے اور مرہٹی زبان کا عروج عہد عالمگیر سے شروع ہوا، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ یہ توپ اسی عہد کی ہے، یا ممکن ہے نظام شاہ کے عہد کی ہو، اس لئے کہ نظام شاہیون کے عہد مین بھی مرہٹے بہت کچھ سلطنت مین دخیل ہو چکے تھے، چنانچہ ملک عنبر نے ان کا ایک دستہ تیار کیا تھا، جس کو بڑے بڑے دھاوے کرکے غنیم کو لوٹ لینا سکھایا تھا، یہ طرز مرہٹون کو اس قدر پسند آیا، جس کو وہ اپنے زوال کے آخری زمانہ تک کام مین لاتے رہے، محاصرہ گولکنڈہ مین دو توپین "اژدہا پیکر" اور "دشمن کوب" اتنی بڑی تھین کہ اُن کی آواز کی دھمک سے دیوارین ہلنے لگتی تھین، افسوس کہ موقع پاکر اس کو غنیم نے بیکار کر دیا،

اسی قسم کی ایک دوسری توپ تھی، جس کا نام توپ کلان تھا، اس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ تھی،

۵؎ سفرنامہ ٹیورنیر بیان دولت آباد،

پانی پت کی فتح کے بعد ابدالی اس توپ کو خواجہ عبید گورنر لاہور کے پاس چھوڑ گیا، جس سے ۱۷۶۲ء میں ایک سردار ہری سنگھ بھنگی نے چھین لی، جو ۱۷۶۴ء تک لاہور کے شاہ برج میں پڑی رہی، اسی سنہ میں گوجر سنگھ نے سردار چرت سنگھ کو جو راجہ رنجیت سنگھ کا دادا تھا، دے دی، وہ گوجرانوالہ لے گیا، پھر راجپوت سردار احمد خان وہان سے احمد نگر (پنجاب) اٹھا لے گیا، کچھ دنون کے بعد گوجر سنگھ نے اُن سے لے لی، دو برس کے بعد چرت سنگھ کے ہات آئی، ۱۷۷۲ء میں یہ توپ پھر احمد خان کے ہاتھ لگی، جس کو اُس نے رسول نگر پہنچا دیا، ۱۷۷۳ء میں سردار جھنڈا سنگھ بھنگی اُن سے چھین کر امرت سر لے گیا، اور ۱۸۰۲ء میں امرت سر فتح ہونے پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضہ مین آئی، اس سے مہاراجہ نے بڑا کام لیا، ڈسکہ، قصور، سجانپور، وزیرآباد اور ملتان کی لڑائیون مین اس کو استعمال کیا، ۱۸۱۸ء مین اس توپ کو محاصرۂ ملتان مین بڑا نقصان پہنچا، اور لاہور کے دہلی دروازہ پر عرصہ تک پڑی رہی، ۱۸۷۰ء مین انگریزون نے یونیورسٹی ہال اور عجائب خانہ کے درمیان ایک چبوترہ پر نصب کردی، جو اب تک موجود ہے، اس کے دہانہ پر مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے،

باصرہ در دوران شاہ ولی خان وزیر   ساخت توپ زمزمہ نام قلعہ گیر (عمل شاہ نظر)

توپ کے پشت پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہین، جس کے آخری مصرعہ سے تاریخ بھی نکلتی ہے۔

در زمان شہ فریدون فر   داور داد بخش عدل شعار

در دوران عصر احمد شاہ   خسرو تخت گیر و جم مقدار

شد بدستور اشرف الوزرار   امر از سدہ سپہر مدار

کہ بر زد با ہتمام تمام   توپ ثعبان شکوہ کوہ وقار

خانہ زاد شہ سپہر سریر   شہ ولی خان وزیر اکثر کار

بہر تقدیم آن مہم سترگ   کرد استاد چند را اظہار

حاضر ہوا اور سترہ لاکھ روپیہ ایک لاکھ ۳۵ ہزار اشرفیان، چارسو بیس گھوڑے ایک سو سترہ اونٹ، ایک من سیسہ، چار من بارود ت خان مرحوم کا اثاثہ جہان پناہ کے ملاحظہ مین گذرانا گیا[۵۱]

عالمگیری عہد مین توپ خانہ کے متعلق حسب ذیل عہدہ دار تھے، (۱) داروغہ (افسر) توپ خانہ (۲) میر آتش، (۳) گولہ انداز (۴) انجینیر (۵) سپاہی۔ توپ خانہ کا داروغہ پہلے مومن خان پھر حاجی مقیم خان بنائے گئے، کچھ دنون امان اللہ بیگ بھی رہا[۵۲]، میر آتش کے عہدے پر صف شکن خان، صلابت خان، سید عزت خان اور مخلص خان وغیرہ مقرر ہوتے رہے[۵۳]، یہ سب افسر ذی عزت اور صاحب منصب ہوتے تھے، چنانچہ مخلص خان ایک ہزار اور سی صد سوار کے منصب پر فائز تھے[۵۴]

عالمگیری عہد مین بے شمار توپین موجود تھین جن کا شمار مشکل ہو، ان مین سے اکثر ہندوستان مین تیار کی گئی تھین، مگر دوسرے ملکون کی توپین بھی مختلف طریقون سے جمع ہو گئی تھین، ان مین سے ایک ہزار چھبیس۱۰۲۶ عدد برنجی اور آہنی وہ توپین تھین جو جنگ چاٹگام مین پرتگیزون اور اراکانیون سے فتح کے بعد بطور مال غنیمت حاصل ہوئی تھین[۵۵]

زمزمہ پانی پت کے میدان مین مرہٹون کے افسر توپ خانہ ابراہیم خان کے ماتحت قلعہ شکن توپون کے علاوہ دوسو میدانی توپین تھین، اور احمد شاہ ابدالی کے پاس صرف تیس توپین، ان توپون مین سے ایک کا نام "زمزمہ" تھا یہ توپ احمد شاہ ابدالی کے حکم سے اس کے وزیر ولی خان نے لاہور کے ایک مشہور توپ ساز شاہ نظیر سے ۱۱۷۵ھ ۱۷۵۵ء مین تیار کرائی تھی، اسی جوڑ کی ایک دوسری توپ بھی اس نے تیار کی تھی، جو جنگ پانی پت کے بعد کابل لیجاتے ہوئے دریائے چناب مین غرق ہو گئی تھی، یہ دونون توپین پیتل اور تانبہ ڈھال کر بنائی گئی تھین، اس کی لمبائی ۱۴ فیٹ ½۴ انچ اور اس کا دہانہ ½۹ انچ ہے،

[۵۱] ماثر عالمگیری جلوس ۱۲، [۵۲] رقعات عالمگیر بنام فرزند عالی جاہ، [۵۳] ماثر عالمگیری جلوس ۳، [۵۴] ماثر جلوس ۳، [۵۵] عالمگیر نامہ،

بھاری کا اضافہ کر دیا ہے، اس کا گولہ ایک من کا ہوتا تھا، اور ایک سو پچاس بیل اور دو ہاتھی اُس کو کھینچتے تھے،

۱۱۲۴ھ میں جب فرخ سیر بادشاہ اکبر نگر (راج محل) سے عظیم آباد پٹنہ گیا، تو اس وقت یہ توپ کیچڑ میں اس طرح پھنسی ہوئی تھی، کہ ہر چند بیل اور ہاتھی زور لگا کر کھینچتے تھے، مگر وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتی تھی،

فرخ سیر خود توپ کے پاس آیا، اور توپ خانہ کے فرنگی ملازموں کی تدبیروں سے نکالنا چاہا، مگر کسی طرح کامیابی نہیں ہوئی، اس وقت میرزا اجمیری آداب بجالا کر عرض پرداز ہوا، کہ اگر اجازت ہو تو بندہ بھی ایک دفعہ زور آزمائی کرے، فرخ سیر نے اجازت دی، میرزا موصوف نے گاڑی کے پہیوں (چکّوں) میں ہاتھ ڈال کر سینہ تک اس توپ کو اٹھا لیا، اور عرض کی جہاں ارشاد ہو رکھ دوں،

فرخ سیر نے بلند زمین کی طرف اشارہ کیا، میرزا نے نیچی زمین سے لیجا کر بلند زمین پر رکھ دیا، اس زور آزمائی سے قریب تھا کہ میرزا موصوف کے آنکھوں سے خون ٹپک پڑے، یہ قوت دیکھ کر فرخ سیر نے بیحد تعریف کی، تماشائی بھی تو دم بخود رہ گئے، پھر تحسین و آفرین کی صدا اس قدر زور سے بلند کی، کہ تمام میدان گونج اٹھا، اس کے صلہ میں مرزا کو سہ ہزاری کا منصب عطا ہوا، اور "افراسیاب خان" کے خطاب سے سرفراز ہوا[1]، غالباً فرخ سیر اس توپ کو دہلی ساتھ لے گیا ہوگا، کیونکہ بنگالہ کی تاریخ میں پھر اس کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے،

محمد شاہ بادشاہ دہلی نے کرنال کی جنگ میں ایسی توپیں استعمال کیں جن کو پانچ سے دس ہاتھی یا ۵۰۰ سے ایک ہزار بیل تک کھینچتے تھے[2]، غرض مغلیہ سلطنت کے زوال پر ہر قسم کی توپیں ایجاد ہو چکی تھیں جن میں سے ہلکی بھی تھیں، اور وزنی بھی، بعض توپیں ہاتھی پر لاد دیجاتی تھیں، اور دو سپاہی بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے، ان کا نام "گجنال" تھا،

کچھ توپیں اونٹوں پر لاد کر لیجاتے اور اُن کی پشت سے دشمنوں پر فیر کرتے، اس کے لئے اونٹوں کو

---

[1] ریاض السلاطین ص ۲۶۹ مطبوعہ کلکتہ [2] نظام فوج اروِن صاحب،

تا بسعی تمام ریختہ شد | زمزمہ نام توپ نادر کار
قلعہ کوب حصار چرخ دوم | شد باقبال شاہ رو بکار
سال تاریخش از خرد جستم | کرد با وحشت آن چنان اظہار
کہ اگر نفت جان کنی تسلیم | راز پنہان تو کنم تکرار
بعد تسلیم او بگفتا توپ | پیکر اژدہاے آتشبار
۱۱۵۵ھ

چونکہ یہ توپ کچھ عرصہ تک سکھوں کے "بھنگی" سرداروں کے پاس رہی، اس لئے اس کا نام "بھنگی توپ" بھی ہے[۱]

۱۱۸۲ھ میں ملتان کے امیر نواب محمد شجاع خان بہادر نے کوہ شکن نامی ایک توپ تیار کرائی تھی، جس پر مندرجہ ذیل کتبہ تھا، غالباً دہانہ پر یہ شعر ہے، اس کا وزن ایک سو دس من ہے؛

"چو اژدر ہا بجان و دل بپسے دلِ غ کہن دارم | حذر کن اے رقیب از من کہ آتش در دہان دارم"

اور پشت پر مندرجہ ذیل اشعار اور عبارت ہے،

اے راست روی توپ ز نواب نامدار | در راستی و پُر دلی خود یگانۂ
اژدر دمے و شیر نژادے و جنگ جو | ماری دمرہ دارے و صاحب خزانۂ

سکالہ نواب محمد شجاع خان بہادر صفدر جنگ ۱۱۸۲ھ ہجری النبوی اسمش کوہ شکن بوزن یک صد و دہ من گولہ بمقدار دہ من و بارود نصف از گولہ در وزن[۲]

فتح ملتان کے بعد یہ توپ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ آئی، اور فتح لاہور کے بعد ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے اس کو کلکتہ پہنچا دیا،

ملک میدان بہاری | اس نام کی یہ تیسری توپ ہے اسی لئے اس کے نام کے ساتھ شناخت کے لئے لفظ

---

[۱] رسالہ ادب لطیف لاہور مارچ ۱۹۳۵ء بہ تصرف و اختصار، [۲] تاریخ پنجاب ص ۱۱۴،

کارخانہ کے افسرِ اعلیٰ جواہر مل (بہمدد) سردار تیج سنگھ، لہنا سنگھ، قادر میان بخش، امام الدین صاحب، اور موسیو شیوالیر صاحب جنرل کورٹ فرانسیسی تھے، جنرل موصوف نے توپخانہ کو یورپین طرز پہ کارآمد بنادیا اور اپنی فیاضی سے متعدد شاگرد بھی پیدا کئے،

ان توپون پر مہاراجہ کے بعد اُن افسرون کے بھی نام ہوتے تھے جن کے ماتحت یہ کارخانے ہوتے تھے، اور توپ ساز کا نام اور تاریخ بھی ہوتی، مگر عموماً سنہ بکرمی استعمال کرتے تھے، اور مغلیہ سلطنت کی تقلید مین اس پر اشعار بھی کندہ کراتے، عام طور پر زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، مگر آخر مین ہندی (غالباً گورمکھی) استعمال کرنے لگے تھے، کسی پر انگریزی مین بھی کچھ الفاظ تحریر کئے گئے ہین،

۱۸۴۶ء مین جب سکھون نے انگریزون سے شکست کھائی، تو دوسو بیس ضرب توپ انگریزون نے چھین لین، اور ۳۶ توپین صلح کے بعد لاہور سے حاصل کین، غرض کل ۲۵۶ توپین، صرف لاہور سے حاصل کرکے کلکتہ کے بندرگاہ سے لندن فتح لاہور کی یادگار مین روانہ کی گئین[۱]،

ان توپون مین سے بعض پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے،

فتح جنگ (۱) کال سہائے نظم

قوی طالع شاہ رنجیت سنگھ	ہمہ ملک را زیر کردہ چو خنگ
کھڑک سنگھ شہزادہ عالی مکان	کہ دانائے کوران بود مادران
فتح جنگ شد در زمانے تیار	کہ ہیجدہ صد و بود ہشتاد و چار
جمعدار این توپ شد دراے سنگھ	کہ در جان نشانیست او بے درنگ
بموجب صلاح لالہ جے سنگھ یار	غلام نبی گفت تاریخ دار

دستخط گروتاراگیر تاریخ پنجم ماہ مانگہ سنبت ۱۸۸۰ (بکرمی)

[۱] تاریخ پنجاب ص ۴۹۶ مؤلفہ منشی عبدالکریم صاحب،

توپ
خاص طور پر سدھایا جاتا تھا، ایسی توپون کا نام "شترنال" تھا، "ہتھ نال" غالباً ان توپون کو کہتے ہون گے جن کو آدمی ہاتھ سے اٹھا لیتے ہون گے، یہ نزنال سے چھوٹی ہوتی ہے، اسی طرح "زنبورک" شاہین دھماکہ، رام جنگی، رہکالہ، بدایجہ، سنگ آزاد، سرکوب، چادر، وغیرہ مختلف قسمون اور نامون کی توپین اور آتشین اسلحہ موجود تھے، جن کا ذکر اس عہد کی تاریخون مین بکثرت ملتا ہے،

سکھون کا توپخانہ مغلیہ سلطنت کے زوال پر دو طاقتور سلطنتین پیدا ہوئین، پنجاب مین سکھون کی اور دکن مین مرہٹون کی، سکھون نے اپنے ابتدائی دور مین توپون کا زیادہ استعمال نہین کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فرقہ ایک مذہبی حیثیت رکھتا تھا، لیکن جب اُن مین جنگ جوئی پیدا کی گئی، تو اس طرف بھی اُن کا رجحان ہوا، لکڑی کی توپ چنانچہ ۱۷۱۰ء اور ۱۷۱۵ء کی جنگ لوہ گڑھ اور گرداس پور مین جب اُن کو توپین نہ ملین تو انھون نے عجیب طریقہ سے توپ تیار کی، یعنی بڑے بڑے املی کے درختون کو کاٹ کر اس کے تنون مین سوراخ کرکے توپ کی جگہ استعمال کیا، گو یہ طریقہ کچھ زیادہ کارآمد نہین ہوا، لیکن غنیم کو توپ کا خوف دلانے کے لئے کافی تھا[1]،

سکھون کے عروج کا زمانہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا عہد ہے، اس زمانہ مین توپخانہ کو ترقی دینے کی کافی کوشش کی گئی، اس کے متعدد کارخانے لاہور مین قائم ہوئے، ملکی اور غیر ملکی، اور مسلم اور غیرمسلم ہر قسم کے ماہرین فن کی قدردانی کرکے اُن سے فائدہ اٹھایا گیا،

لاہور مین صوبہ سنگھ کا کارخانہ اس کے لئے زیادہ مشہور تھا، بعض توپون پر صرف "کارخانہ دارالسلطنت" کندہ پایا گیا، ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ سرکاری کارخانہ ہو،

توپ بنانے والون مین بھی سکھ اور مسلمان دونون نظر آتے ہین، ان مین سے بسران سدھا سنگھ اور رائے سنگھ زیادہ مشہور تھے، مسلمانون مین محمد حیات فضل علی اور باقی خان زیادہ نامآور ہوئے،

[1] نظام فوج مصنفہ اروِن صاحب (لندن)

فطرت فلاطون فطنت موسیو شوالیر، جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

توپ فتح جنگ | بموجب حکم حضور فیض گنجور سنگھ صاحب سرتاج خالصہ پادشاہ رنجیت سنگھ جیو دام اقبالہ باہتمام میان قادربخش در قلعہ مبارک لاہور، توپ دیوان لالہ موتی رام و رام دیال تیار شد، سنہ ۱۸۸۶ رسم توپ فتح جنگ عمل محمد حیات،

توپ لیلی | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ، بہادر دام ملکہ و سلطنتہ، سری مہاراجہ صاحب اوجھراج در سنہ ۱۸۸۱ از راجہ سری بکرماجیت ہذا الضرب موسومہ لیلان (لیلی) حسب الامر اشرف اقدس اعلی حضور انور در سنہ ۱۸۵۹ باہتمام صاحب ارسطو فطرت فلاطون زمان موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بحسن خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح بہادر ریختہ شد،"

توپ مجنون | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ و سلطنتہ سری مہاراجہ صاحب موجھراج در سنہ ۱۸۸۸ از راجہ بکرماجیت ہذا الضرب موسومہ مجنون حسب الامر اشرف اقدس اعلی حضور انور ۱۸۵۹ء باہتمام صاحب ارسطو فطرت فلاطون زمان موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر در عیدگاہ بحسن خدمت فضل علی کمیدان شاگرد صاحب ممدوح ریختہ شد،

ایک توپ پرکندہ ہے،

ارب سہاے روپ سنگھ و انوپ سنگھ کل تیار شد سنبت ۱۸۵۱

نصرت جنگ | نظم

نیست این توپ اژدہاے دہان | از دم خود شرار برق افشان
بہ یک آواز خود کند ناگاہ | بخت دشمن چو دود خویش سیاہ
پے تفتیح قلعہ سخت چو جنگ | زین سبب نام گشت نصرت جنگ

درعہد بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر، توپ سردار جوالا سنگھ پٹھرانیہ باہتمام دیا نہرا سنبت ۱۸۸۸ عمل دراستگھ

توپ

اس کے علاوہ کچھ ہندی (یا گورمکھی) مین بھی کندہ تھا،

(۲) توپ سی بان برون باب شتا ہولی، طول یپ وال للہ درسہ ۱۳۶ دی"

اس کے بعد کچھ گورمکھی مین تحریر ہے،

فتح ونصرت | (۳) سری اکال سہائے نظم

هست این توپ مصر بلی رام | ہاتفش گفت فتح و نصرت نام

ضرب آتش فشان و برق شرار | صبح اعدا، از دود او چون شام

جنگ بجلی | بفضل اکال سہائے از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ جنگ بجلی باہتمام جواہر مل بکارخانہ صوبہ سنگھ ساخت دار السلطنت لاہور سمبت ۱۸۹۵ در تحت سردار فتح سنگھ، سمبت ۱۸۹۲ (بکرمی)

ترسنگھ گھی | بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم رنجیت سنگھ بادشاہ بہادر بلند اقبال نرسنگھ گھی کارخانہ دار السلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنہ ۱۸۹۲ عمل پسران سدھا سنگھ،

فتح بان | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ و سلطنتہ سری مہاراجہ صاحب ادھیراج ہذا ضرب موسوم بفتح بان حسب الامر قدس در ۱۸۹۴ء از سال راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب ارسطو فطرت فلاطون فطنت موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

شش بان | بفضل اکال از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ شش بان باہتمام جواہر مل کارخانہ صوبہ سنگھ دار السلطنت لاہور سنہ ۱۸۸۵ در تحت سردار فتح سنگھ،

بام بان | بفضل اکال کے بعد بجز توپ کے نام کے باقی عبارت مندرجہ بالا ہی درج ہے، جو شش بان مین ہے،

نصرت بان | بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ و سلطنتہ، سری مہاراجہ صاحب ادھیراج ہذا ضرب موسوم بہ نصرت بان حسب الامر قدس در ۱۸۸۸ء از راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب ارسطو

ایک توپ پر صرف مندرجہ ذیل عبارت ہے، دوسری رام جی سہائے سری راجہ سوچیت سنگھ سنت ۱۸۸۱

کچھ گورکھی مین بھی لکھا ہے،

توپ راہ بان   نفضل اکال از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ راہ بان باہتمام جواہر مل

کارخانہ صوبہ سنگھ ساخت لاہور ۱۸۳۱ء

جنگ جیت   ابتدا مین کچھ گورکھی مین لکھا ہے، اس کے بعد ہے،

اسم این توپ از سرکار عالی جنگ جیت تحریر بتاریخ سنبت ۱۸۷۴،

جوالا لکھی،   بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ جوالا لکھی کارخانہ

دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

خالصہ پسند   بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ خالصہ پسند کارخانہ

دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

ہنونت بان   نفضل اکال از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ ہنونت بان در کارخانہ صفہ سنگھ

دارالسلطنت لاہور سنبت ۱۸۸۶ در تحت تیج سنگھ

شیو درشن بان   نفضل اکال پورکہ جی از حکم بادشاہ رنجیت سنگھ بہادر بلند اقبال توپ شیو درشن بان

کارخانہ دارالسلطنت لاہور باہتمام جواہر مل سنبت ۱۸۸۷ عمل پسران سدھا سنگھ در تحت تیج سنگھ،

بھرت بان   از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ   از حکم بادشاہ بہادر رنجیت سنگھ

شد توپ نو تیار عدو خوار بھرت بان   منصوب توپخانہ سردار تیج سنگھ

رام بان   بفضل سری اکال پورکہ جی ضرب رام بان بعہد بادشاہ جمجاہ ہفت کشور زمان کرن دوران

مہاراجہ ادھیراج رنجیت سنگھ در دام اقبالہ حسب الحکم مقرب بارگاہ سلطانی مصاحب درگاہ خاص الخاص

خاقانی سردار خوشحال سنگھ در سنبت یکہزار و ہشت صد و نود و پنج بکرماجیت مطابق یک ہزار و دو صد

توپ ساز، در سال یک ہزار و ہشتصد و ہشتاد و ہفت اتمام یافت،

شیوکھی بفضل سری اکال پورکہ جی از حکم رنجیت سنگھ بادشاہ بہادر قلبند اقبال توپ شیوکھی بر دارالسلطنۃ لاہور باہتمام جواہر مل ۱۸۹۴ عمل پسران سدھا سنگھ،

رام بان ضرب رام بان بفضل سری اکال جی بعہد بادشاہ جہاہ جدھشٹر زمان کرن دوران، ادھیراج رنجیت سنگھ بہادر خلد اللہ ملکہ مقرب بارگاہ سلطانی مصاحب درگاہ خاص الخاص خاقانی سر خوشحال سنگھ در سنبت یکہزار و ہشت صد و نود و پنج بکرماجیت مطابق ایک ہزار دو صد و پنجاہ و چہار باہتمام باکسی خان (باقی خان) توپ رتہ تیار کنانید،

سورج مکھی از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ
واز حکم شاہزادہ کنور نونہال سنگھ
شد توپ نو طیار ظفر جنگ و شہ پسند
منصوب توپخانہ جرنیل تیج سنگھ
(ضرب سورج مکھی ساخت لاہور سنہ ۱۸۹۶)

عدوکوب نفس اکال نظم
از فضل گرو نانک و لطف گوبند سنگھ
وز حکم بادشاہ بہادر رنجیت سنگھ،
شد توپ نو تیار عدو کوب دو زبان
منصوب توپ خانہ جرنیل تیج سنگھ،
(ساخت دارالسلطنت لاہور کارخانہ صوبہ سنگھ سنہ ۱۸۹۰)

اندربان بفضل سری اکال پورکہ جی مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر دام ملکہ و سلطنۃ سری مہاراج ادھیراہ ہذا الضرب موسوم اندر بان حسب الامر اشرف اقدس در سنہ ۱۸۹۴ از راجہ بکرماجیت باہتمام صاحب ارسطو فطرت افلاطون فطنت موسیو شوالیر جنرل کورٹ صاحب بہادر ریختہ شد،

توپ اژدھا سنہ ۱۹۰۲ فتح حضرت مرتبت ساخت توپ اژدہا، شتاق برق، رعدسائی آمین الملک امام الدین بہادر خطابی شاہانہ شاہی (شہنشاہی) سنہ ۱۲۶۱

عربی نظم و نثر کی مختصر تاریخ

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۳)

عباسی دور کی شاعری

عربی شاعری خلافت عباسیہ کے پہلے دور مین

عربی شاعری اگرچہ زمانۂ جاہلیت کے اخیر زمانۂ اسلام کے آغاز اور حکومت امویہ کے زمانۂ عروج مین منتہاے کمال تک پہنچ گئی تھی، لیکن وہ صرف اہل عرب تک محدود تھی، اور عربی شعر کہنے والے اور اس کے سننے والے دونون صرف اہل عرب تھے، کیونکہ اہل عجم اب تک فصاحت و بلاغت کے اس درجہ تک نہین پہنچے تھے، کہ بادیہ نشین عربی شعراء کا مقابلہ کر سکتے، البتہ بنوامیہ کی حکومت کے دور تنزل مین اُن کو اس کا موقع ملا، اور جب خلفائے عباسیہ نے عجمیون بالخصوص ایرانیون پر جو اُن کی خلافت کے داعی تھے، نگاہ لطف و کرم ڈالی تو ان کو اپنی عربی شاعری کی داد طلبی کا موقع ملا، اور انھون نے بڑے بڑے صلے پائے، کیونکہ ان کی شاعری مین ایک طرف تو بدویانہ فصاحت پائی جاتی تھی، دوسری طرف تمدنی اختراعات کی جھلک بھی نمایان ہوتی تھی، کوفہ، بصرہ، اور مشرقی شام کے متمدن عربون نے بھی چونکہ عربیت کو تعلیم کے ذریعہ حاصل کیا تھا، اس لئے ان مین بھی یہی دونون خصوصیتین پائی جاتی تھین، اسی لئے وہ بھی محدثین اور مولدین کے لقب سے مشہور ہوئے، اس وقت متمدن شعراء نے بادیہ نشین شعراء کا مقابلہ کیا، اور اعیان سلطنت نے اُن کو اپنا مصاحب اور ہمنشین بنا لیا، اور متعدد

توپ

پنجاہ و چہار ہجریہ باہتمام باکی (باقی) خان توپ ریزہ تیار کنانید[۵۱]

سلطان شہید ٹیپو کا توپخانہ بارہویں صدی ہجری کے وسط میں ایک جدید طاقت حیدر علی اور فتح علی (ٹیپو سلطان) کے قالب میں نمودار ہوئی، ان میں سے حیدر علی کو فتوحات سے بہت کم فرصت ملی، مگر اس کے جانشین لائق فرزند فتح علی کو اس کی طرف توجہ کرنے کی کافی مہلت حاصل ہوئی، اس نے فرانسیسی گولہ انداز اور افسر توپ خانہ خاص طور سے مقرر کئے، اس نے مختلف قسم کی توپیں بنوائیں، اور اس کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر کارخانہ قائم کیا تھا، اس کے پاس ۹۲۹ ضرب توپیں مختلف قسم کی موجود تھیں[۵۲] کہتے ہیں کہ مہاراجہ بڑودہ نے سونے اور چاندی کی ایک ایک توپ بنوائی تھی، جس کو دیکھنے کیلئے دور دور سے سیاح آتے تھے،

---

۵۱ تاریخ پنجاب ص ۸۵ لاہور افسوس ہے کہ ان توپوں کی نسبت یہ نہ معلوم ہوسکا، کہ یہ کس قدر وقیمتی تھیں اور انکا دہانہ کتنا تھا، کس قدر بارود اور گولہ اس میں ڈالا جاتا تھا، اس لئے صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا، کہ میدان جنگ کے لئے یہ کتنی کارآمد تھیں، ۵۲ تاریخ ٹیپو سلطان بنگلور،

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے، قیمت:- ۶ے،

"منیجر"

۱۔ **عصبیت** زمانۂ جاہلیت مین عصبیت صرف بعض قبائل تک محدود تھی، اور یہی قبائل باہمی مفاخرت کے ذریعہ اس کا اظہار کرتے تھے لیکن اس زمانہ مین اہلِ عرب اور اہلِ عجم کے درمیان بھی عصبیت پیدا ہوئی، اور فرقہ شعوبیہ نے شاعری کے ذریعہ اس کا اظہار کرنا شروع کیا، حالانکہ بنو امیہ کے دور مین وہ اس قسم کی عصبیت کا اظہار نہین کر سکتے تھے، اہلِ علم مثلاً بصرہ اور کوفہ کے نحویون اور اہلِ مذہب یعنی فقہا اور متکلمین کے درمیان بھی عصبیت پیدا ہوئی،

۲۔ **سیاست**: اس دور مین شاعری کا استعمال سیاسی اغراض سے بھی کیا گیا، اس دور سے پہلے علویون اور عباسیون مین کوئی سیاسی اختلاف نہ تھا، بلکہ دونون بنو امیہ کے مخالف تھے، اور دونون ہاشمی گروہ کہا جاتا تھا لیکن اس دور مین دونون مد مقابل پارٹیان ہو گئین، اور دونون کی تائید و مخالفت مین شعر کہے گئے کسی عباسی خلیفہ یا کسی ولی عہد کی تائید بھی اس کے حریف کے مقابلہ مین شاعر کے ذریعہ سے کی گئی، خلافتِ عباسیہ مین اہلِ عجم کو اہلِ عرب پر جو ترجیح دی گئی تھی، اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے جوان کو دیئے گئے تھے، اس پر بھی شاعری کے ذریعہ سے تنقید کی گئی،

۳۔ **وصف نگاری** اس مین بہت زیادہ تنوع پیدا ہوا، اور اس کی مختلف شکلین قائم ہوئین مثلاً محلون، باغون، رنگین مجلسون، کارخانون، مچھلی اور چڑیون کی شکار گاہون، مختلف قسم کی کشتیون قدرتی مناظر، آثارِ قدیمہ اور نفسانی حالات پر نظمین لکھی گئین،

۴۔ **رندی و ہوسناکی**، اگرچہ بنو امیہ کے دور مین بھی کسی قدر ان خیالات کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جس بے باکی کے ساتھ عباسی دور مین ابونواس وغیرہ نے اس قسم کے خیالات شاعری مین ظاہر کئے، اس کی نظیر اموی دور مین نہین مل سکتی،

۵۔ **حکیمانہ خیالات**، اگرچہ زمانۂ جاہلیت، آغاز اسلام، اور بنو امیہ کے دور مین بھی اس قسم کے حکیمانہ خیالات بعض قصائد مین پائے جاتے ہین لیکن عباسی دور مین جب یونان، ایران اور ہندوستان

شعرا، مثلاً محمد بن عبدالملک زیات، مسلم بن ولید اور ابوتمام نے اس قدر ترقی کی، کہ وزارت اور صوبیداری کے درجہ تک پہنچ گئے، رفتہ رفتہ اس دور کے وسط مین صحرانشین بدوؤن کی شاعرانہ آواز بالکل پست ہوکر رہ گئی، دور اول کے تمام خلفاے عباسیہ نے شعر وشاعری کی قدر دانی کی، اور اس کے لئے سالانہ مجلسین منعقد کرنے لگے، اور شعراء کے قصائد پر انعام اور صلے دینے لگے جس کا مقصد یہ تھا، کہ عربیت کے تمام عمدہ اوصاف قائم رہین، ان کے ایرانی وزراء وعمال نے بھی اس کی تقلید کی، یہان تک کہ ان مین بہت سے ادیب اور شاعر پیدا ہوگئے، اگرچہ اس دور مین شعراے مولدین نے شاعری کے اغراض، مضامین اور اسلوب بیان مین بہت سی جدتین اور لطافتین پیدا کین، لیکن قصیدہ کی بنیاد جن چیزون پر زمانۂ جاہلیت مین قائم تھی، اس کو بعینہ قائم رکھا، قصیدہ کو ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ کی پابندی کے ساتھ کہتے تھے، اگرچہ ان مین کسی شاعر نے صحرانوردی اور اونٹ کی سواری نہین کی تھی، تاہم قصائد کی تشبیبون مین معشوق کے اجڑے ہوے کھنڈر، اونٹنی کے اوصاف، صحرانوردی، اور سیر وشکار وغیرہ کے واقعات بیان کرتے تھے، اور اس کا مقصد صرف وطن کی یاد کا تازہ کرنا اور شعر مین بدویانہ خصوصیات کا قائم رکھنا تھا، بااین ہمہ بعض عربی شعراء مثلاً ابونواس نے اس کی پابندی نہین کی، اور جو شعراء اس کے پابند تھے، ان پر نکتہ چینی کی، اور اس کے بدلے قصائد کی ابتداء، شراب وکباب یا محلون اور باغون کے اوصاف سے کی، اور اونٹنی کی جگہ کشتیون کی سواری کا ذکر کیا، اور اس معاملہ مین بہت سے شعراء نے اس کی تقلید کی،

بہرحال خلافت عباسیہ کے دو پہلے دورون مین شاعری کے اغراض اسلوب بیان اور وزن وقافیہ مین جو تغیرات پیدا ہوے اُن کی تفصیل یہ ہے:-

اگرچہ زمانۂ جاہلیت مین جن اغراض کے ماتحت شعر کہے جاتے تھے، وہ اس دور مین بھی باقی رہین، لیکن اس دور مین اُن کی ایک خاص شکل قائم ہوگئی، یا کثرت سے ان اغراض کے ماتحت شعر کہے گئے، چنانچہ جن اغراض نے ایک خاص شکل اختیار کرلی، یا اُن کے ماتحت بہ کثرت شعر کہے گئے، وہ حسب ذیل ہین،

۳ - زہدیات، اس قسم کی شاعری مین دنیا اور دنیوی عیش پرستیون کی بے ثباتی، موت کا ذکر اور شہوت پرستی اور لذت پرستی کی ممانعت کی جاتی تھی، اور وہ فقہار علما، متکلمین، محدثین، اور زہد پیشہ لوگون کے خیالات کی اشاعت کا ایک ضروری آلہ تھی، اور یہ لوگ اس کے ذریعہ سے بدکار شاعرون اور انشا پردازون کی مخالفت کرتے تھے، اس میدان کا سب سے بڑا شہسوار ابوالعتاہیہ تھا، اگرچہ ابونواس وغیرہ نے بھی اس قسم کے بہت سے قصائد لکھے لیکن اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ لوگ بھی ہر صنف مین شعر کہہ سکتے ہین، ورنہ ان کی شاعری مین خلوص نہین پایا جاتا تھا،

۴ - تہذیب اخلاق، اس دور مین نوجوانون کی اخلاقی اصلاح کے لئے جانورون اور انسانون کی زبان مین بہت سے قصے اور حکایتین نظم کی گئین، اور سب سے پہلے ابان اللاحقی نے برامکہ کے لئے کلیلہ و دمنہ کو نظم کیا، اور اس پر برامکہ نے اس کو بڑا صلہ دیا، اور اس کے بعد اور لوگون نے اس کی تقلید کی،

۵ - مذہبی اور علمی شاعری، اس کے ذریعہ سے فقہ اور دوسرے علوم کے مسائل نظم کئے گئے، اور اس سے علوم کے حفظ کرنے مین آسانی پیدا ہوئی، اور اب تک اہل مشرق اور اہل مغرب اس سے فائدہ اٹھا رہے ہین،

ان اغراض سے زیادہ تمدن اور خوش مذاقی کا اثر الفاظ کے انتخاب، اسلوب بیان اور مطالب و معانی کے طریقۂ ادا پر پڑا، کیونکہ بدیہہ گوئی کا رواج کم ہوگیا تھا، لوگ غور و فکر اور کانٹ چھانٹ سے زیادہ کام لینے لگے تھے، اور خلفار وزرار اور ولاۃ کی مدح، ان کے مرثیون اور فخریہ شاعری مین نرم اور آسان زبان استعمال کرتے تھے، اور ہزل و ظرافت کے علاوہ وہ الفاظ کی جزالت اور متانت کو بھی قائم رکھتے تھے، البتہ عجمی شعرار نے کھانے پینے، وضع و لباس، ظروف اور سامان آرایش وغیرہ کے متعلق شاعری مین بہت سے فارسی اور دیہاتی الفاظ شامل کر دیئے، جو خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور مین معرب تسلیم کئے گئے، اور فصحار ان کو استعمال کرنے لگے، لیکن جب شہرون کی زبان خراب

کے فلسفہ کا ترجمہ عربی زبان مین ہوا، تو شعراء نے اُن کے بہت سے مسائل کو شاعری مین داخل کیا، اور خود بھی بہت سے فلسفیانہ خیالات پیدا کئے، اس قسم کے شعراء مین صالح بن عبدالقدوس اور ابو تمام زیادہ مشہور ہین،

ان کے علاوہ شاعری کے جو نئے نئے اغراض پیدا کئے گئے، اُن کی تفصیل یہ ہے،

۱- **امرد پرستی** اہلِ عرب اس ذوق سے بالکل ناآشنا تھے، اس کی ابتدا عجمی نژاد بدکارون نے کی، اور جو اہلِ عرب اُن سے میل جول رکھتے تھے، وہ بھی ان کے متعدی اثر سے اس مرض مین مبتلا ہو گئے، رفتہ رفتہ یہ فتنہ بہت زیادہ پھیل گیا، اور سب سے زیادہ ابو نواس اور حسین بن ضحاک وغیرہ نے اوس کے پھیلانے مین حصہ لیا،

۲- **خمریات** بعض شعرائے جاہلیت کے کلام مین شراب کباب کے مضامین پائے جاتے ہین لیکن جب اسلام نے شراب نوشی کی ممانعت کی، تو صرف بعض عیسائی شعراء مثلاً اخطل نے اس قسم کے مضامین باندھے، اس کے بعد حکومت بنو امیہ کے آخری دور مین بعض رندمزاج امراء نے شراب وکباب کے متعلق چند قطعات لکھے، اور غلط یا صحیح طور پر ان مین بعض قطعے ولید بن یزید کی طرف منسوب کئے گئے، اور خود اس کے خاندان کے بعض حریفون نے خصوصاً اور بنو امیہ کے دشمنون نے عموماً اس کے بدنام کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا لیکن خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور مین جب اہلِ عجم کو پوری آزادی حاصل ہوئی، تو بہت سے عجمی شعراء نے اس لے کو بہت بڑھا دیا، اور شراب وکباب کے ذکر مین اس قدر غلو کیا، جس کی نظیر دورِ جاہلیت اور دورِ اسلام مین نہین پائی جاتی، خلفاء اور امراء نے اگرچہ اس کو اس کو روکنا چاہا، اور ان شعراء کو قید و بند کی سزائین بھی دین لیکن اس کا کچھ اثر نہین ہوا یہان تک کہ جو لوگ خود شراب نہین پیتے تھے، وہ بھی رنگینی کلام کے لئے اس قسم کے اشعار کہنے لگے، سب سے زیادہ ابو نواس نے اس صنعت کو ترقی دی اور اس کے بعد اور لوگون نے بھی اس کی تقلید کی،

نثر انشا پردازی

اس سے عام بول چال کی زبان مقصود نہین، بلکہ وہ تحریری زبان مقصود ہے جس سے اصل مقصد کو ایسی انشا پردازانہ عبارت مین ظاہر کیا جاتا ہو، جو ایک دلفریب صورت مین دل پر خوشی یا اچھی کا اثر ڈالتی ہے۔ اور اس مین حسب ذیل تحریرین داخل ہین۔

۱۔ شاہی خطوط جو حکومت کے دفتر خط و کتابت کے سلسلہ مین روانہ کئے جاتے تھے،

۲۔ دوستانہ خطوط جو بعض دوست دوسرے دوست کو تہنیت تعزیت یا سفارش کے لئے لکھتے تھے،

۳۔ طویل ادبی رسالے جن کو بعض انشا پرداز حکومت یا رعایا کے بعض معاملات یا کسی مذہب کی تائید یا کسی فریق کو دوسرے فریق پر فضیلت دینے یا محض دلچسپی کے لئے لکھتے تھے شلاً قصے، مقامات، سیر و اخبار اور کہانیان وغیرہ علمی تحریرین جو علمی طرز پر علمی اصطلاحات کے ساتھ لکھی جاتی ہین، اور اس مین ترتیب عقلی اور قیاس منطقی کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور عبارت مین حشو و زوائد نہین ہوتا، وہ اس سے الگ ہین، اور ان کو تصنیفی طرز تحریر کہا جاتا ہے لیکن مؤرخین ادب صرف انشا پردازانہ طرز تحریر کی خصوصیات سے بحث کرتے ہین، اور علمی طرز تحریر کو نظر انداز کر دیتے ہین، کیونکہ انشا پردازانہ طرز تحریر مین حسن و جمال پایا جاتا ہے، اور اس سے دل کو انبساط حاصل ہوتا ہے، اسلئے عباسی دور مین انشا پردازانہ تحریرون مین جو خصوصیات پیدا ہوئین، ہم اجمالی طور پر انہی کے بیان کرنے پر قناعت کرتے ہین،

بنو امیہ کی خلافت کے آخری دور مین سالم اور عبد الحمید کے انشا پردازانہ طرز تحریر نے انشا پردازی کو ایک محبوب ترین فن بنا دیا تھا، اس لئے ان کی جماعت کے جن لوگون نے عباسی خلافت کا زمانہ پایا، انھون نے اس کو اور بھی زیادہ ترقی دی، اور وہ فنون ادبیہ مین ایک شریف ترین فن بن گیا، اور ایسے ایسے نامور انشا پرداز پیدا ہو گئے، جن کا پایہ نامور شعراء سے بھی بھاری ہو گیا، کیونکہ نثر کی ان انشا پردازانہ

ہوگئی، تو ان کو غیر فصیح قرار دیا گیا، ابو نواس نے جو شعوبی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس قسم کے الفاظ زیادہ استعمال کئے۔

اسی طرح ان شعرا نے علم کلام کے بعض الفاظ اور اسالیب بیان اور قرآن و حدیث اور اشعار عرب کی عمدہ تشبیہات کا استعمال کیا، اور اس کا نام بدیع رکھا، سب سے پہلے بشار نے اس کی ابتدا کی، اس کے بعد مسلم بن ولید نے اس کا بہت زیادہ استعمال کیا اور ان تکلفات کی بنا پر اہل ادب کے نزدیک سب سے پہلے اس نے شاعری کو خراب کیا، ابو تمام نے اس میں اور بھی زیادہ غلو کیا، پھر بعد کے شعرا نے اس کی تقلید کی، اور اس کی اور بھی بہت سی قسمیں پیدا کیں، جن سے اہل عرب ناواقف تھے،

اشعار کے معانی و مطالب میں بہت زیادہ نزاکت، خیالی رنگینیاں اور تشبیہات و استعارات میں ترکیب پیدا ہوگئی، اور ابو تمام اور ابن رومی وغیرہ کا کلام جو مامون اور اس کے بعد کے زمانے میں پیدا ہوئے، فلسفیانہ اور منطقیانہ روح کا مظہر بن گیا، اور چونکہ شعرا مذہبی روح کے اثر سے خالی تھے، اس لئے انھوں نے ممدوحین کے اوصاف میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا، کہ ان میں خدا اور پیغمبروں کے اوصاف ثابت کئے، اس کے بعد شاعری کی ہر صنف میں اس قسم کا غلو پیدا ہوگیا،

وزن اور قافیہ کے لحاظ سے اس زمانہ میں ایسی چھوٹی چھوٹی بحروں کا رواج ہوا جن کو اہل عرب نے بہت کم استعمال کیا تھا، اس کے علاوہ بعض نئی نئی بحریں ایجاد کیں، جو اہل عرب کے کلام میں موجود نہیں تھیں، مثلاً شعر مزدوج" جس کے دو ٹکڑے ایک قافیہ پر پھر دوسرے دو ٹکڑے ایک قافیہ پر نظم کئے جاتے تھے، اور اس کا زیادہ تر استعمال امثال، قصہ حکایت، اور علوم اور فقہ کے اصول و قواعد کے نظم کرنے میں کیا جاتا تھا، موالیا کے نام سے شاعری کی ایک عامیانہ صنف بھی ایجاد ہوئی، اور سب سے پہلے برامکہ کی ایک لونڈی نے ان کو مرثیہ میں اس کا استعمال کیا،

ہوسکتا ہے جن کے متعلق یہ تحریریں لکھی جاتی تھیں مثلاً

(۱) سرکاری تحریریں یعنی خلفا اور ولی عہدون کے بیعت نامے اور سیاسی اور دفتری فرمان وغیرہ

(۲) بعض سیاسی اور دینی یا حکومت کے سیاسی مسلک کی تائید،

(۳) پاکیزہ اخلاق کی ترغیب،

(۴) ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح دینا،

(۵) قصے، کہانیان اور جانورون وغیرہ کی زبان سے حکایتین بیان کرنا،

(۶) کسی ماہر فن، یا کسی مذہب کے مُبلّغ یا کسی باپ کا اپنے بیٹے یا شاگردون یا اوس مذہب کے معتقدین کے لئے ہدایتین دینا یا نصیحتین کرنا،

الفاظ، معانی اور اسالیب بیان مین اس طرز تحریر کی امتیازی خصوصیات یہ ہین،

(۱) لمبے لمبے خطوط، معاہدات اور فرمانون کی ابتدا مین مقدمات قائم کرنا جس کا اثر اب بھی باقی ہے؛

(۲) خطوط کی ابتداء مین مختلف النوع عبارتون سے کام لینا مثلاً لمبے لمبے شاہی خطوط مین مختلف الفاظ مین خدا کی حمد کرنا اور چھوٹے چھوٹے خطوط مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کی نقل کرنا مثلاً من عبد اللہ فلان امیر المومنین الی فلان ومن قبلہ من المسلمین سلام علیک، اما بعد فانی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو،)

ہارون رشید نے حمد کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا طریقہ بھی اختیار کیا، اور امین نے خلیفہ کی کنیت کا بھی اضافہ کیا، کبھی صرف "اما بعد" سے خطوط کی ابتدا کرتے تھے، کبھی مکتوب الیہ کو دعا بھی دیتے تھے، اور بعض اوقات صرف اس قدر لکھتے تھے کہ کتابی الیک"

(۳) آسان اور فصیح الفاظ کا انتخاب کرنا اور اُن کو عمدہ طریقہ سے ترکیب دینا،

(۴) حسب موقع ایجاز و اطناب سے کام لینا،

(۵) نزاکت خیال اور دلائل و نتائج و احکام کے دلنشین کرنے کے لئے علم فلسفہ و منطق سے کام لینا۔

عبارتون مین دو خوبیان پائی جاتی تھین، ایک تو یہ کہ وہ تمدنی اور دفتری دونون ضرورتون کو پورا کرتی تھین، دوسرے یہ کہ عربی زبان کے جمال و کمال کا مظہر ہوتی تھین، اور شاعری صرف اس دوسری صورت تک محدود تھی، اس زمانہ مین انشا پردازی اس درجہ تک مختلف اسباب سے پہنچی،

(۱) ایک یہ کہ بہت سے اہلِ عرب اور وہ لوگ جو عرب تو نہ تھے لیکن عرب بن گئے تھے، قرآن مجید کو حفظ کرنے لگے، اور اپنے کلام مین اس کی آیتون کے ٹکڑے شامل کرنے لگے، اور معانی اسلوب بیان اور امثال و تشبیہات مین اسکی پیروی کرنے لگے۔

(۲) دوسرے یہ کہ ان لوگون نے حدیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین، اُن کے گورنرون، سپہ سالارون کے خطوط، خلفائے بنو امیہ، اور خوارج وغیرہ کے خطبات کا اکثر حصہ یاد کر لیا، چنانچہ جب عبدالحمید کا تب سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ بلاغت کیونکر حاصل کی، تو اُس نے کہا اس لیے کہ مین نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کلام کو از بر کر لیا تھا،

(۳) تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے بنو امیہ اور اُن کے گورنرون نے معاہدات صلح وغیرہ کے متعلق جو تحریرین لکھی تھین، اُن کو اُن لوگون نے حفظ کر لیا تھا، اور ان تحریرون مین بہت سی بلیغ نصیحتین اور سیاسی شرعی احکام موجود تھے،

(۴) چوتھے یہ کہ ان لوگون نے اُن اسلامی اداب کا جو قرآن، حدیث اور ان خطبات اور تحریرون مین جن کا ذکر اوپر کیا گیا، موجود تھے، اور تمدن، تومون مثلاً ایرانی، ہندو، رومی، یونانی کلدانی، وغیرہ کی علمی و ادبی ترقیون کا مطالعہ کر لیا تھا اس سے ان مین ایک مخلوط تہذیب پیدا ہو گئی، جو اسلامی روح کا مظہر بن گئی، اور خلفاء، وزراء، اور اس زمانہ کے مورخین اور ادبا کی انشا پردازانہ تحریرین ان سب کا مرقع بن گئین،

اس زمانہ کی انشا پردازی جس درجۂ کمال کو پہنچ گئی، اوس کا اندازہ ان مختلف موضوعات سے بھی

اس کے فرزند مامون رشید کا ہمسر ہو گیا، اور کتابون کے جمع کرنے اور کتب خانون کے قائم کرنے مین قرطبہ بغداد کا مقابلہ کرنے لگا

پھر جب اموی سلطنت زوال پذیر ہوئی، تو اندلس کی حکومت کو امرار کی ایک جماعت نے جس کو ملوک الطوائف کہتے ہین، باہم تقسیم کرلیا، اور ۴۲۲ھ سے ۴۸۴ھ تک اندلس مین فرمانروائی کی، ان مین شعراء وادبا بھی تھے جنھون نے ادبی ترقی مین اعانت کی، اس سے پہلے عقلی علوم لغت اور ادب کافی ترقی ہو چکی تھی، اب ان بادشاہون نے شعراء وادبار کی اور بھی حوصلہ افزائی کی، اور اُن کو وزیر اور امیر بنا لیا، اس لئے ادب کی شاخین خوب سرسبز وشاداب ہوئین، اور بہت سے شعر وادب کے امام پیدا ہو گئے، شاعری تو یون بھی عرب کی گھٹی مین پڑی ہوئی تھی لیکن جب انھون نے اندلس مین فطری حسن وجمال کو دیکھا تو اس ذوق نے اور بھی ترقی کی، اور اب وہ بدویانہ اور تمدنی دونون قسم کی زندگیون کا مظہر بن گئی، اور اوس مین فطری حسن وجمال کے ساتھ تمدنی جلوے بھی نظر آنے لگے، اندلس کے تمدن اور فطری حسن وجمال کا اثر شعراء پر بہت زیادہ پڑا، اور انھون نے وصف نگاری مین اسقدر ترقی کی کہ یہ اندلس کی شاعری کی نمایان خصوصیت قرار پائی،

وصف نگاری کے علاوہ اندلس کے شعراء نے اور تمام اصناف شعر مین بھی اہل مشرق کا مقابلہ کیا، اور شاعری کی ایک خاص صنف ایجاد کی جس کو موشح کہتے ہین جس مین ایک قافیہ اور ایک وزن کی پابندی نہین کی جاتی، البتہ اجتماعی اور فلسفیانہ مضامین کے پیدا کرنے مین وہ اہل مشرق کا مقابلہ نہ کرسکے، اور ان مین کوئی متنبی، اور معری پیدا نہین ہوا،

نثر | اندلس مین قدیم امراء کے زمانے مین انشا پردازانہ نثر کی ترقی کے لئے کوئی میدان نہ تھا، کیونکہ اب تک سیاسی، اور اجتماعی حالات کو رسوخ وثبات حاصل نہین ہوا تھا، اس لئے کوئی چیز ایسی نہین پیدا ہوئی تھی، جو اجتماعی یا ذاتی موضوعات مین انشا پردازی کے ملکہ کو ترقی دیتی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

اس دور کے مشہور انشا پردازون کے نام یہ ہین، ابن المقفع، احمد بن یوسف، عمرو بن مسعدہ،

عربی شاعری اندلس مین

اہلِ عرب نے اندلس کو ۹۲ھ مین فتح کیا، اور فتح کے بعد اُن کے جو قبیلے اور خاندان، مصر، شام، اور آفریقہ کے شہرون مین رہتے تھے، وہ ہجرت کر کے اندلس مین آباد ہو گئے، بنو امیہ کے گورنرون نے تقریباً چھیالیس سال یعنی ۹۲ھ سے ۱۳۸ھ تک اندلس پر حکومت کی، اور یہ زمانہ فتوحات، بغاوت اور شورش مین بسر ہوا، اس لئے عقلی زندگی، اور عربی زبان کو اس زمانہ مین ترقی کرنے کا موقع نہین ملا، اس زمانہ مین صرف چند تقریرون مین ادبی روح پائی جاتی ہے جن کو وہان کے گورنر فوج مین شجاعت کے پیدا کرنے اور انتظامی امور مین اُن کو ثابت قدم رہنے کے لئے کرتے تھے، اِن کے علاوہ بعض خطوط بھی تھے جن کو امرا سپہ سالارون وغیرہ کے نام لکھتے تھے، مجلسون اور محفلون کی عام گفتگو بھی زیادہ تر فصیح عربی زبان مین کی جاتی تھین، اور اندلس کے جو باشندے تعلیم کے ذریعہ سے عربی زبان سیکھتے تھے، وہ بھی اس معاملہ مین اہلِ عرب کی تقلید کرتے تھے،

اندلس کے آخری باغی امیر یوسف بن عبد الرحمٰن فہری سے جب عبد الرحمان بن معاویہ بن ہشام بن عبد الملک الملقب بالداخل نے (۱۳۸ھ) سلطنت چھین لی، تو وہان بنو امیہ کی دوسری سلطنت قائم کی، اور عربی زبان عربی لغت اور شریعت کی اشاعت کا کام شروع کر دیا، اور اس کے بعد اس کی آل و اولاد نے بھی اس کی تقلید کی، اب اندلس مین علمی ترقی کا دور شروع ہوا، جو عبد الرحمان ناصر کے زمانہ (۳۰۰ھ - ۳۵۰ھ) مین اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا، اس وقت اندلس مین بہ کثرت شاعر، ادیب، انشا پرداز اور مصنف پیدا ہو گئے، خلفائے بنو امیہ مشرق کے شہرون یعنی بغداد وغیرہ مین اہلِ علم اور اہلِ ادب کو اس لئے بھیجتے تھے، کہ وہ اہلِ مشرق کے علوم کو سیکھ کر آئین، اور اندلس مین اُن کی اشاعت کرین، اس لئے لوگ لغت ادب اور دینی علوم کی طرف نہایت کثرت کے ساتھ متوجہ ہوئے، عبد الرحمان ناصر اور اس کے فرزند حکم مستنصر نے اس طرف اس قدر توجہ کی کہ ہارون رشید اور

بے خوف زندگی

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

جائے روح پاک علیین بود کرم باشد کش وطن سرگین بود! (رومی)

آیئے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گر تبلائیں جنھیں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق و وجدان سے دریافت کیا ہے، اگر آپ انھیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لا خوف علیھم ولا یحزنون کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کرکے بے خوف و مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں

زین شہد یک انگشت رسانم بلبت از لذت اگر محو نگردی تف کن

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیۂ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے جیتے ہیں، اور انہی کے لئے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:۔

بہر یزدان می زید نے بہر گنج، بہر یزدان می مرد نز خوف و رنج

انکہ اللہ خندد کہ او بیند رضا ہیچو حلوائے شکر او را قضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق تعالیٰ ہی کی مراد اور ان ہی کے منشار کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ منشار یا مراد خیر بر ترین ہے،

عمر خوشی در قرب جان پروردن است عمر زاغ از بہر سرگین خوردن است (رومی)

فرمانروایانِ اندلس کے پہلے دور مین نثر صرف ان خطبات اور خطوط مین محدود رہ گئی جو فوجیون مین شجاعت پیدا کرنے اور امور سلطنت کے انجام دینے کے لئے امرا، عمال فوج کے سامنے دیتے اور لکھتے تھے اور ان سب مین اس خالص عربی روح کی جھلک پائی جاتی تھی، جو دمشق مین خلفائے بنو امیہ کے زمانہ مین موجود تھی، اس لئے ان مین خالص عربی موضوعات اور الفاظ و عبارت مین خالص عربی اسلوب کا لحاظ رکھا جاتا تھا، اور وہ صنائع و بدائع اور تکلف و تصنع سے خالی ہوتی تھین، لیکن جب سیاسی اور اجتماعی حالات نے وسعت اور ترقی حاصل کی ملک مین خوشحالی پھیلی، اور علم و ادب کی اشاعت ہوئی تو انشاپردازانہ نثر کا میدان بھی وسیع ہوا، اور مشرق مین جن موضوعات پر نثر لکھی جاتی تھی، اندلسیون نے بھی ان پر لکھنا شروع کیا، اور اس کے ساتھ اندلسیون نے نثر کے لئے بعض ایسے موضوع ایجاد کئے جو مشرق مین موجود نہ تھے، مثلاً نثر مین خلفاء کی مدح کرتے تھے، اور تہنیت، تعزیت، اور شوق نہ ناراضی کا اظہار کرتے تھے، جس سے وصف نگاری کے تمام اقسام نثر مین آگئے تھے، مثلاً مجالس محافل، بالخصوص رقص و سرود کی مجلسون باغون چشمون، ستارون اور آسمانون کے اوصاف نثر مین بیان کرتے تھے، زہد و تقویٰ اور تصوف کے مضامین بھی نہایت انشاپردازانہ عبارت مین لکھے تھے اس لئے ان کی تحریرون کے ہر جملہ مین استعارہ اور تشبیہ پائی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ مقفی عبارتون کا رواج تھا،

اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کریں گے،

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سے غائب نہیں، بعید نہیں، "اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ" میرا رب مجھ سے قریب ہے میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے "اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ" بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنتا ہے جب کسی اعرابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے، جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی،

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، — جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں،

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا،

یاایها الناس اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصما ولا غائبا انکم تدعون سمیعا بصیرا وهو معکم والذی تدعونه اقرب الی احدکم من عنق راحلته،

یعنی اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، (یعنی آہستہ کہو) تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو تم پکار رہے ہو سننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے ساتھ ہے، اور تم جس کو پکار رہے ہو وہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے،

یہ حدیث "وما کنا غائبین" کی تفسیر ہے، اور "فانی قریب" کی تشریح ہے،

خواب جہل از حرم قرب مرا دور فگند — ورنہ نزدیک تر از دوست کسے ہیچ ندید

اس معرفت کے حصول کے بعد جو وراء طور عقل و نظر ہے، جس کی سند نص قطعی و کشف صحیح ہے[۵] اور

---

۵ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵،

اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کریں گے،

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط ہیں،

ہمارے ساتھ ہیں

میری دعاؤں کا قبـ

جب کسی اعرابی نے

ہم اس سے سرگوشی کر

وَاِذَا سَاَلَه

قَرِیْبٌ،

حضرت ابو م

تھے، لوگ بلند آواز

یَا اَیُّھَا النَّاس

اَنْکُمْ لَا تَد

اِنَّکُمْ تَدْعُو

وَھُوَ مَعَکُم

اقرب الی ا

راحلہ، سے بھی زیادہ قریب ہے،

یہ حدیث "وما کنا غائبین" کی تفسیر ہے، اور قرآنی قریب کی تشریح ہے۔

خواب جہل از حرم قرب مرا دور فگند \
ورنہ نزدیک تر از دست کسے ہیچ ندید

اس معرفت کے حصول کے بعد جو درار طورعقل ونظر ہے، جس کی سند نص قطعی وکشف صحیح ہے[1] اور

[1] مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵،

معلوم کرنے کے بعد کہ قرب حق بغیر اختلاط و حلول و اتحاد[۵] ہمیں حاصل ہے، صوفیہ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر غور کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے، اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور یہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں،

(۱) قرب حق رحمت ہے، رحمت حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے۔ حق تعالیٰ تو حلیم و رحیم ہیں، غفور و کریم ہیں اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَؤُفٌ رَّحِیْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن و رحمت ہی کی طرف بلاتے ہیں، اللّٰہُ یَدْعُوا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ ان کا فضل و کرم عظیم ہے، وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ وہ ہمارے سچے دوست ہیں، اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، اُن کے سایہ رحمت میں زندگی بسر کریں اور اُن کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی کیونکہ رحمت حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، حق کے مقابلہ میں کونسی قوت آسکتی ہے!!

لیکن ہماری زندگی ذہول و غفلت میں گذرتی ہے، معصیت و نافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ یار مہربان کی طرح ہمارے جویا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور بلاؤں اور آفتوں کا شکار ہوتے ہیں،

تو مرا جویا چو یار مہربان من گریزان از تو مانند خران (رومی)

جب خوف و حزن آفات و بلیّات کا سامنا ہو اور ہم قرب حق کا ارادہ قائم کر سکیں، قلب کو اس واقعہ کا یقین دلا سکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب ہیں، مونس و رفیق ہیں، یار مہربان ہیں، ہماری قوت بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں

---

۵ شیخ علی الہاشمی و رتفسیر الفاتحہ (۱) السیمہ شمس العرفان[illegible]

أذكرِ اللهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرْكَ فِي الشِّدَّةِ ، — اللہ کی یاد چین کی حالت مین کر وہ تجھ کو سختی کی حالت مین یاد کریگا یعنی تیری مصیبت دور کرے گا،

جب انسان آسایش اور چین کی حالت مین حق تعالیٰ کی یاد نہین بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت مین نہین بھولتے، اس لئے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے،

فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ، — چین اور آسایش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو

جانتے ہو کہ چین کی حالت مین دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے، وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ حقیقت مین منعم، تاسم، فاعل مسبب و موجد حق تعالیٰ ہی ہین، اور ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتون کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ مین "شکر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور مومن کی شان مین فرمایا گیا ہے،

الْمُؤْمِنُ شَكُورٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ — مومن چین کی حالت مین حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے،

اگر ہم آسایش و نعمت کی حالت مین حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھین، نعمتون کو ان ہی کی جانب سے سمجھین، اور اس طرح اپنا رُخ اُن ہی کی جانب نہ رکھین، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہین قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چین و آسایش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمین اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم اُن کی معیت کا ادراک کر سکین، اُن کی رحمت کاملہ کو اپنا مونس و رفیق پا سکین، اس لئے حضور انورؐ نے ابن عباسؓ سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احْفَظِ اللهَ يَحْفَظْكَ اللهُ، — خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمھاری نگہداشت

دی حق تعالیٰ جن کے حضور مین رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے جاندار اور پانی کے حیوان سجدہ ریز ہین، جو محسن و مکرم و منعم ہین جو حرز ضعفاء ذکر فقرا ہین، تو بھلا بتلاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب مین خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، حاشا و کلا، قرآن کریم نے بانگ دہل اعلان کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی و یقینی ہی،

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ،	جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلون کو اطمینان ہوتا ہی، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلون کو اطمینان ہوتا ہے

ذکر "توجہ قلبی" ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت و محبت کی طرف قلب نے توجہ کی، اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے، کہ خوف دور ہوا، اور طمانیت نصیب ہوئی، اور زندگی کے میدان مین قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہمین یقین ہوگیا، اور ہم نے محسوس کرلیا کہ رحمت حق ہمارے سامنے ہی، وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا؛

لیکن خوف و خطرے کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز ہی نہین، جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت مین حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ کیا ہو، تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہین قائم کرسکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمین نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کردیا گیا، ہی اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت مین خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو، یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھین، اُن کی یاد مین زندگی بسر کرین، اُن کی معیت کا ادراک کرتے رہین، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اسی بنا پر نصیحت فرمائی تھی، کہ

گر بہ سر کوے عشق ما کشتہ شوی شکرانہ بدہ کہ خونبہاے تو منم

(۲) ثانیاً قرب حق یا حضورِ حق حکمت ونظم کا نام ہے، حضور حق عالم لاہوت ہے، عالم لاہوت مین کامل الٰہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہین، عالم لاہوت مین شر نہین فساد نہین بلکہ کامل نظم وترتیب ہے،

نظمِ کائنات پر غور کرو، یہان پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے، مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام مین قصور نہین کرتا، دوسرے برقیہ سے نہین ٹکراتا اُن کے درمیان تصادم ممکن نہین، یا قرآنی الفاظ مین یون کہو کہ صُنع الٰہی مین کوئی خلل نظر نہین آتا، بار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ درماندہ ہو کر لوٹتی ہے اور کوئی عیب یا خلل نظر نہین پڑتا،

ما تری فی خلق الرحمٰن مِن	تو خدا کی صنعت مین کوئی خلل نہ دیکھے گا
تفٰوت فارجع البصر ھل	تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہین تجھ کو
تری من فطور، ثم ارجع البصر	کوئی خلل نظر آتا ہے، پھر بار بار نگاہ ڈال کر
کرتین ینقلب الیک البصر خاسئاً	دیکھ نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری
وھو حسیر (پ ۲۹ ع ۱)	طرف لوٹ آئے گی،

عالم لاہوت مین اس سے کہین زیادہ کامل نظم وتوافق کی حکمرانی ہے، یا یون کہو کہ "نظم الٰہی" مین کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہے، نغمہ موسیقی جن تارون سے پیدا ہوتا ہے، ان مین سے ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے مرتعش ہوتا ہے، اس رفتار مین کمی یا زیادتی نہین ہوتی، نظم الٰہی کا بھی یہی حال ہے، یہان بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہے، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہے، اپنا مفوضہ کام انجام دیتی ہے، اس کو کامل طور پر انجام دیتی ہے، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے،

حضور حق یا قرب حق کے مفہوم مین نظم الٰہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہین

احفظ اللہ تجدہٗ اَمامک

کرے گا، خدا کو حاضر جان تو اس کو اپنے سامنے پاؤگے،

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھین یعنی اُن کی معیت کے ادراک مین رہین، تو حق تعالیٰ ہمین اپنی نگاہ مین رکھتے ہین، (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھین، تو ہم انھین اپنے سامنے ہی پاتے ہین :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہو کہ ہم کہین حق تعالیٰ مین آپ کا شکر گذار ہون کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہین " مین آپ کی نظرون مین ہون " پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے، کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھون کے سامنے ہین، اور اُن کی رحمت کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط ہے،

خوف اور بلا کے ورود کے وقت قرآن شاہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ

وَاصبرْ لحکمِ ربِّک فَاِنَّک باَعیُنِنا، اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھون کے سامنے ہو،

بعض عارفین کی جیب مین یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، حضور و معیتِ حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہین، اس تجربہ مین شریک ہین، دیکھ رہے ہین جھومتے رقص کرتے، خود حضور انورؐ پر اس آیت سے وجد طاری ہوا تھا، اور اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤن پر گر گئی تھین[1]، جامی نے شاید اسی مفہوم کو یون ادا کیا ہے،

با درد بساز چون دوائے تو منم
در کس منگر کہ آشنائے تو منم

[1] معارف :- لائق مضمون نگار نے اس کی کوئی سند نہین لکھی ہے،

ین دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشا، مرضی، سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس زیادہ حسین وجمیل، یادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہوسکتی، نیک انجام و شادکام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے ے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کرلیا او بآواز بلند کہا

اُرِیْدُ ان لا ارید،	میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا

ر حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو،

اللّٰھمّ انّ قلوبنا ونواصینا	حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سراپا
وجوارحنا بیدك لم تملکنا	اور ہمارے اعضا آپ ہی کے قبضہ
منھا شیئًا فاذا فعلت	میں ہیں، آپ نے ہمیں اُن میں سے
ذالك، فکن انت ولیّنا	کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں
واھدنا الی سواء السّبیل [1]	دیا ہے، پس جب آپ نے یہ کیا ہے،
	تو آپ ہی ہمارے مددگار رہئے، اور
	ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہئے،

جس کی شب و روز یہ دعا ہو کہ

اللّٰھمّ انّی ضعیف	حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی
فقوّنی فی رضاك	مرضیات میں میرا ضعف اپنی قوت
ضعفی وخذ الی	سے بدل دیجئے، اور کشاں کشاں
الخیر بناصیتی و	مجھے خیر کی طرف لے جائیے، اور اسلام
واجعل الاسلام	کو (یعنی ہر امر میں آپ کے سامنے

---

[1] ترمذی عن ابی ھریرہ وکنز العمال عن جابر،

اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظم الٰہی، حکمتِ حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں، تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہے گا،

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں، کہ حق تعالیٰ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے، کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہی، بلکہ حکمت بھی ہے، نظم بھی ہی، لہٰذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوگی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہوگی، اور اگر ہم اس یقین صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا،

عارف رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے،

رو دیدہ بہوش تا دلت دیدہ شود　　زان دیدہ جہانِ دگرت دیدہ شود

گر تو ز پسند خویش بیرون آئی　　کارت ہمہ سربسر پسندیدہ شود

اگر "دیدہ دل" سے حکمتِ الٰہی نظر آنے لگے، اگر دل نظم الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت وشہود میں وہ جما بھی رہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہوگا، اپنے وقت پر ہوگا، اپنے مقام پر ہوگا، اور ہر وقت وہی کہے گا، کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آنچنان می باید　　و آن چیز کہ آنچنان نمی باید نیست!

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللّٰہ معنا، بلکہ ہر زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل ہمارے اعضاء اور ہم خود سراپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشائے الٰہی کی بنیاد لا متناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سراپا حکمت ہی، رحمت ہی، یہ ہمیں خیر و بہتری کی طرف لیجا رہی ہے، اس کو ارادۃ اللّٰہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضی مولیٰ بھی کہا گیا ہی، حق تعالیٰ کے ارادہ سے توافق اُن کی رضا سے راضی ہوتا، رضا از و، رضا بدو، رضا در و، اعراض عن الاعتراض" حفظ حال، "قیام فی ما اقام اللّٰہ" اس کی تعلیم تو ہمارے رہبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے

قرب حق مین زندگی بسر کرنے کا مدعا اس پر یقین صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی مین مرادِ الٰہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف پریشانی فکر اور بے شمار خرابیون کا کامل دفعیہ ہو، ہم کو اس سے اس عارف کامل کا نقطۂ نظر حاصل ہو جاتا ہے، جو زندگی اور اس کے ہموم و غموم، افکار و پریشانیون پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پس پردہ حکمتِ مطلقہ و رحمتِ مطلقہ کام کر رہی ہے، اور اپنے شاندار منشاء و مراد کی تکمیل کر رہی ہے، اور ہمین خیر بر ترین کی طرف لے جا رہی ہے، سارے جہان کو ابھی اگر وہ برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے، تو گھبراتا نہین، کیونکہ وہ جانتا ہے، کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ ساری برف پگھل جائے گی،

گر جہان پُر برف گردد سر بسر
تابِ خور بگدازدش از یک نظر (رومی)

اس لئے وہ اپنے ساتھیون سے عجیب امید افزا لہجہ مین کہتا ہے،

سوے نومیدی مرو کامید ہاست
سوے تاریکی مرو خورشید ہاست

بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہی ہے کہ

(۱) قرب حق مین زندگی بسر کرو کیونکہ

عمر خوش در قرب جان پروردن ست
عمر زاغ از بہر سرگین خوردن ست

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھون مین نرم اور ملائم بن جاؤ تاکہ ارادہ اللہ جاری ہو جائے، رضائے حق تمھارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ" (حق تعالیٰ نے جہان تمھین کھڑا کیا ہے، وہین کھڑے رہو) رضا بالعطا، حفظ حال تمھارا شیوہ ہو، (ہر حالت مین خوش رہو) تصادم بالقضا سے بچو،

منتہا رضائی، سر تسلیم خم کرنے کی خو کو) میری پسند
کا منتہا بنا دیجئے،

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھون مین اپنے آپ کو دیدیتے ہین، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہین، اُن کے ارادے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہین، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے ہین، تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہین، رازی نے اس کی توثیق کی ہے ان اللہ رجالا یرضی برضائهم ویغضب بغضبهم کما یرضوا برضاء لا ویغضبوا بغضبه،

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہی آن کنی
آنچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر یہ پروا نہین رہتی، کہ زندگی مین ہم پر کیا گذر رہی ہے، یا گذرنے والی ہے، کیونکہ ہم جاننے لگتے ہین، کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لئے بھی اسی لئے شیخ جیلی نے جان کر کہا تھا، کہ

الرضا بالقضا هو الراحة الكبرى والجنة العالية المنفردة فی الدنیا وعلة محبة الله بعبده المومن فمن احبه الله لم یعذبه فی الدنیا والآخرة[۱]

قضائے الٰہی سے راضی رہنا دنیا مین بڑی راحت کا سبب ہے، گویا جنت عالیہ ہے، اور عبد مومن کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے، اور جس سے حق تعالیٰ محبت کرتے ہین، اس کو نہ دنیا مین تکلیف

---

[۱] فتوح الغیب

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ہند کی قرون وسطیٰ

جلد دوم

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (علیگ)

مذکورہ بالا کتاب ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ہے جس میں ۶۰۲ھ؁ سے ۱۳۲۰ء یعنی سلطان محمد غوری سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی تک کے حالات ہیں، فاضل مؤلف قاری محمد بشیر الدین بدایونی ام اے (علیگ) وائس پرنسپل اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہجہانپور مبارکباد کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے بڑی محنت کاوش اور ایک نئے نقطۂ نظر سے اس کتاب کو لکھنے کی کوشش کی ہے، اور اب تک ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ کتاب جداگانہ حیثیت رکھتی ہے،

کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد حبیب بی، اے (آکسن) بارایٹ لا، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا مقدمہ، شیخ عبدالرشید ایم اے ال ال بی صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی کی تقریب اور پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ام اے شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کا تعارف ہے، مسلم یونیورسٹی کے ان تینوں فاضل اساتذہ میں سے اس اردو کتاب میں صرف پروفیسر ضیاء احمد بدایونی ہی نے اردو زبان میں تعارف لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے، پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر شیخ عبدالرشید نے انگریزی ہی میں اپنی زبان کی

جن تجربات سے گذر رہے ہو، ان پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمھین موقع دیا گیا، ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دنیا کو "روح ساز" وادی کہا گیا ہے، یہان کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تارون سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہین، ان پر ہر حال مین شکر واجب ہے، کرب و بلا دونون کی ایک سی قیمت ہے،

بالفاظ دیگر جن چیزون سے تمھین خوف ہو، اُن ہی سے پیار کرو، اور خوف سے تمھین ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی،

بس زبون وسوسہ باشی دلا
گر طرب را باز دانی از بلا

شعر الہند جلد اوّل

جس مین قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کی گئی ہے اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، قیمت: للعہ

سیرت عائشہؓ

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حالات زندگی، اور اُن کے مناقب و فضائل و اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنف نسوانی پر اُن کے احسانات اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان اور معترضین کے جوابات، قیمت: للعہ طبع سوم باضافہ حواشی،

"منیجر"

حیرت ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے ایسی غیر ذمہ دارانہ بات کیونکر نکلی ایک غیر مسلم بھی جو اسلامی شریعت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، ایسی بات نہیں لکھ سکتا، اسلام کی تو سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی طرح اس کا دائرہ محض خدا اور بندے کے تعلق یعنی عقائد و عبادات اور اخلاق تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ پورا نظام زندگی ہے جس میں عقائد و عبادات اور اخلاق کے ساتھ معاملات یعنی انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اقتصادیات، معاشیات اور زندگی کے تمام پہلوؤں کا پورا دستور العمل ہے، موجودہ لادینی سیاست کے نقطۂ نظر سے اسلام اور اس کی شریعت پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ نہیں ہیں، حکومت اور سیاست کو بھی مذہب میں داخل کر لیا گیا ہے اگر حسن ظن سے کام لیا جائے، تو غالباً فاضل پروفیسر نے اسی اعتراض سے بچنے کے لئے سیاست کو اسلامی شریعت سے خارج کر دیا ہے، اس لئے کہ ایک پڑھے لکھے مسلمان سے ہرگز اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے مذہب سے اتنا ناواقف ہو سکتا ہے، پروفیسر موصوف فقہ کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیں، اس میں عبادات کے ساتھ معاملات یعنی انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض، جنگ و صلح، حقوق اعداء، حقوق ذمیین، حقوق مستامن، حقوق عوام وغیرہ کے مکمل قوانین ملیں گے، بلکہ حکومت کے سیاسی و مالی قوانین پر مستقل کتابیں موجود ہیں، ماوردی اور ابن عماد حنبلی کی احکام السلطانیہ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور ابن عبید کی کتاب الاموال حکومتِ اسلامیہ کے دستوری اور مالی قوانین پر مشہور کتابیں ہیں، اس کے علاوہ فقہ کی کوئی کتاب بھی ان ابواب سے خالی نہیں ہے، ایسی حالت میں اسلامی شریعت کو محض نجی اور شخصی حقوق تک محدود کر دینا یا تو مصلحت آمیز دروغ یا اسلام سے بالکل ناواقفیت کی دلیل ہے؛

آج کل کے غیر مسلم اہل قلم جب کبھی مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ پر لکھنے بیٹھتے ہیں، تو وہ ان کی مذہبی اور تاریخی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بجائے کسی مسلمان اہل قلم کی ایسی رائے اور تحریر کی جستجو و تلاش میں رہتے ہیں جن سے وہ کسی خاص غرض کے لئے فائدہ اٹھا سکیں، اس لئے اگر کوئی غیر مسلم

داد دی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ دونوں فضلا اپنے بلند درجہ سے اردو کی نچلی سطح پر اترنا پسند نہ کرتے ہوں، یا شاید تمام زندگی اردو بولنے اور اس کے ایک بڑے مرکز میں رہنے کے باوجود وہ انگریزی زبان ہی میں سوچتے ہوں تاہم جو کچھ انھوں نے انگریزی میں لکھا ہے اگر اس کو اپنی ٹوٹی پھوٹی مادری زبان میں لکھ دیتے تو اُن کی خوش مذاقی کی دلیل ہوتی، ورنہ اردو کی تصنیف میں مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی تحریر کے پیوند سے خود اپنے لسانی افلاس کا مظاہرہ ہوتا ہے، کتاب کے فاضل مؤلف کو شاید اس کا احساس تھا، اس نے اُن انگریزی تحریروں کا ترجمہ اردو میں بھی دیا ہے، اور غالباً پروفیسر حبیب کی بعض باتیں بھی اُن کی نگاہ میں قابلِ اعتراض تھیں، اس نے مقدمہ کے اردو ترجمہ میں اُن کو حذف کر دیا ہے۔

پروفیسر حبیب کا مقدمہ بیس صفحوں پر مشتمل ہے، جو نہ صرف ایک کتاب کا دیباچہ بلکہ ایک پر مغز علمی مقالہ بھی ہے، یہ اگر علٰحدہ کسی انگریزی رسالہ میں شائع ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا، کچھ دنوں سے پروفیسر حبیب نے مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوؤں کے تمدنی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کو اپنا موضوع بنا لیا ہے، اور وقتاً فوقتاً وہ اس موضوع پر لکھ کر اپنی وسعتِ نظر اور فراخدلی کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں، چنانچہ اس مقدمہ میں بھی انھوں نے ہندوؤں کے قدیم تمدنی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے،

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پروفیسر حبیب جب کبھی مسلمانوں کے دورِ حکومت کی جانب توجہ کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور لکھ جاتے ہیں، جس سے مسلمانوں کے مذہبی اور ملّی جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے، یہ مقدمہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

"مسلمانوں کی شریعت میں کوئی پبلک لا نہیں ہے، یہ (یعنی اسلامی شریعت) سیاسی حقوق سے کچھ بھی واقف نہیں، اس کا تعلق صرف نجی اور شہری حقوق سے ہے،"

(انٹروڈکشن صفحہ ۱۹)

سارا ہندوستان مسلمانوں کے زیرنگین ہوگیا، اب اگر پروفیسر صاحب کی رائے تسلیم کرلی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک بہت ہی قلیل مدت مین مزدورون اور کام کرنے والے طبقون مین بدلی اسی سرعت اور عجلت کے ساتھ پھیلی جیسی کہ موجودہ دور مین ڈاک، تار، ریل، ہوائی جہاز، اخبار اور ریڈیو کے ذریعہ سے پھیلائی جاتی ہے،

علائی مینار (جس سے مراد غالباً قطب مینار ہے) اور اس کے پاس قطب مسجد (یعنی مسجد قوت الاسلام) مسلمانون کی شاندار تعمیری یادگارین ہین لیکن پروفیسر حبیب کا خیال ہے کہ اس قسم کی بے مصرف تعمیرات عامہ (Useless public structures) محض بے روزگارون کی بے روزگاری، مزدورون کی بے چینی دور کرنے کے لئے کرائی جاتی تھین، اگر کسی چیز کو محض جنبش قلم سے بے کار اور بے مصرف قرار دیا جاسکتا ہے، تو دنیا کے ہر ملک کی شاندار یادگارون کی اہمیت بالکل ہی ختم ہو جائے گی، لیکن اس قسم کی رائے وہی مورخ ظاہر کرسکتا ہے جو کسی خاص عینک سے تاریخ کی مطالعہ کرنا یا کسی مقصد کے لئے ماضی سے نفرت پیدا کرانا چاہتا ہو، اگر قطب مینار، اور مسجد قوت الاسلام کی محرابون کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ محض مزدورون کی بے چینی دور کرنے کی خاطر تعمیر کی گئین تو پھر اسپین کے الحمرا، والزہرا، دمشق کی جامع اموی اور مصر کی جامع عمرو بن العاص کی محرابون اور میناروں، ہندوستان مین فتح پور سیکری کی عمارتون، جہانگیر کے مقبرے اور تاج محل وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے، اس طرح آرٹ کے نقطۂ نظر سے ان عمارتون کے مطالعہ اور اُن کی اہمیت کا سوال ہی باقی نہین رہ جاتا،

فاضل پروفیسر نے اپنے انگریزی مقدمہ مین کتاب کے مؤلف قاری محمد بشیر الدین پنڈت کے نام کے ساتھ کہین پنڈت اور کہین شری لکھا ہے، اسی کے ساتھ اگر وہ کسی جگہ قاری بھی لکھدیتے، تو ان کی روشن خیالی اور فراخ دلی پر حرف نہ آتا،

اہلِ قلم مسلم یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر کی مذکورۂ بالا تحریر سے فائدہ اٹھائے تو اُن کے یہ چند فقرے کس قدر مضر ثابت ہوسکتے ہین،

پروفیسر موصوف نے خلاف توقع ایک نئی بات یہ پیش کی ہو کہ ہندوستان مین مسلمانون کی آمد سے پہلے اور اُن کی حکومت کے زمانہ مین مزدورون کا سوال بہت اہم تھا، اور بے روزگاری کی وجہ سے اُن مین مستقل بے چینی رہتی تھی، آج کل ہر ملک مین یہی سوال پیدا ہے، اور سیاست کا کھیل مزدورون ہی کے ذریعہ سے کھیلا جارہا ہے، اور آیندہ تاریخ ان ہی مزدورون کے ذریعہ سے بنائی جانے والی ہو، اس لئے آج کا مورخ گذشتہ عہد کی تاریخ کا مطالعہ بھی اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہتا ہے، جو صحیح نہین ہے، ہماری گذشتہ تاریخ عام طور سے جو مسخ ہوگئی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ اس کو موجودہ دور کی عینک سے دیکھا جاتا ہے، معلوم نہین آگے چل کر اور کن کن عینکون سے گذشتہ دور کے واقعات دیکھے جائین گے، اور اُن کی کیا کیا تعبیرین کی جائین گی، لیکن یہ تعبیرین مورخون کی محض اُپج ہی ہون گی، جن کا تعلق حقیقت سے نہ ہوگا،

پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ اگر مزدورون، گاؤن والون اور شہر کے کام کرنے والون مین بددلی اور بے چینی نہ ہوتی، تو شہاب الدین غوری ہندوستان کو اتنی آسانی سے فتح نہ کرسکتا تھا، اُن کے خیال مین غوریون کی فتح اُن کی سپہ گری اور جانبازی کا نتیجہ نہین، اس لئے اس کو اُن کا سپاہیانہ کارنامہ قرار نہین دیا جاسکتا، بلکہ ان کی فتح کو سقوطِ ہند (Indian Coollapse) کہنا چاہئے، ممکن ہے، یہ رائے صحیح ہو، لیکن اس کو قبول کرنے مین اس لئے تامل ہوتا ہے کہ ۱۱۹۱ء مین جنگ ترائن مین غوریون کو شکست فاش ہوئی، تو پروفیسر صاحب کے خیال کے مطابق اس کا سبب یہ ہوگا کہ ۱۱۹۱ء مین مزدورون، کسانون، اور کام کرنے والے طبقون مین بددلی، اور بے چینی نہین تھی، لیکن اس کے کل سوا سال کے بعد پھر غوریون نے راجپوتون کے مقابلہ مین فتح حاصل کی، اور بہت جلد

پہلی جلد بھی لکھی ہو، جس میں ظاہر ہے کہ عربون اور غزنویون کی حکومتون کے حالات ہون گے، اس لئے جلد دوم کے باب دوم مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر وہ ان کی پہلی جلد مین ہوتا، تو زیادہ مناسب تھا، لیکن شاید پہلی جلد مین یہی باتین کسی اور نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہون،

باب سوم مین ۱۲۰۰ء سے پہلے کی ہندؤون کی مختلف ریاستون اور حکومتون کا ذکر ہے، باب چہارم اور باب پنجم مین غوریون، غلامون اور خلجیون کی تاریخ ہے جس کے پڑھنے کے بعد مؤلف کی تلاش و تحقیق کے شوق اور تاریخ نویسی کے ذوق کا پورا اندازہ ہوتا ہے، طرزِ بیان سنجیدہ اور متین ہے اور زبان صاف و سلیس ہے،

حاشیے مین جن ماخذون کے حوالے دیے گئے ہین، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ وسیع ہے، لیکن ان مین بکثرت ایسی کتابین بھی نظر آتی ہین، جو تعلیمی ادارون مین مقبول ہین، لیکن نصابی کتابون کو خواہ وہ کیسی ہی مفید اور مستند ہون کسی محققانہ کتاب کا ماخذ بنانا احتیاط کے خلاف ہے، معلوم نہین فاضل مصنف نے کہین ضیاء برنی، اور زیادہ تر ضیاء برنی لکھنا کیون پسند کیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید، پُر از معلومات اور لائقِ مطالعہ ہے،

تاریخ سندھ

مولانا مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ، اور ان تمام دورون کے نظامِ حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہِ عام کے جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے، قیمت:- ۷ روپے

"مینیجر"

فاضل مصنف کی اصل کتاب کا آغاز لمحۂ فکریہ سے ہوتا ہے جس میں بعض خاص خاص مسائل مثلاً اسلامی جہاد کی حقیقت، حرمت نفس، قصاص، مقصد جنگ، مجاہدین کا درجہ، مدافعانہ جنگ، جزیہ اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول، مسلمانوں کا خلیفہ، طریق انتخاب و طریق کار۔ یہ مفید مباحث ہیں جن سے مؤلف کی وسعت مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، لیکن اگر یہ مباحث ایک مستقل باب میں لکھے جانے کے بجائے کتاب کے خاص خاص مسائل کے ساتھ ہوتے، تو زیادہ بہتر ہوتا، مثلاً اسلامی جہاد کی حقیقت کے سلسلہ میں یہ بتایا جاتا کہ اس بارہ میں اسلام کی اصل تعلیم کیا ہے، اور عملی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے کیا کیا، اسی طرح یہ بھی ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد کیا ہے اور مسلمان فاتحوں کے کیا مقاصد تھے، یا اسلامی نظام حکومت کے بنیادی اصول پر بحث کرکے یہ دکھایا جا سکتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ان اصولوں کی پابندی کہاں تک کی، تمہید میں جزیہ پر تو بحث ہے، لیکن جن مسلمان فرمانرواؤں کا حال لکھا گیا ہے اُن کے دورِ حکومت میں کہیں جزیہ کی بحث نہیں آئی ہے، اسی طرح باب اول میں ہندوستان میں آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا رنگ اور اسی کی فصل دوم میں "ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مصنف کے معلومات کا اظہار تو ضرور ہوتا ہے، لیکن اگر ان کو حذف کر دیا جائے تو اصل کتاب کے علمی وزن میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے، البتہ اگر یہ دکھایا جاتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت اسلامی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا، اور خود ہندوستان کے مسلمانوں کی سوسائٹی کا کیا رنگ رہا، اسی طرح ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں کی علمی ترقیاں دکھا کر ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی ترقیاں پیش کی جاتیں تو لائق مصنف کا یہ بڑا علمی کارنامہ ہوتا،

باب دوم کی مختلف فصلوں میں عہد [illegible] سے پہلے کے ہندوستان کے مذہبی اور معاشرتی حالات [illegible] کی وجہ سے لائق مطالعہ ہیں، فاضل مؤلف نے زیرِ نظر تاریخ کی

مطبوعات جدیدہ

مضامین سید سلیمان ندوی | مرتبہ جناب مولوی ابو سلمہ محمد شفیع صاحب بہاری تقطیع
حصہ اول | چھوٹی ضخامت: ۲۹۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر،

قیمت للعہ پتہ مکتبہ علم و حکمت محلہ سکونت کلان بہار شریف ضلع پٹنہ،

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے سیکڑوں علمی ادبی و مذہبی مضامین نکل چکے ہیں جن کا بڑا حصہ الندوہ اور معارف کے اوراق میں بکھرا ہوا ہے، یہ تمام مضامین علمی و افادی حیثیت سے اس لائق ہیں کہ ان کا مجموعہ کتابی شکل میں شائع کیا جاتا، لیکن موصوف نے کبھی اسکی جانب توجہ نہیں فرمائی، اسلیے لائق مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے ذوق سے چند مذہبی و علمی مضامین منتخب کرکے ان کا ایک حصہ شائع کر دیا، اس حصہ میں حسب ذیل مضامین ہیں، اسلام دونوں جہان کی بادشاہی، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، اسوۂ النبی، حقیقت صوم، کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے، وحی اندوے قرآن، اور مدعی کا تضاد بیان، وحی کے اقسام، علوم القرآن، مجدد الف ثانی، خلیل اللہ کی بشریت، ذبح عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک، اسلام اور سوشلزم، دین کی تکمیل کی چند منی کوششیں، مسلمانوں کی موجودہ حالت کی برائی و شادی وغیرہ، اندراج نکاح و طلاق اور تقرر قضاۃ، تاج محل، اور لال قلعہ کے معمار، یورپ کی بحری تصنیفات، عرب اور امریکہ، یہ تمام مضامین اپنے مفید اور بیش قیمت معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں، لیکن جہاں فاضل مرتب شکریہ کے لائق ہیں کہ انھوں نے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا، وہیں وہ قابل شکایت بھی ہیں کہ مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں پوری توجہ

ادبیات

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولی ڈپٹی کلکٹر آرہ

بزمِ طرب سے کام کیا لذتِ غم چشیدہ کو
صحنِ چمن سے کیا غرض برگِ خزاں رسیدہ کو

نرگسِ مستِ ناز کی اُف رے فسوں طرازیاں
دیتی ہے ذوقِ مے کشی زاہدِ برگزیدہ کو

دل کو سکون محال ہے رات کی نیند حرام ہے
روگ ہے انتظار کا دیدۂ خوں چکیدہ کو

عقل کی ہرزہ کاریاں اہلِ خرد کو ہوں پسند
دے نہ سکے گی یہ فریب ذوقِ جنوں چشیدہ کو

بڑھ گئی دل کی بے کلی دیکھ کے زلفِ خم بہ خم
کیسے سکون ہو سکے طائرِ دام دیدہ کو

اپنے مریضِ غم کا حال پوچھ بھی لو دمِ اخیر
دیدو نویدِ زندگی جانِ بلب رسیدہ کو

سامنے آکے دل کو پھر محشرِ غم بنا دیا
آگ لگا دی چھیڑ کر شعلۂ آرمیدہ کو

بزمِ جہاں میں ابتری پھیل رہی ہے ہر طرف
اُٹھ کے ذرا سنوار لو کاکلِ سرکشیدہ کو

گلشنِ دہر میں ولی لالہ و گل تھے بے شمار
کوئی سکون نہ دے سکا میرے دلِ رمیدہ کو

نوی اور حضرت گرامی جیسے اساتذہ سخن کی بزمِ ادب کے ایک رکن تھے، اور ان اساتذہ نے اُن کے
م کی داد دی ہے، بوستانِ حسرت کی غزلیں، نعتیں، قطعات تاریخ اور دوسری متفرق منظومات
ت ہیں، ان میں قند پارسی کی شیرینی اور چمنستانِ شیراز کی بہار کا لطف ہے، بیشتر غزلیں عالمِ شباب
ہیں، اس لئے ان میں شراب کی مستی، پھولوں کی نکہت و رنگینی اور موسیقی کا ترنم ہے، اور بقول مولانا حالی
تا ہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہیں جن میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، خیالات کی رنگینی و لطافت آ
لطف کا اندازہ اُن کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں سید الطاف حسین صاحب
ا تقریب اور مصنف کے قلم سے فارسی غزل کی مختصر تاریخ ہے، جو بجائے خود مستقل حیثیت رکھتی ہے،
ہ شیراز کا ذوق ختم ہوتا جاتا ہے، اس کے لذت آشنا بہت کم باقی رہ گئے ہیں، اس لئے اس کا جو
نظر آجائے، تبرک سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہئے، اس لئے توقع ہے کہ فارسی شاعری کے ذوق آشنا
حسرت کی نکہت بیزیوں سے لطف اندوز ہوں گے،

مولود شمسی، مرتبہ محترمہ شمسی عباد الرحمن صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت
و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؍ پتہ نولکشور پریس لکھنؤ،

میلادِ نبوی کی محفلوں میں جو کتابیں عام طور سے پڑھی جاتی ہیں، ان کی بیشتر روایات غیر معتبر اور اسلامی
ہ کے خلاف ہوتی ہیں، جس سے محفلِ میلاد کا اصلی مقصد یعنی اسوۂ رسول پر عمل کی ترغیب کا فائدہ
نہیں ہوتا، لیکن مولود شمسی سیرت نبوی کی معتبر کتابوں سے ماخوذ ہے، اس لئے اس عیب سے
ہے، اور مصنفہ نے واقعات کے انتخاب اور اُن کی ترتیب و تحریر میں بڑے سلیقہ سے کام لیا ہے، اُ
خ نبوی، آپ کے خلق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کو بڑے موثر اور دلنشین انداز میں تحریر کیا ہے، یہ کتاب
میلاد کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے مناسب بلکہ مذہبی معلومات کی حیثیت سے عورتوں کے مطالعہ کے
ہے، انداز بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہے، اگر اس قسم کی کتابیں میلاد کی مجلسوں میں پڑھی جائیں

سے کام نہین لیا، اگر مختلف حصّون مین مضامین کو شائع کرنا تھا تو ہر جلد ایک موضوع کے مضامین کے لئے مخصوص ہونی چاہئے تھی اور اس جلد مین جیسا کہ مضامین کی فہرست سے ظاہر ہے، علمی مذہبی و تاریخی کئی قسم کے مضامین ہین، اور ان کا انتخاب و ترتیب بھی قابلِ اصلاح ہے، گو اس مجموعہ مین حضرت الاستاذ کے مختصر پیش لفظ کی بھی سند موجود ہے لیکن موصوف کو خود اپنے کامون کی جانب توجہ کرنے کی مہلت نہین ملتی اور جو شخص بھی اُن سے اس قسم کی تحریرین لکھانا چاہتا ہے، اس سے پاس مروّت سے انکار نہین کر سکتے، یہ پیش لفظ بھی اسی قسم کا ہے، اگر مرتب دار المصنفین کے کسی شخص سے مشورہ کر لئے ہوتے، تو یہ مجموعہ اس سے بہتر شکل مین ہوتا، ہم کو امید ہے کہ اگر اس کے بقیہ حصّون کی اشاعت کی نوبت آئے، تو وہ ضرور رفقاے دار المصنفین سے مشورہ کر لین گے، اور ان کی طباعت و کتابت مین بھی اس سے زیادہ اہتمام فرمائین گے تاکہ یہ مجموعے ہر حیثیت سے مضامین کے شایان شان ہون تاہم ان فروگذاشتون کی وجہ سے ان مضامین کی اہمیت و افادیت مین کوئی فرق نہین آیا ہے، اور وہ اصحابِ علم کے مطالعہ کے لائق ہین،

بوستانِ حسرت از جناب مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۳۱ صفحے، کاغذ عمدہ، طباعت نفیس و پاکیزہ، قیمت نہ رپیہ:- کانفرنس بک ڈپو، سلطان جہان منزل علی گڈہ،

ہمارے مخدوم نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ہماری بزمِ دوشین کی وہ آخری شمع ہین جن سے ہماری پرانی باوضع و باوقار تہذیب و شرافت کی محفل روشن ہے، ممدوح کے گوناگون کمالات کے ساتھ ان کا ذوقِ ادب اور ذوقِ سخن بھی نہایت پاکیزہ و ستھرا اور نکھرا ہوا ہے، اور ان کی نثر کی طرح اُن کی نظم بھی رنگینی و لطافت اور حسن و دل آویزی کا مرقع ہوتی ہے، اگر انھون نے تالیف و تصنیف کی طرح شعر و سخن کو مستقل مشغلہ نہین بنایا لیکن ان کا ذوقِ ادب کبھی کبھی اس رنگ مین بھی اپنی بہار دکھاتا تھا، بوستانِ حسرت اسی بہار کا خوش رنگ گلدستہ ہے، ممدوح، مولانا شبلی، خواجہ

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

...ڈاقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت
...ین رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن اُن سے
...، بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ
...، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس
...ن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ
...اعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی
...سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر
...ی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ
...ں تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی
...ن دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم
...رون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت،
...یاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ
...ام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- ۳ر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت :- ۴۱۵ صفحے،

قیمت :- صہ ر

منیجر

تو ان سے بڑا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے،

پیام نو، مرتبہ جناب وفا راشدی تقطیع اوسط، ضخامت ۲۱۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت مجلد عار، پتہ:- محمد تسلیم الدین پروانہ کاکوی، بدتی پریس بانکی پور پٹنہ،

گذشتہ چند برسوں کے اندر اردو شاعری میں قومی و ملی اور سیاسی و انقلابی نظموں کا بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہو اور ایسے بعض مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، پیام نو اسی قبیل کی نظموں کا نیا مجموعہ ہے، اس میں اردو کے ۳۵۔۴۰ شعراء کی منتخب نظمیں ہیں، نظموں کے ساتھ شعراء کے مختصر حالات بھی دیدئیے گئے ہیں، لیکن یہ انتخاب جامع و مانع نہیں ہے، بعض مشہور شعراء کا کلام اس میں نظر نہیں آتا، اور اس کے مقابلہ میں غیر معروف اور مقامی شعراء کو جو کسی حیثیت سے بھی مشاہیر شعراء کے زمرہ میں شمار ہونے کے لائق نہیں ہیں، شامل کر لیا گیا ہے، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب جدید رجحانات شاعری کے نمونوں کا اچھا مجموعہ ہے، اس کے شروع میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مختصر مگر مفید اور دلچسپ مقدمہ ہے،

باب القرآن از جناب افضل العلماء ابو سعود احمد صاحب باقوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت تحریر نہیں، پتہ:- جنرل سپلائنگ ایجنسی میل وشارم مدراس،

یہ رسالہ اس مقصد سے لکھا گیا ہے کہ عربی حروف تہجی اور ان کے اعراب کو اس طرح بچوں کے ذہن نشین کرایا جائے کہ وہ آسانی سے قرآن مجید پڑھ سکیں، چنانچہ مفرد حروف، اعراب، اور ان کی ترکیب کی شکلوں کو الگ الگ مشق کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اور قرآن پاک کے الفاظ فقروں اور آیات کو روانی سے پڑھنے کی مشق کے اسباق دیئے ہیں، رسالہ اپنے مقصد کے لئے مفید ہے،

"م"

رجسٹرڈ نمبر ۱۷۵۱

مارچ ۱۹۵۵ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت چھ روپے سالانہ

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس مین عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز مین پیش کی گئی ہین، ہندوستان کے اسلامی عہد مین جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی مین مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین انسانون کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتین قائم ہوگئین، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہان جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر مین فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والون کے ذریعہ ہندوستان مین اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمائین،

قیمت :- ے

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) **منیجر**

جلد ۶۵ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی ادارون نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدر دانی کی بعض یونیورسٹیون نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب مین داخل کر لیا، اس لئے چند برسون کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافون کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہین، اور بعض زیر طباعت ہین، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۵۵ صفحے قیمت: عہ/

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۹۳ صفحے

قیمت:- عہ/

منیجر

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ/۷۴۹ء سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو صدیون کی سیاسی تاریخ،

قیمت ـعـہ/

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۳۲۲ صفحے

قیمت:- عـہ/

منیجر

ورنہ موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت اور انتقام در انتقام کا سلسلہ اگر قائم رہا تو دونوں ملکوں کے انسانوں کی تباہی اور ہلاکت یقینی ہے جس کا وبال دونوں حکومتوں کے سر ہوگا،

ہندوستان کی حکومت تو لادینی ہے، جو صرف دنیاوی قانون کی حیثیت سے مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اس کو اور کسی مواخذہ کا خوف نہیں لیکن پاکستان تو اسلامی حکومت ہونے کا مدعی ہے اس لئے پاکستان کے غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت اس کا مذہبی فریضہ ہے اور وہ خدا کے سامنے اس کا جوابدہ ہوگا، اس لئے اس پر غیر مسلم محکوموں کی حفاظت کی دہری ذمہ داری ہے اس کے علاوہ غلط یا صحیح ہندوستان کے مسلمانوں کا امن و سکون پاکستان کے ہندوؤں سے وابستہ کر دیا گیا ہے، جو حال ان کا پاکستان میں ہوگا وہی مسلمانوں کا ہندوستان میں ہوگا، اس حیثیت سے پاکستان پر ہندوؤں کی حفاظت کی اور زیادہ ذمہ داری ہے کیا غازیان پاکستان پر شہدائے پاکستان کا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ وہ ان کے تحفظ و اطمینان کے لئے پاکستان کے ہندوؤں کو محفوظ و مطمئن رکھیں، ان کو کیا خبر کہ ان کی ایک غلطی سے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گذر جاتی ہے،

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی   تپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

ان کے ساتھ پاکستان کا سب سے بڑا سلوک و احسان یہی ہے کہ وہاں کے ہندوؤں پر زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ محفوظ و مطمئن رہیں، ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت پاکستان کے بیرومیٹر کی ہے، وہاں کی جو فضا ہوگی اس کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر ضرور ظاہر ہوگا، اسلئے ان کا امن و سکون انہی کے ہاتھ میں ہے، خواہ وہ ان کو زندہ رہنے دیں یا تباہ کرا دیں،

اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ کہنا ہے کہ غیر اللہ کا خوف و ہراس نہ صرف اسلام کی تعلیم اور ایمان کی شان کے خلاف ہے بلکہ دنیاوی حیثیت سے بھی زندہ رہنے کا یہ اصول نہیں، وہ اپنے دل کو مضبوط رکھیں اور ایمان و عمل کی قوت پیدا کریں اسی سے زندگی کی طاقت آتی ہے، اگر وہ حوصلہ و ہمت اور ہوشمندی سے کام لیں تو نہ فرقہ پرست اُن کو ختم کر سکتے ہیں اور نہ حکومت نظر انداز کر سکتی ہے، چار کروڑ کی طاقت معمولی نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خوف و ہراس اور سوء تدبیر سے خود اپنے کو موت کے حوالہ نہ کر دیں، موت سے ڈرنا زندہ رہنے والی قوموں کا شیوہ نہیں، مسلمانوں کا قوم

شذرات

ہندوستان کی غلامی کے زمانہ مین فرقہ پرستی کا سارا الزام انگریزون کے سر منڈھ دیا جاتا تھا، اور یہ کہکر دل کو تسلی دیجاتی تھی کہ یہ آگ انگریزون کی لگائی ہوئی ہے، ان کے بعد خود ٹھنڈی ہو جائیگی، لیکن آزادی ملنے کے بعد اس کے شعلے اور بھڑک اٹھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیون کا بھرا ہوا بخار دفعۃً پھوٹ پڑا ہے جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی جماعت بھی محفوظ نہین، جو لوگ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علمبردار سمجھے جاتے تھے، وہ بھی اس کی لپیٹ مین آگئے تاہم اب بھی دونون ملکون مین کچھ ایسے حق پرست، انصاف پسند اور محبِ انسانیت موجود ہین، جو ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہشمند اور ہندوستان اور پاکستان پر یہان کی اقلیتون کا بھی وطنی حق سمجھتے ہین، اور چاہتے ہین کہ ان پر زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ ان ملکون کی اکثریت کی طرح امن و سکون و خوشحالی کی زندگی بسر کرین لیکن اُن کی تعداد بہت کم اور اُن کی آواز بے اثر ہے، عام ذہنیت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ حکومت کو بھی فرقہ پرستون پر قابو نہین رہ گیا ہے، اور وہ آزادی کے ساتھ اقلیتون کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھڑکاتے رہتے ہین اور حکومت اُن کے خلاف کوئی اقدام نہین کر سکتی،

ہندوستان اور پاکستان کے آئے دن کے اختلافات اور ان کی اقلیتون کی بے اطمینانی اس آگ کو اور مواد دیتی رہتی ہے اس سے فرقہ پرستون کو زہر پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، اور اس کا خمیازہ دونون ملکون کی اقلیتون کو بھگتنا پڑتا ہے، جن کی حیثیت یرغمال کی سی ہو گئی ہے، جہان ہندوستان اور پاکستان مین کوئی نئی پیچیدگی پیدا ہوئی، یا ایک ملک کی اقلیت پر ظلم و زیادتی کی جھوٹی یا سچی خبر آئی کہ دوسرے ملک کی اقلیت کی جان پر بن گئی، اور اس کے امن و سکون کا خاتمہ ہو گیا، انکی زندگی جس بے اطمینانی اور موت و حیات کی کشمکش مین گذر رہی ہے اس کا اندازہ صرف ہندوستان کے مسلمان اور پاکستان کے ہندو ہی کر سکتے ہین اگر یہ صورت قائم رہی تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان دونون کا حشر کیا ہوگا، ان کے بچنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہین ہے کہ پاکستان ہندوون کی اور ہندوستان مسلمانون کی پوری حفاظت اور اپنے عمل سے اُن کو مطمئن کرے

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے زمانہ مین

فنون جنگ

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین

میدان جنگ مین فوجون کی ترتیب

غزنویون کی فوج کی صف آرائی غزنویون کے عہد مین لڑائی کے موقع پر فوجون کی ترتیب مین حسب ذیل صفین ہوتی تھین،

(۱) مقدمہ (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب،

تاریخ یمینی کے مصنف عتبی کا بیان ہے کہ ناردین کی معرکہ آرائی کے موقع پر سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کی ترتیب اس طرح دی،

"سلطان جب اپنی منزل مقصود کے قریب پہونچا تو اس نے اپنے سوارون کو صفون مین مرتب کیا، اور مختلف حصون مین اس طرح تقسیم کیا کہ میمنہ مین اپنے بھائی امیر نصر بن ناصر الدین کو جانباز بہادرون کے ساتھ مقرر کیا، میسرہ مین ارسلان الجاذب کو طاقتور نوجوانون کے ساتھ مامور کیا، اور مقدمہ مین عبد اللہ محمد بن ابراہیم طے تھا جس کے ساتھ غیض و غضب سے

اس پر ایمان ہو کہ موت نہ وقت سے پہلے آسکتی ہے اور نہ وقت مقررہ سے ٹل سکتی ہے، پھر اس سے ڈرنے کے کیا معنی،
مسلمانوں کی تو یہ شان ہونی چاہئے کہ ع چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

زندگی کی کشمکش میں بزدلی اور خوف و ہراس سے موت آتی ہے، اور اس کے بہادرانہ مقابلہ سے زندگی پیدا
ہوتی ہے، اس لئے مسلمانوں کو زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے، انشاء اللہ وہ ایک نہ ایک دن ہندوستان میں
اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکتے ہیں، لیکن اگر بالفرض کوئی ایسا وقت آجائے کہ ان کو مرنے کے لئے مجبور کیا جائے تو بہادری
سے جان دینا بزدلی کی موت سے کہیں بہتر ہے، اور اس صورت میں شہادت کا اجر تو بہرحال کہیں نہیں گیا ہے،

افسوس ہے کہ ہماری پرانی علمی و ادبی بزم کی ایک اور شمع گل ہوگئی، گذشتہ ماہ فروری میں سر شیخ
عبدالقادر مرحوم نے چھہتر سال کی عمر میں انتقال کیا، مرحوم کی ذات گوناگوں اوصاف کی جامع تھی، وہ اردو
زبان کے مشہور ادیب اور اس کے پرانے محسن اور خدمت گذار تھے، ان کا مشہور رسالہ مخزن اپنے زمانہ کا اردو کا
سب سے زیادہ ممتاز اور مقبول رسالہ تھا، اردو میں سنجیدہ نگاری اور اچھے اصحاب قلم پیدا کرنے میں اس کا بڑا حصہ
تھا، مرحوم کا ادبی ذوق ہر زمانہ میں قائم رہا، اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے برابر اردو کی خدمت کرتے رہے، مخزن
کے جدید دور میں بھی وہ اس کے سرپرست تھے، پاکستان کے قیام سے پہلے تک وہ دارالمصنفین کے رکن تھے، ان علمی
و ادبی کمالات کے ساتھ ان کو بڑے سے بڑے دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوئے، اور وہ مختلف اوقات میں ہائی کورٹ
کی ججی، وزارت تعلیم، مرکزی پبلک سروس کمیشن کی رکنیت، انڈیا کونسل کی ممبری وغیرہ جیسے مناصب جلیلہ پر فائز
رہے، لیکن ان کی وضعداری میں کبھی فرق نہیں آیا، وہ نئی تعلیم کے ساتھ پرانی تہذیب و شرافت کا نمونہ، اور
ہر طبقہ و ہر فرقہ میں مقبول اور سب کے ساتھ ان کے یکساں تعلقات تھے، اب ایسی شخصیتیں مشکل ہی سے پیدا
ہونگی، ایسی یادگاریں خواہ ہندوستان کی ہوں یا پاکستان کی کم از کم ایک دو نسلوں تک دونوں کی مشترک
ملک ہیں، اور ان کی موت دونوں کا نقصان ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے،

سلاطینِ دہلی کی فوجوں کی صف بندی

غلاموں، خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ میں لڑائی کے موقع پر فوجوں کی صفوں کے لئے حسبِ ذیل اصطلاحات استعمال ہوئیں،

(۱) طلایہ[1]، مقدمۂ پیش[2]، یزک[3]، یہ تینوں اصطلاحات فوج کے اس دستہ کے لئے استعمال ہوتی تھیں، جو لشکر سے بہت آگے دشمنوں کی مختلف خبریں پہنچانے پر گویا مامور ہوتا تھا، یہ کبھی کبھی غنیم سے ہلکی جھڑپ بھی کر لیتا تھا،

(۲) مقدمہ یعنی اگلی صف اس کے کبھی کبھی دو بازو کر دیئے جاتے تھے، جو جناح[4] کہلاتا تھا،

(۳) میسرہ، اس کے دونوں جانب کے حصہ کو دست راست میسرہ، دست چپ میسرہ کہتے تھے،

(۴) میمنہ، اس کے دونوں بازو دست راست میمنہ و دست چپ میمنہ کہلاتے تھے،

(۵) قلب، اس کے دائیں بائیں حصہ کو دست راست قلب اور دست چپ قلب کہتے تھے۔

(۶) سقہ یا خلف،

ہر حصہ کی نگرانی علیحدہ علیحدہ عہدیداروں کے ذمہ ہوتی تھی، اگلی صف کا نگران مقدم یا سرلشکر مقدمہ کہلاتا تھا[5] میمنہ اور میسرہ کے نگران علی الترتیب سرفوج میمنہ یا سرفوج میسرہ کے لقب سے ملقب ہوتے تھے[6] قلب میں بادشاہ یا اس کا قائم مقام عہدیدار ہوتا تھا، بادشاہ کے اردگرد علما، ائمہ، اطبا

---

[1] و [2] طبقات ناصری ص ۱۲۲ [3] ایضاً ص ۲۳۱ [4] برنی ص ۲۰۹، فتوح السلاطین ص ۲۲، دص، ۵۴ وغیرہ [5] جناح کی اصطلاح بالکل واضح نہیں ہوتی میرا ذاتی خیال ہے کہ اگلی صف کے بازوؤں ہی کے لئے یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہے، جناح کے لفظی معنی بازو کے ہیں لیکن اس سے میمنہ یا میسرہ ہرگز مراد نہیں، فتوح السلاطین میں ہے،

چو قلب جناح و یسار و یمین ... دو سو شد مرتب دران دشت کین

[6] فتوح السلاطین ص ۲۵۰ و برنی ص ۹۰ [7] برنی ص ۲۶۰،

بھرے ہوئے عرب سوار تھے، قلب مین التون تاش شاہی حاجب تھا، اس کے ہمراہ شاہی غلامون کی ایک بڑی تعداد پہاڑ بن کر کھڑی تھی[۵۱]،

مقدمہ فوج کی اگلی صف، میمنہ دائین صف، میسرہ بائین صف، اور قلب مرکز کو کہتے تھے، کچھ فوجین عقب مین بھی رہتی ہون گی، مگر غزنوی دور مین ان ۔۔۔۔ کے لئے کون سی اصطلاح استعمال کیجاتی تھی معلوم نہین ہو سکی،

غوریون کے لشکر کی صف آرائی | یہی ترتیب غوریون کے زمانہ مین بھی رہی، ترائین کی جنگ مین معز الدین محمد بن سام المعروف بہ شہاب الدین غوری نے جب صفون کی ترتیب دی تھی، اس کے لئے منہاج سراج نے ذیل اصطلاحات استعمال کی ہین،

(۱) قدام لشکر (۲) میمنہ (۳) میسرہ (۴) قلب (۵) خلف،

اس جنگ مین فوجون کی صف آرائی کا ذکر منہاج سراج نے ان الفاظ مین کیا ہے:

"در حدود ترائین لشکر گاہ کردہ سلطان تعبیہ لشکر بساخت و قلب و بنہ و رایات و علامات و چیز و پیلان در عقب بقدر چند کروہ بگذاشت صف راست کردہ آہستہ می آمد و سوار برہنہ و جریدہ را چہار فوج فرمودہ بود از طرف کفار نامزد کرد، و فرمان داد، می باید کہ از چہار طرف میمنہ و میسرہ و خلف و قدام لشکر بہر طرف دہ ہزار سوار تیرانداز دست بر لشکر کفار می دارند و چون پیلان و سوار و پیادہ ملاعین حملہ می کنند شما پشت می دہید و تنگ اسپ پیش ایشان دور می شوید لشکر اسلامیان ہمبران منوال کفار را عاجز کردند حق تعالیٰ اسلام را نصرت بخشید[۵۲]"

---

[۵۱] ایلیٹ جلد دوم ص ۸۰ تاریخ یمینی کا فارسی نسخہ پیش نظر نہین ہے، اس لئے ایلیٹ کی انگریزی عبارت سے میمنہ میسرہ اور قلب کی اصطلاح قیاساً لی گئی ہے [۵۲] طبقات ناصری ص ۱۲۰، نیز دیکھو مبارک شاہی ص ۱۰،

کو یہ حکم سُنایا،

کس از سرفرازان نجنبد ز جائے مگر ہم بہ فرمان فرمان روائے
دگر خود کسے بگذرد زین سخن سر خود نہ بیند بہ پہلوے تن[۵۱]

صفون کی ترتیب مین پیادون، سوارون اور ہاتھیون کے تقدم و تاخر مین کسی یکسان ضابطہ کی پابندی نہین ہوتی تھی، مصالح اور مواقع کی بنا پر کبھی پیادے کبھی سوار اور کبھی ہاتھی آگے رکھے جاتے، پیادے اگر آگے ہوتے تو پہلی قطار مین برگستوان، جوشن اور سپر والے تیر انداز رکھے جاتے، دوسری قطار مین زرہ پوش، نیزہ باز اور تیغ انداز سپر کے ساتھ ہوتے، تیسری قطار مین تیر اور گرز بردارون کی جماعت ہوتی، چوتھی قطار، سیف شمشیر اور گرز والون پر مشتمل ہوتی، تمام قطارون کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دیجاتی کہ عقب کے سوار اور دوسرے لشکری سامنے لڑائی کے نشیب و فراز کو دیکھ سکتے تھے، یا ضرورت کے وقت ان جگہون سے ہوکر آگے مدد کے لئے بڑھ سکتے تھے، یا آگے بڑھ کر اپنی مقررہ جگہ پر واپس آسکتے تھے[۵۲]

سوار اگر آگے ہوتے، تو زرہ، خود، جوشن، دستوانہ، اور برگستوان مین ملبوس، تیر کمان، تیغ، نیزہ اور تبر سے لڑتے،

ہاتھی کبھی آگے ہوتے، تو اُن کے پیچھے سوار ہوتے، غیاث الدین تغلق اور خسرو خان کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو اول الذکر کی فوج کی صف آرائی کا حال لکھتے ہین،

صف پیلان چو صف ابر آذار ہر ابرے، برق حملہ، باد رفتار
نمودہ ہر پیل چون کوہے باشکوہ بر و برگستوان چون ابر بر کوہ
بہ پشت پیل ترکان تیر درشت چو کوہے کو بہ پشت کوہ نشست
پس پیلان سواران صف کشیدہ بجوشن از پشت ماہی تف کشیدہ[۵۳]

---

۵۱ فتوح السلاطین ص ۲۵۰ ۵۲ آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۶ء ۵۳ تغلق نامہ ص ۹۳-۹۲،

منجنیق اور ان کے بعد تیر انداز پرے جمائے کھڑے رہتے تھے[۱]، شاہی علم، طبل، بوق، دمامے، نفیری، ارغون سرنا وغیرہ بادشاہ کے سامنے ہوتے[۲]، بادشاہ جنگ مین شریک نہ ہوتا، تو ساری فوج سرلشکر[۳] کے ماتحت ہوتی، جو یا تو وزیر اعظم یا کوئی بہت ہی اعلیٰ رکن سلطنت ہوتا،

مقدم، سر فوج میسرہ اور سر فوج میمنہ کوئی معزز خان ہوتا تھا، اس کے ماتحت ملک، ملک کے ماتحت امیر، امیر کے ماتحت سپہ سالار، اور سپہ سالار کے ماتحت سرخیل ہوتے تھے، ایک ملک زیادہ سے زیادہ دس ہزار سوار، ایک امیر، ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار، ایک سو سوار، اور ایک سرخیل یا ایک عارف دس سوارون کی نگرانی کرتا تھا[۴]، قلب مین خاصہ خیل یعنی بادشاہ کے خاص سوارون کی نگرانی سر جاندار کرتے تھے، اور وہ قلب کے دونون بازوؤن پر ہوتے تھے، اس لئے سر جاندار میمنہ اور سر جاندار میسرہ کہلاتے تھے[۵]، لشکر مین شاہی غلام ہوتے تو وہ امیر غلامان میمنہ و میسرہ کے ماتحت ہوتے تھے[۶]،

اس عہد کے پیادون کے نگران کیلئے اصطلاحات معلوم نہ ہوسکین، سہم الحشم و نائب سہم الحشم و شحنہ حشم فوج کے بعض عہدے تھے[۷]، حشم سے مراد اگر پیادے ہون تو شاید یہ عہدے پیادہ فوج ہی سے متعلق ہونگے،

ہر حصہ مین گھوڑون کی نگہبانی کے لئے ایک اخور بک، ہاتھیون کے لئے ایک شحنہ پیل، اونٹون کے لئے ایک شحنہ نفر، ہتھیارون کے لئے ایک سر سلاحدار ہوتا تھا، ایک چاؤش بھی متعین رہتا تھا، جو اس کی نگرانی کرتا کہ ہر شکری اپنی اپنی جگہ پر موجود ہے، ایک نقیب احکام سنانے کے لئے مامور ہوتا تھا[۸]،

ضوابط اور احکام کی خلاف ورزی یا صفون مین بے ترتیبی پیدا کرنے کے سلسلہ مین سخت سے سخت سزا مقرر تھی، علاؤ الدین خلجی کی فوج کیلی مین مغلون کے مقابلہ مین صف آرا ہوئی، تو اس نے اپنی فوج

---

[۱] صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف نمبر ۹ جلد ۲۶، [۲] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء [۳] برنی ص ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۸۴، علاء الدین کے عہد مین سرلشکر ملک نائب کافور تھا، [۴] برنی ص ۴۵، [۵] مبارک شاہی ص ۶۲ [۶] برنی ص ۳۰ [۷] مبارک شاہی ص ۹۳ و برنی ص ۴۳۰ [۸] برنی ص ۱۳۰،

شاہی حرم کی بیگمات ہوتین، اُن ہی کے ساتھ شاہی خزانے، اسلحہ خانے، آبدار خانے، باورچی خانے وغیرہ ہوتے، دوسری قطار مین فاضل گھوڑے، اونٹ اور مویشی، قیدی اور زخمی سپاہی رکھے جاتے، پھر تیسری قطار مین فوج کا ایک دستہ ہوتا تھا، جو عقب سے دشمنون کے حملہ کی مدافعت کے لئے تیار رہتا تھا،[۱] خلف قلب سے چند کروہ پر واقع ہوتا،[۲]

ان مختلف صفون کے علاوہ کمین گاہون[۳] مین بھی فوجین پوشیدہ رکھی جاتی تھین، یہ دشمنون پر اچانک حملہ کرتی تھین، کوئی صف کمزور دکھائی دیتی تھی، تو اسکی مدد کو بھی پہنچتی تھین

تیموری فوجون کی صف آرائی | امیر تیمور نے اپنے لشکر کی صف آرائی کے لئے خاص خاص قوانین وضوابط مرتب کئے تھے، اگر اس کی فوج بارہ ہزار سوار پر مشتمل ہوتی، تو اس کی صف آرائی حسب ذیل طریقہ پر ہوتی،

(۱) قراول

(۲) ہراول

(۳) جرانغار، اس کے تین حصے ہوتے، ہراول جرانغار، چپاول جرانغار، سقاول جرانغار،

(۴) برانغار، اس کے بھی تین حصہ ہوتے، ہراول برانغار، چپاول برانغار، سقاول برانغار،

(۵) قول

اور اگر فوج کی تعداد بارہ ہزار سے چالیس ہزار یا اس سے زیادہ ہوتی، تو اس کی صف آرائی کا نقشہ یہ ہوتا،

(۱) قراول، قراولِ دست راست، قراولِ دست چپ،

---

[۱] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء [۲] طبقات ناصری ص ۱۲۲ [۳] فتوح السلاطین ص ۲۵ علاء الدین خلجی کیلی مین مغلون کے خلاف صف آرا ہوا تو اس کی ہر صف کے پیچھے کمین گاہ تھی،

بہ پشتی ہر صف کرانے دلیر ... کمین کردہ چون دررہِ صید شیر

کبھی ہاتھی ہر صف کے آگے ہوتے، علاؤ الدین خلجی مغلون کے خلاف کیلی مین جنگ کر رہا تھا، تو فتوح السلاطین کے مؤلف کا بیان ہے کہ

بہر فوج دو بستگاں پیل مست ۔۔۔ یقین کردہ آن خسرو چیرہ دست
ازان تندہ پیلان شیرزہ شکار ۔۔۔ کہ کس بزکوہد درین کارزار
بفرمود پس شاہ والا تبار ۔۔۔ شدہ پیش ہر صف یکے کوہسار
کس از سرفرازان بجنبید زجائے ۔۔۔ مگر ہم بہ فرمان فرمانروائے[51]

مگر ہاتھی عموماً بادشاہ کیساتھ قلب مین ہوتا، صبح الاعشیٰ کا مصنف محمد تغلق کی لشکری ترتیب کے سلسلہ مین رقمطراز ہے،

"سلطان خود قلب مین ہوتا، ...... اس کے سامنے ہاتھیون کا جھنڈ ہوتا ہے، ہاتھیون پر برجون سے ڈھکے ہوئے آہنی ہودج رکھے جاتے ہین، جن پر تیرانداز سوار رہتے ہین، اور پھر ان ہی برجون کی ہر سمت مین سوراخ بنے ہوتے ہین جن سے تاک تاک کر نشانے لگائے جاتے ہین، اور ان ہی ہودجون مین روغن نفط ہوتا ہے، جو شیشہ کی نلکیون سے دشمنون پر اچھالا جاتا ہے جس سے شعلے پیدا ہوتے ہین"[52]

محمود تغلق امیر تیمور کے خلاف معرکہ آرا ہوا تو اس کی فوج کے قلب ہی مین ہاتھی تھے[53] ابراہیم لودی پانی پت کی جنگ مین صف آرا ہوا تو قلب ہی مین اُس نے ہاتھی رکھے تھے،

قلب کے پیچھے آخری صف یعنی سقہ یا خلف ہوتی، اس کی بھی کئی قطارین ہوتی تھین، پہلی قطار مین

---

۵۱ فتوح السلاطین ص ۲۰۵ نیز دیکھو برنی ص ۳۰۱ سیری کی جنگ مین بھی علاء الدین کی فوج کے ہر حصہ مین ہاتھی تھے، برنی کا بیان ہے
"در ہر فوجی و تنگی پیجگان پیل برگستوانہا کردہ ایستادانیدند"

۵۲ صبح الاعشیٰ بحوالہ معارف جلد ۲۶ نمبر ۹ ۔ ۵۳ ظفرنامہ جلد دوم ص ۱۰۶،

دستہ تھا، جو پلٹ کر غنیم کے عقب پر تیزدن سے حملہ کرتا تھا، اس کو تولقمہ اوج جرانغار کہا جاتا تھا،
جرانغار کے ساتھ ایک فوج محفوظ بھی تھی، جو طرح جرانغار کہلاتی تھی،

(۴) جرانغار، جرانغار کے ساتھ بھی تولقمہ اوج برانغار اور طرح برانغار تھی،

(۵) قول یا غول یعنی مرکز، اس کے دو حصے تھے، دستِ راست قول، دستِ چپ قول،

(۶) طرح قول یعنی فوج محفوظ قول کے پیچھے صف آرا تھی،

سیکری کی جنگ میں بابر کی فوج کے جرانغار اور برانغار میں دائین اور بائین بازو بھی تھے جن کے لئے یمین جرانغار، یسار جرانغار، یمین برانغار اور یسار جرانغار کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہین[1]

بابر کے جانشینون کی فوجون کی صف آرائی

تیموریون کی سلطنت ہندوستان مین باضابطہ قائم ہوئی تو مختلف لڑائیون کے موقع پر صفون اور ان کی اصطلاحات مین تھوڑی تھوڑی ترمیم ہوتی رہی،

(۱) قراول جو کبھی مقدمۃ الجیش[2] کبھی منقلا[3] اور کبھی طلیعہ[4] یا طلایہ کہلاتا تھا،

(۲) ہراول، اس کے کبھی کبھی دو بازو، راست ہراول اور چپ ہراول ہو جاتے، بدایونی نے جوزۂ ہراول[5] کی ایک اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کی تشریح خود اس طرح کی ہے،

"وچند نفر چیدہ و برگزیدہ ہمراہی سید ہاشم بارہہ پیشتر از ہراول نامزد شدند کہ آنرا جوزۂ ہراول می نامیدند"

مگر یہ اصطلاح کسی اور مورخ نے استعمال نہین کی ہے، ہراول کی فوج محفوظ کو التمش[6] کہتے تھے

---

[1] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۱۲، ۲۱۳، دیا بر نامہ انگریزی جلد دوم ص ۶۷۰، ۶۷۵ [2] بادشاہ نامہ جلد دوم ص [illegible] [3] اکبر نامہ جلد دوم ص ۲۳، ۲۲۳، بدایونی جلد دوم ص ۱۵ تزک جہانگیری ص ۴۹۳، ۲۳۳، بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری ص ۱۴۲، ۲۱۳ وغیرہ وغیرہ [4] اکبر نامہ جلد دوم ص ۳۶، جلد سوم ص ۵۰۶، عمل صالح جلد اول ص ۲۰۴، منتخب اللباب ص ۵۸۹ [5] بدایونی جلد دوم ص ۲۳۱ [6] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۸۳، ۲۳۲، ۴۲۵،

(۲) ہراول بزرگ، ہراولِ ہراول

(۳) جرانغار، ہراولِ جرانغار، شقاول، ہراولِ شقاول،

(۴) برانغار، ہراولِ برانغار، چپاول، ہراولِ چپاول،

(۵) قول دستِ راست قول، دستِ چپ قول،

(۶) عقب،

قراول یعنی فوج کے آگے آگے رہنے والا دستہ، ہراول کے راست وچپ غنیم کے لشکر کی دیدبانی کے لئے ہوتا، ہراول بزرگ کے آگے بھی ایک ہراول ہوتا جس مین فوج کا صرف ایک دستہ ہوتا، ہراول ہراول کے پیچھے ہراول بزرگ کی فوج چھ دستون مین منقسم ہوتی، اسی طرح جرانغار مین چھ دستے ہوتے، ہراول جرانغار مین صرف ایک دستہ، شقاول مین چھ اور ہراول شقاول مین صرف ایک دستہ ہوتا، ہرانغار، ہراول برانغار، چپاول اور ہراول چپاول کی یہی ترتیب ہوتی، قول کی پہلی صف چھ دستون مین تقسیم ہوتی، اس کے عقب مین اٹھائیس دستے کھڑے رہتے، قول کے دست راست پر امیر تیمور کے "فرزندان و نبیرگان" اور دستِ چپ پر "خویشاوندان اور قرابتان" کی جماعت ہوتی، ان کی فوج طرح یعنی فوج محفوظہ کہلاتی، جو بوقت ضرورت مختلف حصون مین مدد کے لئے پہونچی، [۱]

بابر کی فوجون کی ترتیب | صف آرائی کی یہ اصطلاحین بدلتی رہین، پانی پت کی جنگ مین خود بابر کے بیان کے مطابق حسب ذیل صفین تھین،

(۱) قراول

(۲) ہراول، اس کے ساتھ فوج محفوظہ کی صف طرح ہراول کہلاتی تھی،

(۳) برانغار، برانغار کے اوج یعنی اس کی داہنی طرف بالکل کنارے پر فوج کا ایک ایسا

---

[۱] تزوک تیموری صفحہ ۲۱، ۱۹۰،

کے بھی ذمہ کی جاتی تھی[۵۱]، کبھی بادشاہ دارالسلطنت سے فوجون کی صفون کو ترتیب دیکران کو روانہ کرتا، فوجین اسی ترتیب کے ساتھ میدانِ جنگ مین کھڑی ہوتین[۵۲]، اہم لڑائیون مین بادشاہ یا سپہ سالار فوجون کی صف آرائی بہ نفس نفیس خود کرتے، جانشینی[۵۳] کی جنگ کے موقع پر شہزادے خود ہی صفون کو ترتیب دیتے[۵۴] ہر صف کا نگران ایک سردار یا سالار[۵۵] ہوتا تھا، پھر ہر صف کے لشکری مختلف حصون مین منقسم کئے جاتے تھے، یہ حصے قشون[۵۶] (قوشون) یا تومان[۵۷] (تومن) یا کبھی چوکی اور کبھی توپ کہلاتے[۵۸] تھے، ہر قشون کا محافظ ایک علحدہ عہدیدار ہوتا تھا، بابر کی فوج مین ان عہدون کی نگرانی کسی سلطان، یا بیگ یا امیر کے ذمہ ہوتی تھی[۵۹]، اکبری دور مین جب منصبداری نظام قائم ہوا، تو پھر فوجون کے قشون اور تومان کی نگرانی کوئی معزز منصبدار کرتا تھا، دہ ہزاری منصبدار کی رہنمائی مین نو ہزاری سے یکہزاری

---

۵۱ عالمگیر نامہ جلد اوّل ص ۵۴۲ ۵۲ عمل صالح جلد اوّل ص ۲۶۰، جلد دوم ص ۲۶۴ بادشاہ نامہ جلد اوّل ص ۴۰۵ جلد دوم ص ۴۰۲ ۵۳ مثال کے لئے دیکھو دارا اورنگ زیب کی جنگ عالمگیر نامہ ص ۹۵ و ۹۰، منتخب اللباب جلد دوم ص ۲۶-۲۰، منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۰۰ ۵۴ اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ میدانِ جنگ مین شہزادون اور سپہ سالارون کے ساتھ غیر ضروری لوگ نہ ہون، کیونکہ باجوم توابع و پیش آمدن آنہا از فوج انتظام و نسق فوج را مجال نمی گذارد، (رقعات عالمگیر ص ۴۷۳ (معارف پریس) ۵۵ تزک تیموری ص ۲۰۳، جنگ کے موقع پر مختلف سردارون اور سالارون کے نام کے لئے دیکھو اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۴۲، عمل صالح جلد اول ص ۳۶۶ جلد دوم ص ۴۶ ص ۳۶۴، بادشاہ نامہ جلد اول ص ۴۰۵، جلد دوم ص ۴۸۲، منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۰۰ وغیرہ وغیرہ ۵۶ تزک تیموری ص ۲۰۳، الیٹ جلد سوم ص ۴۳۲، اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۲، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۳۴ وص ۶۷، سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۳ ۵۷ تزک تیموری ص ۲۰۳، الیٹ جلد سوم ص ۴۰۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۶۲ ۵۸ اکبر نامہ جلد سوم مین ہے بخشیان را فرمان شد کہ غیر ضروری سپاہ را چوکی بہ چوکی بشایستگی بگذرانند، اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۵۲، خانخانان لشکر منصور را چہار توپ گردانید ۵۹ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۶۶-۴۶۵ و ۱۳-۴۱۲، تیمور کی فوج کی سرداری ایک امیر ہی کرتا تھا، اسکی دو قسمین تھین، امیر باتمغا، اور امیر بے تمغا (تزک تیموری ص ۲۰۳)

(۳) جرانغار اسکو کبھی دست چپ کبھی یسرہ کبھی صرف یسار کہا جاتا تھا، اس کے دائین بائین بازو بھی ہوتے تھے، جو دست راست جرانغار اور دست چپ جرانغار کہلاتے تھے، جرانغار کے ساتھ تولقمہ یا طلقمہ[۵۰] اور طرح[۵۱] بھی ہوتا تھا،

(۴) برانغار جس کے لئے کبھی دست راست کبھی میمنہ اور کبھی صرف یمین کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی، اس کے بھی دست راست برانغار اور دست چپ برانغار ہوتے تھے، اس کے ساتھ بھی تولقمہ یا طلقمہ اور طرح ہوتا تھا،

(۵) قول یا غول یا قلب، اس کا بایان بازو دست چپ قول اور دایان بازو دست راست قول (یا میسرہ قول یا میمنۂ قول[۵۲]) کہلاتا تھا، ان دونون بازوؤن کے پیچھے کچھ فوجین محفوظ رکھی جاتی تھین، جو طرح دست راست اور طرح دست چپ کہلاتی تھین[۵۳]،

(۶) چنداول جس کو کبھی چنداول یا ساقہ بھی کہتے تھے، یہ فوج کی پچھلی صف ہوتی تھی، جو فوجی سامان شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی محافظت کے لئے متعین ہوتی تھی،

صفون کو ترتیب دینے کا ذمہ دار بخشی الممالک ہوتا تھا، جنگ سے ایک روز پہلے وہ بادشاہ یا شہزادہ یا جنگ کے حاکم اعلیٰ کے سامنے فوجون کی تعداد اور مختلف فوجی سردارون کی متعینہ جگہون کا نقشہ پیش کرتا تھا[۵۴] اسی نقشہ کے بموجب وہ میدانِ جنگ مین مختلف عہدہ دارون کو مختلف صفون مین متعین کرتا تھا، لڑائی مین کوئی سردار جنگی خطا کرتا تو اس کی جگہ پر دوسرے کو متعین کرتا بخشی الممالک کے ماتحت نائب بخشی بھی ان کامون مین ان کی مدد کرتے تھے، کبھی صف آرائی کی خدمت امیر اور ترک

---

۵۰ اکبرنامہ جلد سوم ص ۲۴۴، ۱۵، ۵۱ لب التواریخ ازخافی خان حصہ دوم ص ۲۰۰ ۵۲ عمل صالح جلد دوم ص ۲۰۰ ۵۳ عالمگیرنامہ ص ۶۵، و ص ۹۰ ۵۴ بادشاہ نامہ ازعبد الحمید لاہوری جلد اول ص ۴۰۶ و ۳۱۴ اکبرنامہ جلد سوم ص ۱۹۴ و ص ۳۴۴ ۵۵ تزک تیموری ص ۱۹۲-۱۹۱ ۵۶ بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۲ مین جنگ کے موقع پر نظام الدین علی خلیفہ میر بخشی کی صف آرائی، بابرنامہ انگریزی جلد دوم ص ۵۶۸، ۵۷۲،

منسلک کر دیا جاتا تھا کہ دشمن یلغار اور یورش کر کے گھسنے نہ پاتے تھے[۵۱]، کبھی غنیم کی یورش کو روکنے کے لئے توپچیوں کی صف کے آگے عمیق خندقیں بھی کھودی جاتی تھیں[۵۲]، اور اسکے بعد اونٹوں اور اونٹوں کے بعد ہاتھیوں کی قطار رہتی[۵۳]، اونٹوں پر سے شتر نال اور زنبورک اور ہاتھیوں پر[۵۴] ہتنال اور گجنال چھوڑی جاتی، ہاتھیوں کے بعد برق انداز سوار ہوتے[۵۵]،

دیگ انداز، توپچی، برق انداز، تفنگچی، رعد انداز، اور برق انداز کی کثرت زیادہ تر ہراول، اور اس کے دونوں بازوؤں پر ہوتی، مگر جرانغار، برانغار، اور قول کی اگلی قطاریں بھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھیں[۵۶]، اسی طرح کبھی کبھی ہر صف میں ہاتھی بھی ہوتے تھے[۵۷]، ہتنال اور گجنال کی

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۶) در پناہ ارابہ و توبرہ بفراغت تفنگ توانند انداخت"

منتخب التواریخ میں یہ عبارت اور بھی واضح طریقہ پر لکھی گئی ہے:-

"درمیان ہر دہ عرابہ شش ہفت توبرۂ پر خاک تعبیہ نمودند تا در معرکہ تفنگ اندازان در پناہ عرابہ و توبرۂ پر خاک بفراغت توانند انداخت"

توبرہ کی وضاحت منتخب التواریخ کی توضیح سے ہو جاتی ہے، اس لئے ہم بدایونی ہی کو قابلِ قبول سمجھ کر توبرۂ پر خاک" کو استعمال کرتے ہیں [۵۱] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۳، انگریزی ترجمہ ص ۴۶۳، ۵، اکبر نامہ جلد اول ص ۰۰، نیز دیکھو اورنگ زیب اور دارا کی جنگ سموگڈہ کی تفصیل خافی خان جلد دوم ص ۲۱، ۲۰، ۰، کرنال کی جنگ میں توپوں کی زنجیر بندی کیلئے دیکھو سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۲ [۵۲] ملاحظہ ہو، سلطان بہادر شاہ اور ہمایوں کی جنگ طبقات اکبری جلد دوم ص ۳۳، اکبر نامہ جلد دوم ص ۴۰ و [۵۳] ص ۱۳۔ [۵۳] دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی [۵۴] عمل صالح جلد دوم ص ۵۹۵، ۳ [۵۵] دیکھو بابر اور رانا سانگا کی جنگ کی تفصیل بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۱، ۲۱۷، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۹، عمل صالح جلد دوم ص ۳۶۵، بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۴۵، نیز دیکھو منتخب اللباب حصہ دوم میں جاجو کی جنگ کی تفصیل ص ۵۰۰، ۵۰۹، [۵۶] سلطان مظفر گجراتی سے اکبر کی فوجیں معرکہ آرا ہوئیں، توابع اشتعل کا بیان ہے، فیلانِ کوہ پیکر یاد رفتار در ہر فوج شکوہ دیگر بخشید (اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۸، نیز دیکھو اوڑیسہ کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۰۳، ص ۱۳، ۱۲، ۶، کابل کی جنگ اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۶۵))

منصبدار تک ہوتے تھے، اسی طرح ہشت ہزاری کے ماتحت ہشت صدی تک، ہفت ہزاری کے ماتحت ہفت صدی تک پنج ہزاری کے ماتحت پنج صدی تک اور پنج صدی کے ماتحت یک صدی تک مقرر کئے جاتے تھے،[۵۱] جنگ مین بادشاہ یا شہزادہ شرکت کرتا، تو سارے منصبدار اس کے ماتحت ہوتے، بادشاہ یا شہزادہ نہ ہوتا، تو سارے سردار یا سالار سپہ سالار[۵۲] کی نگرانی مین ہوتے تھے، مختلف لشکریون کا سردار عموماً ان ہی کی قوم کا کوئی منصبدار ہوتا تھا، مثلاً راجپوتون کی چوکی ایک راجپوت منصبدار، افغانون کا تومان ایک افغانی منصبدار، مغلون کا قشون ایک مغل منصبدار کے ماتحت ہوتا، توپچی، برق انداز، تفنگچی، اور دیگ انداز وغیرہ ایک ایسے منصبدار کی نگرانی مین رہتے جو میر آتش کہلاتا تھا،

صف آرائی مین تفنگچی، برق انداز، سوار، ہاتھی، اور پیادے کے تقدم و تاخر مین کسی یکسان ضابطہ کا تحریر کرنا مشکل ہے، مگر بڑی بڑی لڑائیون کے موقع پر عام طور پر ہراول کی پہلی قطار[۵۳] مین توپچی، برق انداز، گولہ انداز اور دیگ انداز ہوتے تھے، توپین کبھی بڑے بڑے چھکڑون اور ارابہائے پر رکھی جاتین، ان مین سے دو دو چھکڑے زنجیر اور چمڑے سے متصل کر دیئے جاتے، اور دونون کے درمیان اتنی جگہ چھوڑ دی جاتی کہ سیکڑون چھ سات مٹی سے بھرے ہوئے تو بڑے رکھے جا سکتے تھے، تفنگچی ان چھکڑون اور تو بڑون کے عقب مین پناہ لے کر تفنگ اندازی کرتے تھے،[۵۴] کبھی توپون کو آہنی زنجیرون سے ا

---

[۵۱] آئین اکبری ص ۱۲۰، آئین درسیا و آبادی [۵۲] تیمور کی فوج کا اعلیٰ ترین عہدیدار امیر الامرا کہلاتا تھا، (تزک تیموری ص ۱۰۰-۹۱) [۵۳] تیمور کی فوج کے ہراول مین اوتچیان، شمشیر داران و نیزہ داران و بہادران آزمودہ کار ہوتے، (تزک ص ۱۹۵) [۵۴] دیکھو بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۴، طبقات اکبری جلد دوم ص ۱۳، منتخب التواریخ جلد اول ص ۳۴۳، لفظ "توبرہ" اس کے معنی مین اختلاف ہے، اکبر نامہ جلد اول ص ۹۵ مین توبرہ کے بجائے تورہ ہے، بابر نامہ کے اردو ترجمہ مین اس کے معنی "جالی" لکھے گئے ہین اس سلسلہ مین طبقات اکبری کی عبارت یہ ہے:

"درمیان ہر دو ارابہ شش ہفت توبرہ تعبیہ نمایند تا تفنگ اندازان بمد زمعرکہ

مختلف صفوں میں تواچی، یساول، یا سزاول پہنچاتے، یہی یساول اور سزاول اس کی نگرانی بھی کرتے کہ ہر لشکری اپنی جگہ پر ہو، احکام کی پابندی سختی سے عمل میں آتی، عدول حکمی کی سزا موت تھی۔

چنداول قلب کے پیچھے ہوتا، اس کی فوجیں عقب سے غنیم کی یورش روکنے کے لئے مستعد رہتیں، شاہی حرم کی بیگمات اور فوجی کیمپ کی نگہبانی بھی کرتیں، کچھ فوجیں کمین گاہوں میں بھی پوشیدہ ہوتیں،

صفوں کو ترتیب دیتے وقت مختلف صفوں کے درمیان اور پھر ہر صف میں جا بجا ایسا خلا اور گذرگاہ چھوڑی جاتی تھی کہ عقب کے لشکر کے سامنے کی چیزیں دیکھی جاسکیں، اور ضرورت کے وقت مختلف گذرگاہوں سے سواروں کے گھوڑے آسانی سے گذر سکیں، ایک صف سے دوسری صف کا فاصلہ کبھی نصف کوس اور کبھی تیر پرتاب کا ہوتا،

ہر صف کے گھوڑوں کی نگہبانی کے لئے ایک اخور بیگ، ہاتھی کے لئے ایک شحنہ پیل، آتشیں اسلحہ کے لئے ایک میر آتش، اور عام اسلحہ کے لئے داروغہ قور خانہ یا قور بیگی ہوتا، قور بیگی کے ہاتھ میں شاہی علم بھی ہوتا،

(باقی)

لہ ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۳۲، بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵، اکبر نامہ جلد اول ص ۱۰۷، جلد سوم ص ۲۳ لہ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵، عالمگیر نامہ جلد اول ص ۸۵ لہ منتخب اللباب ص ۵۹ اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۳، وص ۱۲۲، تزک جہانگیری ص ۲۵۳ لہ تزک تیموری میں ہے:-

"وام نمودم کہ بامیر ہر فوج کہ فرمان یرلیغ فرستم مطابق حکم یرلیغ نمایند، وازان تخلف نورزند، وہر کس از بیگلر بیگیان وامراء از حکم تخلف دتجاوز نماید نہ بہ شمشیر بگذرانند وکوتل دیرا کہ منتظر الامارت باشد بجاے وے نصب کنند" (ص ۲۰۲)

بابر نامہ میں ہے:-

"چون ارکان لشکر قائم گشتہ ہر کس بجاے خود شتافت، فرمان واجب الاذعان لازم الامتثان شرف اصدار یافت کہ ہیچکس بے حکم از محال خود حرکت نماید، رخصت بجاریہ نکشاید" (بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۳۱۵) لہ بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۷ لہ ایضاً

کمی ہوتی، تو ہاتھیوں پر تیر انداز بٹھائے جاتے، تیر انداز بہادرون کے ہمراہ ایک ہاتھی ایک ہزار سوار کا کام کرتا تھا[۵۱]، ہر صف مین ہاتھی کے پیچھے سوار ہوتے تھے، راجپوت سوار عموماً برچھے[۵۲] سے لڑتے تھے، مغل سوارون کا ہتھیار تیر و کمان تھا، ہر سوار کی کمر مین شمشیر یا تیغ یا تلوار آویزان ہوتی، کمر کی دوسری طرف کبھی کٹار یا خنجر ہوتا، بائین کاندھے پر سپر یعنی ڈھال ہوتی، جو لڑتے وقت بائین ہاتھ مین پکڑ لی جاتی، سوارون کے عقب مین پیادے ہوتے، تیموریون کے زمانہ مین بڑی لڑائیون مین پیادون کی تعداد زیادہ نہین ہوتی تھی،

قول مین بادشاہ یا شہزادہ یا سپہ سالار عموماً ہاتھی پر حوضۂ زرین اور چتر[۵۳] کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا تھا، وہ ایسی جگہ ہوتا کہ لشکر کے ہر حصہ سے دکھائی دیتا تھا، شاہی جنگی علم کبھی اس کے ہاتھی پر یا کبھی اس کے بالکل قریب دوسرے ہاتھی پر لہراتا رہتا تھا[۵۴]، آس پاس دوسرے ہاتھیون پر فوجی باجون کی مختلف قسمین بھی ہوتین[۵۵]، بادشاہ یا شہزادہ کی عماری مین اس کی کوئی چہیتی اولاد بھی ہوتی[۵۶]، اس کے ہاتھی کے دونون جانب اعیان سلطنت اور اولیان دولت گھوڑون پر سوار رہتے تھے، کبھی کبھی علماء و فضلاء کی بھی جماعت ساتھ ہوتی تھی[۵۷]، بادشاہ یا سپہ سالار قول سے کوئی حکم صادر کرتا تو اس کو

---

[۵۱] آئین اکبری باب آئین فیل خانہ، مثال کے لئے دیکھو راجہ بھگونت داس کے اسلحہ اکبرنامہ جلد سوم ص ۱۵،
[۵۲] عمل صالح جلد دوم ص ۵ [۵۳] تیمور جب جنگ مین شریک ہوتا، تو قلب مین علم کے نیچے ہی جلوہ افروز رہتا، ملفوظات تیموری ایلیٹ جلد سوم ص ۴۴۹ [۵۴] مثال کے طور پر دیکھو، سموگڈھ مین دارا کی فوج کی ترتیب [۵۵] نور جہان مہابت خان سے جنگ کر رہی تھی تو اس کی عماری مین شہریار کی لڑکی، اسکی انّہ اور صبیبہ شاہنواز خان ساتھ تھی، (اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۷۲–۲۷۳) اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے لڑکون مین جنگ [illegible] نشینی ہوئی، تو شہزادہ اعظم کے لڑکے بیدار بخت کے ہاتھی پر اس کا کمسن بچہ بیدار دل تھا، خود شہزادہ اعظم کے ساتھ [illegible] کا لڑکا شہزادہ علی تبار [illegible] اسی جنگ مین اعظم شاہ کے لڑکے شہزادہ والا جاہ کی [illegible] ہاتھی کے ہودج ہی مین ایک تشین کولہ کی زد مین آکر جان بحق ہوئی، (منتخب اللباب ص ۵۹۳)
[۵۷] ظفرنامہ ج ۲ ص ۱۰۱،

اس کے لئے اس زبان کے اسالیب کی دائمی مزاولت و تتبع شرط ہے،

عجمی ادبار کے کلام مین سب سے بڑی خامی اسی "اسلوب" کی ہے، ان کا کلام رفعت خیال، جدت طرازی، امیال وعواطف اور دوسرے اوصاف کے لحاظ سے کتنا ہی بلند ہو لیکن اس مین عربون کے مخصوص انداز بیان کا نقدان نظر آتا ہے، اس لئے وہ نقادانِ سخن کی نگاہون مین نہین جچتا، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے،

وبهذا الاعتبار كان الكثير ممن لقينا من شيوخنا فى هذه الصناعة الادبية يرون ان نظم المتنبى والمعرى ليس هو من الشعر فى شيئ لانهما لم يجريا على اساليب العرب	اسی اعتبار سے فن ادب کے اکثر شیوخ جن سے میری ملاقات ہوئی، یہ رائے رکھتے تھے کہ متنبی و معری کی نظمین کسی حیثیت سے بھی شعر نہین، اس لئے کہ یہ دونون اسالیب عرب پر نہین چلے،

(مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۴)

ہندوستان کی تاریخ سے اگر سندھ کی عربی حکومت کو الگ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہان عربی ان مسلم فاتحین ہی کے ذریعہ آئی جن کے دربارون مین حسن بن اسحاق فردوسی، ملک الشعرا احمد عنصری، ابوالحسن رودکی فرخی، علی خرخی وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا، انہی درباروں مین تفال مروزی، ابونصر عراق، ابوریحان البیرونی، ابوالحسن انخار جیسے حکما بھی ملین گے، جنھون نے اپنی قیمتی تحقیقات و معلومات سے عربی زبان کو مالا مال کیا،

ہندوستان کی شاہی زبان غزنوی و غوری دور سے لیکر تیموریون کے خاتمہ تک فارسی رہی لیکن ہر دور مین یہان علمار کی ایسی جماعتین بھی رہین، جو عربی ادب و لغت کو بھی فروغ دیتی رہین آج جن کی صرف مختصر سی فہرست ہمارے سامنے ہے لیکن معلوم نہین ماضی کے دھندلکے مین ایسے کتنے درخشندہ تارے ہم سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے، اس مختصر فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو حدیث نبوی

ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر

از

جناب ابو محفوظ الکریم صاحب معصومی استاذ مدرسۂ عالیہ کلکتہ

اہلِ عجم کی ترقی و عروج کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی پروان چڑھی، اور یہی اُن کے درباروں کی زبان بنی لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کو زبان عربی کے ساتھ اعتنا نہ تھا، کیونکہ ہمیں ان ہی زبانوں میں زمخشری، رشید الدین وطواط، حسن صغانی، عبد القاہر جرجانی، بدیع الزمان ہمدانی، خطیب تبریزی، ابوبکر خوارزمی جیسے سیکڑوں ائمۂ لغت و اعیان شعر و ادب کے نام ملیں گے، جو آسمانِ عجم ہی کے مہر و ماہ تھے، اہلِ عجم نے عربی کی خدمت اپنی مادری زبان سے کم نہیں کی، وہ اُن کی مذہبی زبان تھی، اس لئے اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور آج تک اسی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے،

عربی شاعری جب صحرا سے نکل کر اہلِ بادیہ کی عنجہیت اور مخضرمین کی عبقریت کھو بیٹھی، اور ادبا مولدین، عربوں کی فطری سادگی اور اُن کی خالص عربی تعبیر و اسلوب کو زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھ سکے، تو رفتہ رفتہ اس صحرائی ادب کی معصوم سادگی عجم کے صنائع و بدائع کی رنگا رنگی میں گم ہو گئی، اہلِ عجم نے اپنے خیالات کو عربی قالب میں ڈھالا، قوانین و ضوابط قیاسیہ کے برتنے میں وہ بیشک کامیاب رہے، لیکن اس تعبیر و اسلوب کو نہ پاسکے، جو خالص عربی اسلوب کہا جاتا ہے، قواعد علمیہ کے ذریعہ کسی زبان کے تمام اسالیب و طرق کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا جاننے والا اپنے مافی الضمیر کو اسی زبان کے مخصوص طریقہ میں بالکل اسی طرح تعبیر کرسکے جس طرح ایک اہلِ زبان ادا کرتا ہے،

سے اتنے دور رہکر بھی انھون نے کس حد تک ادب عربی کی خدمت کی، عرصہ ہوا، ایک صاحب عبدالرشید بریلوی نے الشعر العربی فی الہند یہ تلاش و تحقیق ... کا کام شروع کیا تھا، معلوم نہین انجام کو پہنچا یا نہین،

مسعود بن سعد بن سلمان | سعد[1] بن سلمان ہمدان سے لاہور آیا، اور یہین توطن اختیار کرلیا، کئی اولادین ہوئین، ان مین سے مسعود نے بڑی شہرت و ناموری حاصل کی،

مسعود کے مولد و منشاء مین تذکرہ نویسون کا اختلاف ہے[2] صحیح یہ ہے کہ مسعود لاہور ہی مین پیدا ہوا، اور وہین تعلیم و تربیت حاصل کی، ولادت کے سال متعین نہین ہے البتہ اتنا متیقن ہے کہ ۴۳۸ھ اور ۴۴۰ھ کے مابین اس کی پیدایش ہوئی[3]

۴۶۹ھ مین سلطان ابراہیم بن مسعود بن سبکتگین کی طرف سے شہزادہ ابو القاسم سیف الدولہ محمود حکومت ہندوستان پر متعین ہوا اس وقت مسعود سعد سلمان ابو القاسم سیف الدولہ کے ملازمین خاص مین شامل ہو گیا، قیاس ہے کہ ۴۷۰ھ کے حدود مین مسعود کی رسائی غزنوی دربار تک ہوئی،

حدود ۴۸۰ھ مین سلطان ابراہیم کو سیف الدولہ محمود کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوئی[4] اس کا سبب یہ ہوا کہ سلطان کو یہ خبر ملی کہ سیف الدولہ محمود ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ-۴۸۵ھ) سے ربط پیدا کر رہا ہے اور عراق جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس خبر سے مشوش ہو کر سلطان نے سیف الدولہ محمود اور اس کے ندماء و حوارین کو گرفتار کرکے مختلف قلعون مین قید کر دیا، اسی سلسلہ مین مسعود بھی قید کیا گیا،

---

[1] ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان ص ۲۸، چہار مقالہ بہ تصحیح و تحشیہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی ص ۲۰، ۴۵، ۴۶، ۱۴۰-۱۵۰-۱۵۲-۱۶۸، ۱۸۲، ۲۰۷، مطبوعہ بریل لیڈن [2] چہار مقالہ ص ۱۴۳ [3] ایضاً ص ۱۴۵،

[4] نظامی عروضی نے اس کو ۴۷۲ھ ہجری کا واقعہ بتایا ہے (چہار مقالہ، مقالہ دوم ص ۴۴) لیکن یہ صریحاً غلط ہے تفصیل کے لئے دیکھو (ص ۱۷۸، ۱۷۹)

کے خدام بھی ملیں گے، فقہ و فرائض کے عامل بھی، لغت کے امام بھی ہیں گے، شعر و ادب کے مفتون بھی، صغانی[1] کا تذکرہ پڑھئے تو ایک طرف لغت و انساب کا دریا امنڈتا نظر آئیگا تو دوسری طرف مشارق الانوار کی شعاعیں دلوں کو روشن کرتی دکھائی دیں گی، یہی منظر سید مرتضیٰ[2] زبیدی کے یہاں بھی مشاہدہ میں آئے گا، تاتارخان[3] اور اورنگزیب عالمگیر رحمہما اللہ کے درباروں میں علماء کبار نے تدوین و تصنیف کے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، غرض ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جن میں سے صرف دو چار کے نام لئے گئے،

آیندہ سطروں میں دور گذشتہ کے چند ایسے ادباء پیش کئے جائیں گے جنھوں نے اپنے تاثرات کو عربی نظم میں ظاہر کیا، اس لئے عربی شاعری میں ان کے ذوق کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ عربدان

---

[1] رضی الدین ابوالفضائل حسن بن محمد بن حسن بن حیدر عمری صغانی ۵۷۷ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے آبا و اجداد صغان یا صغانیان (چغانیان) ماوراء النہر کے رہنے والے تھے، اسی انتساب سے صغانی یا صاغانی کہلائے، ۶۵۰ھ میں بغداد میں انتقال کیا، اور مکہ میں مدفون ہوئے، حدیث و لغت کے مشہور امام تھے مشارق الانوار حدیث میں، شوارد، تکملۃ الصحاح، مجمع البحرین، العباب الزاخر و اللباب الفاخر لغت میں آپ کی مشہور تصنیفات ہیں، کتاب العباب مکمل نہ ہو سکی تھی، مادہ "بکم" تک پہنچے تھے کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، (الجاسوس احمد شدیاق) بعد میں کسی نے اس کی تکمیل کی، علامہ زبیدی نے مادۂ "خصی" میں اخصی الرجل کے معنی بیان کرنے کے بعد نقل کیا ہے "نقلہ الصاغانی وھو تجاز" اس قول کی نسبت صغانی کی طرف صحیح نہیں (مقالہ عبد اللہ البستانی مناظرہ لغویہ ادبیہ ص ۹۰) [2] سید ابوالفیض محمد مرتضیٰ ابن محمد بن محمد بن عبد الرزاق الواسطی البلگرامی، زبید میں مدتوں مقیم رہے، اس لئے زبیدی کہلائے ۱۱۴۵ھ میں بلگرام میں پیدا ہوئے، ۱۲۰۵ھ میں مصر میں انتقال کیا، (تاریخ جبرتی) قاموس کی مشہور شرح تاج العروس آپ کی تصنیف ہے، جو ۱۱۸۱ھ میں اختتام کو پہنچی [3] فیروز شاہ تغلق متوفی ۷۹۰ھ کے دربار کا مشہور امیر جو خود بڑا فاضل اور علماء و فضلاء کا قدردان تھا، تفسیر تاتارخانی و فتاوی تاتارخانی اسی کی طرف منسوب ہیں، مزید تفصیل کے لئے دیکھو تاریخ فیروز شاہی ص ۲۹۲،

سپرد کی، اور ابو نصر ہبۃ اللہ فارسی کو اس کا مشیر و وزیر بنایا، ابو نصر فارسی اور مسعود کے تعلقات دوستانہ تھے، اس کے بعد پھر مسعود کا ستارۂ اقبال چمکا، ابو نصر نے جالندر کی حکومت پر مسعود کو سرفراز کیا، لیکن بہت جلد ابو نصر معتوب ہو گیا، اس لئے مسعود بھی معزول کیا گیا، اور دوبارہ جیلخانہ بھیج دیا گیا، اس مرتبہ آٹھ نو سال تک حصار مرنج مین قید رہا۔ چنانچہ کہتا ہے،

در مرنجم کنون سہ سال و بود   کہ ببندم دراین چو دوزخ جائے

آخرحدود ۵۰۰ھ مین ثقۃ الملک طاہر بن علی بن مشکان[۵] کی سفارش پر رہائی نصیب ہوئی، مسعود یمین الدولہ بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم (۵۱۱ھ۔۵۵۲ھ) کے ابتدائی عہد تک بقید حیات رہا۔ اسّی سال کی عمر مین ۵۱۵ھ مین انتقال کیا،

مسعود ہندی اور فارسی کیساتھ عربی کا بھی قادر الکلام شاعر تھا، تینون زبان مین اس کے دیوان تھے، لیکن عربی اور ہندی دیوان بقول آزاد بلگرامی "طارت بہما العنقاء" بالکل ہی ناپید ہو گئے، البتہ فارسی دیوان ہندوستان و ایران مین متداول و متعارف رہا۔ فارسی دیوان اس کی حیات ہی مین سنائی غزنوی نے مرتب کیا تھا، سنائی نے دوسرون کے اشعار کو غلطی سے مسعود کا سمجھ کر اس مین شامل کر لیا تھا، بعد مین جب طاہر بن علی مشکان نے اس غلطی سے آگاہ کیا تو سنائی نے ایک قطعہ مسعود کے پاس معذرت مین بھیجا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) لیکن یہ صحیح نہین، نظامی عروضی کہتا ہے کہ قلعہ نائے وجیرستان مین واقع ہے، لیکن نہ تو وجیرستان کے متعلق صحیح علم حاصل ہو سکا، اور نہ قلعہ نائے کی جائے وقوع معلوم ہو سکی (۲) دوسرا قلعہ دھک ہے، جو زرنج پایۂ تخت سیستان اور "بست" کے درمیان واقع تھا (۳) تیسرا قلعہ "سو" ہے جس کا مقام معلوم نہین، دوسری دفعہ مسعود قلعۂ مرنج مین قید کیا گیا، مرنج کے متعلق برہان قاطع مین ہے کہ قلعہ ایست در ہندوستان (چہار مقالہ ص ۱۶۹) (ص ۱) [۵] طاہر سلطان مسعود بن ابراہیم کا وزیر تھا، لب الالباب جلد ۲ ص ۲۴۶ چہار مقالہ ص ۱۸۲ [۶] چہار مقالہ ص ۱۲۹،

اور دس[۱] سال تک قید کی مشقتین مختلف قلعون مین جھیلتا رہا۔ سات سال تو قلعۂ "سو" اور قلعۂ "دھک" مین گذارے، بقیہ تین سال "قلعۂ نائے" مین چنانچہ خود کہتا ہے،

ہفت سالم بکوفت "سو" و دھک   پس از آنم سہ سال "قلعۂ نائے"،

پھر سلطنت کے ایک رکن ابوالقاسم کی سفارش سے سلطان ابراہیم نے عفو تقصیر کیا، اور مسعود کو رہائی نصیب ہوئی،

سلطان ابراہیم خود شاعر اور شاعرون کا قدردان تھا، علامہ آزاد بلگرامی کا بیان ہے :-

"وکان شاعراً یحب الشعراء	(خزانۂ عامرہ ص ۱۰)	شاعر اور شعراء کا محب تھا، بڑے بڑے
یعطیھم صلات وجوائز فخیمۃ		انعامات وعطایا معمولی قطعہ ورباعی کے
علی ادنیٰ شعر من القطعۃ والدوبیت"		صلہ مین دیا کرتا تھا،

سلطان ابراہیم نے ۴۵۰ھ سے ۴۹۲ھ تک سلطنت کی، باتفاق مورخین اس کا انتقال ۴۹۲ھ مین ہوا، البتہ ابن الاثیر سے سہو ہوگیا ہے، اس کے بیان کے مطابق سنہ وفات ۴۸۱ھ ہے، جو تمام تذکرہ نگارون کے خلاف ہے،

سلطان ابراہیم کے بعد اس کا لڑکا علاؤ الدولہ مسعود سریر آرائے سلطنت ہوا، علاؤ الدولہ ۵۰۸ھ تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے دور مین ہندوستان کی حکومت اپنے ولی عہد عضد الدولہ شیرزاد کے

۱؎ نظامی عروضی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) کل مدت حبس بارہ برس کی تھی (۲) اور سلطان ابراہیم نے اپنی حیات مین مسعود کو رہائی نہین دی (چہار مقالہ ص ۴۸) لیکن دونون باتین خلاف واقعہ ہین (دیکھو ص ۶۴ - ۷۴ ، التحشیہ محمد قزوینی ۲؎ مسعود دو مرتبہ قید کیا گیا، پہلی دفعہ تین قلعون مین دس سال تک قید رہا (۱) قلعہ نائے جس کے متعلق صرف حمد اللہ مستوفی نے نزہتہ القلوب مین اتنا لکھا ہے کہ "قلعہ نائے محبس مسعود سعد سلمان است"، تمام تذکرہ نویسون کا بیان ہے کہ قید کی پوری مدت قلعہ نائے مین گذری،

شہاب الدین دولت آبادی کے استاد تھے، قاضی صاحب کا قصیدہ لامیہ جو لامیۃ العجم طغرائی کے معارضہ میں ہے، اُن کے مذاق سلیم کا بین ثبوت ہے، آپ کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی، حوض شمسی کے قریب خانقاہ شیخ عبد الصمد میں مدفون ہوئے[۵۱]

قاضی عبد المقتدر کے معاصر و برادر طریقت مولانا احمد تھانیسری کا قصیدہ دالیہ بھی ہندستان کے قدیم عربی ذوق کا اعلیٰ نمونہ ہے، ان بزرگون کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو کہ اس مین وہ ہندیت نہین، جو پچھلے دور کے اعیان شعر و ادب کے کلام مین عموماً پائی جاتی ہے، محمد مومن شیرازی[۵۲] (م ۱۰۸۰ھ) سید عبد الجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ھ ۔ ۱۱۳۸ھ) سید محمد بلگرامی (۱۱۰۱ھ ۔ ۱۱۸۵ھ) طفیل محمد اترولوی (۱۱۰۳ھ ۔ ۱۱۵۱ھ) علامہ آزاد بلگرامی وغیرہ بلند پایہ ادیب تھے، عربی لغات اور محاورات اُن کی نوک زبان تھے، پھر بھی اُن کے کلام مین عجمیت کا اثر ہے، جس سے اُن کی فنی قابلیت واغلاق نظر آتی ہے، علامہ عبد الجلیل بلگرامی کے دو شعر ہین،

حبیبی توس حاجبہ کنون ۔۔۔ وصادیل ابن مقلۃ شکل عینہ

لعمری انہ نص جلی ۔۔۔ علی ان الرمایۃ حق عینہ

اس کو سنتے ہی نقاد فن یا تو یہ خیال کرے گا کہ کسی ماہر فن خطاط کا شعر ہے یا یہ کہ کسی اصولی و فقیہ کے پرواز خیال کا نتیجہ ہے، سید محمد بلگرامی کے بھی دو شعر سن لیجئے،

بروحی سلمی قد تبتنی کرامۃ ۔۔۔ وساعدنی فیھا زمان مبشر

لقد ذقت من فیھا مزید حلاوۃ ۔۔۔ نعم شفتاھا سکر و مکرر

محمد مومن شیرازی جس نے اپنا دیوان "ثمر الفواد" سرزمین سندھ مین مرتب کیا تھا، اس کے چند اشعار یہ ہین :-

---

۵۱ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر، سبحۃ المرجان و اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۱ ۔ ۵۲ سبحۃ المرجان ص ۱۰۰،۹۰

مسعود کی عربی شاعری کے لئے یہ سند کافی ہے کہ رشید الدین وطواط جیسا ادیب اس کے حسن تخیل، انسجام بیان و جودت کلام کی شہادت دیتا ہے، حدائق السحر[۱] میں وطواط نے مسعود کے کچھ عربی اشعار بطور استشہاد نقل کئے ہیں، آج اسی کے ذریعہ مسعود کے عربی کلام کا نمونہ ہم کو ملتا ہے "براعۃ المطلع" کی مثالون مین وطواط نے ایک مطلع مسعود کا بھی پیش کیا ہے، جو مندرج ذیل ہے،

تق بالحسام فعهده میمونُ	وارکب وقل للنصر کن فیکون

توریہ کی مثالون مین مسعود کے حسب ذیل اشعار نقل کئے ہین،

و لیل کأنّ الشمس ضلت مرها	ولیس لها نحو المشارق مرجع
نظرت الیه والظلام کأنّه	علی العین غربان من الجو وقّع
فقلت لقلبی طال لیلی ولیس لی	من الهم منجاة و فی الصبر مفزع
أری ذنب السرحان فی الجو طالعا	فهل ممکن انّ الغزالة تطلع

وطواط ہی کی زبانی چند اشعار ذوقافیتین بھی سُن لیجئے،

یا لیلة اظلمت علینا	لیلاء قاریة الدجنه
قد أرکضت فی الدجی علینا	دهما خداریة الأعنه
فبت اقتا مها فکانت	حُبلیٰ نهاریة الأجنه

مذکورۂ بالا اشعار مین قاریہ، خداریہ نہاریہ قافیۂ اولی اور دجنہ، اعنہ، اجنہ قافیۂ ثانیہ ہین،

مسعود کے بعد ایک طویل خاموشی چھا جاتی ہے تا آنکہ ۷۰۳ھ مین قاضی عبد المقتدر بن قاضی رکن الدین شریحی کندی پیدا ہوئے، جنھون نے اپنی نواسنجی سے اصحاب ذوق کی روح کو بالیدگی بخشی، قاضی صاحب حضرت شیخ نصیر محمود چراغ دہلی (م ۷۵۷ھ) کے خلیفہ اور مشہور فاضل قاضی

---

[۱] سبحۃ المرجان

آزاد بلگرامی | سید غلام علی آزاد بن سید نوح حسینی واسطی بلگرامی، یوم یکشنبہ ۲۵ ر صفر ۱۱۱۶ھ ہجری مین مقام بلگرام پیدا ہوئے،

تمام کتب درسیہ سید طفیل محمد اترولوی کی خدمت مین پڑھین، اپنے نانا سید عبد الجلیل بن سید احمد بلگرامی نور اللہ ضریحہٗ سے لغت اور سیرت کی تحصیل کی، انہی سے حدیث مسلسل بالاولیہ، حدیث الاسودین اور اکثر کتب احادیث وسنن نبویہ کی سند و اجازت حاصل کی، عربی و فارسی دواوین کی اجازت بھی انہی سے ملی، عروض و قوافی اپنے ماموں سید محمد بن سید عبد الجلیل بلگرامی سے حاصل کئے اور حضرت سید لطف اللہ بلگرامی المتوفی ۱۱۴۳ھ سے بیعت کی،

۱۱۴۳ھ مین سیوستان پہنچے[۱] اور سید محمد کی جگہ ۱۱۴۵ھ تک بخشیگری اور وقائع نگاری کے عہدہ پر مامور رہے، سفر سیوستان کا حال اپنی ایک مثنوی مین لکھا ہے جس کے چند اشعار یہ ہین؛

بیا اے قامہ راہ نامہ سرکن	باقلیم سخن عزم سفر کن
نخستین گہر نام فیض سرمد	فروغ مکرمت سید محمد
بکار نیک توفیقش رفیق ست	مرا خال حقیقی و شفیق است
بسیوستان عظیم الاقتدار است	کہ آنجا بخشی و واقع نگار است
چو آنجا مدت دہ سال ماندہ	مرا بہر نیابت باز خواندہ
کہ خود سوے وطن تشریف آرد	مرا بر عہدہ خدمت گذارد

سید محمد آزاد کو اپنی جگہ چھوڑ کر بلگرام روانہ ہوئے، اسی اثنا مین ایک شخص عبد العزیز تتوی (ٹھٹھوی) نے بخشی گری و وقائع نگاری کی خدمت پر اپنا تقرر کرا لیا، لیکن سید محمد نے دوبارہ اس کو حاصل کر لیا، اور ۱۱۴۵ھ مین پھر اپنے عہدہ پر آگئے چنانچہ سنہ مذکور کے واقعات قلمبند کرتے ہوئے

[۱] سبحۃ المرجان ص ۱۱۰، و تبصرۃ الناظرین (ذکر سنہ ثلاث و اربعین و مایۃ و الف) مصنفہ سید محمد (قلمی)

يشق على الموت فى ارض غربة — يقل صراخ النائحات على قبرى

تقضت ليال كنت اجهل قدرها — سفاها وما ادريت ماليلة القدر

وجاءت ليال ما أشد سهادها — بها عذبت روحى الى مطلع الفجر

وقائلة صبراً على ما تذوقه — فقلت وهل شئ أمر من الصبر

بلى اتداوى داء صبرى بمثله — كما يتداوى شارب الخمر بالخمر

البتہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ ۔ ۱۱۷۶ھ) اور شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹ھ ۔ ۱۲۳۹ھ) کے قصائد و مقطوعات میں ایک خاص جاذبیت و سادگی پائی جاتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کے کلام کا مجموعہ "طیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" شائع ہو چکا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز کے اشعار و قطعات جو مختلف رسائل و کتب میں نظر آتے ہیں، آپ کی فصاحت و بلاغت کا آئینہ ہیں، آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

یا من[1] یسئل عن دھلی ورفعتها — على البلاد وما حازته من شرف

ان البلاد إماء وهى سيدة — وانها درة والكل كالصدف

فاقت بلاد الورى عزا و منقبة — غير الحجاز وغير القدس والنجف

کیا ان اشعار کے مطبوع و حسین ہونے میں کچھ کلام ہو سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں علامہ آزاد بلگرامی کے کلام پر تبصرہ کرنا ضروری ہے اگرچہ آزاد پر ایک طویل مقالہ معارف کے قدیم پرچوں میں قسط وار شائع ہو چکا ہے، اور مقالات شبلی[2] میں بھی ان پر ایک قیمتی مضمون موجود ہے، تاہم اُن کی بعض خصائص و مزایا پر روشنی ڈالے بغیر یہ مضمون ناقص رہے گا، اس لئے اُن کے مختصر حالات اور شاعری کے بعض خصوصیات پر تبصرہ ضروری ہے،

---

[1] حالات خاندان عزیزی ص ۳۸، ص ۳۹ [2] ایضاً ج ۵ صفحہ ۱۱۹۔

خوشہ چینی کرتے رہے، چنانچہ خود فرماتے ہین[۱]،

"وقرأت أیاما قامتها صحیح البخاری	مین نے قیام مدینہ کے دوران مین اپنے
علی شیخی ومولائی صاحب الجلالۃ	بلند مرتبہ شیخ حضرت محمد حیات سندی
السنی الشیخ محمد حیاۃ السندی	قدس سرہٗ سے صحیح بخاری پڑھی صحاح
المدنی قدس سرہ واخذت	ستہ اوران کے تمام مقروات کی اجازت
عنہ اجازۃ الصحاح الستۃ	لی، اوران کی ذات بابرکت سے مستفید ہوا،
وسائر مقروءاتہ واقتطفت	
ثمارا اینع من غصون برکاتہ	

(سبحۃ المرجان صفہ ۱۲)

مکہ معظمہ مین شیخ عبد الوہاب طنطائی مصری (م ۱۱۵۷ھ) کی صحبت سے فیضیاب ہوئے، احادیث وآثار نبویہ کے متعلق فوائد ومعلومات حاصل کئے، ایک دن شیخ سے اپنے تخلص "آزاد" کا ذکر کیا، اوراس کے معنی بتائے تو اُن کی زبانِ مبارک سے یہ کلمۂ بشارت نکلا، "یا سیدی انت من عتقاء اللہ"

حجاز مقدس کی زیارت سے واپس آکر اورنگ آباد مین قیام کیا، اورحضرت شاہ مسافر غجدوانی المتوفی ۱۱۳۶ھ کی خانقاہ مین ۱۱۵۹ھ تک یعنی تقریبًا سات برس رہے، اواخر ۱۱۵۹ھ مین نواب نظام الدولہ ناصر جنگ بن نواب نظام الملک آصفجاہ سے ملاقات ہوئی، انھون نے بڑی قدر ومنزلت کی، اورسفر وحضر مین برابر اپنے ساتھ رکھنے لگے ۱۱۶۱ھ مین جب خود ناصر جنگ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو احباب کا اصرار ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر کوئی بڑا منصب عز وجاہ حاصل کرلین، لیکن علامہ آزاد کی نگاہ مین اس کی کوئی وقعت نہین تھی، جواب دیا،

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۱۲۰،

رقمطراز ہین :-

"درین سال راقم الحروف بعد زانکہ خدمت بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان تابع صوبہ ملتان بنام خود از حضور انور بحال و مقرر نمود و مطالب مانی الضمیر تیسیر پذیر گشت، اہلِ خانۂ خود را از وطن طلب داشتہ بتاریخ ہفدہم شہر جمادی الاولی از دار الخلافہ شاہجہان آباد بعزم ولایت سند برآمدہ بعد طے مراحل و قطع منازل مع مردم وطن و قبائل بخیر و عافیت باحسن احوال باجان ومال بتاریخ بست و پنجم رمضان المبارک روز پنجشنبہ ببلدۂ سیوستان رسیدہ سرگرم کار پادشاہی گردید و مخالف کہ سند خدمت بنام خود حاصل کردہ بود حیران و سراسیمہ و پریشان شد و دخل نیافت[۱]"

اس کے بعد علامہ آزاد سیوستان سے واپس آگئے ۱۱۵۰ھ مین تن تنہا ارضِ حجاز کا سفر کیا، اس سفر کا حال اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے شوق کا نقشہ سبحۃ المرجان مین اپنی کلک گہربار سے کھینچا ہے، اور ایک مثنوی "طلسم اعظم" مین بھی حالاتِ سفر کو بیان کیا ہے، روانگی کی تاریخ "سفر خیر" سے اور واپسی کی تاریخ "سفر بخیر" سے نکلتی ہے ۱۱۵۱ھ مین حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اس کا مادۂ تاریخ "عمل اعظم" ہے،

مدینہ طیبہ کے قیام کے زمانہ مین محدث جلیل حضرت شیخ محمد حیات سندی[۲] کے خرمن علم سے

---

[۱] تبصرۃ الناظرین، پیشِ نظر نسخہ صدیق محترم مولوی ابوسلمہ شفیع احمد استاذ مدرسہ عالیہ، کا نقل کردہ ہے، جو پٹنہ لائبریری کے مخطوطہ سے منقول ہے [۲] آپ نے ریعان شباب مین حرمین شریفین کا سفر کیا، مدینۃ النبی مین اقامت پذیر ہوگئے شیخ ابوالحسن سندی نزیل مدینہ سے شرف تلمذ تھا، شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے حدیث کی اجازت لی، یوم چہارشنبہ ۲۶ صفر ۱۱۶۳ھ مین وفات پائی، بقیع غرقد مین مدفون ہین، اپنا نسب خود لکھا ہے؛ "والد الفقیر محمد حیات السندی اسمہ ملا فلاریہ من قبیلۃ جاچڑ الساکن فی اطراف عادل پور دالسید موسی القادری، الساکن فی کوتہ یعرفہ انتہی" سبحۃ المرجان ص ۹۵،

إن تبتغوا ماء الحیوٰۃ فذلکم
فی الهند لا فی موضع الظلمات[51]

آزاد کی شاعری

عربی و فارسی ادب میں علامہ آزاد کا درجہ محتاج تشریح نہیں، ان دونوں زبانوں کے علاوہ ہندی پر بھی ان کو پورا عبور حاصل تھا، اور اس میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے، مسعود لاہوری کا بھی یہی کمال تھا کہ اُسے بھی تینوں زبانوں پر قدرت تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ آزاد فرماتے ہیں:۔[52]

"وھو مثلی عارف بالالسنۃ	وہ میری طرح تینوں زبانوں کا جاننے
الثلاثۃ وصاحب الثلاثۃ	والا، اور تین دواوین عربی، فارسی
دواوین العربی والفارسی و	ہندی رکھتا ہے، میرے دو دیوان عربی
الهندی وانا صاحب الدیوانین	و فارسی کے ہیں، ہندی کا کوئی
العربی والفارسی ومالی فی الهندی	دیوان نہیں، لیکن میں ہندی
دیوان لکنی ماھر بالشعر الهندی	شاعری اور اس کے گُر سے واقف
و دقائقہ"	ہوں،

آزاد کی عربی شاعری تقلید محض نہیں ہے، بلکہ اس میں انھوں نے ایک نئی راہ نکالی ہے، اُن کا تغزل ہندی تغزل سے مشتق ہے، اور یہی وہ خاص نہج ہے، جس کی جانب نواب صدیق حسن خان نے اشارہ کیا ہے[53]،

وَلَہٗ فی التغزل طورٌ خاصٌ قلما	تغزل میں اُن کا خاص طریقہ ہے جو
یوجد فی کلام غیرہ یعرفہ	جو دوسروں کے کلام میں بہت کم پایا
اصحاب الفنّ،	جاتا ہے، اس فن والے واقف ہیں،

---

[51] سبحۃ المرجان ص ۹۰، [52] ایضاً ص ۷۰، [53] ابجد العلوم ص ۹۱۳،

مثل ھذہ الدنیا مثل نھر　　اس دنیا کی مثال نہر طالوت کی ہے کہ
طالوت غرفة منہ حلال　　اس کا ایک گھونٹ (بقدر ضرورت)
والزیادة علیھا حرام　　حلال اور اس سے زیادہ حرام ہے،

یہ شرف صرف ناصر جنگ کو حاصل ہے کہ علامہ آزاد نے اُن کی شان میں دو شعر کہے، ورنہ انھوں نے کبھی کسی امیر کبیر کی تعریف نہیں کی، وہ اشعار یہ ہیں:-

ھو ناصر الاسلام سلطان الوری[۵۱]　　ابقاہ فی العیش المخلد ربہ
حاز المناقب والمآثر کلھا　　جبل الوقار یحبنا ونحبہ

علامہ آزاد نے اورنگ آباد ہی میں اپنی مشہور کتاب سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان تصنیف کی، اور یہیں ۱۱۹۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[۵۲] تاریخ وفات "غلام علی آزاد" سے نکلتی ہے، لیکن نواب صدیق حسن خان نے ایک جگہ یہ تصریح کی ہے، کہ سنہ ۱۲۰۰ھ[۵۳] میں اُن کی وفات ہوئی،

آزاد کی وطنیت　آزاد کو اپنے وطن کے ذرہ ذرہ سے بڑی محبت تھی، اسی جذبۂ وطن پرستی میں وہ سرزمین ہند ہی کو نور محمدی کی پہلی جلوہ گاہ کہتے ہیں، سبحۃ المرجان کے ابتدائی صفحات میں اپنی پوری قوت بیان ہندوستان کی برتری و تفوق کے اثبات میں صرف کرنے کے بعد فرماتے ہیں[۵۴]:-

قل أودع الخلاق آدم ذرة　　متلألأ کالکوکب الوقاد
والھند مھبط جدنا ومقامہ　　قول صحیح جید الاسناد
فسواد ارض الھند ضابط آیة　　من نور احمد خیرة الامجاد

وطن کی فضیلت ایک اور شعر میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

---

[۵۱] سبحۃ المرجان ص ۱۲۲　[۵۲] ابجد العلوم ص ۹۲۲　[۵۳] ابجد العلوم ص ۲۱۳،
[۵۴] سبحۃ المرجان ص ۲۴،

وفارسی سے مختلف ہیں لیکن بحر تقارب کفن الخلیل اور بحر سریع ہندی میں بھی ہیں، ایک بڑا فرق یہ بتایا ہے کہ ہندی میں بعض بحریں ایسی ہیں جن کا قافیہ مصرع کے آخر کے بجائے وسط میں آتا ہے، اور باوجود اس کے یہ بحر مطبوع اور دلپسند ہے[۵۱]

آزاد اپنی جدت پر ناز کرتے ہیں، اور اپنے کو مجدد و بدیع کہتے ہیں، فرماتے ہیں[۵۲]

الفت سفرا فی البدیع وغیرہ　　　ونظمت سمطا من ثمین جمان

قد کان عبد اللہ واضع فنہ　　　ولہ الینا غایۃ الاحسان

وانا المجدد للبدیع فیا لما　　　قد صغتہ من حلیۃ الآذان

آزاد کے دواوین میں سیکڑوں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں خالص ہندوستانی خیالات، اور بھاشا کی تشبیہات و استعارات ہیں، اُن کی مشہور کتاب سبحۃ المرجان سے صرف دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں[۵۳]

نیلوفر طرفک السکران من سنۃ　　　بشانہ قلبی المشتاق یھتم

نعم امسی حذاء البدر منفتحا　　　وعما اضحی حذاء الشمس ینضم

مذکورۃ الصدر شعر میں ایک حسینہ اپنے شوہر سے جس نے رات کہیں اور بسر کی ہے، یوں شکایت کررہی ہے کہ تمھاری نیلوفر جیسی سرخی مائل آنکھیں نیند کے غلبہ سے مندی جارہی ہیں، تو ضرور اس میں کوئی بات ہوگی، پھر کہتی ہے کہ یہ آنکھیں چاندنی میں تو کھلی رہیں، لیکن آفتاب حسن کے مقابل میں کیوں بند ہوئی جارہی ہیں،

اس شعر کے معنوی محاسن کی تشریح آزاد نے خود کی ہے کہ نیلوفر کی دو قسمیں ہیں، شمسی و قمری، نیلوفر شمسی آفتاب کی روشنی میں کھلتا اور چاندنی میں مرجھا جاتا ہے، اور

---

۵۱ مقالات ۶/ ۱۲۶ ۵۲ سبحۃ المرجان ص ۳ ۵۳ سبحۃ المرجان ص ۲۴۳،

آزاد جیسا کثیر الکلام عربی شاعر ہندوستان کے کسی دور مین نہین پیدا ہوا، اپنی اس خصوصیت کا اظہار انھون نے خود کیا ہے[۵۱]

وما ظهر فی الهند قبلی من یکون	مجھ سے پہلے ہندوستان مین کوئی ایسا
له دیوان عربی ومن یکون له	شخص نہین ہوا، جو عربی دیوان رکھتا
شعر عربی علی هذه الحالة"	ہو، اور اس کے عربی اشعار ایسے ہون"

یہ کہنا کہ ان سے پہلے کوئی صاحب دیوان عربی ہندوستان مین نہین گذرا، صحیح نہین کیونکہ مسعود لاہوری کا صاحب دیوان عربی ہونا مسلم ہے، اگرچہ اس کا دیوان زمانہ کی ناقدردانی کے باعث ناپید ہو گیا اور چند اشعار کے سوا اس کے عربی کلام کا نمونہ بھی آج نہین ملتا، محمد مومن شیرازی بھی صاحب دیوان تھے، آزاد نے خود اس کو ہندوستان کے عربی شعراء کے زمرہ مین لکھا ہے، اور اس کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے[۵۲]

آزاد کے کلام کا بیشتر حصہ مدائح نبویہ پر مشتمل ہے، اسی لئے اُن کے استاذ نے اُن کو حسان الہند کا خطاب مرحمت فرمایا تھا[۵۳]

آزاد کی جدت طرازی آزاد کو عربی ادب کی طرح اپنے وطنی لٹریچر بھاشا مین بھی پوری مہارت تھی، اُن کے ذوق و وجدان نے ان دونون کے حسین امتزاج کا نہایت لطیف نمونہ پیش کیا ہے،

تعالوا واسمعوا لحن الأغانی عن الورقاء ثم الکوکلاء

انھون نے عربی مین "بھاشا" کے خیالات اور شاعرانہ صنائع منتقل کئے، ان صنعتون کی تعداد تیئیس (۲۳) ہے[۵۴] ہندی کے بحور و قوافی کا بھی عربی سے مقابلہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہین کہ ہندی کی اکثر بحرین عربی

---

۵۱ سبحۃ المرجان و ابجد العلوم ص ۹۲۲ ۵۲ سبحۃ المرجان ص ۲۰۸ ۵۳ ابجد العلوم ص ۹۲۲،
۵۴ مقالات شبلی ص ۲۶ جلد ۶ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان ص ۱۶۲، ۲۵۵،

سمجھتے ہیں، اسی مفہوم کو حسان الہند کی زبانی سنئے[۱]،

سمعت غراب الھند تضحی مبشرا — بعود حبیب یا لہ من مبشر

الا یا غراب البحد انت شقیقہ — فما لک تؤذی ھائما بالتطیر

عرب شعراء میں صرف ابو الشیص ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنے اسلاف سے الگ راستہ اختیار کیا ہے[۲]:-

ما فرق الاحباب بعد اللہ الا الابل

والناس یلحون غراب البین لما جھلوا

وما علی ظھر غراب البین تطوی الرحل

ولا اذا صاح غراب فی الدیار احتملوا

وما غراب البین الا ناقۃ او جمل

ہندیت | ہندوستانی نقطۂ نظر سے جو چیز آزاد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہے، وہی عربی شاعری کے نقطۂ نظر سے اُن کے کلام کا نمایاں عیب ہے؛

معشوق من است آن کہ بنزدیک تو زشت است

ان کے اشعار میں ہندیت اس قدر غالب ہے کہ اسالیب عرب سے بالکل مختلف نظر آتا ہے اور یہ سقم صرف ان ہی اشعار میں نہیں ہے جن کے متعلق یہ عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ علی الارتجال کہے گئے اور ان کے حک و اصلاح کی نوبت نہیں آسکی، بلکہ وہ طویل قصائد بھی جو یقیناً غور و تامل کے ساتھ کہے گئے ہیں اس سے پاک نہیں ہیں، مثلاً ان کا قصیدہ لامیۃ الہند پڑھ جائیے، اس کا دو سو شعر کے قصیدہ میں ایک شعر بھی تو ایسا نہیں ملیگا جس کو خالص عربی مذاق کا نمونہ کہا جائے، اس کے مقابل

---

[۱] سبحۃ المرجان ص ۱۰۳ و ۲[۲] الشعر والشعراء ابن قتیبہ ص ۳۴۰

قمری چاند کی روشنی مین شگفتہ رہتا ہے، اور طلوع آفتاب تک پژمردہ ہوجاتا ہے، آنکھون کو نیلوفر سے تشبیہ دینے مین یہ لطافت ہے کہ نیلوفر ایسا سُرخی مائل ہوتا ہے، جس طرح آنکھون مین شب بیداری کی وجہ سے سُرخ ڈورے پڑجاتے ہین، دوسرے شعر مین بدر و شمس مین صنعت توریہ ہے، یعنی شمس سے وہ اپنے حسن کی تعبیر کررہی ہے، اور بدر سے اپنی سوکن کی طرف اشارہ کیا ہے جس مین سوکن کی تنقیص اور اپنی فضیلت اور بڑائی کے ساتھ ہی باتون باتون مین شوہر کو اختیار ناقص پر غیرت بھی دلا رہی ہے،

اسی طرح یہ دونون اشعار[۵۱]

لقد نحلت فی یوم راح حبیبها　　　الی أن هوی من ساعدیها نضارها

ولما اتاها مخبر عن قدومه　　　علی الساعد العلان ضاق سوارها

بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے خالص ہندی ہین،

ایک اور شعر ہے[۵۲]

بتنا معًا فاذابدی فلق الدجی　　　غشلت بفضل الکم سلک جمان

ہندی ادب مین موتیون کا ٹھنڈا ہوجانا طلوع سحر کی علامت ہے، لہذا معشوقہ (بلکہ عاشقہ) زیورات اور گلے کے ہار کو چھپا رہی ہے کہ ان کی ٹھنڈک سے محبوب بیدار نہ ہوجائے، عربون کے یہان بھی "بَرد السوار" یعنی کنگن کی ٹھنڈک طلوع صبح کی دلیل ہے، چنانچہ ابو فراس بن حمدان کہتا ہے،

وکم من لیلۃٍ لم ارو منها　　　حنیت لها تؤرقنی نوارُ

فبت اعلّ خمرًا من رضاب　　　لها سکر ولیس لها خمارُ

الی أن رق ثوب اللیل عنا　　　فقالت قم فقد برد السوارُ

شعرائے عرب کو غراب بین خون کے انسو رلاتا ہے، لیکن اہل ہند اسی کو غراب الوصل

---

[۵۱] سبحہ ص ۳۴ [۵۲] سبحہ: القصیدۃ الغزلانیہ، ص ۲۶۰، ۲۶۳

تصانیف[1] علامہ آزاد کو آج تک ہندوستان کا سب سے بڑا عربی شاعر اور مستند مورخ سمجھا جاتا ہے،
اور بقول علامہ شبلی گو وہ اختصار پسند واقع ہوئے ہیں لیکن جو کچھ لکھتے ہیں مستند و مفید ہوتا ہے، انکی
تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے،

(۱) ضوء الدراری، یہ صحیح بخاری کی شرح ہے جو شروع سے کتاب الزکوٰۃ کے ختم تک ہے، الحطہ
بذکر الصحاح الستہ میں نواب صاحب نے اس کی ابتدائی عبارت نقل کی ہے،

(۲) تسلیۃ الفواد،

(۳) سبحۃ المرجان، ان کی تصانیف میں بے نظیر کتاب ہے، جس کی تصنیف سے ۱۱۷۷ھ میں فارغ
ہوئے، اور جس کی توصیف میں خود رطب اللسان ہیں،

هذا الکتاب له محل شامخ   یدریه من هو صاحب العرفان
حررت تالیفی وقلت مورخًا   تجلو البصیرة سبحة المرجان

(۴) شفاء العلیل، اس کتاب میں عربی کے مشہور شاعر ابو الطیب احمد بن الحسین المتنبی (م ۳۵۴ھ)
کے دیوان پر تنقید و مواخذات ہیں،

(۵) غزلان الہند،

(۶) سند السعادۃ،

(۷) عربی دواوین، جن میں کل اشعار بہ قول علامہ صدیق حسن خان قنوجی گیارہ ہزار ہیں،
ان دواوین کی تفصیل یہ ہے :-

(الف) سبع سیارہ، یعنی سات دیوان کا مجموعہ، مثلاً دیوان مردف، دیوان مستزاد،
دیوان مرجع وغیرہ، یہ تمام اجزار، غزلیات و مدائح نبویہ پر مشتمل تھے، سبع سیارہ نواب صاحب

---

[1] تصنیفات کی فہرست ابجد العلوم ص ۱۳، ۲، ۲۲ و سے ماخوذ ہے۔

مین قاضی عبدالمقتدر کا لامیہ اپنی عجمیت کے باوجود حسنِ انسجام، برجستگی، عربیت اور مطبوعیت مین بڑھکر ہی، علامہ شبلیؒ لکھتے ہین [۵۱]،

" آزاد کا عربی اور فارسی کلام اگرچہ کثرت سے ہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے چہرۂ کمال کا داغ ہے، اس سے انکار نہین ہو سکتا، کہ وہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب ہین، نہایت نادر کتب ادبیہ پر اُن کی نظر ہی، لغات اور محاورات ان کی زبان پر ہین لیکن کلام مین اس قدر عجمیت ہے، کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے، اُن کو اس پر ناز ہے کہ انھون نے عجم کے خیالات عربی زبان مین منتقل کئے ہین، لیکن نکتہ سنج جانتے ہین کہ یہ ہنر نہین بلکہ عیب ہے "،

اس سخت عیب کے باوجود آزاد کی شاعری خاص مرتبہ رکھتی ہے، جس سے کسی کو انکار نہین ہو سکتا اب ان کے کچھ سنجیدہ اور سادہ اشعار پیش کئے جاتے ہین، جن سے اندازہ ہوگا کہ اگر اُن کے کلام کا اکثر وبیشتر حصہ اسی رنگ کا ہوتا تو ان کا مرتبہ ہر حیثیت سے بلند ہوتا [۵۲]

یا ظبیۃ فتنتنی این مرعاك	حیث اصبحت عین اللہ ترعاك
انی لھمت وما أمری بمبتدع	الآس والبان والغزلان تھواك
اری غصون النقا یرقصن قاطبۃ	لقد تمایلن نشوی من حمیاك
والشمس ترقل فی ابراجھا مرحا	لعلھا ما رأت یوما محیاك
لقد طال أشجانی بطول مطالك	فعطفا علی المملوك یا ابنۃ ملك
وما ابتغی واللہ مالا ودولۃ	ملاذك رجائی نظرۃ من نوالك
علی م أبث المشتکی ان نسیتنی	ومن أنا حتی اخطرن ببالك

---

[۵۱] مقالات ۲/۱۲۹ [۵۲] سبحۃ ص ۲۳۶ [۵۳] ایضاً، ۲۳۰،

ہندوستان کے عربی شعراء کی بزم مین مذکورۂ بالا اکابر کے علاوہ شیخ فضیل بن شیخ جلال کالپی[1] شاہ رفیع الدین[2] (م ۱۲۳۳ھ یا ۱۲۳۲ھ) فضل حق خیرآبادی صاحب قصائد فتنۃ الہند (۱۲۱۲ھ تا ۱۲۷۸ھ) نفیس علی بن مولانا نور[3] علی بن مولانا اکبر علی بن مولانا احمد اللہ سندیلی، نیفی[4] احمد بن حافظ غلام احمد ابن شمس الدین بن مولانا محمد علی بدایونی، علی عباس چریاکوٹی، سید احمد حسن قنوجی المتخلص بہ عرشی، شیخ اوحد[5] الدین ابن قاضی علی احمد بلگرامی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، شیخ عفیف علی رعب شاہ آبادی، عبد العلی آسی مدراسی، حافظ عبد الاول بن علی جونپوری، علامہ حمید الدین فراہی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی دیوبندی، حضرت شاہ انور کشمیری، مولانا احمد حسین اعظمی، ابو الطیب یعقوب بخش راغب بدایونی وغیرہ کے اسمائے گرامی روشن رہین گے خصوصاً فیض سہارنپوری، علامہ فراہی اور راغب بدایونی کا درجہ تو بہت ہی بلند ہے، مولانا فضل حق خیرآبادی کی ذات تبصرہ و تذکرہ کی محتاج نہین، انھون نے حریری و بدیع الزمان کے معارضہ مین اشعار کہے، اور خوب کہے، البتہ صنائع کے التزام سے کلام مین ثقل پیدا ہوگیا ہے، اس موقع پر نواب صدیق حسن خان کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا،

---

[1] تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء از مولوی عبد الشکور عرف رحمن علی ص ۱۶۵ [2] حالات خاندان عزیزی از مختار احمد آزاد مرحوم ص ۶۹، دار الحکومت دہلی ص ۵۰۸، حدائق الحنفیہ، ابجد العلوم ص ۲۱۳،
[3] تحفۃ الفضلاء کی عبارت ہے:- بمقام کلکتہ تحصیل علوم خصوصاً ادب عربی را بکمال حقہ تکمیل رسانیدہ دستگاہے پیدا کرد، و چند دیوان اشعار عربی دارد و بمدرسۂ کلکتہ دو صد و پنجاہ روپیہ مشاہرہ می یافت و مدرس بود نزد ملک نصیر الدین حیدر فرمانروائے لکھنؤ بود، بکلکتہ رحلت نمود" ص ۲۵۰ [4] آپکے قصائد زیادہ تر حضرت غوث الاعظم کی منقبت مین تھے، عربی و فارسی مین تین دیوان تھے، اپنے ماموں شاہ فضل رسول بدایونی سے تحصیل علوم کی (تحفۃ الفضلاء ص ۱۶۵) ان کا کلام غدر ۵۷ھ کے ہنگامہ مین برباد ہوا [5] ابجد العلوم صفحہ ۲۱۴،

کے پاس موجود تھا، [1]

(ب) مرآۃ الجمال، ایک قصیدہ ہو جس مین معشوق کے ہر عضو کے حسن و جمال کو قلمبند کیا ہے، اور خود ہی اس کی ایک لطیف شرح بھی لکھی ہو،

(ج) دو دیوان جو مدینہ طیبہ بھیجے گئے، اور روضۂ اقدس مین پیش ہوئے تھے، ان دونون مین کل تین ہزار اشعار ہین،

(د) مظہر البرکات، مثنوی کے وزن پر سات دفاتر کا مجموعہ، جس کے متعلق نواب صدیق حسن خانؒ رقمطراز ہین :-

مزدوجۃ فی البحر الخفیف فی	مزدوجہ ہے بحر خفیف مین، جس
غایۃ السلاسۃ والعذوبۃ	کی زبان نہایت ہی سلیس اور شیرین
ولم ینظم احد قبلہ مزدوجۃ	ہے، ان سے پیشتر کسی نے اس بحر مین
عربیۃ فی ھذا البحر (ابجد العلوم ص۲۱۳)	عربی مزدوجہ نظم نہین کی؛

نواب صاحب کا بیان ہو کہ اس کا ساتوان دفتر ۱۱۹۶ھ مین نظم کیا گیا، اگر یہ صحیح ہے تو یہ کہنا کہ آزاد کی وفات ۱۱۹۴ھ مین ہوئی صحیح نہین ہوسکتا،

(ہ) نواب صاحب نے مذکورۂ بالا دواوین کے علاوہ اور تین دیوانون کا ذکر کیا ہے جن مین یا تو نعت و مدائح نبویہ ہین ان مین سے کسی کے نام کی تصریح نہین کی ہے (ابجد ص۹۲۲)

علامہ آزاد کی فارسی تصانیف مین ید بیضاء، سرو آزاد، مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیاء، ہندوستان، ایران، توران کے شعراء کے تذکرے، سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات، فارسی دیوان وغیرہ ہین،

---

[1] معارف پریس سیارہ اسی پریس لکھنؤ سے شائع ہوچکا ہے،

فاصبح صدری فاسحًا بعد ضیقة ‏ واصبح قلبی فارحًا بو فورًا

ونبأ الاحباب بعد طول لقائھم ‏ کروح سری فی المیت بعد ھوًا

نسیم الصبا ان زرتھم بلغی لھم ‏ تحیة من قد قام بعد نشورًا

آپ کے دو قصیدے دست خاص کے لکھے ہوئے برادر محترم مولانا صغیر حسن صاحب معصومی لکچرر فلسفہ اسلام، ڈھاکہ یونیورسٹی کے پاس تھے، لیکن افسوس کہ دونون ناگہانی طور پر ضائع ہوگئے، اب صرف ایک ٹکڑا باقی رہ گیا ہے جس کے دونون طرف چھ چھ اشعار ہین، ان مین سے ایک قصیدہ لامیہ تھا، اور دوسرا نونیہ، اس ٹکڑے مین جتنے اشعار ہین، قصیدہ نونیہ کے ہین، ایک جانب ذیل کے اشعار ہین،

لولا الھوی خفرت عھود نبی الحجی ‏ ایدی الکروب علی ذوی الاذمان

ولما تعارفت النفوس محلھا ‏ والسرب جوء ذرھا مدی الاوان

ترمی فوارسھا السھام فما سھت ‏ وتعود طاغیة من الشّران

فتصاب من ذالک الحمام ولم تمت ‏ وتفتش ھذا اشرف البنیان

لولا الھوی لم یذکر اللسن الذین خلوا ولم یفصح لھم بلسان

وھی الکریمة عنصر الحیاة تنا ‏ وحیاة من قد دبّ فی القیعان

دوسری طرف یہ اشعار ہین:-

ھیھات اعفی الدھر اُبلی رسمھا ‏ وجفت علیھا نائبات زمان

وغدا احذ وق الناس جل سفیھھم ‏ وحکی القرود مناطق الانسان

ورأوا فلول العود سیفا باترا ‏ ورأوا جبانا مقتدی الشجعان

ضرب الجلاجل ایقنوہ عبادة ‏ والکفر قد سمّوہ بالایمان

ذاتی فیھا بکل لفظ لطیف	یعنی ان کے شعر کے الفاظ لطیف اور
ومعنی بدیع اولا انہ اکثر	معانی بدیع ہیں، کاش تجنیس،
فیھا من التجنیس والاشتقاق	اشتقاق اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت
والالفاظ الحوشیۃ بلاخلاف	نہ ہوتی،

اسی طرح مولانا راغب بدایونی (۱۳۰۸ھ - ۱۳۶۷ھ) کے کلام میں بھی بعض جگہ التزام صنائع کی وجہ سے تکلف پیدا ہو گیا ہے،

ناظرین سے احمد حسین اعظمی کا تعارف کرا دینا ضروری ہے، کیونکہ اُن کے نام و کلام سے اکثر و بیشتر قارئین ناواقف ہوں گے،

احمد حسین اعظمی رسول پور، اعظم گڈھ کے رہنے والے، لانبا قد، چھریرا بدن، گندمی رنگ، ناک کھڑی طبیعت میں شاعرانہ ظرافت، بیحد جیت و چاق، بے لوث و بے غرض انسان تھے،

موصوف نے رام پور، اور خیرآباد میں تحصیل علم کی، علامہ طیّب مکّی سے شرف تلمّذ تھا، مشرقی پاکستان کے دارالسلطنت ڈھاکہ میں ایک مدّت تک رہے، مدرسہ حمادیہ کے صدر المدرسین تھے، ۱۹۱۹ء میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر وطن لوٹ گئے، اخیر زمانہ میں دوستوں کے اصرار پر دوبارہ ڈھاکہ تشریف لائے، پھر مگرلہ جاکر اپنے طبی تجربات سے خدمت خلق کرتے رہے، کم و بیش پچھتر برس کی عمر میں اپنے وطن میں بعارضۂ اسہال وفات پائی، سن وفات ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۸ء ہے،

عربی ادب میں خاص دستگاہ رکھتے تھے، اُن کے کلام کی خصوصیت ذیل کے اشعار سے واضح ہو جائیگی، ایک خط میں فرماتے ہیں،

وأخبرنی ریح الصبا عن جنابکم بما زال احزانی وزاد سروری

انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت

از

مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

کوئی تراشا ہوا خیالی افسانہ نہیں بلکہ معتبر راویوں کی مسلسل سند کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کا جو مجموعہ ابن سعد کے طبقات میں پایا جاتا ہے، اسی کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، ہر ہر واقعہ کے لئے حوالہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ یہاں جو کچھ بھی درج کیا جا رہا ہے صرف ایک ہی کتاب سے ماخوذ ہے،

دنیا کے تین[1] مشہور دل کشا اور دل آویز سیر گاہوں میں وہ خود شہر اور اس کا مینو سواد علاقہ سمجھا جاتا ہے، جہان کے حکمران کی یہ تاریخی داستان آپ کے سامنے ہم دہرانا چاہتے ہیں،

جانشین کے انتخاب کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں جس حکمران کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا گیا ہے وہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے، انتخاب کے وثائق ملک کے جس باوقار صاحب علم بزرگ کے سپرد کئے گئے ہیں، ان کو حکم ہے کہ جب تک موت اپنے فیصلہ کو قطعی شکل میں صادر نہ کرے، اس وقت تک انتخاب کس کا ہوا، اس کو صیغۂ راز میں رکھا جائے، جس کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کو خود اس کی خبر نہیں ہے، مسئلہ معمولی نہیں ہے، ایک بڑی حکومت کی حکمرانی اور فرمانروائی کا مسئلہ جس کی قلمرو کے حدود میں ایشیا اور افریقہ ان دونوں براعظموں کے تقریباً اکثر اور بڑے آباد علاقے شریک ہو چکے ہیں، اور جو شریک

---

[1] اسلامی تاریخوں میں غوطہ دمشق وادی سمرقند، نہر ابلہ زیریں دریائے دجلہ کے متعلق یہی یاد کرایا گیا ہے،

ویبایعون لنا مھم علما بأنھم ارسطالیس واللقمان[1]

اذا نھم صمٌ واعینھم عمی وقلوبھم عمہ من الطغیانِ

مذکورہ بالا اشعار سے اہلِ نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا کہنے والا عربی شاعری کا کتنا ستھرا مذاق رکھتا تھا،

تلک آثارنا تدل علینا

فانظروا بعدنا الی الآثار

[1] کذا فی الاصل و فی البیت اقوا، ۱۲،

چاہتے ہو، کہ تمھارے لئے مین کوشش کرون، تم پر حکمرانی کے شوق کی حرص سوار ہے"
یہ ایسا سخت اور کارگر حملہ تھا کہ منہ لٹکا کر بیچارے چلے گئے، قدرت نے فیصلہ کر دیا، ارباب بست و کشاد جمع ہوئے، لفافہ کھولا گیا، اور بادشاہی کے لئے جو چنا گیا تھا، اس کے نام کا اعلان کر دیا گیا جن کے سپرد یہ امانت ہوئی تھی، ان ہی کا بیان ہے،

" مین نے اپنے دونون ہاتھون سے اس شخص کے بازو کو پکڑا، اور اٹھا کر بزور اس منبر پہ لیجا کر بٹھا دیا، جس پر انتخاب کے بعد حکمران کو کھڑے ہو کر خطبہ دینا پڑتا ہے"،

وہی کہتے ہین مین اُن کو منبر کی طرف لئے چلا جا رہا تھا، اور ان کی زبان پر بے ساختہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ جاری تھا، اور یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کو نہین چاہتا تھا، وہی زبردستی میرے سامنے آئی، بادشاہی کا اعلان ہو گیا تخت نشینی کہئے یا منبر نشینی کی تقریب ختم ہو گئی، [۱]

گھوڑے ہین، خچر ہین، طرح طرح کی سواریان قطار در قطار سامنے ہین، ہر گھوڑے اور خچر کی لگام ایک سائیس کے ہاتھ مین ہے،

ان ہی سواریون مین مرحوم سابق حکمران کا شاہی گھوڑا بھی اپنی کامل زیب آرایش کے ساتھ

---

[۱] **معارف** حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف انتخاب سے پہلے اپنی نامزدگی کی مخالفت پر بس نہین کیا بلکہ چونکہ آپ کا انتخاب شوریٰ سے نہین ہوا تھا، اس لئے انتخاب و بیعت کے بعد مجمع عام مین دست برداری ظاہر کی، اور مسلمانون کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی، لوگو میری خواہش اور عام مسلمانون کے مشورہ کے بغیر مجھکو خلافت کی ذمہ داری مین مبتلا کیا گیا ہے، اس لئے میری بیعت کا جو طوق تمھاری گردن مین ہے، مین خود اسے اتار دیتا ہون، تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کر لو' یہ تقریر سن کر مجمع نے شور بلند کیا کہ ہم سب نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے، اور آپ کی خلافت سے راضی ہین، جب آپ کو اس کا یقین ہو گیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہین ہے، اس وقت اس منصب کو قبول فرمایا (سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ابن جوزی ص ۱۰۰)

نہیں ہوئے، حالات ایسے سازگار ہیں کہ ان کی شرکت کی توقع بھی بعید از قیاس نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں کرۂ زمین کی سب سے بڑی قاہرہ اور ہر لحاظ سے ممتاز ترین حکومت یہی تھی، تو یہ مبالغہ نہیں، بلکہ واقعہ کا اعتراف و اظہار ہوگا،

بہرحال راز کے وثائق کے امین سے وہی جن کا اس حکومت کی فرمانروائی کے لئے انتخاب ہو چکا ہے، دیکھا گیا کہ وہی ان سے کہہ رہے ہیں،

"اگر کچھ بھی میری محبت اور قدر و قیمت آپ کے دل میں ہے، تو خدارا مجھے آگاہ کیجئے کہ کہیں قرعہ فال میرے نام تو نہیں ڈالا گیا ہے، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہی نہ ہوا ہو،"

ابھی اس کا وقت باقی ہے، کہ اس فیصلہ کو میں بدلوا سکتا ہوں، بات اگر ہاتھ سے نکل گئی، تو جو کچھ میں اس وقت کر سکتا ہوں، آیندہ وہ میرے بس کی بات نہ رہے گی،"

جو اس حکومت کی صدارت نہیں، بلکہ بادشاہی کے لئے چنا جا چکا ہے، مگر اپنے انتخاب کے اس واقعہ سے بے خبر ہے، گڑگڑانے لگا، خود ان ہی کا بیان ہے، جن سے وہ کہہ رہا تھا کہ

"دیکھئے اس بڑے کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت اپنے آپ کو نہیں پاتا،"

بار بار اسی فقرے کو وہ دہراتے جاتے تھے "امانت میں خیانت ہوگی اگر وقت سے پہلے تم کو میں آگاہ کر دوں" یہی جواب ان کو ملتا رہا، جب تقاضا حد سے زیادہ گذر گیا، تب میں نے بیان کیا کہ یہی ایک ذریعہ ان کے حاضر کرنے کا ہو سکتا تھا، بولے،

"خوب میں سمجھتا ہوں اپنے دل کی آرزو کو اس طریقہ سے تم میرے آگے پیش کر رہے ہو"

ہوتی تھی، تو مرکزی خزانہ سے روپیہ بھیجا جاتا تھا، اور یون حقدارون تک اُن کے حقوق پہنچا دئے گئے

طے کیا گیا کہ حکومت کی چیزون کے استعمال کا حق صرف اسی وقت تک ہے، جب تک کہ حکومت

کا کام انجام دیا جائے۔ اس قسم کے عملی نمونون کو پیش کرکے حکام اور عہدہ دارون پر اپنا منشا

واضح کیا جاتا تھا، مثلاً حکومت کا کام رات کو جب کرتے تو حکومت کی شمع استعمال ہوتی، مگر اسی وقت

کسی ذاتی ضرورت کے لئے کچھ لکھتے، تو وہ ہٹا دی جاتی، اور ذاتی مملوکہ شمعدان کی روشنی سامنے لاکر رکھدی جاتی،

شاہی خزانے سے مشک کا ذخیرہ برآمد ہوا، دیکھا گیا کہ ناک کو انگلیون سے بند کئے ہوئے

ہین، کہنے والے نے کہا اگر خوشبو ناک مین آگئی، تو یہ مشک مین تو تصرف نہ ہوا، فرمایا بجز خوشبو کے مشک

مین اور ہوتا ہی کیا ہے،

عوام کے لئے حکومت کی طرف سے سردیون کے موسم مین گرم پانی کا انتظام غسل اور وضو کے لئے

کیا جاتا تھا، ابتدا مین دو ایک مہینے تک وہی پانی آپکے لئے استعمال مین بھی آیا، بعد کو معلوم ہوا، کہ حکومت

کے خرچ سے پانی گرم کیا جاتا ہے تو حساب کرکے اتنی لکڑیان حکومت کے ذخیرے مین جمع کرا دی گئین

مفلوکون، مسکینون، مسافرون کے لئے شاہی مہمان خانے سے کھانا کھلانے کا نظم کیا گیا تھا۔

اسی باورچی خانہ سے دہی کا ایک پیالہ آپ کی بیوی صاحبہ کے لئے لونڈی مانگ کر لئے جا رہی تھی، پوچھا

کیا ہے؟ لونڈی نے عرض کیا آپ جانتے ہین، کہ بیوی صاحبہ حاملہ ہین، دہی کی خواہش ان کو ہوئی

وقت پر کہین نہین ملا، لونڈی نے یہ بھی کہا، مشہور ہے کہ حاملہ عورت کی خواہش اگر نہ پوری کیجائے تو

کہا جاتا ہے کہ بچہ ساقط ہو جاتا ہے، اسی لئے مہمان خانے سے دہی مانگ کرلے جا رہی ہون، لونڈی

کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا گیا اور گھر پہنچے تو کڑکتے ہوئے کہہ رہے تھے "اگر غربا اور فقرا ہی کے کھانے سے

بچہ پیٹ مین ٹھہر سکتا ہے تو خدا تیرے پیٹ کے بچہ کو گرا دے"

اور دہی کا پیالہ واپس کر دیا گیا،

سامنے لاکر کھڑا کیا گیا اور کہا گیا سوار ہو جائیے، انھوں نے گردن جھکائی، اور بغلہ شہباز، اشہب رنگ کا خچر جس پر ہمیشہ سوار ہوتے تھے، حکم دیا کہ سب کو لیجاؤ، اور اسی خچر کو میرے آگے لاؤ، چنانچہ وہ لایا گیا اور آپ سوار ہو کر چل پڑے، جلوس کی شاہانہ سواریاں واپس ہوگئیں، جا رہے تھے، سامنے دارالخلافت کا قصر رفیع تھا، مگر اپنے خچر کا سوار آگے بڑھا جا رہا تھا، عرض کیا گیا کہ بادشاہ کا محل یہ چھوڑ دیا، اس میں مرحوم کے بچے اور اہل وعیال ابھی ہیں، میرے لئے تو میرا فسطاط (خیمہ) ہی کافی ہے، یہ فرماتے ہوے حکم دیا گیا، کہ مرحوم کے لوگون کے لئے پہلے مکان کا نظم کر لیا جائے، تب حکومت کے کامون کی نگرانی کے لئے مین حکومت کے اس مکان مین آؤن گا، یہ بھی کیا گیا،

شاہی توشک خانہ سے غالیچین، قالینون، گدون شطرنجیون، مسندون کا ایک انبار اسی پرانے گھر یا خیمہ مین بھیج دیا گیا، یہ کیا ہے شاہی فراش خانہ کا سامان ہے، جواب دیا گیا، سب کو واپس لیجاؤ، صرف آرمینیہ کا بنا ہوا ایک نمدہ اس سے نکال لیا گیا، زمین پر خود ہی اسے بچھا کر بیٹھ گئے، "حکومت کے کام کو اسی پر بیٹھ کر اگر انجام نہ دیتا، تو مین تجھ پر ہرگز نہ بیٹھتا" یہ فقرہ آرمینیہ کے اسی نمدے کو خطاب کر کے کہا گیا،

فرمان پر فرمان حکم پر حکم جاری ہونے لگا "غیر قانونی ذریعہ سے جس کے پاس جو چیزین بھی پہنچی ہین، ایک ایک کر کے واپس کر دی جائین، خواہ وہ کوئی ہو اور خود فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس کام کو چاہئے کہ مین خود اپنی ذات سے شروع کر دون"

کوڑی کوڑی کا حساب کیا گیا، قانون نے جسکی واپسی کا حکم دیا، وہ واپس کر دی گئین، جن مین بعض غیر معمولی پتھر کے نگینے بھی تھے،

ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر ضلع مین تو منظالم کا نظم کیا گیا یعنی غیر قانونی ذرائع سے جن کے پاس جو کچھ ہے اس کو حقدار دن تک پہونچایا جائے، اس کا خاص محکمہ کھولا گیا، صوبہ کے مقامی خزانے کی رقم اگر کافی نہین

کو سامنے بٹھا کر حکمران کی طرف سے یہ عہد نامہ پیش ہوا کہ

"میں آپ لوگوں میں سے ہر ایک کی جو مجلس شوریٰ میں حاضر ہیں گے، ان کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گا"

اور حکومت کے پورے دور میں اس عہد نامہ کی پابندی کی گئی،

ایک کھانی وسیع تھا انتظام کے لئے جتنے آدمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہوگی، اس کا خود اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی مجلس شوریٰ کے ایک رکن نے بڑی اچھی بات اس وقت کہی، جب بیہودہ کے قابل کارآمد آدمیوں کے مہیا کرنے کا سوال انھوں نے پیش کیا، مجلس شوریٰ کے رکن نے کہا،

"آپ اس کی زیادہ پروا نہ کریں، آپ کی حیثیت تو گویا بازار کی ہے، ہر بازار میں جس چیز کی طلب ہوتی ہے رسد بھی اسی طلب کے مطابق ہوتی ہے، آپ کے بازار میں جس چیز کی [illegible] آپ کے ہاں آئے گی"

. . . .

گو اس بازار کے لوگوں کو جب مفصلات میں بھیجتے، تو وہاں کی عام پبلک کے نام حکمران اپنا ایک خط بھی بھیجتا تھا جس میں لکھا ہوتا کہ

"میں جنھیں بھیج رہا ہوں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ تم میں سب سے بہتر ہیں، مگر اتنی بات کہہ سکتا ہوں، کہ تم میں جو برے لوگ ہیں، اُن سے شاید یہ اچھے ہوں"

سب سے زیادہ توجہ اپنے ولاۃ اور حکام کو اس مسئلہ کی طرف دلاتے تھے کہ رعایا پر محصولوں کا جو بار ہے، حتی الوسع اس بار کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے، عموماً محصولوں کی وہ قسم جنھیں اس زمانہ میں مکس اور [illegible] مکس کہتے ہیں، ان کا اور ان کی مختلف قسموں کا فرامین میں ذکر کر کے لکھا کرتے:-

اس معاملہ مین حکام کا شعور اس حد تک بیدا ہو چکا تھا کہ ایک بڑے محکمہ کے ذمہ دار افسر کا بیان ہے کہ حسب دستور مین کاغذات پیش کر رہا تھا، اب ایک بالشت تھا، یا چار انگل کے برابر سادہ کاغذ تھا، مین نے دیکھا کہ اس سادہ کاغذ کو اپنی ذاتی ضرورت مین انھون نے استعمال کیا، چونکہ یہ پہلا واقعہ تھا، جو اس افسر کے سامنے گذرا تھا، دل مین خیال آیا آج غفلت کا شکار یہ شخص بھی ہوا، مگر دوسرے دن وہی کہتے ہین کہ خلاف دستور کاغذات جو دیکھے ہوئے تھے، ان کے بستے کو واپس منگایا، مین نے بھیج دیا، واپسی کے بعد جب اپنے بستے کو کھولا تو دیکھا کہ سادہ کاغذ کا ایک ٹکڑا جو اسی کاغذ کے برابر تھا، بستے مین دوسرے کاغذون کے ساتھ لپٹا ہوا رکھا ہے، "غفلت کا شکار ہوا" اپنے اس خیال مین ان کو ترمیم بھی کرنی پڑی، اور حکمران کی نظران معاملات مین کتنی کڑی اور سخت ہے، اس کا بھی تجربہ ہوا،

یہ تو ان کے ذاتی تقوے ہین، دیکھنے کی بات حکمرانی کے وہ خاص طریقے ہین، جو انھون نے اختیار کئے تھے، سب سے پہلی چیز تو وہی ہے کہ خود اپنے آپ کو انتخاب کے لئے پیش نہین کیا، بلکہ آپ سن چکے کہ اس سلسلہ مین ان کی کوشش کی نوعیت اس طریقۂ کار کے بالکل برعکس تھی، جسے آج انتخابی قصون مین لوگ اختیار کر رہے ہین" درہمِ خود قصیدہ گفتن جس کا دوسرا ترجمہ مینی فسٹو کیا جا سکتا ہے، اور لوہے کا وزن نہسہی لیکن چاندی اور سونے کے دباؤ سے رائے عامہ کو دبانے اور ضمیر و احساس کے خلاف اپنے مطابق بنانے مین کرنے والے جو کچھ کر رہے ہین، سب کے سامنے ہے آخر کیا فرق ہے چنگیز و تیمور کی آہنی تلوار اور انتخابی ارکان کے نقرئی و طلائی گرزون مین یقیناً روح کے لحاظ سے دونون کے جرم کی نوعیت ایک ہی ہے صرف بیرونی قالب بدلا ہوا ہے،

دوسری بات اس سلسلہ کی وہ ہے کہ عنانِ حکومت کو ہاتھ مین لینے کے ساتھ ہی انھون نے ملک کی چند ایسی ممتاز و نمایان ہستیوں کا انتخاب کیا، جن کی سیرت و کردار کی استواری، علم و فہم کی گہرائی پر اس عہد کی عام مخلوق کامل اعتماد رکھتی تھی، یہ دس آدمیون کی مجلس شوری تھی، اراکین شوری

ہوگیا ہے کہ خود صدقہ ادا کر رہا ہے"

تجارت میں زراعت میں، یا کسی اور کاروبار میں جو نقصان اٹھاتے تھے، یا مقروض ہو جاتے تھے، بیان کیا گیا ہے کہ ملک کے دور دراز گوشوں سے اس قسم کے تاوان زدہ افراد آتے، اُن کے واقعہ کی تحقیق کی جاتی، جب ثابت ہو جاتا کہ واقعی تاوان کے وہ شکار ہوئے ہیں، تو صدقات کے شعبہ سے ان کی تلافی کر دی جاتی تھی، لکھا ہے کہ چار چار سو طلائی اشرفیاں بسا اوقات کسی ایک ایک آدمی کو اس سلسلہ میں ملتی تھیں، نہ صرف مرکزی خزانہ سے یہ امداد لوگوں کو ملتی تھی بلکہ ہر ہر علاقہ کے مقامی خزانوں میں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، عام فرمان تمام ملک میں گشت کرا دیا گیا تھا کہ جس شخص پر کوئی ایسا بار ہو جس کے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، تو خزانے سے رقم اس کی طرف سے ادا کر دی جائے"

یہی نہیں بلکہ اسی فرمان میں یہاں تک لکھا پایا جاتا ہے کہ جو شادی کرے، اور مہر ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کو بھی مہر ادا کرنے کے لئے خزانے سے رقم عطا کیجائے،

سرکاری خزانے کی ان مدوں سے استفادے کے لئے صرف یہ شرط تھی کہ وہ ملک کا باشندہ اور قانونی رعیت ہو، کسی نسل سے ہو، کسی فرقہ کا ہو، کسی قسم کا مذہب رکھتا ہو، ہر ایک کیلئے دروازہ کھلا ہوا تھا، لکھا ہے کہ

"ایک ایک بطریق (عیسائی پادری) کو ہزار ہزار طلائی اشرفیاں دی گئیں"

کم سے کم رعایا سے لیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان ہی سے لئے ہوئے مال کو انہی تک ایک خاص نظم کے تحت واپس کر دیا جائے، یہی ایک معاشی اصول جس پر یہ مثالی حکومت کار فرما نظر آتی ہے، اس سلسلے کے تفصیلات اگر تلاش کئے جائیں، تو ان سے کافی مجلد ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے،

"یہ کس نہین بلکہ بخس ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مین ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین (اور نہ کم کرو لوگون کی چیزون مین، اور بگاڑ پیدا کرنے والے ان مفسدین مین نہ بنو، جنھون نے زمین مین سر اٹھا رکھا ہے)

ایک دفعہ شکایت پیش ہوئی کہ محصولون کی تخفیف کی وجہ سے آمدنی فلان علاقہ کی بہت کم ہوگئی ہے، فرمان والی کے نام گیا "مین نے ان محصولون کو نہین ساقط کیا، بلکہ خدا نے ساقط کیا ہے" دارالسلطنت مین خبر پہنچی کہ ایک علاقہ مین حکام کا دستور ہے کہ پیداوار کی قیمت بازار کے مطابق نہین، بلکہ منمانے طریقہ سے لگا کر رعایا سے خراج وصول کرتے ہین، اسی وقت حکومت نے اپنے دو معتبر نمایندے بھیجے، حکم دیا گیا کہ جس کسی سے جتنی مقدار بھی زائد وصول کی گئی ہو، فوراً واپس کر دی جائے"،

اور گورنر کے لئے حکم تھا "ان دونون کے کام مین تمھاری طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ اگر ڈالی گئی تو یاد رکھو کہ تمھین جو بات ناگوار ہوگی، اسے اپنے سامنے پاؤ گے،

گھوڑون پر ڈاک آتی تھی، راستہ مین کسی مقام کی ڈاک کے گھوڑے بے کار ہوگئے، مقامی کسانون کو بطور بے گار کے حکام نے پکڑا، اوران ہی پر ڈاک لاد کر دارالسلطنت روانہ کر دی گئی اطلاع ہوئی، لکھا ہے کہ بے گار لینے والے پر پہلے تو چالیس کوڑے لگائے گئے، اور کہا کہ میری حکومت مین اور بے گار"!

شاہی خزانے کے تین شعبے کر دیئے گئے، ایک شعبہ مین خراج اور مالگذاری کی عام آمدنی جمع ہوتی تھی، دوسرے مین فوجی فتوحات کی آمدنی کا پانچوان حصہ جسے خمس کہتے تھے، جمع ہوتا تھا، اور تیسرا مستقل شعبہ ملک کے حاجت مندون، غریبون، یتیمون، تاوان زدہ افراد، مسافرون وغیرہ کے لئے مختص تھا، صدقات و زکاۃ کی آمدنی اسی شعبہ مین جمع ہوتی تھی، دیکھا گیا تھا، دیکھنے والون کا چشم دید بیان ہے، ایسا نظم قائم کر دیا گیا کہ گذشتہ سال جو خود خیرات کا مستحق تھا، اس کے پاس اتنا سرمایہ اکٹھا

اور یہی روح ہے مثالی حکومت کی جس مین حکومت کی آخری اقتداری طاقت حکومتی آمدنی سے استفادے مین سب سے آخری ہستی سمجھی جاتی ہو،

یہ سیدنا حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ہین جن کی حکمرانی کا زمانہ خواہ جتنا بھی مختصر ہو، لیکن صدیون قائم رہنے والی حکومتون کے لئے ان کی "مثالی حکومت" پہلے بھی قابلِ رشک تھی، اور جب تک الدین یا انسان کی قانونی زندگی پر پولیس و فوج کی نگرانی کے ساتھ اللہ کی نگرانی کا یقین مسلط نہ ہوگا، ان کی یہ مثالی حکومت آیندہ بھی قابلِ رشک رہے گی، کیونکہ جب تک الدین للہ کے اصول کو مان کر خواص و عوام کو اس راہ پر نہین لائین گے فتنہ کا ازالہ نہین ہو سکتا،

گاندھی جی نے بھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حکومتون کو مثالی حکومت قرار دیکر مطالبہ کیا تھا کہ اسی کو چاہئے کہ نمونہ بنایا جائے میرے خیال مین اسی کے ساتھ حضرت عمر بن عبد العزیز کے نام کا بھی اضافہ ہونا چاہئے،

مگر امکان اس کا سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی قاعدے سے پیدا ہوا تھا جس کا ذکر مین نے شروع ہی مین کیا تھا، یعنی حکومت کی آمدنی حکومت کی یا جن لوگون کی حکومت تھی ان کی آمدنی سمجھی جاتی تھی، نہ کہ ان لوگون کی جن کے سپرد حکومت کی باگ کردی جاتی ہے،

اسی مثالی حکمران کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خاندان مین پیدا ہوئے تھے، والد اُن کے ملک مصر کے گورنر تھے، انتخاب سے پہلے ان کی زندگی امیرانہ تھی، ایک ایک قمیص کا کپڑا چار چار درم کا استعمال کرتے تھے، کھانے پینے، رہنے سہنے، الغرض زندگی کے تمام شعبے مین ان ہی امیرانہ عادتون کے عادی تھے، لیکن حکومت کی ذمہ داری جب سر پر آگئی، تو اسی شخص کے اس لباس کا جسے جمعہ کے دن پہن کر منبر پر آئے تھے، جب حساب کیا گیا تو بارہ درم (ڈھائی روپیے) سے زیادہ پورے لباس کی قیمت نہ ٹھہری، لکھا ہے اس لباس مین عمامہ بھی تھا، اور قمیص بھی، قبا بھی، اور قرطق (کرتا) بھی، موزے بھی اور چادر بھی،

عمدہ کھانے کے عادی تھے، مگر حکومت کے بعد اس کا میسر ہونا دشوار ہوگیا، چنے اور مسور کی دال ہی پر کبھی قناعت کرنی پڑتی، پیٹ پھول جاتا، نفخ کی شکایت پیدا ہو جاتی، مگر صرف یہ فرما کر کہ

"اے پیٹ یہ تیرے گناہون کا جنازہ ہے،

خاموش ہو جاتے،

ان کا غلام جنگلوں مین لکڑیان اور مینگنیان تلاش کرتا پھرتا، کیونکہ بازار سے ایندھن خریدنے کی قیمت کبھی نہین ہوتی، ایک دن اسی غلام نے جو اپنے وقت کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کا غلام تھا، اسی نے ایک دن عرض کیا،

"آج ساری دنیا اچھے حال مین ہے، بجز آپ کے اور میرے"

و ذذرعا	سرش اور ذو ذرعا نے
خز وتقص وسخهم	بیدھا اور شکار کیا اور سیاہ رو کیا،
عوص ابنوهم علك	عوص نے فرزندان علک کو

اس ترجمہ پر بحث کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ترجمہ کے مصنف کو علم نہ تھا کہ جو مطالب اس سے چاہئیں مصنوعی عبارت کو دیدیا، دوسرے قاریان مسند نے نقوش کی جو آوازیں بتائی ہیں ان پر اس بحث کو ہم اس وقت ملتوی رکھیں گے، (ج ۲ ص ۴۰۸ و ص ۴۰۳) میں خود پادری صاحب نے نقوش کی جو آوازیں دی ہیں ان کے مطابق نہیں پڑھنا چاہئے تھا،

سارهو شهر و ذذرنبوهم سرش وذذريا

قتل وقتش وسخمهو ذا بنوهم اق

ایک توراتی مورث (تکوین ۱۰: ۲۳، ۲۶، ۲۸) کی جستجو اور علک کو سیاہ رو کرنے کے شوق نے ق کو عوص اور اق کو علک بنا دیا،

اس کتبہ میں کل ۳۰۵ نقوش ہیں، مکررات کو حذف کرنے کے بعد جملہ تعداد ۲۸ رہ جاتی ہے، ان میں سے ۱۵ اور ۹ کو عین اور غین سمجھنے سے عبارت بامعنی ہو جاتی ہے، یہ دو نقوش مجھے قدما کے یہاں نہیں ملے، باری باری سے ہر حرف قرار دیکر آخر میں ان نقوش کو ع، غ خیال کیا، اسی طرح ۲۸ بھی قدما کے یہاں نہیں ملا، اس نقش کو روئیدہ جر نے شین اور سین اور الف نما نقش کو "الف" اور "واو" پڑھا ہے، اکثر قاریان مسند اس کو اختتام لفظ کی علامت قرار دیتے ہیں، اس نقش کی آواز بحث طلب ہے لیکن یہ محل بحث کا نہیں ہے، کیونکہ اس کی قرات میں روئیدہ جر اور نادسٹر کا ہم نوا ہوں، باقی نقوش کو قدما کی بتائی ہوئی آوازیں دے کر پڑھیں تو تین مصرے بن جائیں گے۔

صَیِدْ مَا شَذَ زَدُذ ذُنُومِل عنا مَصَدْ شُوذُ ذُدغا قَذَ اقتشا

تاریخ یمن کی ایک سطر

عمرو بن عامر عرف مزیقیا کے عہد کا سیل عرم

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

دسمبر ۴۹ء کے معارف مین کتبات حصن غراب کی فارسٹری قرأت پر مختصر تبصرہ کیا جا چکا ہے، آج ان مین سے ایک کی صحیح قرأت پیش کی جاتی ہے، اس کا متن یہ ہے:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ تین سطرین ہین، دوسری سطر پہلی سطر کے پانچوین حرف کی سیدھ سے شروع ہوتی ہے، تیسری سطر پہلی سطر کے پانچ نقوش کا اعادہ ہے، پادری صاحب نے اس سطر کو قرأت مین حذف کر دیا ہے اور بار بار اسے دوسری قرار دیا ہے، نقوش کو مصنوعی آواز مین دیگر اسے پڑھا ہے،

سرهر — تقسیم کیا حصون مین،

وشنزر — اور دائین سے بائین لکھا،

وزنمو رنیو سرش — اور نقطے لگائے اس ترانہ فتح مین

۶- اور یہ لوگ مختلف دیار میں تتر بتر ہوگئے،

یہ قصہ سیل عرم کے اس قصہ سے ملتا جلتا ہے جو سورۂ سبا میں مذکور ہے، قرآن کا بیان یہ ہے کہ قوم سبا کے ایک شہر پر وہاں والوں کی ناشکری کے سبب بطور سزا کے خدا نے سیل عرم بھیجا، یہاں والے اپنے شہر سے نکلے، اُن کے درمیان اور برکت والی سرزمین کے درمیان چند زبردست آبادیاں حائل تھیں، ان آبادیوں میں چند دن اور چند راتیں اُن کے لئے سیر کرنا مقدر تھا، حکم تھا کہ ان بستیوں میں چند روز بے خوفی کے ساتھ بسر کر لو، پھر اپنے شہر کو چلے جانا، مگر ان لوگوں نے اپنی صوابدید کو خدا کی مصلحت سے زیادہ قیمتی سمجھا اور دعا کی کہ اے خدا ہماری سفروں میں درازی پیدا کر دے، ان کی یہ دعا قبول ہوئی، اور ان کو اس طرح پڑے پڑے سڑ کر کے بکھیر دیا گیا کہ اب وہ لوگ محض باتیں ہی باتیں ہو کے رہ گئے ہیں، یہ مضمون سورۂ سبا کی آیتوں کا ہے، اس وقت ہم کو ان آیتوں کی تفسیر کرنی منظور نہیں ہے، صرف کتبہ کی تشریح مقصود ہے، قرآنی قصہ کا تذکرہ صرف اس لئے کیا گیا تاکہ اس کتبہ کی اہمیت کا اندازہ ہو،

اس کتبہ میں جس واقعہ کا تذکرہ ہے اس کی بابت عرب میں یہ کہانی مشہور تھی کہ جبل مارب اور جبل ابلق کے درمیان زمانہ قدیم میں سبا نے ایک باندھ بنایا تھا جس میں کئی برساتی نہروں کا پانی آکر جمع ہوتا تھا، وادی حضرموت کا سیلاب بھی اس میں آکر گرتا تھا،

مارب میں ایک بادشاہ تھا، عمران بن عامر دوعاۃ سلیمانؑ میں سے تھا، اُس نے مرتے وقت اپنے بھائی عمرو بن عامر عرف مزیقیا کو بلا کر کہا کہ عنقریب یہ باندھ ٹوٹ جائیگا اور اہل مارب تتر بتر ہو جائینگے اور وصیت کی کہ اس آفت سے بچنے کے لئے ظریفہ کاہنہ سے رائے لیکر اس پر عمل کرنا، عمران کے مرنے کے بعد مزیقیا نے ظریفہ سے شادی کر لی،

ایک روز ظریفہ نے دیکھا کہ ایک کچھوا پانی میں سے کودا، پیٹھ کے بل زمین پر گرا، بڑی کوشش کے بعد کافی دیر گذرنے پر سیدھا ہوگیا اور دوبارہ پانی میں کود گیا، یہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور آنے والی آفت کی خبر مزیقیا کو دی اس کے

سَتِطرأذ رهنوم بیت صید ما

صید کو تتر بتر کر دیا، نوحل کے کیڑے نے جسے خارج کیا بڑی بارش نے جو کہ بدخو کو بہا لے گئی
سزا کے طور پر صید کے ساتھ رہنوم بھی جلا وطن ہو گئے"

صید ما کے آخر میں جو ما ہے، اس کی حقیقت ہمدانی کے اس بیان سے معلوم ہو گی، ریاً اور ماذنا کو حمیری میں ریام اور ماذنم بولتے ہیں، اسی طرح تلفم دراصل تلف تھا، اس کے آخر میں صا کا اضافہ ہوا پھر الف حذف ہو گیا، اور تلفم بن گیا، اس بیان کے مطابق ما عربی مبین کی تنوین کا بدل ہے، اور صید ایک ہمدانی قبیلہ کا نام ہے، دوذ، شو اور ستطراذ کو دود، سوء اور استطر د کا قدیم تلفظ سمجھنا چاہئے نوحل سے مراد یا تو نمل (چیونٹی) ہے یا نملہ ہے، حوض کے اندر بچے ہوئے پانی کو نملہ کہتے ہیں، اس لئے دوذ نوحل کے معنی پانی کے کیڑے کے بھی ہو سکتے ہیں، رهنوم کو عربی مبین میں راہنون سے بدل سکتے ہیں، یہ وہی لفظ ہے جس کے نقوش کو جعلی آوازیں دے کر یادری صاحب نے ابہوم پڑھا ہے، اس لفظ نے اس کتبہ کو حل کرنے میں ہم کو بڑی مدد دی ہے، رہنوم سے مراد بنو ازد ہیں جن کا رئیس سیل عرم کے زمانہ میں عمرو بن عامر عرف مزیقیا تھا، اس کے مزیقیا کہلانے کی اور بنو ازد کے رہنوم کہلانے کی وجہ آگے معلوم ہو گی، یت کو عبرانی ات (ہمراہ) سمجھنا چاہئے اور تفش کو عربی لفظ تفس خیال کرنا چاہئے جس کا ایک مطلب براہیم المارع نے جدا بتایا ہے،

یہ کتبہ ہم کو خبر دیتا ہے

۱- ایک زمانہ میں ایک نہایت بڑی بارش ہوئی،

۲- یہ بارش ذُو غار (بدخو) کو بہا لے گئی،

۳- یہ خدا کی طرف سے بدخوئی کی سزا تھی،

۴- قبل اس کے کہ وہ بارش آئے "ایک دوذ نوحل" کے خروج سے اس کا اندازہ ہو گیا،

۵- بنو صید اور اس کے ساتھ رہنوم نے جلا وطنی اختیار کی،

کتبہ کے مطابق سیدھا سادہ واقعہ یہ تھا کہ ایک آبی کیڑا یا چیونٹیون کا گروہ نہایت بری بارش کا اندازہ پاکر پانی سے یا بلون سے باہر نکل پڑا، اور اس کا خروج سابق تجربہ یا پیشین گوئی کے مطابق آنے والی آفت کا قدرتی اعلان تھا مگر زبانی روایت کے اعجاز نے اسے ایسا جرذ عفار بنا دیا، جو اپنے دونون ہاتھون سے پتھر کے اس دربند کو حرکت دے رہا تھا، جسے ۵۰ مرد مل کر ہلا نہین سکتے تھے۔

اس کتبہ کے داہنے حاشیہ پر [illegible] مکتوب ہے، جسے شط پڑھا جا سکتا ہے اس کا مطلب ہے سنہ ۳۰۹ حمیری مطابق سنہ ۱۹۴ء یہ ہے صیدما اور رہتوم کے استطراد و تمزق کا پہلا سال، عمرو بن عامر عرف مزیقیا اس سال مارب سے روانہ ہوا، اس کی نسل کی ایک شاخ شمال کی طرف روانہ ہوئی، کچھ لوگ مکہ مین رہ گئے، اور بنو خزاعہ کہلائے، کچھ لوگ مدینہ مین مقیم ہوئے، اور ان کا اسلامی نام انصار ہے ممکن ہے یہ انہی Anooritae کی نسل سے ہون جن کا ذکر رومی مورخون نے آلوس جالوس کے حملۂ یمن کے تذکرہ مین کیا ہے، کچھ لوگ ملک شام مین جا بسے، اور غسان کہلائے یہان پہنچ کر انھون نے اپنی ایک حکومت قائم کی، عربی روایت کے مطابق غسان کا اولین فرمانروا عمرو بن جفنہ بن عمرو بن عامر تھا صاحب تیجان کے بیان کے مطابق عمرو بن جفنہ نے دقیوس (Decius) قیصر (سنہ ۲۴۹ تا ۲۵۱ء) کے زمانہ مین وہان حکومت قائم کی جسے دقیوس نے کسی قدر جنگ و معاملہ کے بعد تسلیم کر لیا، عمرو بن عامر کے خروج سے لیکر عمرو بن جفنہ کے والی بلقا ہونے تک جملہ ۵۰ برس گذرے اور یہ خلاف قیاس نہین ہے،

عمرو بن عامر کی قوم مارب مین رہتی تھی صیدما کا وطن اس کتبہ کے شہر حضر موت کو ہونا چاہئے مارب کے بند کو جس سیلاب نے توڑا تھا اس کا سبب یہی معد شو تھا جس کا سیلاب حضر موت کی وادیون سے سد عرم مین پہنچا تھا،

پادری فارسٹر نقوش کی صحیح آوازون سے ناواقف تھے لیکن چونکہ اس کتبہ سے ایک عربی داستان کی اصلیت معلوم ہوتی ہے جس کا تعلق ایک قرآنی قصہ سے ہے اس لئے انھون نے اس کی تحریف کو ضروری سمجھا، اور اسی کی تحریف کے لئے تمام کتبات کی تحریف کی ہے دہ سطری کتبہ مین ایک لفظ منکر دیکھ کر جیسا کہ خود معترف ہین، ان کو انتہائی رنج ہوا تھا کہ اس سے تو قرآن کی تصدیق ہوتی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیل عرم کے قصہ کی تصدیق

بعد خود مزیقیا نے

رأی جرذا یحفر بالرجلین ویقلب — ایک چوہا دیکھا جو اپنے دونوں پاؤں سے زمین

الصخر بیدیہ التی لا یقلبھا — کریدتا تھا اور اپنے ہاتھوں سے وہ پتھر کو حرکت

خمسون رجلا (تیجان ص ۲۶۰) — دے رہا تھا جس کو ۵۰ مرد مل کر حرکت دے سکتے تھے

عمرو بن عامر نے اس کی خبر طریفہ کو دی تو اس نے کہا:

اذا ظھر الجرذ الحفار فاستبدل — جب زمین کریدنے والا جانور نمودار ہو گیا تو

دارا من دار وجارا من جار فحذرھا — اب اپنا وطن اور پڑوس بدل دو کیونکہ مصیبت

تنزل الاقدار — آنے والی ہے۔ (تیجان ص ۲۶۰)

طریفہ کی اس رائے کو مان کر مزیقیا اور اس کے لوگوں نے مارب کو چھوڑ کر دوسرے دیار میں چلے جانے کا فیصلہ کیا، اور اپنی تمام املاک دوسروں کے ہاتھ فروخت کر کے اور تمام منقولات کو ساتھ لے کر مارب سے چل پڑا، اور دیار عک میں پہنچا، تو اس نے وفات پائی، اس جگہ مختلف اشخاص کی قیادت میں اس کے ہمراہی متفرق دیار میں منتشر ہو گئے،

زیر بحث کتبہ میں رہنوم یعنی جائداد رہن کرنے والے ان ہی ازد کو کہا گیا ہے، عربی روایات کے مطابق انھوں نے اپنی املاک کو فروخت کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ رہن کیا تھا، اس لئے رہنوم کہلائے۔

زیر بحث کتبہ کے مطابق سیلاب کا تعین ازد تنت علم ذوذنول کی وجہ سے ہو گیا تھا، جسے سعد شمو یعنی بارش نے خارج کیا تھا، ذوذنول کو اگر ہم نمل سمجھیں تو حقیقت یہ تھی کہ بارش کا اندازہ پا کر چیونٹیاں کثرت اپنی بلوں سے نکل کر بلند مقامات پر چڑھنے لگیں، اور لوگوں نے فیصلہ کیا کہ زور کا سیلاب آنے والا ہے، لیکن نمل حوض کے اندر بچے ہوئے پانی کو بھی کہتے ہیں، اس لئے ذوذنول کے معنی ہوئے "آبی کیڑا"، یہی مفہوم عربی کہانی کے سلحفاۃ اور جرذ حفار کی اصل ہے،

موسیٰ جار اللہؒ کی بعض تصانیف

از

جناب مولانا عبدالمجید صاحب حریری قنصل جمہوریہ ہند برائے اسعودی عرب

"ہمارے فاضل اور محترم دوست مولانا عبدالمجید صاحب حریری ان علم دوست اصحاب میں ہیں جن کے تعلقات ہندوستان و بیرون ہند کے بہت سے علماء و مشاہیر سے ہیں، اور بنارس میں ان کا دولت کدہ اصحاب علم و کمال کا مستقل مہمان خانہ رہتا ہے، مشہور روسی عالم موسیٰ جار اللہ سے بھی اُن کے خاص روابط تھے، اور وہ بنارس میں کئی سال تک اُن کے مہمان رہے، جنوری کے معارف میں مرحوم موسیٰ جار اللہ کی وفات پر جو شذرہ لکھا گیا تھا، اس میں ان کے شغل تصنیف کا بھی اجمالی ذکر تھا، اس سلسلہ میں مولانا حریری نے بعض مفید معلومات لکھ بھیجے ہیں، ان کو گذشتہ شذرات کے تتمہ کے طور پر شائع کیا جاتا ہے"

"م"

حضرت الاستاذ الامام نے میرے یہاں بیٹھکر جو رسالے ترتیب دیئے وہ بھوپال سے شائع ہوئے انکی سب سے بڑی دو کتابیں ہیں جن کے مسودے وہ صاف کرا چکے تھے، اور اُنہی کی اشاعت کی آرزو اُن کو نقرہ لے گئی، مگر جب جمہوریہ ترکیہ نے ان مولفات کی اشاعت کی اجازت بہ خط عربی ان کو نہیں دی تب وہ شکستہ خاطر قاہرہ واپس آئے صحت تباہ ہو چکی تھی، اضمحلال حواس کے آثار بھی نمایاں ہو چکے تھے، وہاں بھی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور انھوں نے جوار رحمت الٰہی میں پناہ لی، یہ دو کتابیں یہ تھیں،

سے ان کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا،

سیل عرم کے وقت مارب کے فرمانروا کو مزیقیا کیا جاتا تھا، عربی کہانی نے اس کی وجہ تسمیہ یہ تجویز کی ہے کہ وہ اپنے کپڑے جب بھی اتارتا تھا تو پھاڑ ہی یا کرتا تھا لیکن اس لفظ کو فرق (پاش پاش کیا ہو) یا خدا وند کا) پڑھو پھر قرآن مین غور کرو سبا کی بابت کہا گیا ہے، مزقناہم کل ممزق، اس کتبہ مین تمزق کی حقیقت شذرا ورا ستطراد کے الفاظ ظاہر کرتے ہین، قرآن کے اندر مذکور سیل عرم کا زمانہ یقینی طور پر عمرو بن حفنہ کے زمانہ ۲۵۰ء سے نصف صدی قبل گذرا، لیکن الکلیل کے مصحح الاب انستاس ماری لکرملی البغدادی فرماتے ہین،

آج علما پر واضح ہوگیا ہے کہ سیل عرم کا انبثاق وانہدام ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان ہوا اس سے قبل نہین جیسا کہ بعض علماے عرب اور بعض اے غرب کا وہم ہے جسے مزید تشفی کی ضرورت ہو وہ مجلہ الاسلام مین مارب کو پڑھے۔ (حاشیہ اکلیل ص ۲۶۳)

عربیا بیفور محمد کے مولف ڈے لیسی اولیری (De Lacy O'leary) نے اس کا زمانہ ۴۴۷ء اور ۴۵۰ء ق م فرض کیا ہے سیلاب یمن مین بارہا آیا، متعدد قدیم تحریرون کے تذکرہ مین سیلاب کا ذکر ملتا ہے ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان بھی سیلاب آیا، اور سد عرم ٹوٹا بارہا اس کی مرمت ہوئی، مگر قرآن مجید مین جس سیلاب کا ذکر ہے وہ اس قدر قدیم زمانہ کا واقعہ ہے کہ خدا نے فرمایا،

وجعلناھم احادیث ہم نے ان کو باتین ہی باتین بنا دیا،

جس قوم پر یہ حادثہ گذرا جو قوم تتر بتر ہو کر اپنی قومی ہستی کھو بیٹھی اور سبا کی بجائے مزیقیا ہوگئی اسی قوم کے اس بیان پر کہ سیل عرم عمرو بن حفنہ (۲۵۰ء) کے دادا عمرو بن عامر کے زمانہ مین آیا تھا، اس قوم کی متواتر روایت کو محض اتنی سی بات پر جھٹلا دینا کہ عرب کے سیلاب کا ذکر ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان بھی ملتا ہے، تکذیب روایت کے شوق اور نئی بات کہنے کے اشتیاق سے بہتر کسی اور بات کا ثبوت نہین ہے قرآن مین یقینی طور پر عمرو بن حفنہ کے دادا مزیقیا کے زمانہ والے سیلاب کا ذکر ہے،

باب التقریظ والانتقاد

جہان نو[1]

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

مغربی قوموں کی ترقی کی نقل تقلید مین مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لئے مذہب کے نام سے قرآن و حدیث کی خالص مادی تفسیر و تاویل اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی بدعت سب سے پہلے صاحب تذکرہ نے جاری کی اور اب اس کی تقلید شروع ہوگئی ہے، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی قبیل کی ہے، گو مصنف کے نقطۂ نظر کے مطابق اسکا مقصد مسلمانوں کی مذہبی و اخلاقی اصلاح اور دنیاوی ترقی کی ترغیب دونوں ہے، لیکن اس کا طریقہ وہی ہے جو عنایت اللہ مشرقی نے تذکرہ میں اختیار کیا ہے، اور یہ کتاب اپنے خیالات کے اعتبار سے اس کا چھوٹا اڈیشن معلوم ہوتی ہے، یعنی نام تو مذہب کا لیا گیا ہے، اور اپنے خیالات کی تائید میں قرآن و حدیث، اسوۂ صحابہؓ تاریخ اسلام کے واقعات سے استدلال کیا گیا ہے، لیکن یا مصنف کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہے، یا انھوں نے عمداً تدلیس مغالطہ اور غلط استنباط نتائج سے کام لیا ہے، مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کی ضرورت سے انکار نہیں ان کی دینی اصلاح کیساتھ ان کی دنیا سنوارنے کی کوشش بھی مستحسن و محمود ہے، اور اس کی تعلیم خود اسلام میں موجود ہے، اس کے لئے قرآن و حدیث کی غلط تاویل اور تاریخ اسلام کو بگاڑنے علماء و مجتہدین کے کارنامون

---

[1] مصنفہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق تقطیع اوسط ضخامت ۲۵۱ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ کتاب منزل لاہور

۱۔ تاریخ مصاحف الامصار: اس مین انھون نے رسم مصاحف اور اسکی تاریخ پر ایک بڑی سیر حاصل بحث کی تھی، اور جامعۂ فواد اول مصر کے ایک مسیحی پروفیسر ولیم آرتھر جیفرے کی اُس خطرناک تالیف کی دسیسہ کاریون سے پردہ اٹھایا تھا جس مین اُس نے تاریخ تدوین وکتابت مصحف سے متعلق تمام شواذ قرأت وروایات کو جمع کرکے یہ ثابت کرنے کی نامراد کوشش کی تھی کہ معاذ اللہ متن قرآن بھی دوسری کتب سماویہ کے متون کی طرح محفوظ نہین رہا۔

۲۔ دوسری کتاب جس کی اہمیت پر وہ بہت زور دیا کرتے تھے، اور جس کی تالیف پر انھون نے اپنی عمر گران مایہ کے پورے بیس سال صرف کئے تھے، وہ القانون المدنی للاسلام ہے، اس کا مسودہ روس کی اکادمیہ مین اب بھی محفوظ ہے، اُن کی بڑی خواہش تھی کہ ترکیہ یا کوئی اور اسلامی حکومت اس مسودہ کو اکادمیہ سے حاصل کرکے چھپوا دے مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میرے مکرم دوست ڈاکٹر عبدالوہاب بے عزام سفیر مصر جو پچھلے ہفتہ قاہرہ واپس تشریف لے گئے ہین، وہ کوشش کرین گے کہ شیخ کی بقیہ تالیفات کے مسودے شیخ کے مصری دوستون سے حاصل کرین، اور اُن کی اشاعت کی کوئی سبیل نکالین، دیکھئے کہان تک کامیاب ہوتے ہین،

حضرۃ الاستاذ الامام رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کی تعداد سو سے زائد ہے، کچھ عربی مین ہین، جیسے شرح بلوغ المرام، شرح طیبۃ النشر فی القرأت الوشیعہ شرح شاطبیہ، بقیہ ترکی زبان مین، ان مین سے پندرہ بیس کتابین میرے پاس موجود ہین،

ئے ثابت ہوگیا، اس مین شبہہ نہین، کہ قرآن مجید سے کائنات کے بہت سے عجائبات کا پتہ چلتا ہے اور
ہ ابھی سائنس کا تخیل نہین پہنچا ہے، اس کے اشارات بھی موجود ہین لیکن ان کا ذکر قدرتِ خداوندی
بوت کے سلسلہ مین ہے، اور ان کا اوّلین مقصد خالق کائنات کی عظمت اور عبرت پذیری ہے تانوی
رسے اُن سے مادی فوائد بھی مراد لئے جاسکتے ہین لیکن ان کے اصل مقصد کو چھوڑ کر محض مادّی فوائد مراد
نا قرآن پاک سے بے بصـ ـی کا ثبوت ہے اور ان فوائد کے بارہ مین بھی مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا ذاتی استنباط
نا ت نہین بلکہ ایک مولوی ہی طنطاوی جوہری مصری کی تفسیر قرآن سے ماخوذ ہے جس مین اس قسم کے ورمباحث بھی ہین ھُدًی للمتقین
تفسیر مین ارشاد ہوتا ہے، تقویٰ کے معنی بچاؤ، دفاع اور سلفِ نفس کے ہین، یعنی قرآن ان قومون کا
تور العمل ہے جن کا دفاع مضبوط ہو، (ص ۱۰۴) یہ تفسیر تو لا تقربوا الصلوٰۃ کے مشہور لطیفہ سے
ی بڑھ گئی، مصنف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے کلام مجید کے ترجمہ مین اس قسم کی تحریفین جا بجا کی ہین،
نی فضلتکم علی العالمین کا ترجمہ کیا ہے تمھین یاد ہوگا کہ تمھارے تابدار کارنامون کی وجہ سے
م نے تمھین خیر الامم قرار دیا (ص ۱۲) اس ترجمہ مین تابدار کارنامے مصنف کا اضافہ ہے، جس سے اُن کا
صد دنیاوی ترقی کا ثبوت ہے، حالانکہ گروہ اس پر غور کرتے کہ یہ خطاب یہود سے ہے تو ان کو معلوم
جاتا کہ اُن کے تابدار کیا یہ تابدار کارنامے بھی نہین ہین، اللہ تعالیٰ نے ضرور ان کو اپنے فضل وکرم سے
انا اُ کو ایک زمانہ مین حکومت و سلطنت بھی دی، لیکن انھون نے ہمیشہ احکام الٰہی سے سرتابی کی،
ر اپنی بداعمالیون سے اس کو بھی کھو بیٹھے، قوم یہود کا اس کی قدیم تاریخ مین بھی کوئی کارنامہ نہین
ا ہے، مصنف نے ان کی جانب تابدار کارنامے منسوب کرکے نہ صرف اپنی قرآن فہمی بلکہ تاریخ سے بھی
اتفیت کا ثبوت دیا ہے،

اسی طریقہ سے وَمَن کفر فانَّ اللہ غنی عن العالمین کا ترجمہ مسلم ہو، یا کوئی اور گروہ منشائے الٰہی
... حل پڑے تو اللہ تعالیٰ سزا دینے مین کبھی دریغ نہین کرتے، وہ عالم سے بے نیاز ہین (ص ۲۴۲) جبھی

پر خط نسخ پھیرنے اور ان کے استخفاف کی ضرورت نہین ،جس سے اس کتاب کا صفحہ صفحہ لبریز ہے افسوس ہو کہ اس مختصر ریویو مین اس پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجایش نہین ہے، اس کے لئے اتنے ہی حجم کے کتاب کی ضرورت ہوگی ، اس لئے صرف اس کی کچھ مثالین نمونۃً پیش کی جاتی ہین ، ان سے کتاب کی نوعیت اور مصنف کے کمالات کا اجمالی اندازہ ہوجائے گا،

یہ ہر مسلمان بلکہ تعلیم یافتہ غیر مسلمون کو بھی معلوم ہو کہ قرآن مجید ہدایت و رہنمائی کا صحیفہ ہو، کسی علم و فن کی کتاب نہین ، اس کے باوجود مصنف کو اس کی ان آیتون مین جن مین کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہو محض سائنس کی تحصیل کی ترغیب اور سائنٹفک تحقیقات کی تعلیم نظر آتی ہے ، چنانچہ فرماتے ہین "جسے قرآن مجید نے ۷۰ ، مرتبہ بیان فرمایا، (یعنی کائنات پر غور و فکر کی آیات) اور جس سے ہمارے مقتدا و مولانا قطعاً ناآشنا ہین یہی وجہ ہو کہ وہ وعظ مین داڑھی کی لمبائی چوڑائی اور اس قسم کے باقی مسائل پر پورا زور صرف کرتے ہین، لیکن کوئلہ فولاد اور پٹرول کا نام تک نہین لیتے ، (ص ۲۵) گویا کلام اللہ کا مقصد کوئلہ فولاد اور پٹرول نکالنے کی تعلیم دینا تھا، ہمارے فاضل محقق قرآنی آیات سے استدلال اور علماء پر طعن و طنز کے بغیر بھی مسلمانون کو اس کی ضرورت کی جانب توجہ دلا سکتے تھے ، کیا وہ بتا سکتے ہین کہ انھون نے خود اپنی سائنٹفک تحقیقات سے مسلمانون کو کیا فائدہ پہنچایا، یا وہ محض داڑھی کی صفائی ہی مین لگے رہے ، انھون نے جن آیات سے کوئلہ فولاد اور پٹرول نکالنے کے احکام پر استدلال کیا ہو وہ ملاحظہ ہون اس سے ان کی قرآن فہمی کا اندازہ ہوگا وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس مین چونکہ لوہا پیدا کرنے کا ذکر ہو اس سے لوہا نکالنا مسلمانون کا فرض ہوگیا کوئلہ کی کان کنی کی فرضیت اس آیت سے ثابت کی ہو

الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا فاذا انتم منہ توقدون ؛ اللہ وہ ہو جس نے تمھارے لئے سبز درختون سے آگ کا سامان کیا جس سے تم آگ جلاتے ہو،

اس کی شرح مین فرماتے ہین "پٹرول کوئلہ کا پسینہ ہو، کوئلہ سبز درختون سے تیار ہوتا ہو جو آج سے کئی لاکھ برس پہلے زلزلہ کی وجہ سے زمین مین دب گئے تھے، (ص ۲۰ ") اس لئے کوئلہ اور پٹرول نکالنے کا حکم بھی قرآن

اس مین خیانت سے کام لیا، اس لئے غل کے لغوی معنی خیانت کے نہین ہوئے، بلکہ بطور نتیجہ کے اس کی تشریح خیانت سے ہوئی، جو بہت سی لغت کی کتابون مین اس آیت کے ضمن مین ملتی ہے، لیکن یہ قول شواذ مین ہے جمہور علماء کے نزدیک اس کے معنی اٹھانے ہی کے ہین، یہ مصنف کی فہم قرآن اور اُن کے تفسیری اجتہاد کے چند نمونے ہین اس کی مثالین اور بھی ہین لیکن سب کی تفصیل مقصود نہین،

حدیث کی صحت اور اس کی حجیت کے وہ منکر ہین، اور اس کی بے اعتباری کے ثبوت مین انھون نے وہی پرانے دلائل دہرائے ہین، جو منکرین حدیث عموماً دیا کرتے ہین، اور جن کے جوابات بار ہا دیئے جاچکے ہین لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو وہ حدیث کی صحت کے منکر ہین، دوسری طرف انھون نے اپنی تائید مین بکثرت حدیثون سے استدلال کیا ہے، اور عباسی عہد کی علمی ترقیون کے سلسلہ مین جن علمائے وائمہ کے نام لکھے ہین ان مین بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی بھی ہین (ص ۲۹)

ان ائمہ کی عظمت اور ان کا علمی کمال محض ان کی محدثیت و خدمت حدیث کی بنا پر ہے جب حدیث ہی مصنف کے نزدیک دفتر بے معنی ہے، تو پھر ان بزرگون کو اصحاب کمال کے زمرہ مین شامل کرنے کے کیا معنی ہین

فقہ و اجتہاد کے بارہ مین مصنف کے بیان مین عجیب تضاد نظر آتا ہے، ایک طرف تو انھون نے اس زمانہ مین اجتہاد کی ضرورت پر بڑا زور دیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ص ۶۰، ۶۱، اور قدیم مجتہدین کے کارنامون کو ان الفاظ مین سراہا ہے، تمام ائمہ مین اجتہادی مسائل مین شدید اختلاف تھا، ابن ابی لیلیٰ شہر کے سرکاری قاضی تھے، اور جب کوئی فیصلہ کرتے تھے تو امام ابوحنیفہ اُن کے خلاف فتوی صادر کرتے تھے، ص ۶۶ بشر بن غیاث المریسی تو امام شافعی سے باقاعدہ مناظرے کیا کرتے تھے، اور یہی وہ فقیہ ہے جس نے گدہا حلال کیا (ص ۶۶) (زبان کی تہذیب و شائستگی داد طلب ہے) امام ابو یوسف نے اپنی تحریرات مین امام مالک کی سخت تردید کی ہے اور بعض مسائل تو ایسے ہین کہ ساری خدائی ایک طرف اور امام مالک دوسری طرف ص ۶۶ ،

ناظرین کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اس تحریر سے مصنف کا مقصد اختلاف ائمہ کی مذمت ہے ایسا نہین ہے بلکہ

سراسر غلط ہے۔

سور کے بالوں کے استعمال کے جواز میں تحریر فرماتے ہیں، "گویا اللہ کو علم تھا کہ سور کے بال تیرہ سو برس کے بعد انسانی تمدن کا حصہ بن جائیں گے۔ اس لئے سور کو حرام کرتے وقت لحم الخنزیر کے الفاظ استعمال فرمائے، یعنی سور کا گوشت حرام قرار دیا، اور بالوں کے متعلق خاموشی اختیار فرمائی، ص ۲۰۸" اگر اس اصول کو صحیح مان لیا جائے تو پھر مصنف کے لئے ان تمام چیزوں کا استعمال جائز ہو جائے گا جن کی نجاست کے بارہ میں قرآن خاموش ہو، انکو غور کرنا چاہئے کہ اس کا سلسلہ کہاں تک پہنچتا ہے، اس کی تصریح کی ضرورت نہیں آیات ذیل

انا عرضنا الامانۃ علی السموات	ہم نے آسمانوں زمین اور پہاڑ کے سامنے امانت
والارض والجبال فابین ان یحملنھا	پیش کی پس انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار
واشفقن منھا وحملھا الانسان	کیا، اور ان سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو
انہ کان ظلوما جھولا،	اٹھا لیا، یہ بڑے بے ترس اور نادان ہیں

کی تفسیر میں مجتہدانہ شان سے فرماتے ہیں "کہ تمام علمائے اسلام نے حمل کے معنی کی تشریح میں غلطی کی ہے، اس کے معنی اٹھانے کے بھی ہیں، اور خیانت کرنے کے بھی اور اس موقع پر خیانت کرنا مراد ہے اس کی تائید میں انھوں نے قاموس کا حوالہ دیا ہے، ص ۱۴۶)

قاموس کے حوالہ کے ساتھ یہ کہنا کہ تمام علمائے اسلام نے حمل کے معنی کی تشریح میں غلطی کی ہے تضاد بیان کا عجیب نمونہ ہے، جب صاحب قاموس نے خیانت سے تشریح کی ہے، تو پھر سارے علما کو خطا کار بنانا کہاں تک صحیح ہے، یہ بھی مصنف کا نیا اجتہاد نہیں ہے، بلکہ بعض مفسرین خصوصا علمائے لغت نے خاص اس آیۃ میں حمل کی تفسیر خیانت سے کی ہے، لیکن حمل کے معنی کسی لغت میں بھی خیانت کے نہیں ہیں، بلکہ حملہا الانسان سے وہ کافر و مشرک مراد لیتے ہیں، جنھوں نے بار امانت کا حق ادا نہیں کیا، اور خدا کی نافرمانی کر کے

امام مالک کے اجتہاد کو سامنے رکھے جہاں کہیں ان کے وضع کردہ قوانین پسند آئیں انہیں اپنا لے ورنہ اپنی راہ خود نکالے (ص ۶۲)" اس اصول کے مطابق مصنف کے اجتہاد کے چند نمونے ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں "زکوٰۃ ایسی کوئی شرح قرآن نے نہیں مقرر کی ہے، اس لئے پاکستان کی طرف سے مختلف قسم کے ٹیکس بھی مد زکوٰۃ میں شامل کئے جا سکتے ہیں، (ص ۵۳)" داڑھی منڈانے کا اجتہاد یہ ہے کہ "قرآن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل کے متعلق احکام و ہدایات ہیں (یہاں سب کے نام لکھے ہیں) اس میں داڑھی کا ذکر نہ کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز مذہب نہیں ہے یا تو پھر قرآن نامکمل ہے، جس میں داڑھی جیسی ضروری چیز کے متعلق کوئی ہدایت موجود نہیں ہے داڑھی حضور کا ذاتی رجحان ہے جس کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے اس لئے مسلمان کو اختیار ہے چاہے رکھے چاہے نہ رکھے (ص ۱۱۰)"

کس قدر عالمانہ استدلال ہے قرآن میں تو نمازوں کے اوقات ان کی تعداد اور موجودہ شکل کا بھی کوئی تصریح نہیں ہے، اسلئے زکوٰۃ کی طرح نوافل و مستحبات کو بھی فرائض میں شامل کر لیا جائے یا داڑھی مونڈنے کی طرح سرے سے نمازوں ہی کو نہ مانا جائے، اس علم و استدلال پر اجتہاد کا بھی دعویٰ ہے داڑھی کو وہ روزے نماز اور حج و زکوٰۃ کی طرح کوئی بھی ارکان اسلام میں نہیں مانتا لیکن حضورؐ کے بعض افعال و احکام کا درجہ بھی واجبات سے کم نہیں ہے، اس مسئلہ پر اس سے زیادہ تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے،

اسی طریقہ سے مصنف بعض منصوص احکام یعنی چور اور زانی کی سزا میں بھی اپنے اجتہاد سے ترمیم چاہتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص ۹۹ و ۹۵، ان مثالوں سے ان کے تخیلہ اجتہاد کے مفہوم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اجتہاد کی آزادی کے ثبوت میں انھوں نے حضرت عمرؓ کے اجتہاد کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے "اجتہادی مسائل میں حضرت عمرؓ کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اخیافی بھائی، ماں اور باپ کی موجودگی میں حقیقی بھائیوں کو وراثت سے محروم کر دیا، اگلے سال سب کو شریک وراثت بنا لیا، کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا وہ اس فیصلہ کے مطابق تھا جو پچھلے سال کیا تھا، اور یہ اس فیصلہ کے مطابق ہے جو اس سال کیا ہے"

اس واقعہ کو انھوں نے اجتہاد کی آزادی کے ثبوت میں نقل کیا ہے، یعنی جب اور جیسی چاہے رائے قائم کر لے

اجتہاد کی مدح و توصیف مقصود ہو، یہ ان کی بلاغت ادا کی خوبی ہے کہ مدح و ذم میں امتیاز کرنا مشکل ہو، یہ واقعات انھون نے خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کے اردو ترجمہ سے بلاحوالہ نقل کئے ہین جو انھون نے اختلاف ائمہ کے سلسلہ مین تحریر کئے ہین، اور جن کو مصنف نے اپنے حسن تحریر اور تدلیس سے اس شکل مین کر دیا ہو اگر وہ اس کی پوری بحث یا ماقبل اور مابعد کی عبارتین بھی نقل کر دیتے تو ان واقعات مین بدنمائی نظر نہ آتی، لیکن انھون نے تو اپنی خوبی تحریر سے اردو ترجمہ کو بھی مسخ کر دیا ہے،

اجتہاد اختلاف ائمہ کی تحسین کے ساتھ اسلامی فرقون کے اختلاف کا رونا بھی روئے ہین، اور ان الفاظ مین اس کا ماتم کیا ہے "ہر مسجد اور ہر مکتب مین علیحدہ مذہب رائج تھا، اور ہر عالم دوسرے عالم کا کفر، ابن جوزی کے متعلق مشہور ہے کہ آپ غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے سلام کا جواب تک نہین دیتے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے کہ غوث اعظم بدعتی ہین، اس قسم کی بعض اور مثالین بھی انھون نے دی ہین (ص ۳۹)

یہ واقعہ معلوم نہین مصنف نے کہان سے نقل کیا ہو، اس کی حیثیت خرافات سے زیادہ نہین، ہو، ایک طرف تو مصنف کا تشدد اور بلندی یہ ہو کہ وہ قرآن مجید کے علاوہ حدیث کو بھی نہین مانتے، دوسری طرف وہ اس درجہ تک اتر آتے ہین کہ غوث و ابدال کی متصوفانہ اصطلاح کو بھی قبول کرنے مین ان کو تامل نہین شاید اپنی نسبت کی لاج مین یہ تنزل گوارا کیا گیا ہو کہ ان کے نام کے ساتھ جیلانی کی نسبت ہو،

یہ ایک درمیانی بات آگئی تھی، اصل مقصد یہ کہنا تھا کہ ایک طرف انھون نے اجتہاد پر بھی زور دیا ہو، دوسری طرف اسلامی فرقون کے اختلافات کا بھی ماتم ہو جو اجتہاد کی صورت مین ناگزیر ہو اسلئے کہ وحدت خیال تو تقلید کا نتیجہ ہوتی ہے،

مصنف کے نزدیک اجتہاد کا مفہوم بھی شرعی اجتہاد سے مختلف ہو، شرعی اجتہاد کی تفصیل بعد مین آئے گی، مصنف کے نزدیک کسی اصول اور شرط کے بغیر کسی مسئلہ مین اپنی پسند کی رائے قائم کرنے کا نام اجتہاد ہو، چنانچہ لکھتے ہین "مختلف مسائل مین بڑے بڑے ماہرین قانون مثلاً امام ابوحنیفہ امام شافعی اور

اور سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ مجتہد کے لئے عربی زبان و ادب، قرآن و حدیث اور اصول فقہ مین مہارت اور دیانت و تقویٰ بھی ضروری ہے،

ان شرائط سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی بنیاد قرآن و حدیث ہی پر ہے، خواہ اس کے الفاظ سے ہو یا اس سے مستنبط کسی اصول پر، ذاتی پسند اور رائے پر نہین ہے، ان شرائط کے ساتھ آج بھی اجتہاد کی اجازت ہے، لیکن اجتہاد مین خطا و صواب دونون کا امکان ہے، اس لئے صحابہ کرام اس مین بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، اور ناگزیر حالات کے علاوہ اجتہاد سے پرہیز کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ کا یہ اصول تھا، کہ جب آپ کے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا، تو پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے، اگر اس مین کوئی حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے، ورنہ حدیث کی جانب رجوع کرتے، اگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوتا، تو پھر صحابہ کرام کے مشورہ سے فیصلہ فرماتے (مسند دارمی)

کسی مسئلہ مین محض قیاس سے رائے زنی نہین کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اگر مین کتاب اللہ یا نامعلوم مسائل مین رائے زنی سے کام لون تو کون زمین میرا بار اٹھائیگی، اور کون آسمان مجھے سایہ دیگا (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۶) اور جب کبھی ناگزیر حالات مین اجتہاد کرنا پڑتا، تو یہ تصریح فرما دیتے کہ یہ میری رائے ہے، اگر صحیح ہے تو منجانب اللہ ہے، اور غلط ہے تو میری طرف سے ہے، اور مین خدا سے طالبِ مغفرت ہون،

یہی طریقہ حضرت عمرؓ کا تھا، آپ بھی نئے اور نامعلوم مسائل مین علی الترتیب قرآن و حدیث کی جانب رجوع کرتے تھے، اس کے بعد اس بارہ مین حضرت ابو بکرؓ کے فیصلہ یا فتوی کو تلاش کرتے، اگر ان کا فیصلہ بھی موجود نہ ہوتا، تو صحابہ کرام کے سامنے پیش کرتے، اور اس وقت تک بحث و مناظرہ کرتے رہتے، جب تک مسئلہ کے متعلق تمام شکوک و شبہات دور ہو کر پورا یقین، نہ ہو جاتا، (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۵)

یعنی دونون بزرگ پہلے قرآن و حدیث کی جانب رجوع کرتے تھے، اس کے بعد صحابہ سے رائے لیا کرتے تھے اور سب سے آخر مین اجتہاد کرتے، لیکن اُن کے اجتہاد کی نوعیت کا اندازہ حضرت عمرؓ کی ان ہدایات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور کوفہ کے قاضی شریحؒ کو لکھ کر بھیجی تھین، قاضی شریحؒ کو فیصلہ کے بارے مین یہ ہدایت دی تھی کہ

یہ واقعہ بھی انھون نے اوّل آخر کو حذف کر کے لکھا ہو خضری نے اس کو اس سلسلہ مین نقل کیا ہو کہ ائمہ اور صحابہ کرام

کے اجتہاد کی بنیاد غور و فکر اور دلیل و برہان پر ہوتی تھی اسلئے اگر کسی اجتہادی مسئلہ مین ایک فیصلہ کرنے کے بعد

ان کو اس کے خلاف کوئی دلیل مل جاتی تھی، اور وہ دوسرے نتیجہ پر پہنچتے، تو وہ بلا تامل پہلی رائے کو بدل دیتے

تھے غلطی پر جمے نہ رہتے تھے، ملاحظہ ہو تاریخ التشریع الاسلامی، (ص ۴۰، ۳ مطبوعہ مصر)

اس روشنی مین یہ واقعہ مصنف کے ذوقی پسند نما پسند کے اجتہاد کے خلاف پڑتا ہو یعنی اجتہاد کی بنیاد، ذاتی پسند و

رای پر نہین بلکہ دلائل پر ہو اس کے یہ معنی نہین کہ آج ایک بات پسند آئی، اسکے مطابق رائے قائم کر لی اور کل جب کوئی

دوسری بات پسند آگئی تو پہلی رائے کو بدل دیا، ذاتی پسند سے رای قائم کرنے اور بدلنے اور دلائل سے کسی دوسرے

نتیجہ پر پہنچنے مین زمین و آسمان کا فرق ہو، لیکن بالفرض اگر ان معنون مین بھی حضرت عمرؓ کی اجتہادی آزادی

کو مان لیا جائے تو کیا ہمارے مصنف مجتہد کا بھی وہی درجہ ہو اور وہ بھی حضرت عمرؓ کی اجتہادی آزادی کے اہل ہین

اب شرعی اجتہاد کے اصول و شرائط ملاحظہ ہون شریعت مین کسی مسئلہ مین ذاتی پسند سے رائے قائم کرنے

کا نام اجتہاد نہین ہو، بلکہ اس کے حسب ذیل شرائط ہین،

اجتہاد انہی مسائل مین ہو سکتا ہو جن کے بارہ مین قرآن مجید اور احادیث نبوی مین کوئی حکم نہین ہے

اور نہ اجماع سے اس کا ثبوت ملتا ہو جن مسائل مین قرآن مجید اور احادیث نبوی مین احکام موجود

ہین، یا جن پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے ان مین اجتہاد نہین ہو سکتا اجتہاد کے معنی ہین کہ نئے اور نامعلوم

مسائل کے متعلق قرآن و حدیث کی اساس پر احکام کا استنباط کرنا اس کی دو صورتین ہین،

(۱) ایک یہ کہ قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ سے احکام کا استنباط کیا جائے یہ اسی صورت مین

ممکن ہوگا جب قرآن کے الفاظ اس حکم پر حاوی ہون (۲) دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث کے الفاظ مین تو اس مسئلہ

کی صراحت نہ ہو لیکن اس مین ایسی علت اور سبب بیان کیا گیا ہو یا اس سے مستنبط ہوتا ہو جو زیر بحث مسئلہ

مین بھی پایا جاتا ہو تو اس صورت مین قرآن و حدیث کے عقلی مفہوم سے حکم اخذ کیا جائے گا (۳) ایک تیسری

...دی سے لیکر ساتوین صدی کے وسط یعنی اُن کے خاتمہ تک قائم رہا اگر مصنف زمانہ متعین کر دیتے تو
...مسئلہ زیادہ آسانی سے صاف ہو جاتا تاہم دونوں مین سے جو زمانہ بھی مراد لیا جائے، مصنف کو اتنا
...ہر حال ماننا پڑے گا کہ یہ مسلمانوں کے اوج شباب کا زمانہ تھا، ساری دنیا مین اُن کی عظیم الشان حکومتین
...ائم ہو گئی تھین اور وہ تہذیب و تمدن کی ہر شاخ مین اوج کمال تک پہنچ گئے تھے، اس لئے تقریباً
...ام نئے مسائل پیدا ہو کر طے ہو چکے تھے، اور طے شدہ مسائل کو بار بار بدلنے کا نام اجتہاد نہین، بلکہ
...ن نئے مسائل مین جن کے متعلق قرآن و حدیث مین احکام اور گذشتہ ائمہ کے اجماعی فیصلے موجود نہین ہین اجتہاد
...ر علمی سے فیصلہ کرنے کا نام اجتہاد ہے، مثلاً آج کل بیمہ کمپنیون، بینک کے منافع، صنعت و حرفت و تجارت
...غیرہ کی نئی شکلون مین اجتہاد کے شرائط کے مطابق ان کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، لیکن
...انے اجماعی اور متفق علیہ مسائل مین اجتہاد کی اجازت نہین ہے، اگر اس کی اجازت دیدی جائے تو
...ریعت کا کوئی قانون اور کوئی مسئلہ بھی اپنی جگہ قائم نہین رہ سکتا، جیسا کہ مصنف کی اجتہادی
...ثالون سے جو اوپر گذر چکی ہین، ظاہر ہے،

اس اصول کے مطابق اسلام کی ابتدائی چند صدیوں مین تقریباً تمام نئے مسائل پیدا ہو کر
...طے ہو چکے تھے اور اجتہاد کا موقع بہت کم باقی رہ گیا تھا، اس لئے قدرۃً اس کی رفتار سست پڑ گئی تھی
...لیکن اس کا دروازہ مطلق بند نہین ہوا، اور ہر دور مین علمائے مجتہدین پیدا ہوتے رہے، ان مین سے
...ض کے نام تو خود مصنف نے بھی لکھے ہین، امام ابن تیمیہ آٹھوین صدی ہجری مین تھے، خود ہندوستان
...ن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، ان کے علاوہ اور بہت سے
...م لئے جا سکتے ہین، اس لئے اجتہاد کا سلسلہ تو قائم رہا، البتہ چونکہ اس کی ضرورت کم باقی رہ گئی تھی
...س لئے اس کی نوبت کم آئی،

ممکن ہے کسی حکومت یا کسی دور کے علمار نے اصحاب ہوا کی آزادی کو روکنے کے لئے عارضی طور سے اجتہاد بند

جس مسئلہ مین کتاب اللہ کا حکم موجود ہو اس کے مطابق فیصلہ کرو، اس مین نہ ہو تو حدیث نبوی مین تلاش کرو اور اس میں بھی نہ ملے، تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو

اس اجتہاد کی تشریح خود آپ ہی کی ایک تحریر سے جو آپ نے قاضی شریح کو لکھی تھی، ہوتی ہے کہ جو چیز تم کو قرآن و حدیث مین نہ ملے، اور اس کے متعلق تم کو شبہہ ہو تو اس پر غور کرو اور خوب غور کرو، ان کے ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر اس پر اس کو قیاس کرو (ازالۃ الخفاء ص ۸۶) اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اصطلاح شریعت مین اجتہاد کسے کہتے ہین، اس کے کیا شرائط ہین اور صحابۂ کرام کے اجتہاد کی نوعیت کیا تھی اجتہاد کی بنیاد بہر حال قرآن و حدیث ہی پر ہونی چاہئے،

مصنف نے اجتہاد و تقلید کی تاریخ کے سلسلہ مین یہ عجیب و غریب انکشاف کیا ہے کہ "ہمارے علما سلطنت عباسیہ کے زوال تک اجتہاد سے کام لیتے تھے، یہ تقلید کا مرض اس وقت سے شروع ہوا جب مختلف خطون کے امرائے صرف ان علماء کے وظیفے باندھنے (باندھنے کا لفظ کس قدر برمحل استعمال کیا گیا ہے) شروع کئے، جو کسی بڑے مجتہد کی تقلید مین فتویٰ دیا کرتے تھے، اب کسی عالم کو کیا پڑی تھی کہ وہ اجتہاد کی مصیبت مین پھنس کر اپنی تنخواہ گنواتا، (ص ۷۱)"

کاش مصنف نے اس واقعہ کے ثبوت مین حوالہ بھی دیدیا ہوتا، لیکن اس کا واقعہ سے کوئی تعلق ہی نہ حوالہ کہان سے دیتے، یہ تو ان کا تاریخی اجتہاد ہے، اجتہاد کا دروازہ کبھی بھی وظیفہ خواری نے بند نہین کیا، اور نہ کے وقت شرعی اجتہاد کی آج بھی اجازت ہے، البتہ جس قدر زمانہ گذرتا گیا، خود اجتہاد کی ضرورت کم ہ گئی، اسلئے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے مقابلہ مین بعد کے زمانہ مین اجتہاد گھٹتا گیا، مصنف کو یہ ساری غ اس لئے پیش آئی ہے کہ وہ اپنی خواہش نفس سے رائے قائم کرنے کو اجتہاد سمجھے ہین، بہر حال اوپر کے اقتب مین ان کے قلم سے یہ نادانستہ اعتراف نکل گیا ہے، کہ "ہمارے علماء سلطنت عباسیہ کے زوال تک اجتہ سے کام لیتے رہے، گو انھون نے اس زوال کا زمانہ متعین نہین کیا ہے، اس لئے کہ عباسیون کا زوال

اگر مصنف ان بزرگوں کی شخصیت سے ناواقف ہیں تو تاریخ اسلام پر اُن کی نظر نہیں اور اگر جان بوجھکر ان کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے تو اور بھی قابل الزام ہیں، اس سے بھی بڑھکر کمال یہ کیا ہے کہ غزوہ خندق میں ام المومنین حضرت صفیہؓ کی بہادری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں حضور کی ایک بیگم صفیہؓ لیکر نکلیں اور ایک یہودی کو قتل کرڈالا "ام المومنین" کے لئے بیگم ہی کے لقب کا استعمال کیا کم تھا اس کے ساتھ لٹھ مصنف کے حسن مذاق کا ثبوت ہے اس بارہ میں وہ غریب مجبور بھی ہیں آخر کچھ وطنی خصوصیات کو بھی تو ملحوظ رکھنا ہے۔

غرض اس کتاب میں مصنف کے علم و اجتہاد وسعت معلومات حُسن تحریر یا در حسن ادب غرض ہر کمال کے نمونے ہیں ان سب کی تفصیل کی گنجایش نہیں ہے، مذکورۂ بالا مثالوں سے اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا ہم کو اس کے ماننے میں تامل نہیں کہ مصنف کی نیت نیک اور اس کتاب کی تالیف سے ان کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور دنیاوی ترقی ہے، جو ایک محمود اور اچھا مقصد ہے لیکن اس کا طریقہ وہ نہیں ہے جو انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کی تعلیم خود اسلام میں موجود ہے، اور جس طرح ایک مسلمان پر عبادت فرض ہے، اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی قوت و شوکت، اور اُن کی دنیاوی سربلندی کے لئے اس کے مادی ذرائع پر عمل کرنا بھی فرض ہے اس لحاظ سے مصنف کے بعض خیالات، اور مشورے صحیح بھی ہیں، لیکن ان میں حق و باطل دونوں کی آمیزش ہے جس سے فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے، اس قسم کی کوششوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے جسم کے ماؤف حصہ سے مادہ فاسد ۔ ۔ ۔ ۔ کو خارج کرنے کے لئے ماؤف حصہ پر نشتر لگانے کے ساتھ شہ رگ کو بھی کاٹ دیا، اس لئے ایسے اہم اور نازک مسائل میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جس کا سنبھالنا ہر شخص کا کام نہیں۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

بھی کر دیا ہو، تو مصالح شرعی کی بنا پر اس قسم کی بندش قابل اعتراض نہیں بلکہ عین تحفظ دین ہے خاص حالات میں بعض قوانین کا نفاذ عارضی طور سے ملتوی کیا جا سکتا ہے جس سال عرب میں عام قحط پڑا تھا تو حضرت عمرؓ نے چند دنوں کے لئے چوری کی سزا قطع ید ملتوی کر دی تھی اسلئے کسی مصلحت کی بنا پر اجتہاد کی عارضی بندش سے اسکی مطلق بندش کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے ایک عامی کے لئے اجتہاد مطلق تقلید سے کہیں زیادہ خطرناک اور مضر ہے مقلد تو بہر حال ایک امام کا پیرو ہوتا ہے اسلئے اس کی جانب سے کسی غلطی کا امکان نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ اس کو روشن خیالی مقلد جامد کا لقب دیگی لیکن اس کے کسی فعل کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا، اس کے مقابلہ میں اجتہادی غلطیوں سے ایک دنیا گمراہ ہوتی ہے، اس لئے ایسی اجتہادی بندش عین خدمت دین ہے، لیکن اس سے مراد مصنف کا متخیلہ غیر شرعی اجتہاد ہے،

مصنف کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقلید کو اجتہاد کا ضد سمجھتے ہیں، اس اصول سے تاریخ اسلام میں ایک حقیقی مجتہد بھی نہیں نکل سکتا، مجتہد کے صرف یہ معنی ہیں کہ اس میں اجتہاد کے تمام شرائط پائے جاتے ہوں، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عملاً بھی اجتہاد کرتا ہو، اور ان علماے مجتہدین میں بھی جو عملاً اجتہاد کرتے تھے، بہت سے مسائل میں اتحاد رائے ہے، اختلافی مسائل تو صرف چند ہوتے ہیں خود ائمہ اربعہ کے متفق علیہ مسائل کی تعداد اختلافی مسائل سے زیادہ ہے، اس لئے کہ جب اجتہاد کی بنیاد اور اس کا طریقہ ایک ہوگا، تو لازمی طور سے اختلافات کم اور زیادہ تر فروعی ہونگے، یہ بحث ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی پھر بھی اجتہاد پر تفصیلی بحث نہ ہو سکی آجکل اجتہاد پر بڑا زور دیا جاتا ہے اس لئے اس پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے انشاء اللہ آیندہ کسی موقع پر اس موضوع پر مفصل گفتگو کیجائیگی،

آخر میں اکابر اسلام سے مصنف کی ناواقفیت اور انکی ادب ناشناسی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے متعلق لکھتے ہیں "جب ابو موسیٰ مجمع عام اپنا فیصلہ سنا چکا (جنگ صفین کی تحکیم میں) تو اس کے فیصلے سے ترا پائی اپنے انتخاب کی توہین تھی (ص ۳۶، ۳۷)" فرقہ کیسانیہ کے عقائد کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کے فرزند دلبند اور جلیل القدر تابعی حضرت محمد بن حنفیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "محمد بن حنفیہ فوت نہیں ہوا بلکہ بدستور زندہ ہے (ص ۳۹)"

اسلام اور کمیونزم کے معاشی نظام پر جن لوگون کی پوری نظر نہین ہے، وہ اُن کے بعض پہلوؤن مین مشابہت دیکھ کر دونون کو یکسان سمجھنے لگتے ہین، اور قرآن و حدیث سے اس کی تائید و تلاش کرتے ہین چنانچہ اشتراکیت کی طرح اسلام مین بھی وسائلِ معیشت کو قومی ملکیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین، جو قطعاً غلط ہے، درحقیقت اسلام کا معاشی نظام مستقل حیثیت رکھتا ہے، اور کمیونزم اور سرمایہ دارانہ دونون نظامون سے مختلف ہے، لائق مصنف نے اس کتاب مین قومی ملکیت کے بارہ مین اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے اور اس بارہ مین اشتراکی اصول کے نتائج پر بحث کرکے دکھایا ہے کہ اس سے اصل مقصد یعنی طبقاتی اور معاشی مساوات بھی حاصل نہین ہوتا، اور سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں پیدا ہوتی ہین، اس کے مقابلہ مین اسلام کا اصول اس قدر متوازن ہے کہ انفرادی ملکیت کو قائم رکھتے ہوئے بھی اس سے قومی ملکیت کی اصل غرض و غایت کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہین اور اس کی خرابیان بھی پیدا نہین ہوتین، درحقیقت ہر نظام اپنے تمام اجزا سے مل کر کامل ہوتا ہے اور اس کی ایک بنیادی روح ہوتی ہے جو سارے نظام مین ساری ہوتی ہے جس سے اس کو الگ نہین کیا جا سکتا ورنہ سارا نظام بے کار ہو جاتا ہے، اس لئے مختلف نظامون کے اجزاء ایک دوسرے مین فٹ نہین کئے جا سکتے، اور جب اسکی کوشش کیجائیگی تو دونون کا مقصد فوت اور اس کی روح ختم ہو جائے گی، اس لئے اسلام اور کمیونزم کے معاشی نظام کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے کی کوشش کرنا دونون کو بگاڑنا ہے، یہ رسالہ کمیونزم سے متاثر مسلمانون نوجوانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

دلائل توحید باری از مولانا عبدالرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت، و طباعت، بہتر، قیمت ایک روپیہ، مصنف نائب ناظم مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر ڈاکخانہ رام دت گنج ضلع بستی،

خدا کی توحید کا عقیدہ تقریباً تمام الہامی مذاہب مین موجود ہے، زبادہ الناس توحید فی الصفات

مطبوعات جدیدہ

خطبات بدر، از جناب مولوی بدرالدین صاحب بدر جالندھری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۴۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد :- للعہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور،

خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد خدا کی حمد و ثنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب پر درود و سلام، قرأت قرآن، وعظ و تذکیر اور دعا ہے، لیکن اس میں دوسری مذہبی تعلیمات بھی دیجا سکتی ہیں اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے اہم مسائل بھی بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ حصہ ایسی زبان میں ہونا چاہئے جس کو سامعین سمجھ سکیں، اس کی صورت یہ ہے کہ خطبۂ مسنونہ تو عربی زبان میں پڑھا جائے اور دوسرے معاملات و مسائل ملکی زبان میں بیان کئے جائیں، مصنف نے اسی نقطۂ نظر سے یہ خطبات لکھے ہیں، اس میں عربی کے دونوں مختصر خطبے بھی دیدیئے ہیں، اس کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی، اجتماعی، اصلاحی اور اسی قسم کے دوسرے ضروری مسائل پر اردو میں پچاس خطبے ہیں، ان تمام خطبات کی روح خالص اسلامی ہے، اور دورِ جدید کی ضروریات کے مسائل میں بھی مصنف کا قدم دین کے دائرہ سے باہر نہیں نکلا ہے، اس لئے یہ خطبات نہ صرف جمعہ میں پڑھنے کے لئے کارآمد بلکہ اپنے مفید مذہبی معلومات کے لحاظ سے مسلمانوں کے عام مطالعہ کے لائق بھی ہیں، اُن سے کم استعداد مبلغین اور واعظ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

قومی ملکیت اسلامی نقطۂ نظر سے، از جناب نعیم صدیقی، تقطیع بڑی، ضخامت ۵۵ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر، پتہ مکتبہ چراغِ راہ، لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ، کراچی نمبر ۱،

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، نظم سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- عہ/

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت :- ۳۰۰ صفحے،

قیمت :- سعہ/

تیمیجر

مین ہوا ہے، جس نے بگڑ کر شرک کی صورت اختیار کر لی، پرانی مناظرانہ کتابون مین اس پر بڑی بحثین اور توحید کے اثبات اور شرک کی تردید کے پرانے طرز کے دلائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مصنف نے انہی مین سے اپنے پسندیدہ دلائل منتخب کر کے اس کتاب مین جمع کر دیئے ہین، اس کے پہلے حصہ مین توحید باری کے ثبوت اور تعدد الٰہ کی تردید کے دلائل ہین، دوسرے مین ان عقائد و اعمال کی تردید ہے، جو توحید خالص کے خلاف اور مسلمانون مین بھی رائج ہین مثلاً غیر اللہ سے استمداد اور علم غیب وغیرہ مصنف کو موجودہ زمانہ کے کلامی مسائل اور ان کے طرز استدلال کا اندازہ نہین ہے، اس لئے انھون نے انہی پرانے مسائل اور دلائل کو دہرا دیا ہے جن کی آج کل چندان ضرورت نہین، اور نہ ان کو موجودہ مذاق قبول کر سکتا ہے تاہم مصنف کی نیت اور ان کا مقصد نیک ہے، اس لئے انشاء اللہ اس کا اجر ان کو ملے گا،

مادر ہمدرد از جناب خواجہ حسن نظامی دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ امیر خسرو ہر دیو لائبریری دہلی،

ایک عرصہ کے بعد خواجہ صاحب کی نئی تصنیف کی زیارت ہوئی ہے، ان کی تحریر کے مطابق اس تصنیف کا مقصد باشندگان ہندوستان و پاکستان کے کلچر اور قدامت کی مادری تربیت کے عمدہ نتائج کا بیان ہے" اس مقصد کے مطابق مصنف نے ہندوستان کے بہت سے قدیم صلحاء و اخیار اور موجودہ دور کے اکابر و ممتاز آدمیون کے مختصر حالات مادری تربیت کے اچھے نمونے کی حیثیت سے لکھے ہین، لیکن ان مین کم ایسے ہین جن کے متعلق یہ ثبوت دیا گیا ہو کہ ان کے محاسن مادری تربیت کا نتیجہ تھے، ہر شخص کے اوصاف کو مادری تربیت کا لازمی نتیجہ نہین کہا جا سکتا، جب تک اس کا ثبوت موجود نہ ہو ورنہ اگر اس کو بطور کلیہ کے مان لیا جائے، تو پھر ہر انسان کو مادری تربیت ہی کا نمونہ ماننا پڑے گا، جو ایک غیر منطقی بات ہے تاہم اس کتاب سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس مین ہر طبقہ کے بہت سے اکابر اور ممتاز اشخاص کا تذکرہ قلمبند ہو گیا اور اس سلسلہ مین مصنف نے اپنے اجداد و متوسلین کا حق بھی ادا کر دیا،

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱ اپریل ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

[illegible] کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- ے

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے،

جلد ۶۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

بازار آتے ہی ضبط کر لیجائیں، اور بہتر یہ ہے کہ انھیں دار المصنفین بھیج دیا جائے، ہمیں بتایا گیا ہے کہ پہلی کتاب جو بازار آئے گی وہ مولانا شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، (نوائے وقت ۱۵ مارچ ۵۰ء)

یہ نوٹ لکھ کر معاصر موصوف نے جس انسانی شرافت، اسلامی اخوت اور دینی حمیت کا ثبوت دیا ہے، ہم اس کے شکر گذار ہیں جزاک اللہ عنا وعن المسلمین، اس سے زیادہ ہم بھی اور کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن اہل پاکستان کی خدمت میں اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دینا ہے،

(:)

ہندوستان کی تقسیم سے بھارت کے اسلامی اداروں کو جو نقصان پہنچا ہے، اس سے دار المصنفین بھی محفوظ نہیں رہ، چونکہ اسلامی علوم و فنون اور اردو زبان و ادب کا ادارہ ہے، اور اس کی کتابیں انہی موضوعوں پر ہیں اسلئے ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی ان کے خریدار قریب قریب کل مسلمان اور پاکستانی علاقہ تھا، ہندوستان میں انکی مانگ زیادہ تر دلی اور حیدرآباد میں تھی، اس لئے موجودہ انقلاب کا اثر دار المصنفین کی تجارت پر بہت بڑا پڑا، حیدرآباد اور بھوپال سے تھوڑی بہت مدد ملتی ہے، وہ چند دنوں کی مہمان ہے، اور اب اس کا مدار بڑی حد تک پاکستان کی تجارت پر رہ گیا ہے، دونوں ملکوں کے درمیان سکہ کے اختلاف نے اور بھی مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن وہ عارضی ہیں اور یقین ہے کہ دیر سویر اس کا کوئی حل نکل آئے گا، اور اس وقت بھی پاکستان کتابیں جارہی ہیں،

(۰)

ان اسباب کی بنا پر دار المصنفین بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے، جس کا تذکرہ ان صفحات میں کیا جا چکا ہے، ان حالات میں اگر پنجاب کے کسی ناشر نے اس کی کتابیں چھپوا کر بیچنا شروع کر دیں، تو اس کی تجارت بالکل ختم ہو جائیگی، اور اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائیگا، دوسری مملکت کی وجہ سے سردست اس کا قانونی تدارک مشکل ہے، گو انشاء اللہ اس کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جائیگی، لیکن یہ ہم سے زیادہ اہل پاکستان کا فرض ہے کہ اگر وہ ہندوستان میں اسلامی آثار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو پاکستان اور پنجاب دونوں حکومتوں کو اس ننگ اسلام و ننگ انسانیت تاجر کو ایسی عبرت انگیز سزا دینی چاہئے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، ہم کو یقین ہے کہ معاصر نوائے وقت کی طرح پاکستان خصوصاً لاہور کے دوسرے اخبارات بھی اس ناشر کے خلاف لکھیں گے، اور حکومت بھی ہمارے معروضات پر توجہ کرے گی، ورنہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت کچھ نثار ہو چکا ہے، ایک دار المصنفین اور سہی، معاصر نوائے وقت سے اس ناشر کا نام معلوم ہو سکتا ہے،

———•———

ہم کو اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ کا تراشہ موصول ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ پنجاب کا کوئی خود غرض ناشر دارالمصنفین کی کتابوں کو چھپوا رہا ہے، اور چند سکوں کے لئے ہندوستان کے اس اسلامی ادارہ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، اڈیٹر صاحب نوائے وقت نے اپنی انسانی شرافت اور دینی حمیت سے اس کے خلاف حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

"آج یہ افسوسناک اطلاع ملی ہو کہ پنجاب کے کوئی ناشر صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ساری کتابیں بلا اجازت چھپوا رہے ہیں، اور اپنے نام سے بیچیں گے، اس سے پہلے حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری پر یہی ظلم ہو چکا ہے، اور اب ایک ادارہ اس ظلم کا شکار ہو رہا ہے، یہ حرکت مذہب، اخلاق، قانون، شرافت، ہر معیار سے گری ہوئی ہے، اور اب جو ناشر اس کے ارتکاب کا ارادہ رکھتا ہے، وہ انسانیت کے ابتدائی معیار سے بھی گرا ہوا ہے"

مزید براں اس ظالم کو اس امر کا بھی احساس نہیں کہ دارالمصنفین ایک ایسا ادارہ ہے جو سالہا سال سے مولانا سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں مسلمانوں اور اردو زبان و ادب کی بڑی خاموشی سے خدمت انجام دے رہا ہے، ہندوستان میں جو حالات رونما ہیں، ان کی وجہ سے دارالمصنفین اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ پاکستان کے مسلمان اس مفید ادارہ کی مدد کرتے، مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کا ایک ناشر ذاتی نفع کی لالچ میں ادارہ کی آمدنی کا واحد ذریعہ یعنی اس کی کتابیں چھاپ کر اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے، یہ ناشر اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اسے اس بات کا بھی خیال نہیں کہ اس کے اس فعل سے ساری پاکستان کی بدنامی ہوگی، ہم سردار عبدالرب نشتر سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ خود توجہ فرمائیں، اور اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں، اور اس ناشر کی مطبوعہ کتابیں

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں

فنونِ جنگ

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

(۲)

میدان کی جنگ کے طریقے

میدانِ جنگ کا انتخاب عام طور سے معرکۂ کارزار کے لئے ایک بہت ہی وسیع اور کشادہ میدان منتخب کیا جاتا تھا، اس کے لئے حسب ذیل چیزوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا،

(۱) میدان آبادی سے زیادہ دور اور نہ نزدیک ہو،

(۲) اس کی زمین سخت ہو لیکن پتھریلی نہ ہو، تاکہ گھوڑوں کے کھر زخمی نہ ہونے پائیں،

(۳) زمین گیلی اور ریتیلی نہ ہو، تاکہ فوجوں کی نقل و حرکت میں آسانی ہو،

(۴) زمین پر زیادہ گرد و غبار نہ ہو تاکہ جنگ کی شدت کے وقت گرد کے بادل اس میں حائل نہ ہوں

(۵) اس کے آس پاس پانی آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہو،[1]

میدانِ جنگ میں فطری سہولت اور مدافعت بھی مدِنظر رکھی جاتی تھی، مثلاً خسرو خان غیاث الدین

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر سنہ ۳۴ء،

پروفیسر محمد نعیم الرحمن مرحوم ریڈر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی وفات علمی حلقہ کا بڑا المناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور مصنف و مترجم مولوی خلیل الرحمن صاحب مرحوم صاحب اندلسیات کے خلف الصدق اور خود ممتاز صاحب علم اور علم و فن کے خدمت گذار تھے، عربی فارسی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور عبرانی سے بھی واقف تھے، عربی زبان سے ان کا تعلق محض درس و تعلیم تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کو اس کا ذوق اور ان میں اس کی خدمت کا جذبہ تھا، انجمن عربی صوبہ متحدہ کے معتمد اور اس کے سرگرم کارکن تھے، انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کی اہمیت اور مسلمان طالب علموں میں اس کا ذوق قائم رکھا، بہت سے علمی اور تعلیمی اداروں کے رکن اور ممبر تھے، تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب تھے، عربی و فارسی کی بہت سی درسی کتابیں لکھیں، ان کی علمی یادگاروں میں مورخ عبد الواحد مراکشی تیمی کی المعجب فی تلخیص اخبار المغرب کا اردو ترجمہ خلافت موحدین خصوصیت کیساتھ لائق ذکر ہے، مرحوم کی عمر چھپن پچپن سال سے زیادہ نہ تھی، اور صحت ایسی تھی کہ مشکل سے بیالیس سال کے معلوم ہوتے تھے، چند مہینے بیمار رہ کر ۲۸ فروری کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو نعیم جنت سے سرفراز فرمائے،

حافظ ابن قیم نے قرآن مجید کی بعض چھوٹی سورتوں کی تفسیر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں لیکن قرآن کی کوئی مستقل تفسیر ان کی یادگار نہیں ہے، مگر ان کی کتابوں میں مختلف مباحث کے سلسلہ میں اُن کے قلم سے متفرق سورتوں کی آیات کی تفسیریں ملتی ہیں، ہمارے پرانے رفیق مولوی محمد اویس صاحب ندوی نگرامی نے دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے ایماء سے ان تفسیروں کو تلاش کر کے جمع و مرتب کیا تھا، اب یہ تفسیر التفسیر القیم کے نام سے محمد حامد الفقی رئیس جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیۃ کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ عمدہ ٹائپ میں مکہ مکرمہ سے چھپ کر شائع ہوگئی ہے اس کی ضخامت ۶۰۰ صفحہ ہے، اس کے لائق مرتب اور اس کے ناشر عبد اللہ و عبید اللہ صاحب دہلوی تاجران مکہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اہل علم کو اس تفسیر سے استفادہ کا موقع دیا، اگر اللہ تعالیٰ کسی صاحب علم کو اسی طریقہ سے امام ابن تیمیہ کی تفسیر کو جمع و ترتیب کی توفیق دیدیتا تو ایک بڑا کام ہو جاتا،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے پاکستان وی پی نہیں جا سکتے، لیکن پاکستان کے معارف کے اُن خریداروں کے نام بھی جن کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے پرچہ برابر جاری ہے، اُن سے التماس ہے کہ وہ اس کا چندہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور کے نام بھیجدیں، ہم کو توقع ہے کہ جس طرح اُن کے اعتماد پر معارف جاری رکھا گیا، اسی طرح وہ بھی چندہ بھیجنے میں تاخیر نہ کریں گے،

جب اس کو معلوم ہوا کہ ہر منزل مین سپاہی ایسی محنت و مشقت کرتے ہین، کہ لشکر کے گرد خندق کھودتے ہین، اور قلعہ بناتے ہین، تو اس کے ہوش اڑ گئے، اُس نے افغانون سے کہا اللہ اکبر! کیسی محنت کرتے ہو، لمحہ بھر آرام لینا حرام جانتے ہو، افغانون نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کا بھی اسی طرح محنت کرنے کا دستور ہے، اس لئے ہم کو بھی محنت و مشقت کی ایسی عادت ہو گئی کہ اس سے کلفت مطلق نہین معلوم ہوتی ہے، سپاہی کو چاہئے کہ اس کا بادشاہ جیسی بھی محنت و مشقت و خدمت لینی چاہئے، اس کو کرنے سے وہ تنگ نہ آئے، آرام کرنا عورتون کا کام ہے، نیک مردون کے واسطے آرام کرنا شرم کا مقام ہے"[۵]

آگے چل کر عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ شیر شاہی لشکر کے گرد خندق کھودنے مین بڑے بڑے امرار بیلدارون کی طرح پھاوڑے چلاتے تھے، ملو خان کو خوف ہوا کہ کہین اس کو بھی بیلداری نہ کرنی پڑے، اس لئے شیر شاہ کو چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ فرار ہو گیا[۵۳] ۹۵۰ھ مین شیر شاہی لشکر ناگور، اجمیر اور جودھپور کی طرف روانہ ہوا، تو ریگستانی علاقون مین ریت کی وجہ سے قلعہ اور خندق تیار نہ ہو سکی، شیر شاہ کے پوتے محمد خان بن عادل خان نے پھر یہ ترکیب کی کہ تھیلون مین ریت بھر کر قلعہ بنایا،[۵۴]

مندرجۂ بالا باتون کا خیال تیموریون کے زمانہ مین بھی کیا جاتا تھا، تیمور تزوک جنگ و جدل کے سلسلہ مین لکھتا ہے:-

"وامر نمودم کہ امیر الامراء در زمین جنگ گاہ چہار چیز ملاحظہ نماید، **اول** آب آن سرزمین، **دوم** زمینے کہ سپاہ را نگاہ دارد، **سیوم** کہ بر غنیم مشرف باشد وآنچہ —

---

[۵] تاریخ شیر شاہی، مصنفہ عباس خان سروانی بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۹-۳۰۸ نیز دیکھو تاریخ ہند جلد سوم مصنفہ شمس العلما محمد ذکاء اللہ ص ۱۰۷ [۵۳] الیٹ جلد چہارم ص ۴۰۵، ذکاء اللہ ص ۳۱۹،

تغلق سے جنگ کرنے کے لئے سیری سے باہر آیا، تو اُس نے حوض علائی کے پاس جنگ کے لئے اس طرح میدان منتخب کیا کہ حوض علائی کے سامنے باغات تھے، اور پشت پر دہلی کا حصار تھا، محمد تغلق اودھ کے حاکم عین الملک کی بغاوت فرو کرنے کے لئے قنوج پہنچا، تو لڑائی کے وقت اس کے لشکر کی پشت پر شہر قنوج اس کی محافظت کر رہا تھا،[۵۲]

کبھی غنیم کے راستے کو مسدود کرنے کے لئے لشکر گاہ اور میدانِ جنگ کے چاروں طرف خندق کھود دی جاتی تھی، اور خندق کے گرد لکڑی کا حصار بنا لیا جاتا تھا، علاء الدین مغلوں سے سیری کے پاس جنگ کرنے آیا، تو مولانا برنی رقمطراز ہیں،

"سلطان علاؤ الدین باندک سوارے کہ در شہر داشت از شہر بیرون آمد در سیری لشکر گاہ کرد داز غلبۂ مغل و ہجوم مغل سلطان را ضرورت شد کہ گرد برگرد لشکر خود خندق کاوانید و برگرد خندق از تخت ہائے درہائے خانہائے مردمان حصار چوبی بیدا نید وراہ در آمد مغلان را در لشکر گاہ خود مسدود کرد،"[۵۳]

شیر شاہ ہر جنگ میں اپنی لشکر گاہ کے ارد گرد خندق کھدواتا، اور مٹی کا حصار بنواتا تھا، اس کا حریف ملو خان (والی منڈو، اجین، سارنگ پور وغیرہ،) سپر ڈال کر اس سے ملنے آیا تو عباس خان سروانی کا بیان ہے کہ

"شیر شاہ نے ملو خان کو اپنے تمام لشکر کی ترتیب دکھائی جس کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا، کبھی اس نے ایسی فوج نہیں دیکھی تھی، جس وقت بادشاہ کا چتر سواروں کو دکھائی دیا، تو وہ اپنی تلواریں میان سے نکال کر چتر کی طرف دوڑے آئے، اور گھوڑوں سے اُترے، سواروں کے کل دستوں نے اس طرح سلام کیا کہ وہ لڑائی کے دن کیا کرتے تھے،"

---

[۵۱] برنی ص ۱۰۴، [۵۲] ابن بطوطہ ص ۱۸۰، [۵۳] برنی ص ۲۱۰،

طرف دریائے نربدا تھا، اس دریا کے پاس ایک پہاڑی پشتہ (گریوہ) تھا جس سے ہو کر نرہی کا راستہ جاتا تھا، لیکن یہ راستہ بہت ہی تنگ اور ہولناک تھا چنانچہ رانی درگاوتی کے لشکر کے لئے یہ بہت ہی دشوار گذار تھے، تیموری فوج کو رانی کے لشکر تک پہونچنے کے لئے بظاہر کوئی ذریعہ میسر نہ تھا، مگر شاہی فوج کے دلیرانہ اور سپاہیانہ جانبازی سے کام لے کر پہاڑی پشتہ پر پہنچ گئے، اور یہاں اپنی توپوں کا ایک مورچہ بنا کر اتنی زبردست آتشباری کی کہ رانی درگاوتی کے لشکریوں کو کٹ مرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا[۵۱]

ابراہیم حسین مرزا کے خلاف اکبر گجرات میں معرکہ آرا ہوا تو اس کی سب سے بڑی دقت میدان جنگ کی سرزمین تھی، وہ بہت ہی خراب اور کانٹوں سے بھری تھی، دو سوار پہلو بہ پہلو ساتھ گذر نہیں سکتے تھے، ان ناہمواریوں سے فائدہ اٹھا کر غنیم کے دو سواروں نے اکبر پر حملے کئے، اکبر کے فوجی سردار پاس ہی کھڑے تھے مگر جھاڑیاں بیچ میں حائل تھیں، اس کی مدد کو نہ پہنچ سکے، اکبر نے غیر معمولی سرعت سے جھاڑیوں کے اوپر سے اپنے گھوڑے کو جست کرایا اور دشمنوں کا مقابلہ کیا،[۵۲]

خان اعظم مرزا کوکہ نے سلطان مظفر گجراتی کے خلاف لشکرکشی کی، تو دونوں فوجیں سابرمتی کے پاس مقابل ہوئیں لیکن شاہی لشکر کو زمین کے نشیب کی باعث پیچھے ہٹنا پڑا[۵۳]

اڑیسہ میں افغانوں نے اکبر شاہی فوج کا مقابلہ کیا تو [illegible] انھوں نے اپنی فوج کو اس طرح کھڑا کیا کہ بیچ میں جنگل تھا اور اس کے چاروں طرف ایک دریا بہتا تھا، شاہی فوج کی باگ راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، اس نے پیش قدمی کر کے غنیم کی فوج کے نزدیک ایک سرکوب پر قبضہ کر لیا اور وہاں فوراً ایک قلعہ تعمیر کر لیا، جہاں سے توپوں کی آتشباری کر کے دشمنوں کو پسپا کیا،[۵۴]

شاہجہانی عہد میں اوزبکوں نے شاہی فوج کا تسلط اور اقتدار اپنے ملکوں میں اس لئے قائم نہیں ہونے دیا کہ وہ دروں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کی غارتگری کرتے تھے، عالمگیری عہد میں آسام کے علاقوں میں مگھ اور اہوم کی مخالفت محض اس لئے جاری رہی کہ وہ جنگلوں اور بحری قزاقی

---

[۵۱] اکبر نامہ جلد دوم ص ۲۱۲-۲۱۳ [۵۲] ایضاً جلد سوم ص ۱۵ [۵۳] اکبر نامہ جلد سوم ص ۵۹ [۵۴] ایضاً ص ۶۱۱-۶۱۲

روبرو وبنا شد تا شعاع آفتاب چشم سپاہ را خیرہ نگرداند **چہارم** پیش روے جنگ گاہ کشادہ ووا باشد"[۱]

میدانِ جنگ میں مذکورۂ بالا سہولتیں میسر ہو جاتیں تو تیموری لشکر کے سپاہی ایک بے پناہ قوت بن کر دشمنوں سے لڑتے، اور فتح و کامرانی حاصل کرتے، چنانچہ اُن کی میدان جنگ کی نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی کا خوف اور رعب اُن کے مخالفوں پر ہر زمانہ میں رہا، ہندوستان کی سب سے بڑی بہادر قوم یعنی راجپوت باہر سے میدان کمواہا میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد اپنا تحفظ اسی میں سمجھتے تھے کہ تیموریوں کے نذرت حصار اور قلعے میں محصور ہو کر اپنی مدافعت کریں،

اگر مذکورۂ بالا سہولتیں میسر نہ ہوتیں تو شاہی لشکر کو بڑی دقتیں اور مشکلیں پیش آتیں، جو نسا کی جنگ میں ہمایوں کو شیر خان کے مقابلہ میں جو شکست ہوئی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایوں کی فوج کو خاطر خواہ میدانِ جنگ نہیں ملا، دونوں مخالف فوجیں گنگا کے ساحل پر مقیم ہوئیں، دونوں کے درمیان گنگا کی ایک شاخ جیسی گزرگاہ پڑتی تھی، شیر خان نے سبقت کر کے ایک ایسے مقام پر اپنی فوج کو لا کر کھڑا کیا، جو اس کے لئے ہر طرح مفید ثابت ہوا، ہمایوں کی فوج کو مجبوراً ایسی جگہ قیام کرنا پڑا، جہاں کی زمین بہت ہی ڈھلوان تھی، اس کی گہرائی میں کیچڑ اور دلدل ایسی تھی کہ سوار اور گھوڑے اس میں پھنس کر رہ جاتے تھے[۲]

اکبری عہد میں گڈھ کی رانی درگاوتی کے خلاف خواجہ آصف خان نے لشکر کشی کی تو رانی درگاوتی نے کھلے ہوئے میدان میں آنے کے بجائے ندی کے پاس اپنی فوج کا پڑاؤ اس طرح ڈالا کہ اس کے چاروں طرف سر بفلک پہاڑ تھے، اردگرد درختوں کے گھنے جنگل تھے، سامنے دریائے گور تھا، اور اس کے دوسری

---

[۱] تزک تیموری ص ۱۹۱ [۲] تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی بحوالہ الیٹ جلد چہارم ص ۲۷۰ و ذکاء اللہ جلد دوم ص ۲۹۳

تو توپ و تفنگ کی ضرب سے ان مین سے اکثر ہلاک ہو جائین گے، سلطان بہادر نے یہ رائے پسند کی، اور اپنے لشکر کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، دو ماہ کی مدت تک دونون لشکر ایک دوسرے کے مقابل مین پڑے رہے[۱]۔

ابوالفضل کا بیان ہے کہ خندق کے چارون طرف ارابہ کا حصار بھی بنایا گیا اور حصار پر توپین نصب کر دی گئین، مگر توپون کی یہ قلعہ بندی کام نہین آئی، ہمایون نے حصار کے باہر توپون کی زد سے دور تیر اندازون کی ایک بڑی جماعت دشمنون کی رسد کو تاراج کرنے کے لئے مقرر کر دی، چنانچہ ہر طرف سے سلطان بہادر کی فوج کی رسد بند ہو گئی، جس سے لشکر مین بڑی سراسیمگی پھیل گئی، اور یہ توپخانہ کا قلعہ قید خانہ بن گیا، بالآخر سلطان بہادر ہلکی سی جھڑپ کرنے کے بعد توپخانہ مین آگ لگا کر فرار ہو گیا[۲]۔

۹۹۲ھ مین اکبر نے سلطان مظفر گجراتی سے احمد آباد کے پاس سرکھیج مین جنگ کی، تو شاہی فوج کے ایک طرف شہر اور دوسری طرف دریا تھا، میدان جنگ کو خاردار شاخون سے استوار کیا، اور پھر ان خاردار شاخون کو مٹی کی دیوار بنا کر مستحکم کیا[۳]۔

اکبر کے اکتالیسوین سال جلوس مین صادق خان نے نظام الملک کے خلاف دکن مین فوج کشی کی تو جنگ و جدل کا مقام تھکر واقع دریائے بان گنگا (شاخ گوداوری) تھا، شاہی فوج نے لشکرگاہ کو اس طرح ترتیب دیا کہ سامنے دریا، اور پشت پر ایک رود بار تھا[۴]۔

جہانگیر کے اٹھارہوین سال جلوس مین شاہی فوج گجرات مین عبداللہ خان کے خلاف معرکہ آرا ہوئی، تو تزک جہانگیری مین ہے (ص ۳۰۳)

"از اتفاقات حسنہ جائے کہ دولت اللہ (یعنی عبداللہ) فرود آمدہ بود زمین پست و بلند بود، از قوم نا راہمہ ہ و کوچہاے تنگ داشت بنا برین سلسلہ افواج او انتظام شایستہ نیافت

[۱] سنت اکبری جلد دوم ص ۳۵ [۲] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۳۳ [۳] ایضاً جلد سوم ص ۴۲۵ [۴] ایضاً ص ۶۱۵،

ین لڑنے کے عادی تھے، مرہٹے پہاڑیون مین چھپ چھپ کر تیموری فوج کا مقابلہ کرتے رہے، اس لئے تیموری ان پر غلبہ حاصل نہ کرسکے،

میدانِ جنگ مین فوجین صف آرا ہوتین تو تیموری بھی لشکر گاہ کی مدافعت کے لئے مختلف تدبیرین اختیار کرتے تھے، امیر تیمور جب محمود تغلق کے خلاف جمنا کے کنارے جنگ کرنے آیا تو اس کے لشکر گاہ کے چارون طرف خندق کھودی گئی، وہ خود لکھتا ہے،

"وازین جہت در دور لشکر خندق کندم، و میانِ خندق خود را استوار ساختم"[۱]

ہاتھیون کو پسپا کرنے کے لئے تیمور نے صف لشکر کے آگے چیرون سے حصار بنایا، اور اس کے گرد خندق کھودی، خندق کے سامنے بھینسون کی گردنون اور ٹانگون کو چمڑے سے باندھ کر ان کو کھڑا کیا، اور آہنی کانٹے بنا کر پیادون کو دئیے کہ ہاتھی حملہ آور ہون تو یہ کانٹے راستہ مین بکھیر دئیے جائین[۲]

بابر نے پانی پت کے میدان مین اپنے لشکر گاہ کا تحفظ اس طرح کیا کہ دائین طرف پانی پت شہر کے محلے اور مکانات کی آڑ لی، سامنے توپون کے ارابے اور مٹی کے تورے رکھے، بائین طرف خندق کھود کر درختون کی شاخون کی باڑ لگائی،[۳] کنواہا کی جنگ کے موقع پر بھی بابر نے اپنے لشکر گاہ کو ارابون اور خندقون سے مستحکم کیا تھا،[۴] ہمایون کے خلاف سلطان بہادر مانڈسور مین صف آرا ہوا، تو اس نے لشکر کے گرد خندق ہی کھود کر ہمایوں کا مقابلہ کیا، طبقات اکبری مین ہے،

"رومی خان نے جس کے اختیار مین سلطان بہادر کا توپ خانہ تھا، کہا کہ صفون کی جنگ مین توپ و تفنگ کام نہین آتا ہے، توپ خانہ تو کافی فراہم کرلیا گیا ہے چنانچہ قیصر روم کے سوا اس قسم کا توپ خانہ کسی اور کے پاس نہین، لیکن مناسب یہ ہو کہ لشکر کے گرد خندق کھدوا دی جائے، اور ہر روز جنگ ہو، اور جب مغلون کے لشکر مقابلہ مین آئین گے

---

[۱] تزوک تیموری ص ۹۰، [۲] ظفرنامہ جلد دوم ص ۱۰۴، [۳] بابر نامہ ص ۲۶۶، [۴] ایضاً ص ۳۱۱

ذکر آئے گا، مگر میدانِ جنگ میں بھی زمین کھود کر توپوں کی مورچہ بندی کے لئے ملچار اور مورچل بنائے جاتے،

مثلاً شاہجہانی عہد میں شہزادہ اورنگ زیب بلخ کی مہم میں اوزبکوں سے لڑ رہا تھا، تو تیمور آباد کے پاس

اس نے اپنے لشکر گاہ کے گرد ملچارہا تعمیر کئے، بادشاہ نامہ میں ہے،

"و باشارۂ آن والا گوہر برداران ظفر آئین کو تمکین بر دو رادو ملچارہا مقرر نمودہ و

در ہر جانب یاسیا ہیان بہرو گزین مراسم حفظ و حراست بتقدیم رسانیدہ شب گذرانیدند"[۵۱]

دارا شکوہ اپنی جنگ جانشینی کی دوسری لڑائی کے سلسلہ میں اورنگ زیب سے لڑنے کے لئے دھولپور

پہنچا تو عاقل خان کا بیان ہے،

"و بر ساحل آب چنبل خیمہ و خرگاہ تا گنبد نیلگون برافراشت و بر مسالک و معابر

مورچال مقرر کردہ جابجا افواج و توپخانہ تعبیہ نمود از جوانب و اطراف راہ عبور بر موکب

منصور مسدود ساخت"[۵۲]

دارا شکوہ جب دھولپور سے بڑھکر سموگڈھ میں معرکہ آرا ہوا، تو میدانِ جنگ میں اس کی فوج

کو پانی کی کمی کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا، اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب اس کے لڑکوں میں تخت

تاج کے لئے قتال و جدال کا میدان گرم ہوا تو جاجو کی جنگ میں شہزادہ اعظم شاہ کے لشکریوں کو بھی پانی

کی قلت کے سبب بڑی صعوبت اور مصیبت اٹھانی پڑی، جاجو کا میدان اعظم شاہ کی فوج کے لئے اس

کی گرد آلود زمین کے باعث بھی نہایت مضر اور ہلاکت خیز ثابت ہوا[۵۳] جنگ جب انتہائی شدت کو پہنچ

گئی، تو یکایک اعظم شاہ کی مخالف سمت سے بہت تیز اور تند ہوا چلی، گرد و غبار کی کثرت سے لڑائی

کا میدان لشکریوں کی آنکھوں میں ایسا سیاہ اور تاریک ہوگیا کہ اپنے اور بیگانے کی تمیز باقی نہیں

---

۵۱ بادشاہ نامہ جلد ۲ دوم ص ۱۹۲ ۵۲ واقعات عالمگیری ص ۳۱ ۵۳ منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۹۶ عہدِ اکبری میں جب شاہی فوج جانی بیگ کے خلاف سیہوان کے (ٹھٹھہ) قریب جنگ کر رہی تھی، تو شاہی فوج کو گرد آلود زمین کی وجہ سے میدان جنگ میں بہت دقتیں اٹھانی پڑیں جنگ کے درمیان تیز ہوا چلنے لگی تو از شورش باد و خاک از یک دیگر آگہی نبود (اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۰۹)

شاہجہانی عہد میں دارا اور اورنگ زیب کی جنگ جانشینی کی پہلی لڑائی میں دارا کی طرف سے مہاراجہ جسونت سنگھ نے نربدا کے ساحل پر دھرماوت میں میدان جنگ منتخب کیا، لیکن اس کی زمین بہت ہی تنگ، پست، ناہموار اور نشیب و فراز سے پُر تھی، مہاراجہ جسونت سنگھ نے حسب معمول لشکر گاہ کے چاروں طرف خندق بھی کھدوائی، اور میدان کی زمین کو پانی ڈال کر کیچڑ سے آلودہ کر دیا، جو سواروں کے گھوڑوں کے لئے مضر ثابت ہوا[1]،

خندق کھود کر لشکر گاہ کو محفوظ کرنے کی تدبیر آخر آخر وقت تک قائم رہی، بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں میں جانشینی کی جنگ شروع ہوئی، تو شہزادہ عظیم الشان نے لاہور کے پاس راوی کے ساحل پر اپنے لشکر کی قیامگاہ کو جس طرح ترتیب دیا، وہ خافی خان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو،

"پشت بدریائے راوی دادہ فرود آمدہ دو طرف لشکر حکم کندن خندق فرمودہ طرف دیگر لشکر عظیم الشان دریا داشت"[2]

فرخ سیر اور جہاندار شاہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوئے تو جہاندار شاہ نے پہلے اپنے لڑکے عز الدین کو پچاس ہزار سوار دے کر فرخ سیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا، عز الدین کھجوہ میں اپنے لشکر کے ساتھ قیام پذیر ہوا، لشکر کے گرد اس نے خندق کھدوائی، جو پندرہ فٹ چوڑی اور دس فیٹ گہری تھی، خندق کی مٹی لشکر کی طرف ڈال دی گئی جس کی اونچائی قد آدم کے برابر تھی، اسی اونچائی پر مورچال بنایا گیا، (تفصیل کے لئے دیکھو خافی خان جلد دوم ص ۶۹۹)

خندق کھود کر توپوں کے لئے جو مورچے تیار کئے جاتے وہ ملچار، مورچل یا مورچال کہلاتے تھے، گو یہ اصطلاحات قلعہ اور حصار کی جنگ کے سلسلہ میں زیادہ استعمال کی گئی ہیں، جیسا کہ آئندہ

[1] واقعات عالمگیری عاقل خان ص۲۲، لاہور اڈیشن [2] منتخب اللباب جلد سوم ص۶۸۶،

اہم فیصلے غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد کئے جاتے، کیونکہ اگر لشکریون کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا کہ سر لشکر کے کسی حکم سے ان کی جانین محض تلف ہو جائین گی، تو وہ اس کے حکم کو بجا لانے سے انکار کر دیتے، اس لئے آداب الحرب والشجاعہ کے مولف فخر مدبر نے لشکر کے نگہبانون کے لئے یہ ہدایت لکھی ہے کہ فوج کی کثرت اس وقت تک مفید اور موثر نہین ہو سکتی ہے جب تک کہ باقاعدہ مشورون سے مہم مین کافی احتیاط اختیار نہ کی جائے[۱]،

تیموریون کے زمانہ مین بھی لڑائی کے موقع پر جنگی مشاورت کی خاص اہمیت تھی، امیر تیمور نے تزک تیموری مین اُن کے متعلق جو اپنے خیالات جابجا ظاہر کئے ہین، وہ ملاحظہ ہون :-

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ مخالفون پر غالب آنا نہ لشکر کی کثرت سے اور نہ ان سے مغلوب ہونا، فوج کی کمی سے ہوتا ہے، بلکہ غلبہ صرف تائید اور تدبیر سے حاصل ہوتا ہے،

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا کہ راے تدبیر، اور مشورہ عقلمند اور ہوشیار آدمی سے کرنا چاہئے اگرچہ کامیابی کا راز پردۂ تقدیر مین چھپا ہوا ہے" لیکن رسول اللہ صلعم کی سنت کے موافق مین نے جو کام کیا، مشورہ سے کیا، جب ارباب راے واصحاب مشورہ اکٹھا ہوے تو بُرے بھلے، نفع و نقصان اور پیش آنے والے کامون کے کرنے یا نہ کرنیکے متعلق مین نے ان سے گفتگو کی، اور جب ان کی باتین سنین، تو دونون پہلوؤن پر غور کیا، اور نفع و نقصان کو سوچا، اور اس کام کے خطرات کو غور سے دیکھا، جس کام مین مجھکو دو خطرے نظر آئے، اس کو نظر انداز کر دیا، اور جس کام مین صرف ایک خطرہ تھا، اس کو اختیار کر لیا،.........

مین نے تمام کامون مین مشورہ سے کام لیا، اور اس کام کے انجام دینے مین صحیح تدبیر کی، اور اس کام کے پورے ہونے کی راہ پر غور کرنے کے بعد اس کام کو شروع کیا، اور تدبیر،

---

[۱] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۳۷ء

رہی، لیکن یہی ہوا، اعظم شاہ کے حریف معظم شاہ کے لئے فتح و کامرانی کی وجہ بن گئی، موخرالذکر کے لشکر سے جو تیر پھینکا جاتا وہ ہوا کی مدد سے اوّل الذکر کے فوجیوں کے زرہ و بکتر میں تیزی سے پیوست ہو جاتا تھا، اور جو سنگ ریزے بادصرصر سے اڑ کر اس کے لشکر میں پہونچتے، وہ گولیوں کی طرح لشکریوں کے چہروں پر لگتے تھے، برخلاف اس کے اعظم شاہ کی طرف سے جو بان تیر اور گولہ پھینکا جاتا وہ مخالف ہوا کی وجہ سے یا تو چند قدم پر جا کر گر جاتا، یا پلٹ کر خود اسی کی صف میں چلا آتا تھا، (خافی خان جلد دوم ص ۵۹۴)

بہادر شاہ کی وفات کے بعد شہزادہ عظیم الشان لاہور کے پاس راوی کے کنارے جہاندار شاہ سے جنگ کر رہا تھا کہ یکایک ایک آندھی آئی اور راوی کی ریت ہوا میں بادل کی طرح چھا گئی، لشکریوں کو غبار کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی، وہ مشکل سے اپنی آنکھیں کھول سکتے تھے، وہ صرف توپوں کی صدائیں سن رہے تھے، اور بے حس و حرکت کھڑے تھے، اس تاریکی اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ لشکریوں نے عظیم الشان کے خزانہ کو لوٹنا شروع کر دیا،[۱]

مجلسِ مشاورت لڑائی شروع ہونے سے پہلے اعلیٰ فوجی عہدیداروں کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوتی تھی، سلاطین دہلی کے زمانہ میں اس قسم کی مجلس کے لئے امیر خسرو نے کبھی صرف مجلس[۲] اور کبھی مجلس ملکی[۳] اور عصامی نے انجمن[۴] کی اصطلاح استعمال کی ہے، امیر خسرو نے اس مجلس میں شریک ہونے والوں کو "رائے زنانِ لشکر" کہا ہے[۵] یہ مجلس سر لشکر کی صدارت میں منعقد ہوئی، اور فوج کے اکثر "ملوک کبار" "مردانِ رزم و کار" اور "ریغانِ سال خوردہ" اس میں شریک ہوتے، کیونکہ مہم کی کامیابی کی ذمہ داری اُن پر بھی ہوتی تھی[۶] عارض ادران کی عدم موجودگی میں نائب عارض اس مجلس میں ضرور شریک ہوتا،

---

[۱] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۰۲ [۲] تغلق نامہ ص ۸۴ [۳] خزائن الفتوح ص ۸۴ [۴] فتوح السلاطین ص ۲۵۴ [۵] خزائن الفتوح ص ۱۴۳ [۶] ایضاً ص ۱۳۹، تغلق نامہ ص ۸۴، مجلس مشاورت کی مثالوں کے لئے دیکھو تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۰۳، ۳۴۰، ۳۸۱ وغیرہ،

مین ایسی انجمن اور مجلس کنکاش کا انعقاد اسی کی صدارت مین ہوتا، وہ نہ ہوتا تو صدارت کے فرائض سپہ سالار انجام دیتا، اور اس مین امرائے "ذوی الاقتدار"[۲۲] "اہل اعتبار"[۲۳]، "خبرت گزینان رکاب دولت" "کار آگاہان"[۲۴] "سران لشکر یعنی قشون اور تومان کے سردار وغیرہ شریک ہوتے، اس انجمن مشاورت مین خوب مباحثے ہوتے، اور ہر ایک فرد آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتا، ضرورت کے وقت یہ انجمن عین لڑائی کے دوران مین بھی منعقد کی جاتی، اس وقت اجتماع شاہی تور کے نیچے ہوتا، مباحثے مین زیادہ تر "برد آزمائی" حملہ آوری، "صف شکنی" کے قواعد و ضوابط اور "دغا دہیجا" کے رسوم و آداب پر گفتگو ہوئی[۲۶]،

مجلس مشورت مین پرجوش تقریرین

اس مجلس اور انجمن مین بعض اوقات ولولہ انگیز تقریرون سے لشکر کے سرداروں اور عہدیدارون مین غیر معمولی جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، بعض مثالین ملاحظہ ہون،

علاؤالدین خلجی کی فوج کیلی مین مغلون کے مدمقابل ہوئی، تو ظفر خان نے فوجی سردارون کی ایک انجمن منعقد کی، اور ان کو مخاطب کرکے کہا، اے سران سپاہ! میدان جنگ مین کون سی تدبیر اختیار کرنی چاہیے، اگر ہم ان کفار سے جان بچا کر فرار ہو جائین، تو ہم اپنے سلطان کو کیا منہ دکھائین گے، اور اگر ہم لڑنے کو آمادہ ہو جائین، تو دس ہزار فوج کے مقابلہ مین ہمارے پاس ایک ہزار فوج ہے، ہم عجیب کشمکش مین ہین، دو بھیڑیون کے درمیان ایک بھیڑ آگئی ہے، نہ پیچھے ہٹنے اور نہ لڑائی لڑنے مین چین ہے لیکن مین وہی کرون گا جو اس مجلس مین آزمودہ کار اصحاب مجھکو کرنے کو کہین گے،

قران السعدین مین اس تقریر کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے،

---

[۲۲] طبقات اکبری جلد سوم[۲۵] [۲۳] اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۱۸ [۲۴] ملفوظات تیموری الیٹ جلد سوم ص ۴۰۳ - ۴۰۹ [۲۵] ذکا اللہ جلد سوم ص ۲۷، ۲۶۵،

عزم صحیح، احتیاط، انجام بینی، اور دور اندیشی سے اس کام کو پورا کیا، مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ صاحب مشورہ وہ لوگ ہو سکتے ہیں، جو باتفاق اپنے قول و فعل پر مصمم عزم کرلیں، اور اس کام کو کسی وجہ سے نہ چھوڑیں، اور اگر یہ کہیں کہ ہم اس کام کو نہ کریں گے، تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکیں،"

مجھ کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ مشورہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک زبان سے، دوسرا تہِ دل سے، میں نے جو زبانی مشورہ سنا، اس کو صرف کان سے سُن لیا، اور جو مشورہ تہِ دل سے سنا، اُس کو کان اور دل دونوں میں جگہ دی،

فوج کشی کے وقت میں نے صلح و جنگ دونوں کے متعلق گفتگو کی، اور اپنے امراء کے دل کی بات کا سُراغ لگایا کہ وہ جنگ چاہتے ہیں، یا صلح، اور اگر انھوں نے صلح کا مشورہ دیا، تو صلح کے فوائد کا مقابلہ جنگ کے نقصان سے کیا، اور انھوں نے اگر جنگ کی بات چیت کی، تو اس کے فائدے پر صلح کے نقصان کے متعلق غور کیا، جس میں فائدہ زیادہ نظر آیا، اسی کو اختیار کر لیا، اور وہ مشورہ جو فوج میں نااتفاقی پیدا کرتا تھا، اس کے سننے سے میں نے احتراز کیا، اور جس صاحب مشورہ نے بے اختیارانہ مشورہ دیا، اس کو سُن لیا، اور جس شخص نے عاقلانہ اور مردانہ بات کی، اس کو بھی سنا،

میں نے مشورہ ہر شخص سے طلب کیا، لیکن ہر بات کی بھلائی اور بُرائی پر غور کیا، اور اس کے صلح و صواب کے پہلو کو اختیار کیا، [۱]

تیمور کے جانشین مذکورۂ بالا زرّیں مشوروں سے برابر مستفید ہوتے رہے، ان کے عہد میں لڑائی کے موقع پر مجلس کنگاش اور انجمنوں کی مثالیں بکثرت ہیں، [۲] میدانِ جنگ میں بادشاہ کی موجودگی

---

[۱] تزوکِ تیموری ص ۹ ۰ ۰، ۷، ۶، ۵ [۲] تزکِ بابری اردو ترجمہ ص ۴۴، ۲۹۲، ۳۰۹، اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۰۸، ۲۹۲، ۳۴۳، ۴۴۳،

مراجعت چاہتے ہیں، وہ واپس ہو جائیں، اُن کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں ہیں، وہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچ جائیں، فتوح السلاطین کے مصنف کی زبانی بھی اس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں

بگفتا کہ اے قوم آشفتہ رائے — ندانید فرقے ز سر تا بپائے

ہمہ حال چون جان بباید سپرد — بباید نمودن یکے دست برد

من امروز آید چو نام آوران — کنم ختم در ملک ہندوستان

دہم جنگے اید کہ در روزگار — بماند بشہنامہا یادگار

کرا زے کہ با ما درین وقت تنگ — وفائے نماید بہنگام جنگ

ہمو ہست ہمراہ اہل غزا — بود نقش نامش بہ مہر و وفا

گروہے کہ دارند بر عطف رائے — نہ بستہ است شان را کسے دست و پائے

سپہ تا نکو داشت بر جنگ ساز — سلامت ہمین دم بگردند باز

ظفر خان کی تقریر سن کر تمام فوجی سردار بے حد متاثر ہوئے، یکزبان ہو کر بولے کہ ہم جان دینے اور آگ میں کودنے کے لئے بھی تیار ہیں،

کہ تا جان بود جان سپاری کنیم — بہ پیشت سر خود بخاک افگنیم

بفرمان خان جملہ راضی شویم — اگر خان فرستد در آتش رویم

غازی ملک (یعنی غیاث الدین تغلق) جب خسرو خان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دہلی کی طرف بڑھا، تو خسرو خان نے پیشقدمی کر کے سرستی کے پاس اس کو روکنا چاہا، خسرو خان کے پاس کثیر فوج تھی، لیکن غازی ملک نے اپنی پریشانی اور سراسیمگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اپنے لشکر کے سرداروں کو بلا کر ایک پر جوش تقریر کی، جس کو امیر خسرو نے تغلق نامہ میں اس طرح منظوم کیا ہے،

۱؎ فتوح السلاطین ص ۲۵۵،

بدیشان بگفت اے سران سپاہ | چہ تدبیر باید درین حرب گاہ
ازین فوج کافر اگر بگذریم | چہ رو پیش صفدار عالم بریم
درآید ونک پیچیم در کارزار | کجا یک ہزار و کجا دہ ہزار
عجب کار ما را بہ پیش آمدہ است | دو گرگ از پس و پیش پیش آمدہ است
در عطف خیرے نہ در کار زار | کنیم انچہ گویند مردان کار

اس تقریر کو سُن کر اصحاب انجمن نے کہا اے خان! مغلون کو پسپا کرنے مین تمھاری شہرت بہت ہی دور تک پھیل چکی ہے، اس لئے اگر تم لڑائی کئے بغیر سلطان کے پاس گئے، تو تمھاری شان مین کمی نہ ہوگی، اور سلطان تم سے ناخوش نہ ہوگا،

گروہے ز اصحاب آن انجمن | بگفتند کاے خان فرخندہ فن
شکستی سراسر مغل را سپاہ | زماہی رسید این خبر تا بہ ماہ
کنون عطف شایان تر از کارزار | کشہ را براہت دو چشم است چار

ظفر خان شجاعت، بہادری اور معرکہ آرائی کے لئے اپنے زمانہ مین بہت مشہور ہو چکا تھا اُس نے بزدلی اور کم ہمتی سے میدان جنگ چھوڑ کر واپس جانے مین ذلت اور خواری محسوس کی، اس کو اپنے فوجی سرداروں کا جواب پسند نہین آیا،

چو زان قوم بشنید خان این سخن | خرد شید و جوشید چون اہرمن

ظفر خان نے اُن کو مخاطب کرکے پھر کہا جب ایک دن مرنا ہے تو دشمنون پر حملہ کرکے مرنا بہتر ہے، مین تو اس ہندوستان مین نامورون کی موت مرون گا، اور آج ہی کی لڑائی مین جان دون گا، تاکہ میرا نام تاریخون مین زندہ رہے، جو شخص اس نازک موقع پر میدان جنگ مین وفادار رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ تو فوجیون کے ساتھ آگے بڑھے، تاکہ مہر و وفا کی کتاب مین اس کا نام باقی رہے، اور

چو من بر نام یزدان تکیہ کردم یقین است آن کہ تنہا چیرہ کردم
مرا در من چو جز دین را فرج نیست من و این کار بر غیرے حرج نیست

اس تقریر سے جو اثر پیدا ہوا، وہ بھی سننے کے لائق ہے۔

چو بشنیدند مردانِ سرافراز ز مخدوم خود این حرف سرانداز
سراسر چون ہمہ سرباز بودند بروے خاک سرہا بازیدند
پس انگاہ از سراسر بازی خویش سر خود خدمتے بردند در پیش
فرو گفتند کاے سرور سران را بزیر پاے تو سر سروران را
ہمیشہ باد سر بار کلاہت کلہ گوشہ کشیدہ سر ہماہت
سرے کز دولتت عمری کلہ داشت ز کارت چون توان اکنون نگہ داشت
بسر بازی چو مارا فرد دادی سر مادر کلہ ناید زشادی
نہ ما آن سرسری آریم پیشت کہ ندہیم از فتد سرہاے خویشت
چہ باشد یک سر ما زیر خنجر ہزاران پارہ گردد جملہ یک سر
ز ہر پارہ جدا برخیزد آواز کہ باز از بہر تو کردیم سرباز
کمر بستیم و پیمان نیز بستیم بر آن پیمان رگِ جان نیز بستیم
کہ تا جان در تن است سر بگردن نخواہم از درت سر دور کردن
چو مارا سر جدا گشت اندرین کار تو دانی خواہ صلح و خواہ پیکار[1]

بابر رانا سانگا سے جنگ کرنے کو کنواہا کے میدان کی طرف بڑھا، تو اُس نے اپنے فوجی امرا اُور

[1] تغلق نامہ ص ۸۴-۸۵-۸۶-اسی جنگ مین ایک اور موقع پر غیاث الدین تغلق نے ایک تقریر کی تھی جو تغلق نامہ ص ۲۰ پر درج ہے،

ملک در پیش یک یک را طلب کرد — پس از دل قصہ را پنہان لب کرد
کہ ما را چرخ پیشین آورد کارے — کہ گردش ہست در روی چرخ وارے
گرانیروے پیل است و دل شیر — کہ ہم بازو شود با ما بہ شمشیر
نخست از خون خود خیزد چو لالہ — پس از خون عدو شوید پیالہ
بہ خنجر نہد اول سر خویش — کشد پس بر دگر سر خنجر خویش
بلے مردان بہر سازے و سوزے — کسان را پرورند از بہر روزے
بود ہر روز عشرت را شمارے — فتد او بعد عمرے کارزارے
بکارے نایدار یارے دران روز — بسوزش دل کہ نبود یار دل سوز
بود تیر از برائے رزم نخچیر — تو بے آن چوبہ وان چوبہ تیر
کمان گر بشکند ہنگام پیکار — زہے کے باید از لب ہای سوفار
اگر شاہین زبون گردد ز شارک — کلہ گل مرغ را زیبد بتارک
بیاید آن کہ دارد کار با ما — شوید از عہد و پیمان یار با ما
شود گر عہدہا محکم بہ سوگند — بکار جان شویم از جان کربند
دگر یارے ندارد میل یاری — کہ دشوار است کار جان سپاری
درین یاری کہ دارد کار با من — دل من ہست آخر یار با من
بدین دل کاہنین سدیست پایے — کنم گر سد آہن باشد از جائے
مرا باید در بس است دہم ترازو — دو بازوے من و تعویذ بازو
شنیدم بود رستم چیرہ دستے — کہ گاہ حملہ تنہا صف شکستے
نہ آن رستم زمن در کار پیش است — کہ ہر کس رستمے در عہد خویش است

چون جان آخر از تن ضرورت رود بمان بہ کہ باری بعزت رود
سرانجام گیتی ہمین است و بس کہ نامی بہ نیکی بماند ز پس

اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی ہے، اور یہ دولت عنایت فرمائی ہے کہ اگر ہم غنیم پر غالب آئے، تو غازی کہلائے، اور اگر مرے تو شہید ہوئے، دونوں حال مین ہم کو بڑا درجہ اور بلند مرتبہ ملتا ہے، آؤ ہم سب مل کر حلف اٹھائین کہ ہم موت سے نہ بھاگین گے، اور جب تک دم مین دم ہے، اس لڑائی سے منہ نہ پھیرین گے، [۱]

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سرداروں، نوکروں، چھوٹوں اور بڑوں نے کلام پاک کو ہاتھون مین لے کر قسمین کھائین کہ وہ میدان جنگ سے کسی حال مین بھی منہ نہ موڑین گے، چنانچہ لڑائی ہوئی تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوئی،

شیر شاہ ہمایون کے خلاف قنوج مین معرکہ آرا ہوا، تو جنگ سے پہلے اُس نے اپنے لشکریوں کو اس طرح مخاطب کیا :

"مین نے بہت سعی کر کے تم کو جمع کیا ہے، اور تمہاری تربیت مین حتی المقدور کوتاہی نہین کی، آج ہی کے دن کے لئے تمہاری نگاہداشت کی ہے، آج ہی امتحان کا روز ہے، آج ہی کے دن جو میدان حرب مین غالب ہوگا، اپنا رتبہ بڑھائے گا، ایسی کوشش کرو کہ وقت کارزار مین سب افغان یک دل و یک زبان ہون، افغانون کی فوج مین اتفاق ہو تو شمشیر زنی مین کوئی ان کے برابر نہین، مین اپنے عزیزون سے یہ التماس کرتا ہون کہ حسد، خصومت اور اختلاف کو جانے دو، سلطان ابراہیم کے عہد مین یہ حسد، مخاصمت اور

---

[۱] یہ تقریر بابر نامہ اردو ترجمہ (ص ۳۱۰-۳۰۹) ہمایون نامہ از گلبدن بیگم (ص ۱۶) اور طبقات اکبری جلد دوم صفحہ ۔۔۔ کے مختلف ٹکڑوں کو ملا کر تیار کی گئی ہے،

سرداروں مین سراسیمگی، بددلی اور کم ہمتی کے آثار دیکھے لیکن اس نازک موقع پر اس نے غیر معمولی ہوشمندی سے کام لیا، اپنے ہمراہیون مین شجاعت و بہادری اور جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک مجلس کنکاش منعقد کی، اور فوجی عہدیدارون کے سامنے حسب ذیل تقریر کی،

"اے امرا اور سردارانِ فوج!

ہر کہ آمد بجہان اہلِ فنا خواہد بود آنکہ پایندہ و باقی است خدا خواہد بود

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا مین آیا ہے وہ یہان سے جائیگا بھی، بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہو کر مرنا بہتر ہے،

بنام نکو گر بمیرم رواست مرا نام باید کہ تن مرگ راست

جانتے ہو کہ یہان سے ہم لوگون کا وطن اور شہر کتنی دور ہے؟ کئی مہینون کا راستہ ہے، خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ ہم کو شکست ہو جائے، اور اگر ہم کو شکست ہو گئی (نعوذ باللہ) تو پھر ہم کہان کے رہین گے؟ کہان ہمارا وطن؟ کہان ہمارا شہر؟ ہم اجنبیون اور بیگانون کے ساتھ پڑے ہون گے، جانتے ہو اگر ہم کو شکست ہو گئی، تو مسلمان بادشاہ جو دنیا کے ہر گوشہ مین موجود ہین کیا کہین گے، اور ہم کو کس زبان سے یاد کرین گے، اہلِ دنیا کی گفتگو اور طعن و ملامت کو چھوڑ دو، قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مین کیا عذر پیش کر سکون گا کہ ایک سلطنت مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئی، مین اس سلطنت کا بادشاہ اپنے بہت سے ہم مذہبون اور ہم قوم کو قتل کر کے بن بیٹھا تھا اور آج غیر مسلمون سے جنگ کئے بغیر، کم از کم بغیر عذر شرعی کے واپسی کا راستہ تلاش کرون؟ آخر اُن کے ہاتھون اس ملک کے باشندون پر کیا کیا مصیبتین نہ آئین گی، افسوس اب وہ وقت ہے کہ دل مین شہادت کی ٹھان کر جہاد کے لئے بڑھین،

کی عنایت اس سے بھی زیادہ ہے، جتنی کہ انسانی عقل کے احاطہ مین آسکتی ہے، تمھارا
طریقہ یہ ہو کہ تم اپنے کو عاطفت ربانی کی مضبوط رسی میں جکڑ لو، تذبذب اور تزلزل کے
شائبہ کو دل مین مطلق نہ لاؤ، یک دل، یک رو، اور ایک راہ ہو کر اپنی پراگندگی
کو اپنے سے دور رکھو، غنیم کی فوج کا جھنڈا سُرخ ہے، اُن کے سر پر خون سوار ہے، تم
نصرت کے ہم رکاب ہو کر اُن کے پاس پہنچ جاؤ، میدان جنگ مین بہادرون کو جوش
مین لڑائی اور تجربے کے مسلک سے باہر نہین ہونا چاہئے، اور جب ہم اس سرکش کا کام
تمام کرلین گے، تو دوسری بدبختون سے چھٹکارا پالین گے"[۵۱]

۱۰۳۵ھ مین جہانگیر کشمیر سے کابل جارہا تھا، تو دریائے جھیلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان
نے سازش کرکے جہانگیر کو اپنی حراست مین لے لیا، نور جہان بھی ساتھ تھی، جہانگیر کا قید ہونا تھا کہ
شاہی فوج مین انتشار پھیل گیا، لیکن نور جہان اپنی فراست اور تدبیر سے کام لے کر مہابت خان
کے پنجہ سے بچ نکلی، اور دریا کی طرف اپنے بھائی آصف خان سے جا ملی، وہان پہنچ کر ارکان دولت
کو طلب کیا، اور نہایت ہی خشمگین ہو کر اُن کے سامنے ایک ملامت آمیز تقریر کی کہ

"تمھاری غفلت اور ناتجربہ کاری سے ایسی بات پیش آئی، جو کسی کے تخیل مین بھی نہین
آسکتی تھی، تم اب خدا اور خدا کی مخلوق کے سامنے شرمندہ ہو، لیکن یہ شرمندگی اس وقت
دور ہو سکتی ہے، کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک ہونا چاہئے، بتاؤ اب کیا کرنا ہے"

اس ملامت بھری تقریر کو سن کر نور جہان کے ہمراہیون نے بالاتفاق مہابت خان
کی فوجون پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا[۵۲]

سموگڈھ مین دارا اور اورنگ زیب کی فوجون کا اجتماع ہوا، تو لڑائی سے ایک رات پہلے

---

[۵۱] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۰۵ [۵۲] اقبالنامہ جہانگیری ص ۲۶۰

اختلافات ہی کی وجہ سے افغان مغلوب ہوئے جس کا مزہ انھون نے خوب چکھا، لشکر کو فیروزمندی اور بلندی اس کی یکدلی سے حاصل ہوتی ہے، اے عزیزو! تم کو یہ معلوم رہے کہ مین نے عزم جزم کر لیا ہو کہ اس رزم گاہ سے اس وقت زندہ نکلون گا کہ فتح و نصرت ہو، ورنہ میرا سر دشمنون کے گھوڑون کے سُم سے کچلتا نظر آئے گا، مرنا مسلّم ہے بہتر ہے کہ ایسے کام مین مرین کہ نیک نام ہون، اے عزیزو تم ڈرو نہین، رزم گاہ مین اس طرح جاؤ کہ سر کے ساتھ پاسبانی کلاہ رکھو، سپاہ کے لئے اس سے زیادہ کوئی بدنامی اور شرمندگی نہین ہو کہ اس کا آقا مارا جائے، اور سپاہی اور خدمت گار زندہ رہین، اس جنگ مین ثبات قدم کے لئے تحریص کرتا ہون، کیونکہ ملک ہند کا ہاتھ آنا، اور مغلون کے ہاتھ سے اہل و عیال کا رہائی پانا اسی پر موقوف ہی، مین بڈھا ہو گیا ہون، ہزارون دقتون سے افغانون کو جمع کیا ہے اگر خدانخواستہ اس معرکہ مین یہ لشکر شکست کھا کر پراگندہ ہو گیا، تو پھر اس کا دوبارہ جمع ہونا محال ہے، ہوا سے جو کلیان درخت سے جھڑ جاتی ہین، پھر وہ شاخ پر جمع نہین ہوتین"،

اس تقریر کو سُن کر افغانون نے پامردی اور جان نثاری دکھانے کا وعدہ کیا[۵۱]

شاسمہ جلوس شاہی مین اکبر نے دوسری بار احمد آباد مین محمد حسین مرزا کے خلاف اپنی فوج صف آرا کی تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس نے اپنی فوج کی ہمت ان الفاظ سے بڑھائی،

" غنیم کی تعداد بظاہر بہت ہو لیکن درگاہ الٰہی کے اس نیازمند کی طرف خداوند کا سا

---

[۵۱] تاریخ شیر شاہی مؤلفہ عباس خان سروانی بحوالہ ذکاءاللہ، جلد سوم ص ۳۰۲ - ۳۰۳ و الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۰ - ۴۱۱ مجلس مشاورت مین شیر شاہ کی اور تقریرون کے لئے دیکھو الیٹ جلد چہارم ص ۴۰۲، ۴۰۷، ۴۲۳ و ذکاءاللہ جلد سوم ص ۲۹۲،

دشمنوں سے جا ملے ہیں لیکن وہ اپنے اعمال اور خیالِ خام کی سزا پائینگے،[۱]

اس تقریر سے اورنگ زیب کے لشکر میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی، اور اپنے آقا کا سکون اور اطمینان کلی دیکھکر سکوڈھارس ہوئی، تقریر کے بعد اورنگ زیب نے نقارہ بجانے کا حکم دیا، اور اپنی سواری کا ہاتھی منگوایا، تمام رات اسی ہاتھی پر سوار ہوکر اپنی فوجوں کی نگرانی کرتا رہا، آفتاب طلوع ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ہاتھی شجاع کے ہاتھی کی طرف بڑھایا جائے، مرشد قلی خان نے روکا کہ اتنی جرات بادشاہوں کے دستور کے خلاف ہی، لیکن اورنگ زیب نے کہا کہ

"کوئی شخص یونہی بادشاہ نہیں ہو جاتا، اسی قسم کی جرأت سے بادشاہت ملتی ہی، اگر بادشاہت ملنے کے بعد جرأت میں کوئی فرق آجائے تو سلطنت باقی نہیں رہ سکتی"

عروسِ ملک کسے در کنار گیرد تنگ

کہ بوسہ بر لبِ شمشیرِ آبدار دہد[۲]

(باقی)

---

[۱] عالمگیر نامہ ص ۲۵۵-۵۶، خافی خان جلد دوم ص ۵۳ [۲] احکام عالمگیری بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر معارف پریس ص ۷۷ م،

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء، درباری مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغہ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود ان خطوط و واقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، قیمت: صر

"منیجر"

اورنگ زیب اپنے لشکر کے "مبارزان نصرت کیش" اور "دلیران صف شکن" میں یہ کہکر جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا،

"کل بہادری اور مردانگی دکھانے کا دن ہے، اس جگہ سے ہمارا پایۂ تخت بہت دور ہے، یک دل اور یک رو ہو کر دشمنوں پر حملہ کرو، اور اپنی چمکتی ہوئی تلواروں کی ضرب سے حکومت حاصل کرو، فتح پا کر، اور دشمنوں کو پسپا کر کے دنیا میں نام پیدا کرو،

بکوشید کوشیدن مرد وار | رگ جان بکوشش کنید استوار
اگر دست بر دیم مارا ست ملک | دگر ما شدیم آن دارا ست ملک[1]

کھجوہ کی جنگ میں جسونت سنگھ کی سرداری میں راجپوت سپاہی آئین وفا کے خلاف اورنگ زیب کو چھوڑ کر شجاع سے جا ملے، جسونت سنگھ کے ہاتھ میں اورنگ زیب کی فوج کی یمین یعنی دائیں بازو کی کمان تھی، اس نے لڑائی سے ایک رات پہلے شجاع سے سازش کر لی کہ رات کو میں عقب سے اورنگ زیب کی فوج پر حملہ آور ہوں گا، اور تم سامنے سے حملہ کر دینا، اس طرح ہم دونوں مل کر اورنگ زیب کو پیس ڈالیں گے، چنانچہ جس وقت اورنگ زیب کو جسونت کی بیوفائی کی خبر ملی تو اس وقت وہ تہجد کی نماز پڑھ رہا تھا، اس کی فوج میں انتشار پھیلا لیکن اس کی پیشانی پر بل نہ آیا، اس نے اطمینان کے ساتھ تہجد کی نماز ختم کی، پھر ضبط و ہمت اور وقار و تحمل کا پیکر بن کر تخت رواں پر سوار ہوا اور اپنے امرا اور ہمرکابوں کو جمع کر کے اُن سے اس طرح مخاطب ہوا،

"الحمد للہ، اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی، اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں، اور اب یہی چیز میرے لئے فتح و کامرانی کی باعث ہوگی، بعض کوتہ اندیش، اور باطن منافقوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اب غنیم کو غلبہ ضروری ہے، اور اسی لئے وہ

---

[1] واقعات عالمگیری ص ۲۴،

چھوڑ کر فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسون کی کم کتابون کو نصیب ہوا، اخلاق ہندی بہادر علی حسینی کا مشہور کارنامہ ہے، اور بقول صاحب ارباب نثر اردو حقیقت یہ ہے ان کا نام بھی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہی سے زندہ ہے [۵۱]

جیسا کہ خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ مین بتایا ہے کہ یہ کتاب اس نے ڈاکٹر گل کرائسٹ کی فرمایش پر ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) مین لکھی، پہلی مرتبہ اس کا ایک طویل اقتباس گل کرائسٹ کی بیاض ہندی مین شائع ہوا، اور اسی سال یعنی ۱۸۰۳ء مین خود گل کرائسٹ نے اپنی نگرانی مین پوری کتاب کلکتہ سے شائع کی، اس کے بعد یہ کتاب متعدد بار چھپی چنانچہ سرجارج گریرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا مین اس کے مختلف اڈیشنون کی جو فہرست دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال کے عرصہ مین یہ کتاب بمبئی بنگلور، کلکتہ اور لندن مین چھپتی رہی، اور اس عرصہ مین اس کے دس بارہ اڈیشن نکل گئے، اس کے بعد اس کے اور بھی اڈیشن نکلے، لیکن اس کے باوجود اس کے نسخے بہت کم یاب ہین، اول تو ان دنون ایسی قدیم اور یادینہ کی حیثیت رکھنے والی کتابون کو کوئی پوچھتا ہی نہین، اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایسی دائمی مقبولیت نہین حاصل کر سکی، جیسی کہ باغ وبہار کو نصیب ہوئی، [۵۲]

صاحب ارباب نثر اردو کے پیش نظر اخلاق ہندی کا جو نسخہ تھا، وہ مطبع فتح الکریم بمبئی کا چھپا ہوا تھا، انھون نے لندن کا چھپا ہوا نسخہ نہین دیکھا، لکھتے ہین "۱۸۶۸ء مین ایک صاحب سید عبداللہ نامی نے اس کا نفیس اڈیشن نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع کیا تھا، اس مین تمہید اور حاشیہ بھی تھا" [۵۳] یون بھی اس کتاب کے نسخے کمیاب ہین، یہ اڈیشن تو نایاب کا حکم رکھتا ہے، راقم کی نظر سے یہ نسخہ گذرا ہے، اور بعض ایسی خصوصیتون کا حامل ہے، جن کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہین، اس لئے اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے کتاب متن اور مرتب کے لکھے ہوئے خاتمہ کو ملا کر رائل سائز کے (۱۹۲) صفحون پر ٹائپ مین چھپی ہوئی

---

۵۱ ارباب نثر اردو، از سید محمد طبع دوم ۱۹۳۶ء ص ۱۱۶ ۵۲ ایضاً ص ۱۱۸ ۵۳ ایضاً ص ۱۱۸،

"اخلاقِ ہندی"

کا

ایک نادر اڈیشن اور پامر کا اردو قصیدہ

از

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعتؔ لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد

میر بہادر علی حسینی مصنف اخلاق ہندی نثر بے نظیر تاریخ آسام اور رسالہ گل کرائسٹ کے حالات میں صرف اتنا معلوم ہے، کہ میر بہادر علی حسینی کا شمار مرحوم فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ممتاز ارباب قلم میں ہوتا تھا، اور ڈاکٹر گل کرائسٹ، جان شکسپیر اور ڈاکٹر فوربس جیسے محبانِ اردو کی سرپرستی میں کالج کے منشیوں نے سادہ اور بے تصنع اردو نثر لکھنے کی جو مہم شروع کی تھی، ان میں میر بہادر علی بھی ایک نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے متعلق جو کچھ بھی منتشر مواد مل سکا، اسے صاحب "ارباب نثر اردو" نے ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ یکجا کر دیا ہے،[1]

میر بہادر علی کی کتابوں کو وہ شہرت اور وہ حسن قبول حاصل نہ ہو سکا جو اُن کے ہمعصر اور ہم پیشہ میر امن کی لکھی ہوئی کتابوں کو حاصل ہوا، ان کی تصانیف میں تاریخ آسام اور رسالہ گل کرائسٹ، تو اب تک شائع بھی نہیں ہوئیں، اور ہنوز مخطوطوں کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں، تاہم ان کی کتابوں میں "اخلاق ہندی" کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ "باغ و بہار" "طوطا کہانی" اور "بے تال پچیسی" جیسی کتابوں کو

---

[1] ارباب نثر اردو، از سید محمد طبع دوم ۱۹۳۷ء ص ۱۱۱۰-۱۱۱۲،

ہین امام عاشران کے جدا مجد فخر خلق کون بہتر اُن سے ہوگا اور والا دودمان

رحمت اللہ ان پر ہوے تا روز قیام جو ہوئے اس سال ہی داخل باغ جنان

صاحب تذکرہ ہندو یہ وپی شعراے اردو و فارسی رام بابو سکسینہ کے بیان کے مطابق سید عبد اللہ اودھ کے نواب سید رجب علی خان ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے، اور ان سے لاہور، دہلی اور جگراون مین تعلیم حاصل کی تھی، اور ارسطو جاہ ہی نے سید عبد اللہ کو بمبئی کے گورنر سر جارج کلارک کی خدمت مین پیش کیا تھا، اونھون نے کوشش کرکے سید عبد اللہ کو جامعۂ کیمبرج مین مشرقی زبانون کا استاد مقرر کرادیا تھا، وہ اردو، عربی، اور فارسی کے سوا ہندستان کی اور کئی زبانین جانتے تھے، چنانچہ جامعہ کیمبرج مین اردو، عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی، بنگالی اور گجراتی بھی پڑھایا کرتے تھے،

معلوم ہوتا ہے اس زمانہ مین جامعہ کیمبرج مین اور بھی کئی ہندوستانی عالم جمع ہوگئے تھے، ان مین اودھ کے نواب اقبال الدولہ خاص طور سے مشرقی علوم کی ترویج مین پیش پیش تھے، ایک اور صاحب کا نام سید عبد اللہ نے اس کتاب مین ضمناً لیا ہے، یہ مدرسہ عالیہ ٹرنٹی کالج ڈبلن کے مدرس اولاد علی ہین غالباً یہ وہی صاحب ہین، جو پامر کے پاس مصرع طرح بھیجا کرتے تھے، ان کا نام سکسینہ صاحب کی کتاب مین آیا ہے، ان کا حسب ذیل شعر بھی سید عبد اللہ نے نقل کیا ہی،

سواد موے سیہ یون ہر رُخ کے پرتو پر دھوئین کی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

سید عبد اللہ نے اخلاق ہندی کی طرح سنگھاسن بتیسی کو بھی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کرکے انگلستان سے شائع کیا تھا، یہ کتاب اخلاق ہندی سے پہلے شائع ہوئی تھی، اخلاق ہندی کے اس نسخے کی طرح سنگھاسن بتیسی کا یہ نسخہ بھی نایاب ہے، راقم کی نظر سے یہ کتاب نہین گذری، البتہ اس کا اشتہار ڈاکٹر فوربس کی مرتبہ کتاب منتخبات عربی (Arabic Reading. London. 1869) کی پشت پر دیکھا ہے،

آخر مین آٹھ صفحون مین مرتب کا انگریزی مقدمہ اور (۳۳) صفحون مین حواشی آئے ہین، سرورق کی عبارت ہی:

"اخلاق ہندی جس کی اصل مفتی تاج الدین کی مفرح القلوب فارسی ہے، اور میر بہادر علی حسینی نے زبان ہندستانی مین اس کا ترجمہ کیا اور وہ ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ کے شہر کلکتہ مین چھاپا ہوا تھا، اب بعہد مہد ملکہ معظمہ انگلستان و ہندوستان کوئین وکٹوریہ دامت سلطنتہا بونارت آنریبل سر اسٹافورڈ نارتھکوٹ بیرونٹ ممبر آف پارلیمنٹ سکرٹیری آف اسٹیٹ فار انڈیا بہ تصحیح خاکسار بے مقدار سید عبد اللہ بن سید محمد خان بہادر غفران پناہ مطبع صاحبان ذی شان ڈبلیو ایچ، ایلین اور کمپنی واقع نمبر ۱۳ واٹرلو پلیس ویسٹ منسٹر لندن مین پھر مطبوع ہوا، ۱۸۶۸ء عیسوی، مطابق ۱۲۸۵ھ ہجری،

کتاب کے آخر مین تقریبًا اسی مفہوم کا سرورق انگریزی مین ہی"

اس کتاب کے مرتب سید عبد اللہ کے تفصیلی حالات کی راقم نے بڑی تلاش وجستجو کی لیکن افسوس ہو کہ کامیابی نہین ہوئی، کتاب کے مقدمہ یا خاتمے سے بھی ان کی زندگی کے حالات پر کچھ زیادہ روشنی نہین پڑتی، بہرحال جو کچھ بھی معلوم ہو سکا وہ یہ ہو کہ ان کا تعلق اودھ کے ایک اونچے گھرانے سے تھا، وہ نقوی سید تھے، لیکن زمانہ کے انقلاب کا شکار ہو کر یہ خاندان پراگندہ ہو گیا، ان کے والد سید محمد خان جائس کے باشندے اور مشہور آدمی تھے، انھون نے اس کتاب کی اشاعت کے سال یعنی ۱۸۶۸ء مین وفات پائی تھی، سید عبد اللہ نے کتاب کے آخر مین جو قصیدہ اس وقت کے وزیر ہند سر اسٹافورڈ نارتھ کوٹ کی مدح مین لکھا ہو اس مین اپنے بارے مین کہتے ہین،

انکشاف نام کی خواہش گر بندے کو ہو	انکسار عجز سے دیتا ہون مین اپنا نشان
سید عبد اللہ نقوی نام اس عاجز کا ہی	نام نامی باپ کا میرے ہے مشہور جہان
حضرت سید محمد خان بہادر جائسی	صاحب اعزاز و مکنت افتخار خاندان

میرے عزیز دلی مولوی معنوی میر اولاد علی صاحب دام لطفہ مدرس مدرسہ عالیہ ٹرنٹی کالج ڈبلن کا ایک قطعہ ہے، اور اس میں حسن اتفاق سے مثالیں قواعد مذکورہ کی اکٹھی ہو گئی ہیں، اس واسطے یہاں حسب موقع لکھا جاتا ہے، و ہو ہذا،

شعر

سواد موے سیہ یوں ہے رخ کے پر تو پر ڈھونڈتی جیسے سیاہی ہو آگ کی لو پر

اسی صفحے کے مقابل (یعنی سرورق کی پشت پر) یہی "قواعد ضروری" انگریزی میں ادا کیے گئے ہیں اس کے بعد پانچ صفحوں پر کتاب کے مطالب کی فہرست اردو میں "فہرست اخلاق ہندی کی" اور انگریزی میں انڈکس کے عنوان کے تحت کالموں میں دی ہے،

فہرست کے اختتام پر اصل کتاب شروع ہو جاتی ہے، اب کتاب کو بند کر کے دائیں طرف سے شروع کیجئے تو پہلے انگریزی میں سرورق ہے، جسے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اس کے بعد انگریزی میں رایٹ آنریبل سر اسٹفرڈ. ج نارتھ کوٹ سکریٹری آف اسٹیٹ آف انڈیا کے نام "تمہید" ہے، اس کے ساتھ ایک خط ہے جس میں موصوف کی ہندوستان کی زبان سے دلچسپی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے،

اس کے بعد انگریزی میں آٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا مرتب کا مقدمہ ہے، ابتدا میں اخلاق ہندی سے متعلق وہی باتیں بیان کی ہیں، جن کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں، اس کے بعد اردو یا ہندستانی کے متعلق وہی دعوی کیا ہے جس کی صداقت کو آج ایک صدی کے بعد بھی ہر محب وطن پوری طرح محسوس کر رہا ہے لکھتے ہیں:-

"اخلاق ہندی کی زبان خالص ہندوستانی ہے جو پورے جزیرہ نما کی قومی زبان ہے اور جس کو راس کماری سے کابل تک تقریباً ہر شخص بولتا ہے"

اس کے بعد افسوس کا اظہار کیا ہے کہ حکومت ہندوستانیوں کو انگریزی سکھانے کے لئے تو روپے

سید عبد اللہ اس وقت کے ذریعہ ہند سر اسٹا فورڈ نارتھ کوٹ سے شخصی طور پر متعارف تھے، اور ان کی اجازت سے اپنی کتاب انھون نے ان کے نام معنون کی ہے اور قصیدے مین، اور کتاب کے مقدمہ اور خاتمہ مین بالکل مشرقی انداز مین اُن کی بڑی تعریف کی ہے، اور ان کا شکریہ ادا کیا ہے،

سرورق کے بعد قواعد ضروری کے عنوان کے تحت کتاب مین جو اعراب دیئے گئے ہین، ان کی تشریح درج ہے، ملاحظہ ہو،

" قواعد ضروری جو اس کتاب مین ملحوظ ہین،

واوٗ معروف، جیسا تو، دوسرا، مارون گا، بے نشان ہے،

یٰ معروف، جیسے پانی، موتی، لگی، بھی، بے علامت،

واوٗ مجہول مثل تو، کو، سوچ، جزم مردر، کا نشان رکھتا ہے، تاکہ فرق رہے، اور کوئی تُو بروزن زُو یعنی چہرہ کو، تو، جو وزن پر دو کے ہے نہ پڑھے،

یٰ مجہول متوسط ہو تو یہی نشان رکھتی ہے، مگر آخر لفظ مین بدون کسی نشان کے بڑی "ے" لکھی گئی، جیسے بیٹے، میرے،

واوٗ ماقبل مفتوح پر نشان ء کا دیا کہ واوٗ مجہول سے مشابہ نہ ہو، اور معروف سے تمثیل نہ رہے، جیسا نوٗ، دوٗلت،

یٰ ماقبل مفتوح پر متوسط ہو یا آخر یہی نشان ء ہے، مگر فرق کے لئے ھی کے تلے زیر دے دیا ہے،

نون غنہ یا نون خفی، آخر مین بے نقطہ چھوڑا، مثلاً مین نہین کو مین نہین لکھا، درمیان مین جابجا اس پر جزم ء دے دیا ہے، جیسے ہنسی، مُنہ نون اظہار کو حالتِ اصلی پر رکھا ہے، جیسے منجن، انجن، تین،

صفحہ ۲۰۸ پر اخلاق ہندی کا متن ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مرتب نے ایک خاتمہ لکھا ہے جس میں ان کا اور ان کے شاگرد ہنری پامر کا اردو قصیدہ بھی شامل ہے، اور پھر اس خاتمہ کا پورا انگریزی ترجمہ حواشی کے خاتمہ پر دیا ہے، اس ترجمہ کی ابتدا میں یہ معذرت ہے کہ ترجمہ میں اصل زبان کی لذت و چاشنی نہیں، یہ خاتمہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے اس لئے اسے شروع سے آخر تک نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے،

خاتمہ | ہو الاول، ہو الآخر، الحمد للہ کہ اس کتاب کا اختتام ہوا، اور عہد وزارت امیر کبیر سرا ٹافورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر بالقابہ میں یہ نسخہ تمام ہوا، اور ان کی توجہ بے غایت اور الطاف و عنایت سے نہ فقط اس کتاب کا بلکہ خود اس فدویت انتساب کا رتبہ بڑھا، بقول سعدی

سزد گر بدورش بنازم چنان کہ سید بدوران نوشیروان

اوصاف اس مجمع علم و کمال اور مرکز جاہ و جلال کے میری کیا جان اور قلم کی کیا زبان ہے، جو بیان کروں، اس کی ذات خجستہ صفات فضل حی و قیوم سے موجود ہے، میرا تعریف کرنا فضول اور بے سود ہے، مشک آنست کہ از خود ببوید نہ آنکہ عطار گوید" عیان راچہ بیان، مگر جو امر حق ہو اس کو چھپانا گویا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے، اور اپنے ولی نعمت کا شکر نہ کرنا کفر ہے، من لم یحمد الناس لم یحمد اللہ اس واسطے بالکل ساکت بھی نہیں رہ سکتا،

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا چپ رہوں تو رہا نہیں جاتا

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل، بہر حال الفاظ چند بطور اظہار حق، نہ خوشامد سے عرض کرتا ہوں ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حقیقت حال یہ ہے کہ جس تاریخ سے یہ امیر ابن امیر مدبر امور ہند مقرر ہوا، ہر طرح سے خیال بہبود ہند اور ہندیوں کا مد نظر رہا، اافضال الٰہی اور اقبال شاہی اور اس وزیر خوش تدبیر کی نیک نگاہی سے سارا ہندوستان آباد ہے، اور ہر دل انصاف پسند شاد ہے،

صرف کرکے لائق اور فاضل استادوں کو بھیجنے کا انتظام کرتی ہے لیکن انگریزوں کو ہندوستانی سکھانے کے لئے ایسا ہی طریقہ اختیار نہین کیا جاتا، انگریزوں کو اردو پڑھانے والے جو اشخاص مل جاتے ہیں وہ نہ تو باقاعدہ ترتیب یافتہ ہوتے ہین، اور نہ ان کی علمی استعداد ہی کچھ اچھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایسے انگریزوں کو جو ہندوستان مین قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہین، صحیح ہندوستانی سیکھنے کے بارے مین کئی مشورے دیتے ہین، اسی کے ذیل مین رومن رسم خط اختیار کرنے کے بارے مین لکھتے ہین،

"جو لوگ ہندوستان مین قیام کرنا چاہتے ہین، ان کے لئے ہندوستانی زبان کی اہمیت ظاہر ہے اُس اہمیت کو نظرانداز نہین کیا جاسکتا، اس لئے بیجا نہ ہوگا، اگر کچھ ایسے مشورے پیش کئے جائین، جو اس زبان کے سیکھنے مین بہترین ثابت ہون، ایک بتدی کو اس کے حروف تہجی خود سیکھنے کی کوشش نہین کرنا چاہئے، کیونکہ اگر زبان پر خراب قسم کا تلفظ چڑھ گیا، تو پھر اس کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے ایک تجربہ کار استاد کی نگرانی مین یہ زبان سیکھنی چاہئیے اسی کے ساتھ نستعلیق کی مشق شروع کر دینی چاہئے، جیسا کہ فارسی کی ہندوستانی گرامر مین دی ہوئی ہے، بعض کوتہ اندیش رومن رسم الخط اختیار کرنے کی رائے دیتے ہین، اور اسی رسم الخط مین ابتدائی کتابین پڑھنے کو کہتے ہین، لیکن یہ محض کاہلی کا ایک مہمل بہانہ ہے، کیونکہ کوئی شخص کسی کی زبان کو اس وقت تک نہیں سیکھ سکتا ہے، جب تک اسکے رسم الخط سے بھی واقف نہ ہو جس مین یہ زبان لکھی جاتی ہے"

مقدمہ کا خاتمہ مسٹر پامر کی ایک عربی نظم اور اس کے انگریزی ترجمہ پر کیا ہے جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے کرین گے، مقدمہ کے بعد انگریزی مین حواشی درج ہین، جو (۲۴) صفحات پر محتوی ہین، حواشی مین سب سے پہلے کتاب کے ابتدائی حصہ یعنی حمد و نعت و سبب تالیف کا انگریزی ترجمہ درج ہے، اس کے بعد کتاب مین جہان جہان عربی الفاظ، مشکل روزمرّہ، محاورے، اور اشعار آئے ہین، ان پر مفصل حواشی لکھے ہین،

صف جاہ سلیمان سے عقل اور تدبیر مین بڑھ کر ہے، میرے اوصاف اس حکومت کے اگر کوئی شخص خوشامد پر محمول کرے،
تو اس کو لازم ہے کہ احوال ہند کو ایک نظر بچشم انصاف دیکھے، مدرسے، تھانے، نمایش گاہین، دوا خانے،
تار برقی، ڈاک، مراکب دودی، (یہ ترجمہ ہے steamers کا) ترقی تجارت، داد رسی مظلومان، سرکوبی
ظالمان، رئیس بے انتظام کو معزول کرنا، اور حاکم منتظم کو اختیار دینا، یہ سب باتین رفاہ کی میرے دعوی
پر دلیل ہون گی، اور مخالف کی دلیلین سب ذلیل ہون گی، انصاف شرط ہے، جو حصہ ہندوستان کا ابھی
سرکار نے نہین لیا، دیکھو تو وہان کیسی خرابی اور ویرانی ہے، حاکم وہان کے تھپنے کے تھپنا، گوبر گنیش، مٹی کے
لبیب ان محاورون کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، Blockheads. pampered
جو الف کا نام لٹھا بھی نہین جانتے، رات دن رنڈیون مین بسر کرتے ہین، drivellers -)

صبح تو جام سے گذرتی ہے	شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے	اب تو آرام سے گذرتی ہے

ان کا وجود کالعدم ہے، چہ خفتہ چہ بیدار،

مگر سب حکام اور راجہ ایسے نہین، جناب معزز خطاب، مہاراجہ سرگیاتی والی پٹیالہ کو دیکھئے کہ
اپنے حسن انتظام اور عقل و فہم سے کتنے نیک نام رہے، اور پیش گاہ ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام ملکہا
سے تمغائے عزت اور خطاب فرزند خاص منصور زمان، امیر الامراء، مہاراجہ دھیراج، راجیشر، مہاراجہ
راجگان، نرندر سنگھ بہادر کا ملا، اور اب فی زمانا سری مہاراجہ ادھیراج والی کپورتھلہ دام دولتہ،
جو سرکار انگریزی کے خیر خواہ جانی رہے، اور جانفشانی مین جان و مال سے دریغ نہین کیا، اور
مہمات کابل اور پنجاب مین کیسے کار ہائے نمایان کئے، خصوصًا بلوائے ۱۸۵۷ء مین جو جو شجاعتین اور بہادریان
کین ان کا کیا کہنا، یہی کافی ہے کہ بہ صلہ وہی حسن خدمات پیش گاہ حضرت ملکہ معظمہ سے خطاب فرزند
دل بند راسخ الاعتقاد، راجہ نرندھیر سنگھ بہادر ستارۂ ہند کا تمغا عطا ہوا، جاگیر بھی ملی، اور تسید

یہ سچ ہے کہ اقلیم ہندوستان ہوئی اس کی اقبال سے بوستان

شگفتہ ہیں گل بلبلیں نغمہ سنج شکستہ ہیں سب خار اندوہ و رنج

ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستان میں کوئی مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر کو بے خطر نہ جا سکتا تھا، راہ میں ٹھگوں اور ڈکیتوں سے، بازار و ہاٹ میں دغابازوں اور جیب کتروں سے، دوکانیں اور گھر نقب زنوں اور چوروں سے حفاظت میں نہ تھیں، اور ایک وقت یہ ہے کہ حکومت سرکار میں راہ میں خشکی اور تری کی ریل گاڑی اور دخانی کشتی کی آمد و رفت سے پر شور و غوغا ہیں، مال تجارت کرایہ داروں کا آتا جاتا ہے کوئی نہیں پوچھتا کہ موتی لئے جاتے ہو یا پوت، سونا لادا ہے، یا پتھر، بازاروں میں جتنی مال و اسباب کی کثرت ہوا اتنی ہی کیسہ بروں کی قلت، دوکانوں اور گھروں میں کچھ چوکی پہرے کی حاجت نہیں اگر ہے تو سگ اختری ان کا پاسبان ہے، جہاں لڑائی اور خونریزی ہر روز سننے میں آتی تھی، وہاں اب سناٹا ہے ہر روز علم کی ترقی اور جہل کی کمی ہے، انصاف سے ظلم کی خرابی اور بربادی ہے، جہاں گائے بیل کی قربانی منع اور آدمی کی از مباحات تھی، بچہ کشی اور ستی ہونا گویا منہ کی بات تھی، وہاں ماں پیٹ کا تو کیا ذکر ہے کوئی کسی کو گالی بھی اگر دے یا آدمی کے بدلے جانور کی جان ناحق کو لے تو ایسی سزا پائے کہ چھٹی کا دودھ زبان پر آئے، بردہ فروشی اور کسب حرام گمنام، حفاظت رعایا کو تھانے اور پولیس، حفاظت ملک کو فوج جرار پیادہ اور سوار بری اور بحری ہمیشہ تیار، مخالف سرکاری زبون اور نشان جہازات عالم کے سامنے رایت دولت انگلیزیہ کے سرنگون ہوتے ہیں، یہ عزت کیا کم ہے، کہ حکومت ملکہ معظمہ کی سرکوب عالم ہے، پھر وزیر ایسے بادشاہ ظفر پایگاہ کا کیونکر ویسا نہ ہو، شعر

وزیرے چنین شہریارے چنان

جہان چون نہ گیرد قرار آنچنان

ہندو پر شکریہ اس کا فرض ہے کہ زیر حکومت ایسے بادشاہ معدلت پناہ کے ہیں جس کا وزیر

وہ خدائے پاک و برتر جس نے احمد کو کیا رہ نمائے جن و انسان پیشوائے مرسلان

وہ نبی جس نے علی کو جانشین اپنا کیا جانتے ہین سب غدیر و خم کے جو ہین رازدان

دونون کو پہنچے درود اور دونوں کو پہنچے سلام اُن کے لائق اور کیا ہے پاس میرے ارمغان

شکرِ خالق مین رہے مصروف خلقت چاہیے یعنی بندون پر ہو وہ اپنے نہایت مہربان

سلطنت وکٹوریہ کو کی عطا اللہ نے ہندیون پر ہے یہ احسانِ خداوندِ جہان

کوئین ایسی کوئی گذری ہے نہ آگے ہوئیگی فیض بخش و دادگسترِ اہلِ جود و امتنان

ختم اس پر ہے رعیت پروری و منصفی ہے عجب عاجز نواز اہلِ عطا و مہربان

خلق و اکرام و مروت مین نہین اس کا نظیر قدر اس کی جانتے ہین خوب جو ہین قدردان

پیرِ گردون خم پئے تسلیم ہے اس کے حضور عقل و بخت اس کو دیئے ہین حق تعالیٰ نے جوان

بے سخن وہ باعثِ افزونیٔ اخلاق ہے کیون فدا اس پر نہ کیجئے اہلِ دل اپنا مال و جان

حکم اس کا ماہ سے ماہی تلک جاری ہوا کیون نہ ہو توصیف مین اسکے مرا خامہ روان

اس کے حق مین کر رہے ہین اوج و حشمت کی دعا ساکنِ انگلینڈ و ہر باشندۂ ہندوستان

ہون عدو پامالِ غم آفاق مین اس کے مدام دوست جو دل سے ہون اسکے وہ رہین شادمان

کیسے کیسے اہلِ دانش ہین امیر اسکے رفیق ہے بجا اک اک کو گر کہئے فلاطونِ زمان

انتظامِ مملکت کرتے ہین بآئینِ حسین بند و بست ان کا ہے بیشک باعثِ امن و امان

منتخب ان مین سے ہے ممدوح میرا نارتھ کوٹ رائٹ انریبل سر اسٹافورڈ مشہورِ جہان

وہ مدارِ کارِ عالم مستقل ذی اختیار راتق و فاتق وہی ہے از پئے ہندوستان

اس کے اوصافِ حمیدہ سے ہے خوش وکٹوریا والیٔ روئے زمین شاہنشۂ ہندوستان

بادشاہ کوئی نہ ویسا ہے نہ ایسا ہے وزیر دونون کو رکھے سلامت خالقِ کون و مکان

تو ہی ہے کہ اور ترقی مناصب بھی ہو، یہ سب خوبیان ان کے حسن انتظام اور کالج کی قدر شناسی کا ثمرہ ہی، تعریف دولت انگریزی کی کرنا گویا توصیف ارکان دولت کی ہے، اگر وزرار حکومت کے ایسے نہ ہوتے، تو یہ رونق سلطنت کہان ہوتی؟ اگر رایٹ آنریبل سراسٹافورڈ نارتھ کوٹ صاحب بہادر دوام اقبالہ کی نیک نیتی، خوش نصیبی اور تدبیر رسا شریک نہ ہوتی، تو یہ نیک نامی جو فتح حبش پر ان کی وزارت کے ایام مین حاصل ہوئی، کب ہوتی؟ کیا اعانت ربانی ہے کہ جتنا کام ان کے تحت مین ہے، سب مزین بہ حسن انتظام و کامرانی ہے، جس قدر اس امیر کبیر کے اوصاف بیان کرون، تھوڑے ہین، اس نیاز مند کو خود اُن کی خدمت مین نیاز ہے، اس لئے جو کہتا ہون آنکھون دیکھی ہے، فقط کانون سُنی نہین، جو خوبیان اس مختصر مین اس عالی ہمت والا دودمان مجمع علم منبع فیض، معدن جود و احسان کی لکھون وہ اس سے بہت کم ہون گی، جو تاریخ عالم مین ابدالآباد کو نام پر میرے ممدوح کے لکھی جائین گی مین فقط دعا پر اپنا کلام تمام کرون گا، کیونکہ اس کے اوصاف کرنا اور دریا کو کوزے مین بھرنا میرا کام نہین جو کچھ مین نے کیا ہے، اندکے از بسیارے و مشتے نمونہ از خروارے ہی،

تا زیب زبان بود تبقریر   تا زینت کاغذ است تحریر

نامت بردو بہ نیک نامی   ہر خامہ کند ترا اعلامی

سرچشمۂ فیض تو روان باد   اقبال جود و لتت جوان باد"

اس کے بعد انگریزی مین تمہید ہو، اس مین یہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، کہ قصیدہ مین جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، ان مین بظاہر غلو معلوم ہوگا، لیکن مین نے اُن کو تشکر اور صداقت کے جذبے مین قلمبند کیا ہے،

قصیدہ

گو نہین حاصل بخوبی قوت نطق و بیان   پر مناسب ہو کہ ہون حمد خدا سے تر زبان

یہ امام عاشران کے جدا عید غفر ذاق کون بہتر ان سے ہوگا اور والا و دو ماں

رحمت اللہ ان پہ ہوئے تا روز قیام جو ہوئے اس سال ہی داخل باغ جناں

یہاں مرتب کتاب سید عبد اللہ کا قصیدہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد ایک انگریزی عبارت درج ہے، جس میں مرتب کے دوست اور شاگرد مسٹر ای، اچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج کے ایک قصیدہ کی تعریف کی گئی ہے، اس میں مسٹر پامر کے قصیدہ کے صحیح اسلوب بیان اور اظہار تخیل کی بڑی داد ہے،

اڈورڈ ہنری پامر، جن کا قصیدہ ہم آگے نقل کریں گے، وہی مشہور انگریزی مستشرق ہیں، جنھوں نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، ان کا ذکر مقدمہ میں بھی آچکا ہے، ایسے انگریز جنھوں نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے صحیح اردو کی تحصیل کی ہے، ان کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"ہندوستان تقریباً دو صدیوں سے انگلستان کے قبضہ میں ہے، لیکن ایسی کوئی مثال نہیں کہ ہندوستان کی کسی زبان میں کسی انگریز نے انگریزی کی کوئی کتاب ترجمہ کی ہو، بعض ہندوستانی کتابوں کا ترجمہ یا بعض کو ایڈٹ کرکے انگلستان میں چھاپا گیا ہے، جو بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے لیکن اگر ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے سائنس اور تعلیم کی بعض کتابیں ترجمہ کی جاتیں، تو یہ اور بھی بہتر ہوتا، اہل یورپ جن میں محنت و استقلال زیادہ ہوتا ہے، اچھے اساتذہ کی نگرانی میں اپنے کو اس کام کے لائق بنا سکتے ہیں، مثلاً میں ایک ایسا نام پیش کرتا ہوں جس نے مشرقی زبانوں میں پوری مہارت حاصل کر لی ہے، یہ میرے دوست اور شاگرد مسٹر ای۔ اچ پامر فیلو سنٹ جانس کالج کیمبرج ہیں جنھوں نے عربی، فارسی اور اردو کے اخباروں میں اپنی نثر و نظم کو شائع کرکے ان زبانوں کے ماہرین کو حیرت میں ڈال دیا ہے، ان کی تحریریں صحیح

کس قدر اخلاق نے پایا ہی عالم مین رواج
کبر و نخوت کا نہین باقی رہا نام و نشان

علم اخلاق و ادب مین بے نظیر و بے مثال
مفتی تاج الدین کا اک نسخہ ہی مشہور یہان

بارہ سو اٹھارہ ہجری مین ہوا تصنیف جو
تھے اٹھارہ سو اور تین از سن عیسائیان

ترجمہ اردو زبان مین کیا اک شخص نے
رکھ دیا اخلاق ہندی نام ہو کر شادمان

اسم سامی مترجم ہے بہادر سے شروع
خاتمہ ہے نام کا اس کے علی پر بے گمان

تھی کتاب خوب و زیبائش کہ علم خلق مین
اور سکھلاتی تھی ہر اک کو زبانِ ہندیان

صاحبانِ عقل و دانش کو خوش آئی اس قدر
کر دیا مشروط اس کو از برائے امتحان

مین نے جب اس پر نظر کی خوب غور و فکر کی
بیشتر اغلاط پائین دیکھین کم تر خوبیان

جس قدر ممکن ہوا مین نے کمال جد سے
صرف ہمت کو کیا بہر سرور دوستان

بعد تصحیحِ مزید آخر اسے چھپوا دیا
دیکھ کر تا اہل دانش اسکو ہون سب شادمان

ختم طبع اس کا ہوا مطبع مین بالطفِ تمام
ڈبلیو۔ ایچ ایلن اینڈ کو جو فرمانی ہین یہان

سیزدہ نمبر کے ساکن ہین بہ واٹرلو پلیس
خاص لندن مین جو نزہت بخش ہی بحر روان

ہو اگر ادراکِ سالِ طبع مطبوع مزاج
ہوئے گا اس بیت کے پڑھنے سے ہر اک کو عیان

یک ہزار و ہشت صد او شصت و ہشت عیسوی [۱۸۶۸]
یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج مسلمان [۱۲۸۵]

با وجودِ اہتمامِ صحت و غورِ بلیغ
کچھ بھی گر سہو و خطا کا ناظرین پاوین نشان

لطف و الطاف بزرگانہ سے یہ امید ہی
دامنِ عفو و عطا مین اس کو فرمائیں نہان

انکشافِ نام کی خواہش اگر بندہ کے ہو
انکسار و عجز سے دیتا ہون مین اپنا نشان

سید عبد اللہ ہندی نام اس عاجز کا ہی
نام نامی باپ کا میرے ہی مشہورِ جہان

حضرت سید محمد خان بہادر جائسی
صاحبِ اعزاز و مکنت افتخارِ خاندان

جلوۂ صد رنگ

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب ایڈوکیٹ اعظم گڈھ

اس نام سے جناب حبیب احمد صدیقی ام اے ال بی کلکٹر بلیا نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے شروع مین مصنف کے ایک مختصر دیباچہ کے بعد جناب مجنون گورکھپوری کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے جس سے مصنف کے ذاتی اخلاق، علمی و ادبی قابلیت اور خصوصیاتِ شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے، کلام کا بیشتر حصہ غزلون پر مشتمل ہے، آخر مین چند مختصر نظمین بھی ہین، جن سے صدیقی صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے۔

صدیقی صاحب کی خوش مذاقی اور لطافتِ طبع کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ انھون نے غزل کو جو سب سے زیادہ لطیف اور نازک صنف شاعری ہے، اپنا موضوع سخن قرار دیا ہے، اور اس مین شبہہ نہین کہ وہ اس میدان مین عام غزل گو شعراء کے مقابلہ مین مختلف حیثیتون سے کامیاب اور ممتاز نظر آتے ہین،

غزل کا اصلی موضوع عشق و محبت ہی جو فطرت انسانی کا سب سے زیادہ لطیف، نازک، بلند اور شریفانہ جذبہ ہے، یہ وہی درد ہے جس کو نکتہ دان روم نے طبیب روحانی کہکر پکارا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما

یہ وہی بادۂ تند و تلخ ہے جس کے فیضانِ سرور سے متاثر ہو کر ہاتف شیراز نے حیات ابدی کا غلغلہ بلند کیا تھا،

اسلوب بیان اور آسان اور با محاورہ اشائل کے حیرت انگیز نمونے ہین، اور یہ اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے کہ انھون نے کبھی ہندوستان کا سفر بھی نہین کیا ہے"

پھر اسی مقدمہ کے آخر مین مسٹر پامر کا ایک انگریزی قصیدہ نقل کیا ہے، جو انھون نے رائٹ آنریبل سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ کی شان مین کہا تھا، اسٹیفورڈ کے نام سے اخلاق ہندی معنون کی گئی ہی، اس لئے اس قصیدہ کے آخری شعر مین اخلاق ہندی کی اشاعت کی تاریخ بھی درج ہی،

فی ظل استفرد مجد ذی العلی	وزیرنا الاعظم باھی النعوت
وصاحب الفتح الذی لم یزل	مؤیداً من ربہ الصباوت
الغالب اللہ یا بساداتہا	رأیاً وتدبیراً وعزماً ثبوت
محیی دروس العلم فی عصرہ	فی کل قوم قد عراھم خفوت
طباعتہ الکتب باسعافہ	من بعض آثارہ لا تموت
اخلاق ھند طبعہ للملا	بھیج استفرد نورتہ کوت
	۲۰ ۷۶۱ ۶۶۱ ۴۲۴

۱۸۶۶ء

اس کے بعد اس عربی نظم کا انگریزی نثر اور نظم دونون مین ترجمہ دیا ہے،

(باقی)

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی تاریخ کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے، مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی،

ضخامت ۲۰۶ صفحے قیمت ۱۲/

"منیجر"

محبت سراپا نیاز و بندگی کا نام ہے، اس مین شکایت کی گنجایش نہین،

محبت مین شکایت کیا گلہ کیا — محبت بندگی ہی بندگی ہے

ارباب خرد کے نزدیک طریق عشق گمراہی سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزل حیات کی حقیقی راہ نمایہی گمراہی ہے،

طریق عشق پہ ہنستی تو ہے خرد لیکن — یہ گمرہی کہین منزل سے ہمکنار نہ ہو

عقل و ہوش کے آداب و قیود سے نہین، بلکہ دل ہی کی کجروی و ناعاقبت اندیشی سے زندگی وابستہ ہے،

قیود ہی قیود ہین حواس و عقل و ہوش کے — یہ کجروی دل نہ ہو تو زندگی محال ہے

بغیر عشق کی نادانیون کے زندگی ایک عذاب ہے،

اک مستقل عذاب ہے پھر تو یہ زندگی — الفت مین دل اگر دل نادان نہ ہو سکا

یہ محض شاعرانہ تخیل نہین ہے، بلکہ ایک لطیف حقیقت ہے، یعنی زندگی کی چہل پہل، رنگینی اور دل آویزی دل نادان ہی کی بدولت ہے کیونکہ وہ محبت کے نور یقین سے معمور ہے، اور صرف نور یقین ہی مین قلب و روح کو حقیقی سکون و مسرت کا جلوہ نظر آسکتا ہے، عقل کو اپنی جدت طرازیون اور موشگافیون پر کسی قدر ناز ہو، لیکن حیات انسانی کو رنگین و پرکیف بنانے کے لئے اس کے پاس کوئی سامان نہین، صدیقی صاحب نے نہایت سچ کہا ہے،

جہان آب و گل کو جس نے ذوق زندگی بخشا — اسے اے حضرت ناصح دل ناداں بھی کہتے ہین

لیکن افسوس ہے کہ عام غزل گو شعرا "دل نادان" کی حقیقی قدر و عظمت کا احساس نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سرچشمۂ کیف و نشاط ایک مستقل مریض بن کر رہ گیا، اور عشق کے درد و غم کا باقاعدہ نوحہ گرون کی طرح ماتم کیا جانے لگا، حالانکہ یہی وہ نشتر ہے جس کے زخمہائے خونچکان مین تسکین روحانی

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

یہ وہی اکسیر ہے جس کے فیضِ تاثیر نے نظیری کے ظلمت کدۂ کفر کو ایمان کا جلوہ گاہ جمال بنا دیا تھا

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

اس بنا پر میں اس عام خیال سے متفق نہیں، کہ غزل گوئی نہایت آسان چیز ہے، اگر لکھنؤ کے عامیانہ انداز سخن کو تغزل کا معیار قرار دیا جائے، تو بے شبہہ ہر بوالہوس غزل گوئی کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن اگر غزل در اصل عشق و محبت کے حقائق و اسرار کی مصوری کا نام ہے، تو ہمارے نزدیک اس سے زیادہ دشوار اور دقت طلب اور کوئی صنف شاعری نہیں ہے، اس کے لئے نہ صرف نکتہ سنج دماغ بلکہ ایک قابل دل بھی درکار ہے لیکن یہ متاع گران ارزہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ جب نااہل طبیعتیں اس میدان میں قدم رکھتی ہیں، تو چونکہ نظر میں وسعت نہیں ہوتی، اور دل درد سے خالی ہوتا ہے، اس لئے ان کی جولانگاہِ شوق صرف شاہدانِ بازاری کے لب بام تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ جذبات کی پستی اور خیالات کا ابتذال ہے،

غرض غزل ایک ایسی لطیف اور نازک صنف شاعری ہے جس میں کسی قسم کا لفظی یا معنوی ابتذال برداشت نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ سب سے پہلے میں نے اسی نقطہ نظر سے صدیقی صاحب کے اس مجموعہ کلام کو دیکھا لیکن مجھکو خیالات یا انداز بیان میں وہ نفرت انگیز ابتذال کہیں نظر نہیں آیا، جس کا دوسرا نام لکھنویت ہے، ہمارے نزدیک صدیقی صاحب کے کلام کی سب سے زیادہ نمایاں اور قابلِ قدر خصوصیت یہی ہے کہ وہ حسن و عشق دونوں کے عظمت شناس ہیں، اس لئے اُن کے جذبات میں عام طور پر شستگی، لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے، اس کا اندازہ مثالوں سے ہو سکتا ہے،

محبت ہی حقیقی منزل ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب گمراہی ہے،

محبت کے سوا جادہ نہ منزل محبت کے سوا سب گمرہی ہے

...ی غزا بنا دیا ہے ،

صدیقی صاحب کے دل کو غم سے جو شغف اور وابستگی ہے، اُس نے اُن کو فکرِ مآل سے بے نیاز کر دیا ہے:

مآل دیکھئے ہو کیا کسی کا غم ہو جزوِ جاں — کسی کا غم ہو جزوِ جاں تو پھر غمِ مآل کیا

یہ صدائے مستانہ صرف ایک بلند حوصلہ اور عالی نظر عاشق ہی کے دردآشنا دل سے اٹھ سکتی ہے،

عام غزل گو شعراء نے عشق و محبت کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں بجز ایک صدائے سربانگ...
...ی عامیانہ اور مبتذل اداؤں کے روحانی لطافت و بلندی کا کوئی جلوہ نظر نہیں آتا، لیکن صدیقی صاحب
کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں عشق کی اخلاقی و روحانی عظمت کا کافی احساس موجود
ہے، ان کے نزدیک عقل نہیں، بلکہ عشق ہی رزمگاہِ حیات کا اصلی حریف ہے، وہ عقل کی طرح زندگی کی سخت گیریوں
سے لرزہ براندام نہیں ہوتا، اس کے اندر عزم و استقلال کی وہ روح پنہاں ہے جس کی قوتِ عمل راہِ طلب
کے سخت سے سخت مقام پر بھی عجز و درماندگی کی کیفیت محسوس نہیں کرتی، اس کی فطرت بیم و خوف سے قطعاً
ناآشنا ہے، اس کی زبان سے بزدلی کا کوئی کلمہ بلند نہیں ہو سکتا،

خرد تو زندگی کی سخت گیری سے ہراساں ہے — زبانِ عشق پر آیا نہ لفظِ الاماں اب تک

اہلِ ہوس کو تو عشق کی زندگی ایک مصیبت نظر آتی ہے لیکن صدیقی صاحب کی نکتہ سنج نگاہ میں
وہ سراپا عبادت ہے، جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی، اس کے لئے جوہرِ قابل درکار ہے،

یہ زندگی عشق عبادت کہیں جسے — ہر کس نہیں ہے اہل کہ سب کو عطا کریں

صدیقی صاحب نے اس شعر میں ایک لطیف اور ناقابلِ انکار حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، عبادت
کا اصل مقصد محض ظاہری تقدس نہیں، بلکہ قلب و روح کو تمام رذائلِ اخلاق مثلاً بغض، حسد، کینہ، خود پرستی
خود بینی وغیرہ کی آلائشوں سے پاک کرنا ہے، چنانچہ حضراتِ صوفیہ تزکیۂ نفس کے لئے سب سے پہلے عشق و محبت ہی
کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ صیقل ہر قسم کے زنگ کو مٹا کر طبیعت میں خشوع و خضوع، سوز و گداز اور ذوق و شوق

کا راز پنہاں ہے، اور تشنگانِ ذوق کو ہمیشہ اسی جرعۂ تلخ کی آرزو رہتی ہے کہ بغیر اس کے زندگی کی روح پیدا نہیں ہو سکتی، اگر عشق کے درد و غم میں کوئی مخصوص لذت نہیں ہے تو پھر خواجہ فریدالدین عطار کی یہ بیتابانہ آرزو

کفر کافر را و دین دیندار را
ذرۂ دردے دلِ عطار را

بالکل فضول اور بے سود تھی، اگر عشق کے درد و غم کا اثر بجائے سرور و انبساط کے حزن و افسردگی، رنج و ملال گریہ و زاری، دل شکنی وغیرہ ہے، تو پھر مولانا جامی کی یہ صدائے دعوت،

اسیرِ عشق شو کآزاد باشی
غمش بر سینہ نہ تا شاد باشی

ایک بے معنی اور بے حقیقت آواز تھی،

ہم کو نہایت مسرت ہے کہ صدیقی صاحب کا مذاقِ سلیم درد و غم کی لذت سے ناآشنا نہیں ہے انھوں نے درد و غم کو نوحہ گر دل کی آنکھوں سے نہیں، بلکہ ایک بلند حوصلہ عاشق کی نگاہ سے دیکھا ہے، اس لئے اُن کے ترانہ ہائے محبت نوحہ گری کی آلائش سے پاک ہیں، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے اور سچ کہا ہے،

مجھکو دماغِ شیوۂ آہ و فغاں نہیں
اک آتش نموش ہوں جس میں دھواں نہیں

غم سے عام طور پر نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن صدیقی صاحب اس راز سے واقف ہیں کہ یہی دراصل زندگی کا سہارا ہے اس لئے وہ اس کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں،

دامنِ غم بھی کہیں چھوٹ نہ جائے ہمدم
زندگی کے لئے پھر کوئی سہارا ہی نہیں

صرف یہی نہیں بلکہ صدیقی صاحب کے نزدیک دردِ محبت ہی کائناتِ عالم کی روح ہے،

روح جہان کرشمۂ قدرت کہیں جسے
شاید وہی ہے دردِ محبت کہیں جسے

ناکامیوں پر آنسو بہانا غم کی بہت بڑی توہین ہے،

پلکوں پہ اشک آئے تو توقیرِ غم کہاں
ناکامیوں کو پردۂ اخفا بھی چاہئے

یہ اسی جذبۂ احترام کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ عام غزل گو شعراء نے تغزل کی بزم سرد کو نقش

جس کے دل کو درد مین آرام محسوس نہ ہو، صدیقی صاحب اس کو محبت کی حقیقت سے بے خبر سمجھتے ہین،

جو درد مین راحت پا نہ سکے الفت کی حقیقت کیا جانے پروانہ صفت جو جل نہ سکے سرشاری الفت کیا جانے

مین نے طوالت کے لحاظ سے صرف چند مثالون پر اکتفا کیا ہے لیکن ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہین کہ صدیقی صاحب کے دل مین محبت کے درد و غم کا جو احساس ہو وہ کس حد تک لطیف، پرکیف اور پاکیزہ ہے،

اب دیکھنا یہ ہو کہ صدیقی صاحب کی چشم و نگاہ کے محبوب کی ادائون کا کیا عالم ہے، یعنی وہ محض ایک شاہد لب بام کی ہوس پرور عشوہ طرازیان ہین، یا اُن مین قلب و روح کے اندرونی احساسات کو شگفتہ اور مشتعل کرنے کی کوئی صلاحیت بھی ہو؟ ہم کو مسرت ہو کہ اس موقع پر بھی ہم کو مایوسی نہین ہوئی، یعنی صدیقی صاحب نے حسن کی ادائون کو ایک کم حوصلہ اور ہوس پرست عاشق کی نگاہ سے نہین دیکھا ہو، بلکہ جن جذبات کا اظہار کیا ہے، ان سے ان کے عاشقانہ خلوص و ایثار، نیاز و عقیدت، بلند حوصلگی اور بلند نظری کا کافی اندازہ ہوتا ہی چند مثالین ملاحظہ ہون،

حسن کی ہر ادا زندگی کے نشو و نما کا سرمایہ ہے،

ہر ادائے حسن مین اک راز پنہان دیکھکر زندگی مین قوت بالیدگی آتی گئی

حسن کی رنگینیان، در اصل جزو ایمان ہین، اس لئے سر نیاز جھکنے پر مجبور ہے،

حسن کی رنگینیون کو جزو ایمان دیکھکر بارگاہِ ناز مین سر کو جھکانا ہی پڑا

ذوقِ نظر کی اس قابلیت کی داد دینا آسان نہین ہو،

نگاہِ ناز کا تبسم عام طبائع کو برق بلا نظر آتا ہو لیکن یہ وہ لمعۂ نور ہے، جس کے فیضان سے صدیقی صاحب کا تمام عرصہ گاہ حیات دفعۃً جگمگا اٹھتا ہے،

مسکرائی نگاہ سحر طراز زندگی جگمگائی جاتی ہو،

اسی کیفیت کو دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے،

کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہی جس کے بغیر عبادت کا حقیقی لطف حاصل نہیں ہوسکتا، اس بنا پر اگر صدیقی صاحب کی چشم بصیرت کو عشق و محبت کی زندگی عین عبادت نظر آتی ہے، تو کچھ محل تعجب نہیں، اور نہ اس حقیقت کے اعتراف سے کسی صاحب نظر کو گریز ہوسکتا ہی،

موجودہ دور میں مادہ پرستوں کے نزدیک تو عشق و محبت کے لطیف احساسات کی کوئی وقعت نہیں، عقل و ہنر نے مادی اختراعات و ایجادات کا جو حیرت انگیز منظر پیش کیا ہی، اسی کو وہ زندگی کے بام ترقی کا آخری زینہ سمجھتے ہیں لیکن ہم کو مسرت ہی کہ صدیقی صاحب اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں، ان کے نزدیک محبت تکمیل زندگی کے لئے لازمی ہے، اس لئے کہ وہ حسن اخلاق کا سرچشمہ ہے، اور حسن اخلاق ہی انسان کا حقیقی طغرائے امتیاز ہی اسی کی بدولت اس کو کائنات ارضی کی فرمانروائی کا منصب عظیم عطا ہوا ہے، محبت کی اس شان عظمت کا اعتراف ان سادہ الفاظ میں کیا ہے،

وہ سادہ دل ہوں کہ تکمیل زندگی کیلئے سمجھ رہا ہوں محبت کو لازمی اب تک

افسوس ہی کہ ذوق محبت کے ایسے سادہ دل قدر شناسوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہی ورنہ انسانی زندگی اس قدر بے کیف افسردہ اور غمناک نظر نہ آتی،

صدیقی صاحب کے نزدیک محبت ہی وہ نسخہ ہے جس کے استعمال سے زندگی کی کلفتوں میں ایک خاص راحت محسوس ہونے لگتی ہے،

اب کلفت حیات بھی راحت سی ہوگئی شاید مجھے کسی سے محبت سی ہوگئی

آگے چل کر ان کے درد آشنا دل سے یہ صدائے شکر اٹھتی ہے،

تیرا کرم، وہ درد محبت عطا کیا، آلام زندگی سے فراغت سی ہوگئی

غور کرو لفظ "سی" نے پیرایۂ بیان میں کس قدر دلکشی اور لطافت پیدا کر دی ہی؟ صحیح الفاظ کا انتخاب بھی شاعر کا ایک بڑا کمال ہے،

سے باخبر ہین کہ محبوب کی حقیقی نوازش اس کے جور وستم ہی مین پنہان ہی لیکن ہر دل مین اس کے تحمل کی صلاحیت نہین ہوتی اس لئے وہ یہ نہین چاہتے کہ یہ بجلی ہر جگہ گرتی رہے،

غم نہین سب پہ اگر چشم کرم ہو تیری　　غم تو یہ ہو کہ ستم بھی ہو تو انعام ابھی

یہ اسی لطافت احساس کا نتیجہ ہے کہ صدیقی صاحب کبھی محبوب سے گلہ مند جفا نظر نہین آتے، بلکہ وہ اکثر خشم وعتاب ہی کے آرزومند رہتے ہین کہ ربط وتعلق کی حقیقی دلیل یہی ہی،

یہ التفات مسلسل دلیل ربط نہین　　تبسمون مین تیرا عتاب بھی دیکھین

نگاہ ناز سے عام طبیعتون کو ستم طرازیون کی شکایت رہتی ہے لیکن صدیقی صاحب کی آشفتہ مزاجی کو عدم عتاب کا شکوہ ہے کہ بغیر اس کے ان کے دل کو پر کیف اضطراب کی کیفیت محسوس نہین ہوتی

نگاہ ناز کہ مائل عتاب نہین　　سکون قلب نہین پر کیف اضطراب نہین

باوجود بفا شعار ہونے کے حسن پھر بھی صدیقی صاحب کے قلب وروح کا سرمایۂ قرار ہے،

لاکھ سہی جفا شعار پھر بھی قرار جان ہوئے　　حسن سہی ستیزہ کیش حسن ہو غمگسار بھی

آستانہ محبوب پہ صدیقی صاحب سر جھکانے پر اس لئے مجبور ہین کہ وہ عالم کائنات کا سرمایۂ ناز ہے،

تو ہو وہ نازش فطرت کہ تمنا مین تری　　آستانہ پہ بجز سر کو جھکائے نہ بنے

وصل کی خواہش محض تقاضائے ہوس ہی، طالب صادق کے لئے محبوب کا تصور ہی کافی ذوق آفرین اور لذت بخش ہی،

ایک فردوس تمنا ہے تصور تیرا　　میرے بازو پہ تری زلف پریشان نہ سہی

یہ اسی تصور کا فیض ہی کہ صدیقی صاحب کی شب فرقت بجائے گریہ وزاری کے مستی وسرشاری کے عالم مین کٹ جاتی ہی،

کہیں ضیائے تبسم نہ ہو کرم فرما
جمود قلب میں ہیجان زندگی کیوں ہے

محبوب کے فیض نظر کی معجز طرازیوں کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں،

کبھی گلشن بداماں آئی تھی دل تک نہ آسکی
مری نظروں میں ہو صد گلستاں ہے خزاں اب تک!

اس اعجاز نظر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن صدیقی صاحب کے دل کی قابلیت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے، ابر کرم ہر جگہ برستا ہے لیکن ہر خاک لالہ وگل کی تجلی گاہ نہیں بن سکتی،

بہار حسن محض عارضی نظر فروزی کا سامان نہیں ہے، بلکہ وہ ذوق ابدی کا سرمایہ ہے، جس کو حاصل کرنے کے لئے صدیقی صاحب اپنی تمام دولت ہستی نثار کرنے پر آمادہ ہیں،

تمام دولت ہستی لٹا کے مانگوں گا
بہار حسن تری، ذوق جاودان اپنا

محبوب کی نگاہ ستم میں بھی صدیقی صاحب کو ایک التفات خاص کی جھلک نظر آتی ہے، اس لئے باوجود تباہی و بربادی کے ان کی زبان آلودۂ شکایت نہیں ہوتی،

کچھ ایسی التفات نما تھی نگاہ دوست
ہوتے رہے تباہ شکایت نہ کر سکے

محبوب کے خشم و عتاب میں جس دل کو تسکین و راحت محسوس نہیں ہوتی، وہ صدیقی صاحب کے نزدیک اسرار محبت سے ناآشنا ہے،

رموز عشق سے ناآشنا ہے دل شاید
ہنوز وجہ تجلی ترا عتاب نہیں

عتاب کا وجہ تجلی ہونا بظاہر تعجب انگیز بات ہے، لیکن عشق کی طلب صادق نے ہمیشہ اسی برق عتاب ہی کے جلوؤں سے اکتساب فیض کیا ہے، زخم محبت کو ہمیشہ ناوک بیدادہی کے ذوق خلش سے تسکین و راحت نصیب ہوتی ہے، چنانچہ اسی احساس کی بنا پر صدیقی صاحب نے یہ نعرۂ مستانہ بلند کیا ہے،

مجھے آماجگاہ ناوک بیداد رہنے دے
جو اس کا نام بربادی ہے تو برباد رہنے دے

اہل ہوس ہمیشہ محبوب کے ظاہری لطف و کرم کے متمنی رہتے ہیں، لیکن صدیقی صاحب اس حقیقت

ممکن ہے کہ صدیقی صاحب کے خیالات میں ناظرین کو غیر معمولی فلسفیانہ تعمق یا دقت آفرینی نظر نہ آئے تاہم اُن کے قلم سے اکثر ایسے اشعار بھی نکل گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر حقائق سے بالکل بے خبر نہیں ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

آرزو سے سکون ہے بے معنی … زندگی اضطرابِ پیہم ہے

پھر کیا ہجومِ برق پریشاں ہے آج … کیوں موجِ زندگی پہ سرِ بال دیر ہے

پرستارِ توہم ہے الٰہی یہ جہاں اب تک … ہے رسمِ بندگی رائج بقیدِ آستاں اب تک

معنیِ مقصدِ ہستی کا سمجھنا معلوم … عقل ہے صرف پرستارِ اوہام ابھی

شوق نے پردے اٹھائے بارہا … عقل صرف اختراعِ راز ہے

بہار نام نہیں رنگ و بو کے طوفاں کا … وہ ایک کیفیتِ دل ہے جو خزاں میں بھی ہے

وہ بھی کچھ ایامِ نادانی کے گذرے ہیں کہ جب … موسمِ بے برگ و بے گل کو خزاں سمجھا تھا میں

ہر چند زندگی ہے کسی اور شے کا نام … جینے کے واسطے غمِ دنیا بھی چاہیے

مجھکو احساسِ رنگ و بو نہ ہوا … یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

سعیِ پیہم کی جو لذت سے ہوئے ہیں آگاہ … اپنی منزل کو وہ خود دور بنا لیتے ہیں

اس قسم کے اور بھی اشعار ہیں جو اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ صدیقی صاحب کی شاعری میں نہ صرف دل کی حرارت بلکہ دماغ کی نکتہ سنجی کا عنصر بھی شامل ہے،

علاوہ حسنِ خیال کے شاعری کی ایک ضروری شرط انداز بیان کی ندرت و طرفگی بھی ہے، اس لحاظ سے بھی صدیقی صاحب مستحق ستایش ہیں کہ ان کا پیرایۂ بیان ہمیشہ شاعرانہ رہتا ہے، اور وہ زیادہ تر کنایوں اور اشاروں سے کام لیتے ہیں جن سے طرزِ ادا میں ایک خاص دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ زیادہ کھلتے نہیں، لیکن اسی کے ساتھ اتنا چھپتے بھی نہیں کہ شعر معمہ بن کر رہ جائے، اور اصل مفہوم

یہ کس کا تصور ہے انیس شبِ ہجران اک عالم سرشاریٔ بیہم ہے سحر تک

آدابِ محبت کا تقاضا ہے کہ بارگاہِ حسن سے جو کچھ بھی عاشق کو مل جائے، اسی پر اس کو قانع و شاکر رہنا چاہئے، اپنی طرف سے کسی مزید خواہش کا اظہار نہ کرنا چاہئے، اس جذبۂ شکر و قناعت کو صدیقی صاحب نے ان سادہ لیکن موثر الفاظ میں ادا کیا ہے،

دلِ امیدوار کو نہ پوچھئے کہ کیا ملا بہت ہے جو بھی دیدیا نگاہِ بے نیاز نے

صدیقی صاحب کو محبوب سے جو نیاز و عقیدت ہے، اس کا یہ عالم ہے کہ باوجود نامرادیوں اور محرومیوں کے وہ ترکِ جبین سائی پر آمادہ نہیں ہیں،

باوجود محرومی، باوجود ناکامی پھر وہی کسی کا در پھر وہی جبین سائی

جوشِ محبت کا یہ حال ہے کہ اُن کے خونِ دل کی اک اک بوند دل بن گئی ہے تاکہ محبوب کی ہر نگاہِ ناز پر اک تازہ دل نثار کیا جا سکے،

دل بنی جاتی ہے اک اک بوند دل کے خون کی ہر نگاہِ ناز پر اک دل لٹانے کے لئے

لیکن ہم کو مسرت ہے کہ باوجود اس والہانہ نیاز و عقیدت کے صدیقی صاحب کے جذبۂ عشق میں ایک رسوا سے سربازار کی مبتذل ادائیں نظر نہیں آتیں، اُن کے دل میں عشق کے وقار و عظمت کا بھی احساس ہے جس کا اندازہ ناظرین اشعار ذیل سے کر سکتے ہیں،

یہ کیسے حجابات، یہ کیا دوری و قربت مشتاق نگاہوں کے لئے حدِ نظر کیا

نگاہ ملتجی ٹھہر، کسی کو منفعل نہ کر ہے عشق کیا گداگری سوال بار بار کیوں

چھپتے نہیں بنتی ہے انھیں ارض و سما میں سمجھے تھے نظر دیکھتی ہے حد نظر تک

یہ پردۂ افلاک نہیں مانعِ پرواز ہے یوں کہ ابھی مائل پرواز نہیں ہیں

آپ کے اختیار میں گرچہ نظام عشق ہے عشق کی مستیاں نہیں آپکے اختیار میں

وفیات

مولانا شبیر احمد عثمانی رح

دسمبر ۱۹۴۹ء کے وسط مین جدہ مین تھا، ۱۳ر دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد حکومت سعودیہ کی وزارت خارجیہ جدہ مین ایک ہندوستانی مسافر کی دعوت تھی، شہر کے کچھ معززین، اسلامی حکومتون کے سفیر اس مین شریک تھے، ہندوستان، پاکستان، مصر و عراق وغیرہ کے سفراء، وزارت خارجیہ سعودیہ کے بعض ارکان موجود تھے، مین ہندوستانی کونسل کے نمایندون پروفیسر عبد المجید خان انڈین کونسل اور مولانا عبد المجید انگریزی کمشنر حج متعین جدہ کے ساتھ وہان پہنچا، احباب کچھ آچکے تھے، کچھ آرہے تھے مختلف موضوعون پر گفتگو تھی، خصوصیت سے کراچی مین اسلامی ملکون کی جو اقتصادی کانفرنس ہورہی تھی اس مین حجاز کی طرف کر حجاز کی اقتصادی حالت کی جو مطبوعہ رپورٹ اس وقت سامنے رکھی تھی اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے مین جدہ مین پاکستانی کونسل مسعود صاحب جو مولانا ابو البرکات عبد الرؤف صاحب دانا پوری کے صاحبزادہ مین، تشریف لائے، اور نہایت افسوس کیساتھ یہ ذکر کیا کہ آج مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال ہوگیا، اس خبر کے سننے کے ساتھ مجلس پر اداسی چھاگئی، میرے سامنے سے پوری نصف صدی کی معاصرانہ ابقتون کی ایک دنیا گذر گئی،

۱۹۰۲ء کی بات ہے وہ دار العلوم دیوبند مین اور راقم دار العلوم ندوہ مین تعلیم پارہے تھے، یہ زمانہ دونون درسگاہون کا زرین زمانہ تھا، دار العلوم ندوہ مین میرے ساتھ میرے ایک عزیز قریب وہموطن (مولوی سید محمد قاسم صاحب خلف الرشید مولانا شاہ تجمل حسین صاحب خلیفہ شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، و حضرت مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، رحمہم اللہ تعالیٰ) رفیق درس تھے، وہ اپنے والد کے حکم سے

کی طرف سامع کا ذہن منتقل نہ ہونے پائے، صدیقی صاحب کو اگرچہ فارسیت سے خاص ذوق ہے، اور زیادہ تر وہ فارسی ترکیبوں سے کام لیتے ہیں، لیکن ان کو اس کا احساس ہے کہ غزل کی زبان صاف سادہ شیرین، اور نرم و نازک ہونی چاہئے، اس لئے وہ حتی الوسع ثقیل اور نامانوس الفاظ و تراکیب کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بندش کی چستی، روانی اور برجستگی میں فرق آنے نہیں پایا، غرض مجموعی حیثیت سے صدیقی صاحب کا ایک خاص انداز بیان ہے، جس کا اندازہ ناظرین اشعار مذکورۂ بالا سے بخوبی کر سکتے ہیں،

ناظرین کو غالباً تنقید کے دوسرے رخ کا انتظار ہوگا، کسی شاعر کے کلام کا ہر قسم کی لغزشوں سے اور کمزوریوں سے قطعاً پاک ہونا یقیناً نہایت مشکل ہے، صدیقی صاحب کو غالباً اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا، ممکن ہے کہ ان کے کلام میں نکتہ چین نگاہوں کو تلاش سے کچھ فروگذاشتیں نظر آجائیں، لیکن محض جزئی فروگذاشتوں کی بنا پر صدیقی صاحب کے شاعرانہ مذاق کی لطافت اور پختگی سے انکار کرنا سخت ناانصافی ہوگی، ان کے کلام کے متعلق ارباب فن کی جو رائے بھی ہو، لیکن بحیثیت ایک صحیح المذاق غزل گو شاعر کے ہم ان کا خیر مقدم کئے بغیر نہیں رہ سکتے، ہم کو تو صرف یہ دیکھ کر خوشی ہے، کہ وہ ایک نوحہ گر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دل و دماغ میں ایک مطرب رنگین نوا کا کیف و سرور لے کر بارگاہِ حسن میں حاضر ہوئے ہیں، ان کا یہ ادعا:-

گاتا ہوں محبت کے دل آویز ترانے	اک نوحہ گر عشق کی آواز نہیں ہیں

ہمارے نزدیک بالکل صحیح اور حق بجانب ہے،

کلیات فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ جو اب تک متفرق طور سے دیوان شبلی دستہ گل، بوئے گل، برگ گل کے ناموں سے چھپے تھے، انہیں سب یکجا کر دیئے گئے ہیں، قیمت ۱۲ عمر

اندر دار الاہتمام دکھانے لے گئے، اتفاق دیکھئے کہ ایک طالب علم جو پہلے ندوہ میں پڑھتے تھے، اوراب دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ دار الاہتمام سے نکل رہے تھے، وہ مجھے دیکھنے کے ساتھ دوڑ کر مولانا حبیب الرحمان صاحب نائب مہتمم کی خدمت میں چلے گئے، اور میرا نام بتا دیا، موصوف نے جو ہمہ تن متواضع اور خاکسار تھے، ایک معمولی طالب علم کے لئے یہ زحمت فرمائی کہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ اندر کمرہ کے لے گئے، اور چائے کی دعوت فرمائی جس میں اکثر حضرات مدرسین شریک تھے، دوسرے وقت حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنے فضیلت کدہ پر کھانے کی دعوت فرمائی،

ایک طالب علم کے لئے سب سے بڑی دعوت طالب علموں کے جلسہ کی ہو سکتی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے جلسہ کا اہتمام فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس تھے مگر اس خدمت سے علیحدگی کا خیال کر رہے تھے، اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولینا حسین احمد صاحب تازہ تازہ حجاز سے ہندوستان واپس آئے تھے، جلسہ آراستہ ہوا، طالب علموں نے تقریریں کیں، آخر میں مولینا انور شاہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب نے عربی میں تقریریں کیں، اور پھر اس کم سواد کو عربی میں تقریر کا حکم ہوا، اور اس نے تعمیل کی،

اس زمانہ میں آریوں کی تحریک سے شدھی کا زور تھا، اور عربی مدرسوں میں آریوں سے مناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، چنانچہ جلسہ کے بعد طالب علموں نے آریہ اور مسلمانوں کے مناظرہ کا مظاہرہ کیا، طالب علموں کے دو گروہ بنے، ایک ایک مسئلہ کا حامی تھا، دوسرا اس پر معترض، باہم سوال و جواب اور رد و قدح کا سلسلہ قائم تھا کہ ایک فریق کمزور سا پڑ گیا، مولانا شبیر احمد صاحب جو مدرسین کے ساتھ میرے قریب بیٹھے تھے، مولانا حبیب الرحمن صاحب سے اجازت لے کر مدرسین کی صف سے نکل کر طالب علموں میں مل گئے، اور اس کمزور فریق کی حمایت میں فرمانے لگے، اور آخر اپنی تقریر کی قوت اور استدلال کے زور سے ہارا ہوا میدان جیت لیا، اور سب نے ان کی ذہانت اور طباعی کی داد دی، میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی تمام

ندوہ چھوڑکر دیوبند چلے گئے تھے، اُن کو طالب علموں کی انجمن سازی اور دفتر داری کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، چنانچہ دیوبند پہنچ کر انھوں نے اس سلیقہ کا ثبوت دیا، اور دیوبند میں طالب علموں کی تقریر و تحریر کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا شبیر احمد صاحب جو ان دنوں اُنہی کی طرح طالب علم تھے، وہ تقریر و تحریر کا فطری ذوق رکھتے تھے، ان جلسوں میں دلچسپی لیتے تھے، اور اسی مناسبت سے مولوی قاسم سے بھی ان کو محبت تھی، مولوی قاسم نے ندوہ و دیوبند کو ملانا چاہا۔ وہ میرے خطوط میں مولانا شبیر احمد صاحب کا تذکرہ کرتے تھے اور سلام پہنچاتے تھے، اور میرا تذکرہ ان سے کرتے تھے، اور میری طرف سے ان کو سلام پہنچاتے تھے، اس تعلق کا یہ اثر ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا اور ایک دوسرے کے واقف ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند سے القاسم اور ندوہ سے الندوہ نکل رہا تھا، اور ہم دونوں کے مضامین اپنے اپنے پرچہ میں نکلتے تھے، اور چھپتے تھے، اسی زمانہ میں مرحوم کسی تعلق سے لکھنؤ آئے، تو مدرسہ میں مجھ سے ملنے آئے، یہ میری اُن کی طالب علمانہ ملاقات کا پہلا موقع تھا، یہ غالباً سنہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے،

سنہ ۱۹۰۶ء میں میری دستار بندی ہوئی، اور دستار بندی کے جلسہ میں برجستہ عربی تقریر کی وجہ سے عربی مدرسوں میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی زمانہ میں مولانا کو بھی فراغت حاصل ہوئی، وہ دارالعلوم دیوبند میں اور میں دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہوگئے، اسی کے سال دو سال کے بعد کسی انجمن کی دعوت پر پنجاب جانے کا اتفاق ہوا، تو راہ میں سہارنپور اُتر کر دیوبند چلا گیا، یہ میری حاضری کا پہلا اتفاق تھا، ان دنوں دارالعلوم دیوبند میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (خلف مولانا سید حکیم عبد الحی صاحب ناظم ندوہ) ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر دیوبند میں حدیث کے دورہ میں شریک تھے، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی پہچانے نہیں، منہ چادر میں لپیٹے تھا، مدرسہ پہنچ کر سید عبد العلی صاحب کو پوچھکر انکے کمرہ میں گیا، وہ مجھے یک بیک دیکھ کر زبان سے کچھ کہا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اشارہ سے ان کو منع کیا، اور وہ رُک گئے، اور ساتھ لے کر مدرسہ اور درس کے کمرے دکھانے لگے، اور آخر میں اوپر چھت پر دارالشوریٰ

رحمہ اللہ تعالیٰ کے مضامین نہایت غامض، دقیق اور مشکل ہوتے تھے، جن تک عوام کی پہنچ نہین ہو سکتی تھی،
اس لئے اُن کے مضامین اور حقائق کو سمجھنا، پھر زمانہ کی زبان مین اس کی تعبیر و تفہیم کوئی آسان بات نہ تھی، اس لئے
مولانا شبیر احمد کی تقریر و تحریر کی تعریف کی جاتی تھی،

۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانون کی سیاست کروٹ لے رہی تھی، یکے بعد دیگرے طرابلس، پھر کانپور کی
مسجد، پھر بلقان کی جنگ، پھر یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے واقعات پیش آئے، اور ہندو مسلمانون کے میل ملاپ
کی سیاسی تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی،

یہان پر ایک بات مجھے بے محابا کہنا ہے، یہ وہ وقت تھا کہ جب مولانا ابوالکلام کا الہلال نکل رہا تھا، اُن
کی آتش بیانی سے مسلمانون مین آگ سی لگی ہوئی تھی، اور وہ جہاد جس کے نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے،
مولانا ابوالکلام نے اس کا صور اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ یہ بھولا ہوا سبق لوگون کی زبانون پر
آگیا، الہلال دیوبند کے حلقہ مین بھی آتا تھا، اور حضرت مولانا محمود حسن کی مجلس مین پڑھا جاتا تھا، مین نے
اون زمانہ مین حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا، اور
ابوالکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا،

اس زمانہ مین مولانا عبید اللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمان
تھے، مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اس حلقہ کی ایک جماعت پر مدرسہ کے مصالح مقدم تھے، اور دوسری
پر اسلام کے مصالح، مولانا محمود حسن صاحب دل سے دوسری جماعت مین شریک تھے، مین نے سنا کہ انھون نے
ایک دفعہ فرمایا کہ ہمارے بزرگون نے تو مدرسہ اپنے اصلی مقصد (جہاد) پر پردہ ڈالنے کے لئے بنایا تھا، بہرحال
مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے ہٹنا پڑا، اور دہلی مین مسجد فتحپوری کے ایک گوشہ مین دائرۃ المعارف کی بنیاد
ڈالی، اور اس مین انگریزی خوان تعلیم یافتون اور عربی کے فارغ التحصیل عالمون کو قرآن پاک کا درس
اس جہادی اسپرٹ مین دینے لگے، جو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی زندگی کی روح تھی، اور مجاہدین

عمر مین ایک دفعہ زیارت کی، اور وہ اسی موقع پر نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ایک کمرہ مین جس مین کھری چارپائی اور ایک چٹائی اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، تشریف فرما تھے،

اس واقعہ پر سالہا سال گذر گئے، مولانا شبیر احمد صاحب دارالعلوم دیوبند مین درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور سال بہ سال ادنی سے اعلی کتابون کا درس دیتے ہوئے کتب حدیث کا درس دینے لگے، کچھ دنون کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی مین صدر مدرس ہو گئے، اسی زمانہ مین میرا بھی دلی جانا ہوا، تو مدرسہ مین اُن سے ملاقات ہوئی، مگر پھر دارالعلوم دیوبند لوٹ آئے، اسی زمانہ مین مولانا عبید اللہ سندھی حضرت مولانا شیخ الہند رحمہ اللہ تعالی کی طلب پر دیوبند آکر مقیم ہوئے تھے، ان کا مشن یہ تھا کہ دیوبند کی جو تعلیمی فضا محیط ہو گئی تھی، اور سید احمد شہید اور مولانا اسمعیل شہید کی مجاہدانہ روح جو اس حلقہ سے دیتی چلی جا رہی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اور اس سلسلہ مین موتمر الانصار کی بنیاد پڑی، اور اس کا ۱۹۱۱ء سنہ یا اس کے پس و پیش زمانہ مین مرادآباد مین بہت بڑا جلسہ ہوا، جس مین علی گڈہ اور ندوہ اور دیوبند کے اکثر رجال علم و عمل جمع ہوئے، اور تمام ہندوستان سے مسلمانون کا بہت بڑا مجمع اس مین شریک تھا، ندوہ سے حضرت الاستاذ مولانا شبلی مرحوم شریک ہوئے تھے، اس جلسہ مین مولانا شبیر احمد صاحب نے العقل و النقل کے نام سے اپنا ایک کلامی مضمون پڑھکر سنایا، حاضرین نے بڑی داد دی، اس مضمون مین گو جدید معلومات حضرۃ الاستاذ کی تصنیف سے لئے گئے تھے، مگر اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکالا گیا تھا، یہ گویا حامیان عقل کے اس علم کلام کا رد تھا، جس مین خرق عادت کے وجود اور معجزات کے صدور پر ناک بھون چڑھائی جاتی تھی، حضرت الاستاذ نے واپس آکر مجھ سے فرمایا تھا، کہ انھون نے معلومات میری کتاب سے لئے، اور پھر میرا ہی رد کیا،

دیوبند کے حلقہ مین اس زمانہ مین یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو حضرت مولینا قاسم صاحب کے علوم و معارف پر پورا احتوا ہے، وہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالی کے مضامین و معانی کو اپنی زبان اور اپنی طرز ادا مین اس طرح ادا کرتے تھے کہ وہ دلنشین ہو جاتے تھے، یہ خیال رہے کہ مولانا قاسم صاحب

صدر مولانا حبیب الرحمان صاحب تھے، ان کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے اکثر اساتذہ آئے ہوئے تھے، ان میں مولانا شبیر احمد صاحب بھی تھے، کانگریس اور جمعیۃ کے یہ اجلاس ایک خاص حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں یعنی اس اجلاس میں کانگریس کی سیاست میں ایک اہم تبدیلی ہوئی اور پنڈت موتی لال، سی آر داس، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی رہنمائی میں ترک موالات کی جگہ جس میں کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی تھا، یہ تجویز سامنے رکھی گئی، کہ ان کونسلوں اور اسمبلیوں پر قبضہ کرکے حکومت کو بے دست و پا کر دیا جائے، گویا مقصد یہ تھا کہ مقصود کے حصول کے لئے طریق جنگ اور لڑائی کے ڈھنگ کو بدلا جائے، اس تحریک کے حامیوں نے سوراج پارٹی اپنا نام رکھا، اس وقت گاندھی جی، ابوالکلام، محمد علی وغیرہ جیل میں تھے، ان کے خاص پیرووں نے اس کی سخت مخالفت کی، اور نو چینجر (نہ بدلنے والے) کا لقب پایا، کانگریس کی طرح جمعیۃ میں بھی حکیم صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا، اور اس کے فیصلہ کے لئے ارکان جمعیۃ کا خاص جلسہ ہوا، تجویز کے حامیوں کی رہنمائی ڈاکٹر انصاری نے اور مخالفوں کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کیں، مولانا شبیر احمد صاحب کی اس تقریر کا صرف ایک حصہ مجھے یاد ہے جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام خانہ کعبہ کو فتح مکہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ قریش نو مسلم تھے ان کو یہ بات کعبہ کی حرمت اور ادب کے خلاف نظر آتی، اس لئے حضور نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمھاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی، تو میں کعبہ کو ڈھا کر پھر اس کی بنیاد ابراہیمی اساس پر رکھتا، یہ واقعہ بیان کرکے مولانا نے فرمایا کہ ترک موالات کے بدولت ابھی ہماری قوم انگریزوں کی غلامی سے نئی نئی نکلی ہے، یہ کونسل اور اسمبلی کے چکر میں پڑ کر پھر نہ غلام بن جائے، بہرحال ووٹ لئے گئے، اور مولانا کی مخالفت کامیاب ہوئی۔

مولانا حسین احمد صاحب کا نام اس وقت تک خواص سے نکل کر عوام تک نہیں پہنچا تھا، وہ اس تمام ہنگامہ کے وقت حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹے میں تھے، ساتھ ہی ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس آئے

سرحد (یاغستان وجیر قند) سے حلقۂ اتصال قائم کیا گیا، اس وقت یورپ کی جنگ کے شعلے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں بغاوت کا خیال روز افزون تھا، انگریزی حکومت کی جاسوسی اپنا کام کر رہی تھی، مولانا ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ احرار سب نظر بند تھے، یا جیل میں تھے، حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے ہجرت کی، اور وہ حجاز میں قید ہو کر مالٹا میں نظر بند ہوئے، اور مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبد اللہ انصاری چھپ کر افغانستان پہنچ گئے، جو لوگ اب باقی رہ گئے تھے، ان میں بڑے لوگ حکیم اجمل خاں مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی تھے، ان لوگوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اور پہلے مجلس خلافت اور پھر جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اس وقت تک مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ مالٹے میں تھے، ۱۹۲۰ء میں جو وفد خلافت لندن گیا تھا اس کا ایک ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، مارچ یا اپریل میں جب مسٹر فشر وزیر تعلیم قائم مقام وزیر ہند سے ملاقات ہوئی، تو میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیری و نظر بندی کے معاملہ کو ان کے سامنے پیش کیا، یاد آتا ہے کہ موصوف اسی سال کے اخیر یا ۱۹۲۱ء کے شروع میں مالٹے سے چھوٹ کر مع خدام کے جن میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے، واپس آئے، مگر شاید چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہے اور وفات پائی، اس درمیان میں عقیدتمندوں نے بہت ان کو بلایا، مگر خود تشریف نہ لیجا سکے، اپنے قائم مقام یا ترجمان کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد صاحب ہی کو بھیجا، ان مقامات میں سے خاص طور سے دہلی کے جلسہ میں ان کی نیابت نہایت یادگار اور مشہور ہے، گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خاں مرحوم نے اٹھایا تھا، حضرت مولانا شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت واشگاف تقریر فرمائی تھی، یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے نہ صرف فخر و شرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت اور ہر دلعزیزی کی بڑی دلیل ہے،

۱۹۲۰ء کے آخر میں گیا میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے شاندار جلسے ہوئے، جمعیۃ کے اس اجلاس

پھوٹ کررہے تھے، یہ ان کا دستور تھا، مکہ مین موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے،
مین ہم لوگ شریک ہوتے رہے، اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی شریک ہوتے تھے، اسی سفر مین مجھے علم
ا کہ موصوف عربی تحریر و تقریر پر اچھی طرح قادر تھے، سلطان نے خلافت اور جمعیۃ کے دونون وفدون کو
ساتھ ملنے کو بلایا، اور مختلف موضوعون پر گفتگو کی، مولانا شبیر احمد صاحب نے اس موقع پر خلاف توقع ا
ا بر دیوبند کے عقائد اور فقہی مسلک پر اچھی اور شستہ گفتگو کی، اور سلطان اس کو دیر تک سنتے رہے،

موتمر کی کارروائیون مین تو مولانا نے کوئی خاص حصہ نہین لیا، مگر موتمر کے آخری اجلاس مین ایک
مضمون انھون نے پڑھ کر سنایا، جس کو پہلے سے وہ لکھ لائے تھے، مگر اپنے رفقار کو وہ پہلے سے نہین دکھایا تھا،
ین اس اخیر جلسہ مین شریک نہ تھا، مگر وفد جمعیۃ کے ارکان کو مولانا کے اس تنہا بیان سے بڑی حیرانی تھی،
بہرحال بات چپ چپ ختم ہوگئی،

حج کے مناسک مین بھی ان کی رفاقت رہی، یہ زمانہ گرمی کا تھا، بادسموم کے جھونکے چل رہے تھے،
ظہر کے وقت ذوق و شوق مین مسجد نمرہ مین نماز پڑھنے کی آرزو تھی، مگر آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت
دیکھ کر ہمت نہین پڑتی تھی، مگر مولانا کفایت اللہ صاحب اور حافظ احمد سعید نے اونٹون کا سامان کرلیا تھا،
آخر مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ اونٹ پر ان کا ردیف بن کر چلا، مجھے ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ
اب گرا، اور تب گرا، اسی خوف سے واپسی مین پیدل آیا، اسی موسم کی شدت مین مولانا شبیر احمد صاحب پیدل
ہی روانہ ہوئے، مسجد کے قریب ہی پہنچے تھے کہ بادسموم کے ایک جھونکے نے ان کو آلیا، مگر بال بال بچ گئے،
اس نماز مین آنے کا شوق اس خیال سے بھی تھا کہ سلطان امامت کرین گے، اور ایک سلطان وقت کے
پیچھے ہم ہندوستان کے غلام نماز پڑھین گے، مگر مسجد مین جماعت تیار تھی، سلطان کا انتظار رہا- وہ نہین
آئے، تو ایک مصری شیخ نے نماز پڑھائی، نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ سلطان اپنے نجدی ہمراہیون کے ساتھ ننگے
سر اور ننگے پاؤن لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آرہے ہین، بعد کو جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو مین نے حاجیون

اور سب سے پہلی دفعہ وہ ہندوستان کی سیاست مین کراچی خلافت کانفرنس مین مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے

اور اس مشہور انقلابی تجویز کے مؤیدین مین تھے جس مین مسلمان نوجیون سے فوج کی ملازمت ترک کرنے

کی تحریک تھی، اس کے محرک محمد علی اور مؤید مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد اور سیف الدین کچلو وغیرہ تھے،

آخر سب پر مقدمے چلائے گئے، اور سب کو چند سال کی قید کی سزا ہوئی، ع

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یان سزا کے بعد

اس قید سے آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب بیش از بیش تحریکات مین حصہ لینے لگے اور

آخر خلق کی زبان نے ان کو شیخ الہند کا جانشین مان لیا، اور اب حضرت شیخ الہند کے مسلک کی ترجمانی

اور اُن کی جماعت کی نمایندگی مولانا موصوف فرمانے لگے، تاہم خلافت اور جمعیۃ کے جلسون مین مولانا شبیر احمد

صاحب بھی آتے جاتے رہتے تھے، لیکن یہ آمد و رفت بھی کم ہوتی رہی،

۱۹۲۶ء مین جب سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ مین عالمگیر اسلامی کانفرنس بلائی، اور ہندوستان

کی مختلف مجلسون کی طرف سے وفد بھیجے گئے، تو خلافت کے وفد کی صدارت حکیم صاحب اور احرار پنجاب کے

اصرار سے اس خاکسار کے حصہ مین آئی، اور اس کے ممبر محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی ہوئے، اور جمعیۃ العلماء

کے وفد کے صدر مولانا کفایت اللہ صاحب، اور ممبر حافظ احمد سعید صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، مولینا

عبد الحلیم صدیقی صاحب اور مولانا عرفان صاحب مرحوم تھے، یہ کل وفد ایک ہی جہاز پر حجاز کو روانہ ہوا، اور

اس طرح اس سفر مین مرحوم کو بہت پاس سے دیکھنے کا موقع ملا، طبیعت مین بڑی نزاکت تھی، اور بات بات

مین وہ چیز ظاہر ہوتی تھی، اس لئے رفقاے سفر ان کی بڑی رعایت کرتے تھے، ایک مینی طالب علم جو دیوبند مین

ان کے شاگرد تھے، ان کی خدمت کرتے تھے، اور یہ خدمت پورے سفر حجاز مین انھون نے کی، جدہ سے مکہ معظمہ

تک ہم سب ایک لاری مین آئے، جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مرحوم پر عجب کیفیت تھی، انھون نے قرآن کا احرام

باندھا تھا، اور ہم سب تمتع کے احرام مین تھے، جیسے جیسے مکہ معظمہ قریب آتا جاتا تھا، ان پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا،

گرتا تھا، اسی حالت مین ہندوستان پہنچے، بالآخر اُن کو صحت ہوگئی،

اُن کی آنکھیں کمزور تھین، ایک وقعہ تو تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، موگا (پنجاب) کے ڈاکٹر آنکھون کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان سے علاج کرایا تو درست ہوگئی تھین،

مرحوم اب تک دار العلوم دیوبند مین مدرس تھے، دار العلوم دیوبند کے اکابر مین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے کچھ انتشار سا تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، ایک طرف مولانا حبیب الرحمن صاحب اور مولانا حافظ احمد صاحب اور کچھ مدرسین تھے، دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحب مفتی عزیز الرحمن مولانا سراج احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب، اور بعض نوجوان مولوی عتیق الرحمن صاحب وغیرہ تھے، آخر دوسرا گروہ دیوبند کو چھوڑ کر گجرات مین ڈابھیل ضلع سورت مین منتقل ہوگیا، جہان پہلے سے ایک معمولی سا مدرسہ قائم تھا، مگر عمارت اچھی خاصی تھی، مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد اور مولانا سراج احمد صاحب وغیرہ نے یہان دوسرا دیوبند قائم کیا، بہت سے سرحدی اور ولایتی اور بنگالی، اور ہندوستانی طالب علم بھی اُن کے ساتھ آئے، اور چند سال تک زور و شور سے ان صاحبون کا درس وہان جاری رہا،

اسی زمانہ مین خاکسار کو کسی جلسہ کے سلسلہ مین راندھیر ضلع سورت جانے کا اتفاق ہوا، ڈابھیل قریب ہے، مولانا شبیر احمد صاحب کو معلوم ہوا تو ایک حیدرآبادی طالب علم کو خط دیکر بھیجا، مین نے آنے کا وعدہ کیا، اور دوسرے روز ڈابھیل گیا، مدرسہ کو دیکھا، حضرات مدرسین سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، طلبہ نے میرے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا جس مین تقریرین ہوئین، رات کو قصبہ مین جلسہ کا انتظام ہوا، جس مین مختصر تقریر کی، اس کے بعد خود مولانا نے تقریر فرمائی، جس مین میری حقیر ذات کی نسبت ایک فقرہ استعمال کیا تھا، جو درحقیقت میری حقیقت ہے، میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ مجھے اُن سے بہت اُنس ہے، اس لئے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتون کے درمیان ایک سفیر و متوسط کی حیثیت رکھتے ہین، پھر میری کتاب ارض القرآن کی تعریف فرمائی،

کی طرف سے شکایت پیش کی، کہ نماز میں آپ کا بڑا انتظار رہا۔ سلطان نے کہا ہمارے نجدی بھائی آپ جانتے ہین کہ جھڑی نہین لگاتے، اس لئے مین نے چاہا کہ ذرا آفتاب ڈھل جائے، تو چلون، مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی نماز ہوگئی، پھر کہا کہ آپ جانتے ہین کہ مین بچپن ہی سے بے گھر ہوگیا تعلیم جیسی چاہیے نہین ہوئی، بدوی ہون، قرأت نہین جانتا، بدآواز بھی ہون، اس لئے نماز پڑھانے سے گریز کرتا ہون، مین نے مذاقاً کہا کہ سال مین ایک دفعہ لوگ آسانی سے اس آواز کو گوارا کر سکتے ہین، مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو مشتاق رہتے ہین کہ کسی بادشاہ یا امیر کے پیچھے نماز پڑھین، امیر افغانستان جب ہندوستان آئے تھے، تو مسلمان سیکڑون کوس سے اُن کے پیچھے نماز پڑھنے آئے تھے،

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک سفر مین بھی رفاقت رہی، مین گو محمد علی و شوکت صاحب وغیرہ کے ساتھ تھا، مگر ہم جنسی اور ہم مذاقی کے سبب سے اکثر جمعیۃ والون کے یہان آکر بیٹھا کرتا تھا، اونٹون کا سفر تھا، بارہ روز مین منزلین تمام ہوئین، ہر روز ایک نئی منزل مین قیام تھا،

صبح کہین، کہین ہے شام ہر روز نرالا نیا مقام

راہ دور و دراز مین عشق کی منزلین تمام

مین مرحوم کی خدمت مین بیٹھتا، اور طرح طرح کی باتین ہوتین، ایک منزل مین مرحوم نے غدر دہلی کے زمانہ مین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رفقائے جہاد، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، اور حافظ ضامن علی صاحب شہید کے واقعات اور تھانہ بھون اور شاملی پر تاخت اور مجاہدین کا حملہ اور حافظ صاحب کی شہادت کے واقعات کو اس پر اثر طریقہ سے بیان فرمایا کہ روح نے لذت پائی،

واپسی مین مولانا جہاز پر بہت علیل ہوگئے تھے، حالت بہت نازک معلوم ہوتی تھی، دوسرے درجہ مین ان کا سفر تھا، جو جہاز کے پچھلے حصہ مین تھا، وہان بڑی تکلیف جہاز کے بعض آلات کا دھڑ دھڑ کرکے نیچے

قوتِ تفہیم حدِ بیان سے بالا ہے، مجھے امید ہے کہ ان کے ان حواشی سے مسلمانون کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، ان حاشیون مین انھون نے جابجا اپنے ایک معاصر کی تصنیف کا حوالہ صاحب ارض القرآن کے نام سے دیکر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہو کہ وہ معاصرانہ رقابت سے کس قدر بلند تھے، مین نے اپنے حلقۂ درس مین ان کے حواشی کی افادیت کی ہمیشہ تعریف کی ہے، اوران کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، افسوس یہ ہو کہ یہ حاشیے بہت باریک چھاپے گئے ہین، اس لئے اُن سے استفادہ مین مشکل پڑتی ہے، ان حواشی کی افادیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانون کے فائدہ کے لئے فارسی مین ترجمہ کرکے چھاپا ہو،

صحیح مسلم کی شرح لکھنے کا خیال ان کو اپنی نوجوانی کے عہد سے تھا، صحیح بخاری کی شرح تو احناف مین سے حافظ بدرالدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کردیا تھا، مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہین لکھی گئی تھی، اس کے لئے مرحوم نے اپنے دست و بازو کو آزمایا،

انگریزون کے عہد مین دیوبند مین جو بعض سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، اور کانگریسی اور لیگی خیالات مین جو آویزش تھی، اس کی اطلاع حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد کے کانون تک پہنچی تھی، اس سلسلہ مین انھون نے مناسب سمجھا کہ مولانا شبیر احمد کو مہتمم بناکر دیوبند بھیجین، چنانچہ وہ اس صورت سے ڈابھیل سے واپس آکر دیوبند مین مقیم ہوئے، اور اہتمام کا کام شروع کیا، مگر ظاہر ہے کہ صرف تقرر اور منصب سے خیالات اور نظریون کا اختلاف دور نہین ہوسکتا تھا، چنانچہ طلبہ مین اسٹرایک ہوئی اور بعض نامناسب واقعات پیش آئے جن کا نتیجہ ان کا استعفا، تھا،

اس موقع پر مجھے ایک بات یاد آئی ہے ۱۹۱۳ء کی بات ہو کہ ندوہ مین مولانا شبلی کے استعفے پر ایک عظیم الشان اسٹرایک ہوئی تھی، جس مین علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے، اور ملک اور قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی مین طلبہ کی تائید مین تھے، اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب

اُن کے گجرات کے قیام کے زمانہ مین اُن کی آمد و رفت حیدرآباد دکن کی طرف بہت بڑھ گئی تھی، شرح صحیح مسلم کی امدادی تحریک جاری تھی، اور کبھی کبھی میرا بھی جانا ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک میلاد کی مجلس مین میرا ان کا ساتھ ہو گیا، اسی جلسہ مین خود حضور نظام بھی آنے والے تھے، میری تقریر ہو رہی تھی کہ وہ آگئے، میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، حضور نظام نے بڑی داد دی، اور اہل محفل محظوظ ہوئے، لوگون مین باہمی ترجیح کی اچھی خاصی رد و کد شروع ہو گئی، مگر بحمد اللہ دونون مقررون کے دل باہم صاف رہے اور زبانین محفوظ،

مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب مقرر تھے، عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے، جس سے اہل محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہین ہنستے تھے، مگر دوسرون کو ہنسا دیتے تھے، ان کی تقریرون مین کافی دلائل بھی ہوتے تھے اور سیاسی اور علمی اور تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی، ذہانت و طباعی، اور بدیہہ گوئی ان کی تقریرون سے نمایان ہوتی تھی، اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے، وہ اُنکو اپنی تقریرون مین عمدگی سے کھپاتے تھے،

ان کی تحریر بھی صاف شستہ تھی، اور اس عصر کے اچھے لکھنے والون کے لٹریچر کو غور سے پڑھا تھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا، جمعیۃ و خلافت کے جلسون مین علمار کی بعض تجویزون کی انگریزی بنانے مین بڑی دقت ہوتی تھی، اس موقع پر محمد علی مرحوم نے کہا تھا کہ مولوی شبیر احمد صاحب کی عبارت کی انگریزی بنانے مین بڑی آسانی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی ساخت انگریزی طرز پر ہوتی ہے،

موصوف کے مضامین اور چھوٹے رسائل تو متعدد ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو مین ان کے قرآنی حواشی ہیں، جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمۂ قرآن کے ساتھ چھپے ہین، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی، اور تفسیرون پر عبور اور عوام کے دلنشین کرنے کے نوکی

مرحوم کی شرح مسلم جس کا نام فتح الملہم ہے لکھنے کا کام تمام عمر جاری رہا، اتنے بڑے کام کے لئے ان
کو کسی ریاست سے امداد کی فکر تھی چنانچہ اس کے لئے حیدرآباد دکن کا خیال تھا، اس کے لئے معروضہ پیش کیا
اور بڑے ردوکد کے بعد ریاست نے اس کی سرپرستی منظور کی، اور ہر جلد کے لئے کچھ امداد اور مصنف کیلئے
ماہانہ وظیفہ منظور ہوا، اور مولانا نے جمعیت خاطر کے ساتھ اس کی چند جلدیں لکھ کر شائع کیں، اس سلسلہ میں یہ امر
ذکر کے قابل ہے کہ جب ریاست نے ان کی امداد منظور کی تو مرحوم نے مجھے دوستانہ خط لکھا کہ اہل علم کی طرف سے
ریاست کی اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل معارف کے شذرات میں کی، افسوس
ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی،

مرحوم سے میری آخری ملاقات اس سال ہوئی جب جمعیۃ علمائے اسلام کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا،
اور اس میں ان کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا جس کی اس زمانہ میں بڑی دھوم تھی، اور جس کے بعد مرحوم
مسلم لیگ کی دعوت کی صف میں اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہوگئے اور روز بروز ان کا تعلق لیگ سے بڑھتا
ہی چلا گیا، مرحوم اس زمانہ میں بیمار تھے، نشست و برخاست سے معذور سے رہتے تھے، گٹھیے کا گمان تھا،
اور میرٹھ کے کسی ہومیوپیتھ کے علاج سے فائدہ ہو رہا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں میرا دیوبند جانا ہوا تو ملاقات
کو حاضر ہوا، بشاشت سے ملے، اور مجھ سے اپنے پیغام کے متعلق رائے پوچھی، تو میں نے اس کے نرم و ملائم
اور مصالحانہ انداز کی تعریف کی، اسی زمانہ میں ان کو حیدرآباد دکن کی ریاست اپنی عربی درسگاہ مدرسہ
نظامیہ کی صدر مدرسی کے لئے پانچ سو ماہوار پر بلا رہی تھی، مرحوم اس کے قبول و عدم قبول میں متردد تھے،
مجھ سے بھی اس میں مشورہ پوچھا، مجھے اس مدرسہ کا اندرونی حال جو معلوم تھا، وہ بیان کیا،
اور عدم قبول کا مشورہ دیا، بہرحال مرحوم نے بھی وہاں جانا قبول نہیں کیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لیگ کی
خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہیں ملا، اور آخر ۱۹۴۷ء
میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے، اور وہیں کے ہوگئے،

ندوی کا ایک مضمون "الاعتصاب فی الاسلام" کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا، جس میں اسٹرائک کو خلاف اصول بتایا تھا، اس مضمون میں ایک مصرع یہ بھی تھا ؏

لو آپ اپنے جال میں صیاد آ گیا

پھر جب دیوبند کے احاطہ تک اسٹرائکوں کا سیلاب پہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے بہت یاد آیا،

موصوف کے حیدرآباد دکن اور نظام حیدرآباد سے گوناگوں تعلقات پیدا ہو گئے تھے، مرحوم نے اس ہنگامہ میں جو آریہ تحریک کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا، اپنی تقریر سے بہت کچھ مسلمانوں میں سکون پیدا کیا، یہاں تک کہ حیدری صاحب اپنی ممنونیت ان کی ذات کی نسبت ظاہر کی، اور منصب میں ترقی کی، مگر ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام پر تفضیلیت کا غلبہ تھا، اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، تو مرحوم نے تقریر فرمائی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقہ سے بیان کئے تھے، اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی، اور ان کے بیباکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی،

مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڈھ کی دعوت پر اعظم گڈھ آئے اور شبلی منزل میں میرے ہی پاس ٹھہرے، اس وقت انکی شرح مسلم کے کچھ اجزاء ساتھ تھے جن میں قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے، جن کو جابجا سے مجھے سنایا، ایک اور دفعہ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڈھ آئے، ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے، مجھ سے ملنے آئے میں نے چائے پیش کی، تو پینے سے انکار کیا، انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی، مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں ان پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، اس لئے ان میں پینے سے انکار کیا، بہرحال اس سے اُن کے تقویٰ اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے،

جامعہ عباسیہ کی تعلیمی ضرورت سے بہاولپور گئے، جہاں سنا ہے کہ اس وقت بڑی سردی تھی، اس کے بعد کا حال کراچی کے ایک رسالہ ندائے حرم مورخہ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء سے نقل کرتا ہوں،

"۱۰ صفر ۶۹ھ مطابق ۸ دسمبر ۴۹ء کو حضرت علامہ مرحوم و مغفور جامعہ عباسیہ کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے کراچی سے بہاولپور تشریف لے گئے، ۲۲ صفر ۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر کی صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی، خلاف معمول اس روز ایک پیالی کے بجائے دو پیالیاں چائے پی، اور فرمایا رات کو کچھ حرارت رہی، چنانچہ اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرکے طلب کیا گیا، ڈاکٹر نے بہت خفیف حرارت بتائی، اور دوا دیدی، دس بجے کے قریب سینہ میں غیر معمولی گھبراہٹ محسوس ہوئی، دوبارہ ڈاکٹر کو بلایا گیا، نبض کی رفتار اس وقت اپنی طبعی رفتار سے کچھ کم تھی، ایک طبیب اور دوسرے ڈاکٹر کو بھی طلب کر لیا گیا، بہاولپور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعظم اور وزیر مال بھی پہنچ گئے، چار پانچ انجکشن دیئے گئے، مگر نبض کی رفتار کم ہوتی گئی، آخر گیارہ بجکر ۵ منٹ پر یہ آفتاب علم غروب ہو گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

میت اسی روز شام کو بذریعہ پاکستان میل ۸ بجے کے قریب بہاولپور سے کراچی روانہ کی گئی، اسی روز شام کو پاکستان کے اس مایہ ناز عالم باعمل کو لاکھوں اشکبار آنکھوں اور سوگواروں نے سپرد خاک کیا، ڈیرہ نواب کے اسٹیشن پر نواب صاحب بہاولپور نے میت کی زیارت کی، اور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا"

کراچی کے اسٹیشن پر مسلمانوں کے بہت بڑے مجمع نے میت کو اتارا، اور پہلے مرحوم کے قیامگاہ پر لائے، اور پھر وہاں سے ان کے قیامگاہ کے سامنے ایک زمین میں جس کو عامل کالونی کہتے ہیں دفن کیا گیا، سندھ کے اقطاع میں سے بہاولپور ہی وہ مقام ہے، جس سے دیوبند کے اکابر او رامداد اللّٰہی

مرحوم نے کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہین کیا، مگر مذہبی معاملات مین ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی، اس لئے زبان خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہکر پکارا، جو اسلامی سلطنتون مین عموماً قاضی القضاۃ کا لقب رہا ہے، اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ مین رہی، اسی حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے، اور اس جماعت کے سرگروہ تھے، جو اس آئین کو اسلامی قالب مین ڈھالنا چاہتی ہے، اور اس راہ مین مرحوم ہی کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا وہ نتیجہ تھا جس کو پاکستان کی اپنی اصطلاح مین قرارداد مقاصد کہتے ہین،

مرحوم گو مستقل طور سے پاکستان چلے گئے تھے، مگر تعجب ہوگا کہ انھون نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ بعض عقیدتمند اہل ثروت کے مکان مین رہے، اور اسی مسافرت مین اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کر دی،

مرحوم مروت کے آدمی تھے اور اہل حاجت کی سعی و سفارش بدل و جان کرتے تھے، چنانچہ پاکستان کے اہل حاجت اور اہل غرض دونون ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اور وہ اپنی جاہ و منزلت کا ذرا خیال کئے بغیر ہر ایک کے کام آتے رہے، اور حکام کے پاس جا جا کر بے تکلف ان کی سفارشین کرتے رہے،

مرحوم کا آخری کام ایک عظیم الشان عربی درسگاہ کے قیام کا خیال تھا، چنانچہ اس کے لئے انھون نے مخلصین کی ایک جماعت بنائی تھی، میرے قیام حجاز کے آخری زمانہ مین مرحوم کی طرف سے اس جماعت کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا، اور انھون نے مجھے بھی اس مجلس کا ایک رکن بنایا تھا،

مرحوم کی صحت اخیر دنون مین اچھی نہ تھی، امسال پاکستان سے خیرسگالی کا ایک وفد حجاز جا رہا تھا، اس کے ممبرون مین خواجہ شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ مرحوم کا نام بھی تھا، مگر وہ اسی علالت کے سبب جا نہ سکے اور ان کی جگہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی گئے، مرحوم پر فالج کا اثر تھا جس سے ان کے دل و دماغ، اور جسمانی قوی پر بڑا اثر تھا، اتفاق وقت یا تقدیر کا تماشہ دیکھئے کہ دسمبر مین جب سردی انتہائی نقطہ پر تھی وہ

ادبیات

نغمۂ حیات

از سید شاہ ولی الرحمن صاحب ولی

شاعرِ آتشین نوا دیدے پیامِ زندگی بیٹھے ہین لوگ بزم مین تشنۂ جامِ زندگی

ہاتفِ خوش کلام نے آکے کہا یہ سامنے شاعرِ حق پرست سے سُن لو پیامِ زندگی

اس کو سکون حرام ہے گرمِ سفر مدام ہے صرصرِ تیز گام ہے موجِ خرامِ زندگی

منظرِ صبح و شام مین محفلِ دورِ جام مین کوششِ ناتمام مین جلوۂ عامِ زندگی

گلشنِ لاجواب ہے کانِ دُرِ خوش آب ہے معدنِ لعلِ ناب ہے سنگِ رخامِ زندگی

فتح و شکستِ رزم مین لالہ و گل کی بزم مین ذوقِ سفر کے عزم مین مستیٔ جامِ زندگی

لب پہ صدائے ہاؤ ہو دل مین ہجومِ آرزو سر مین ہوائے جستجو حاصلِ کامِ زندگی

طلعتِ مہرِ نیم روز جلوۂ ماہِ شب فروز صاعقۂ نگاہ سوز حسنِ نظامِ زندگی

جلوہ گہِ حیات مین کارگہِ ممات مین عرصۂ کائنات مین رقصِ دوامِ زندگی

جذبۂ خودسری مین ہے حملۂ قیصری مین ہے غمزۂ دلبری مین ہے حسنِ خرامِ زندگی

معرکۂ ستیز مین عرصۂ رستخیز مین سایۂ تیغِ تیز مین فیضِ حسامِ زندگی

حسن کی شرمِ ناز مین عشق کے سوز و ساز مین سجدۂ پاکباز مین شورشِ عامِ زندگی

سوزِ دلِ پیمبری حملۂ تیغِ حیدری روحِ نیاز بوذری نقشِ دوامِ زندگی

سلسلہ کے مشائخ کو تعلق خاطر رہا ہے، اس لئے اگر مرحوم کی موت اسی سرزمین پر واقع ہوئی، تو عالم مثال کے حوادث میں کوئی عجیب چیز نہیں ہوئی،

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی، لیکن بحمد اللہ کہ انھون نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے، یہ انکے تلامذہ ہین، جو زیادہ تر دیوبند اور بعض ڈابھیل مین اُن کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہین، ان مین بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہین وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہون، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمان صاحب اعظمی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کہ ان مین سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے،

مرحوم کی پیدائش ۱۳۰۵ھ معلوم ہوئی ہے، اس لحاظ سے اُن کی عمر قمری حساب سے چونسٹھ سال کی ہوئی، اس وقت جب مرحوم کے نصف صدی کے واقعات کو سپرد قلم کر رہا ہون، میرا دل کانپ رہا ہے، اور لب معاصر مسافر عدم کے لئے مغفرت کی دعا مین مصروف ہین، ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیون مین پیدا ہوتے ہین، اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو پر نور فرمائے، اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے، وہ اب اس دنیا مین نہین، مگر ان کے کارنامے دنیا مین انشاء اللہ تعالیٰ حیاتِ جاوید پائین گے،

سالہا از زمزمہ پرداز، جہان خواہد بود
زین نواہا کہ درین گنبد گردان زدہ است (س)

تاریخ سندھ

اس مین سندھ کا جغرافیہ آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ، ان تمام دورون کے علمی و تمدنی حالات اور رفاہِ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، مرتبہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین، اعظم گڈھ،

قیمت :- ے/ منیجر

دِرِ عالی پہ پردہ ہے نگہبان آستانے پہ — نگاہِ شوق شرمیلی، جمالِ یار پوشیدہ

کسی نے کہدیا تھا مسکرا کر اپنا دیوانہ — اسی دن سے مری شوریدگی ہے اور بالیدہ

شفیق اندر سے کعبۂ شوق نزدیک بیابان

کہ جیسے قافلے کا قافلہ [illegible]

نیرنگِ حقیقت

از

جناب عتیق انجمی [illegible]

مجھے سلام کرا سے میری منزلِ مقصود — بغیر اٹھائے ہوئے اٹھ گئے حجابِ قیود

[illegible] مجھے اس مقام تک پہنچا — کہیں نہیں ہے مگر ہر جگہ ہے وہ موجود

[illegible] ہے مجھے جس نے دردِ لامحدود — وہی ہے میری تمنا، وہی مرا مقصود

حضورِ غم کے تھپیڑے سہے نہیں جاتے — یہ جانتا ہوں کہ ان میں ہے زندگی کی نمود

گذر سکے دیکھ تو ذوقِ طلب [illegible] — تجھے پکارنے آئے گی منزلِ مقصود

حضورِ دوست بہت سعی ضبط کی میں نے — ٹپک پڑے مگر آنکھوں سے اشکِ خون آلود

خطا معاف کہ اندازِ بندگی میں نے — بدل دیے ہیں کچھ از راہِ احتیاطِ سجود

یہ فیصلہ تری محفل سے ہو تو اچھا ہے — مجھے خبر نہیں موجود ہوں کہ لاموجود

بدل چکی ہے محبت ہزار رنگ مگر

عتیق! ہیں مری آنکھیں ہنوز اشک آلود

جوشِ غبارِ کاروان جنبشِ موجۂ روان ہمتِ مورِ ناتوان کوششِ گامِ زندگی

مجلسِ وجد و حال مین محفلِ قیل و قال مین شوکت و جاہ و مال مین نشۂ جامِ زندگی

سبزۂ نودمیدہ مین لالۂ نو رسیدہ مین غنچۂ چیدہ چیدہ مین شرحِ پیامِ زندگی

نغمۂ عیشِ کامران نالۂ دردبیکسان زمزمہ ہائے طائران حسنِ کلامِ زندگی

طینتِ خود پسند مین طالعِ ارجمند مین ہمتِ سربلند مین رفعتِ بامِ زندگی

تو نے لکھی غزل ولی خوب ہی وجد آفرین

اس کا ہر ایک شعر ہے شرحِ پیامِ زندگی

غزل

از جناب شفیق صدیقی جونپوری

ہے کیا ذی ہوش دیوانہ ترے جلوون کا گرویدہ قدم دیکھو تو شوریدہ نظر دیکھو تو سنجیدہ

چمن مین تازگی پاتے ہین گلہائے خزان دیدہ خوشا تیری ہوائے نازِ دامانِ جنبیدہ

نسیمِ جامۂ یوسفؑ ترے دامن مین رقصیدہ شمیمِ چادرِ مریمؑ تری زلفون مین خوابیدہ

زبان پر ان کا نام آیا کہ آہین بند خشک آنسو تمنا اتنی شایستہ جنون اور اتنا سنجیدہ

تمھاری خوش کلامی سے معطر ہے مسیحائی تمھارا ہر نفس جیسے کہ بوئے گل خرامیدہ

سنایا وصل مین فرقت کا افسانہ تو کہہ اٹھے بھلا دو اس کہانی کو کہ دل ہوتا ہے رنجیدہ

وہ محوِ خواب، گیسو کا بکھرنا روئے تابان پر کہ جیسے چاندنی ہو رات کے دامن مین خوابیدہ

چمن مین باغبان اتنا مخالف ہے نشیمن کا نظر آتی نہین اب کوئی شاخِ ناتراشیدہ

شکایت آسمان سے کیجئے کیا برق باران کی ہزارون بجلیان جب آشیانون مین ہون خوابیدہ

ارے او موت کی دشواریون کو سوچنے والے خبر بھی ہے تجھے خود زندگی ہے کتنی پیچیدہ

سانی کے ساتھ استفادہ نہین کرسکتا، اس لئے ضرورت تھی کہ اُن کو حسن ترتیب کے ساتھ کتابی شکل مین مرتب کر دیا جاتا تاکہ اردو مین تصوف پر ایک جامع کتاب ہو جاتی اور لوگون کو اس سے استفادہ آسان ہو جاتا، اس فرض کفایہ کو حضرت مولانا کے خلیفہ راشد جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے، جو ہر حیثیت سے اس کام کے اہل ہین، انجام دیا وہ حضرت مولانا کے فیض صحبت کا عملی نمونہ اُن کی تعلیمات اور ارشادات کے ماہر و عارف بھی ہین، اور ایک کہنہ مشق ادیب و صاحب قلم بھی، انھون نے مولانا کی تصانیف اور تحریرون سے شریعت و سلوک کی روح اس کتاب مین کھینچ دی ہے، اور اپنی تشریحات سے ان کو نہایت واضح روشن اور دلنشین بنا دیا ہے اس طرح یہ کتاب صحیح معنون مین حقیقی تصوف کا آئینہ ہو گئی ہے جس مین اس کی تمام غلطیون کی اصلاح، غلط فہمیون کا ازالہ، اور سلوک و تصوف کی اصلی صورت نظر آتی ہے، اس کو پڑھنے کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کے دل مین تصوف کے متعلق کوئی شک و شبہہ باقی نہین رہ سکتا، اور وہ اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوگا کہ تصوف نام ہی ہے نہین اسلام بلکہ کمال اسلام کا" کتاب کے شروع مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے حضرت مولانا کی تجدیدات و اصلاحات پر جامع تبصرہ ہے، مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑا مذہبی و علمی فرض انجام دیا جس کے لئے وہ مسلمانون کے شکریہ کے مستحق ہین، یہ کتاب ہر تعلیم یافتہ مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

کلمۂ طیبہ از مولانا غوث علی شاہ المعروف بہ غوثی شاہ صاحب قادری چشتی حیدرآبادی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۲ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت درجہ اول عمر درجہ دوم عہ مجلد کی قیمت ایک روپیہ زیادہ ہوگی، پتے:۔ (۱) بیت النور چنچل گوڑہ حیدرآباد (۲) عبدالقادر صاحب تاجر کتب، چارکمان حیدرآباد، (۳) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اسلام کا کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ایک تخم ہے، جس مین شجر اسلام

مطبوعات جدیدہ

تجدید تصوف و سلوک از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۹۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ ملنے کے پتے (۱) مولوی سعید الباری صاحب شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ (۲) مکتبہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ، (۳) مکتبہ اشرفیہ اشرف المدارس، ہردوئی،

تصوف نام ہے ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے تحسین اعمال و کمال دین کا، لیکن مروجہ خانقاہی تصوف مین اس کی حقیقت بالکل چھپ گئی ہے، اور وہ محض چند غیر اسلامی رسوم و بدعات کا مجموعہ بن گیا ہے، اس سے تصوف کے متعلق بڑی غلط فہمی اور شکوک وشبہات پیدا ہوگئے ہین، اور کچھ لوگ سرے سے تصوف ہی کے منکر ہوگئے، ہندوستان مین سب سے اوّل حضرت مجدد سرہندی نے تصوف کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کیا، اور اس دور مین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اسکی تجدید کامل فرمائی، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی مین تصوف کے مسائل کی تدوین، اس کی پرانی غلطیون کی اصلاح اور اس کے متعلق غلط فہمیون کے ازالہ کا عظیم الشان کام انجام دیا، اور بقول فاضل مرتب تصوف کو تمامتر پرانی علمی و عملی غلطیون سے پاک و صاف کرکے اس حقیقت کو آئینہ کر دیا کہ تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا، حضرت مولانا کی یہ تجدیدات واصلاحات اور تصوف و سلوک کے مسائل ان کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات کے ہزارون صفحات مین بکھرے ہوئے ہین جن سے ہر شخص

ماننے والون کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، اور مہدیون کو دکن مین بڑا عروج حاصل ہوا، اور وہ دکنی حکومتون مین بڑے بڑے مناصب پر ممتاز ہوے، حیدرآباد اور مدراس وغیرہ مین آج بھی مہدوی موجود ہین، لائق مصنف نے جو خود مہدوی ہین، اس کتاب مین ان ممتاز مہدویون کے حالات لکھے ہین جن کا تعلق دکن کی حکومتون سے رہا ہے، کتاب کے شروع مین دیباچہ نگار (دکنی) حکومتون کے زمانہ مین سے لے کر ارکاٹ اور میسور کی نوابی کے عہد تک دکن کی ہندو و مسلمان حکومتون کا مختصر ذکر ہے، اس کے بعد ان حکومتون سے منسلک مہدوی عہدہ دارون کے حالات ہین، شمالی ہند مین مہدویون کا وجود نہین ہے، اور یہان ان لوگون کے علاوہ جن کی نظر تاریخ پر ہے، عام طور سے مہدوی فرقہ کے نام تک سے لوگ ناواقف ہین، اس لئے ضرورت تھی، کہ کتاب کے شروع مین فرقہ مہدویہ کی مختصر تاریخ لکھ دیجاتی، تاکہ اس کے پڑھنے والون کو یہ تو معلوم ہو جاتا، کہ فرقہ مہدویہ سے مراد کون لوگ ہین، کتاب مہدویون اور دکن کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

تحقیقی نوادر، از محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ ایم اے لکچرار مہارانی کالج میسور، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد، قیمت مرقوم نہین، مصنفہ سے ملے گی،

یہ کتاب لائق مصنفہ کے دس علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، انشاء کے شورش پسند حریف، انشا کے مربی الماس علی خان اور نواب سعادت علی خان، قواعد اردو و رسم الخط، خلاصہ تعدیہ فعل از دریاے لطافت، اعلان نون، تنقید دستور الفصاحت، مرتبہ مولانا امتیاز علی خان عرشی، حضرت کیفی اور دریاے لطافت کا اردو ترجمہ، ہندوستان مین فارسی کا نشو و نما، اکبر الہ آبادی اور پردہ، اصلاح زبان اور خواتین، ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کا علمی و ادبی ذوق سنجیدہ اور اردو زبان و ادب پر انکی نگاہ گہری، اور وسیع ہے، تنقیدی مضامین خصوصیت کیساتھ مصنفہ کی وسعت و دقت نظر اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہین، نئی پود مین عورتون کا کیا ذکر، مردون مین بھی صحیح علمی مذاق کا فقدان ہے، ایسی حالت

کے سارے برگ وبار پنہان ہین، اور اس مختصر کلمہ مین اسلام کے تمام بنیادی ارکان اور اسلامی تعلیم کا خلاصہ آگیا ہو، اور شرک یا غیر اللہ کی نفی، توحید کے اقرار اور رسالت محمدی کی تصدیق سے ان تینون ارکان کی جامع و مانع اور کامل شکلیں مراد ہین یعنی لا الہ کے معنی شرک کی ان تمام علمی و عملی اور خفی و جلی شکلون کی نفی ہو، جس مین اس کا خفیف شائبہ بھی نکلتا ہو اور الا اللہ سے مراد صرف ایک ذات کی الوہیت پر ایمان کے ساتھ الوہیت و معبودیت کے سارے اوصاف و خصائص کا عملی اقرار ہے، اور رسالت محمدی کی تصدیق کا مقصد صرف دین اسلام کی صداقت پر ایمان اور دوسرے بگڑے ہوئے دینون سے برأت ہو، اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح اور اس کے مضمرات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ تشریحات نہایت جامع ہین، اور ان مین اسلام کے تمام بنیادی عقائد و اعمال کا خلاصہ آگیا ہے، البتہ کتاب کے بعض مباحث دقیق اور ان کا طریقۂ تعبیر صوفیانہ اور کہین کہین پرانے طرز کا فلسفیانہ ہے جس سے عبارت مین پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے، لیکن مصنف کے صوفیانہ ذوق و شوق کے باوجود ان کا قلم توحید کے جادۂ مستقیم اور شریعت کے دائرہ سے باہر نہین نکلا ہے، اور جابجا غلط متصوفانہ عقائد و اعمال کی تردید کی گئی ہو، مگر یہ کتاب خواص کے مطالعہ کے لائق ہے، عوام اس سے فائدہ نہین اٹھا سکتے،

مشاہیر مہدویہ (جلد اول) مؤلفہ جناب سید عزیز مہدی صاحب بخاری، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتے:- دار الاشاعت مہدویہ چن پٹن (۲) سید اسد اللہ خوندمیری کتب فروش چن پٹن،

فرقۂ مہدویہ سید محمد جونپوری المتوفی ۹۱۰ھ کی جانب منسوب ہو، وہ اپنے زمانہ کے ممتاز عالم و زاہد تھے، نوین صدی ہجری مین انھون نے مہدویت کا دعویٰ کیا، اس زمانہ کے علمائنے اس کی بڑی مخالفت کی، لیکن دکن اور گجرات مین اُن کی دعوت مقبول ہوئی، اور احمد نگر کے بعض نظام شاہی سلاطین اُن کے عقیدت مند ہوگئے، اس سے دکن مین اُن کی دعوت کو بڑا فروغ حاصل ہوا، اور وہان اُن کے

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت
مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان سے
ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ
ہوسکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس
میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی
ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری پھر
فارسی پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ
مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی
خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم
موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریات
تعلیم، سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ
اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے،

قیمت :- عہ

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و
شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی
کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا،
جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء
اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری
اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور
کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی
روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر
نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں
اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں،
دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں
گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس
کتاب میں ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت :- ۵۰۴ صفحے،

قیمت :- صہ

منیجر

مین ایک خاتون کے قلم سے ایسے مفید علمی مضامین اور بھی زیادہ لائق تحسین وآفرین ہین، مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ آیندہ اردو زبان کے ادیبون کی صف مین مصنفہ کی ممتاز جگہ ہوگی،

نماز اور ترقی کی تین راہین از جناب مولانا محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہین، پتہ:- منیجر دارالکتب اسلامیہ نمبر ۱۰، اعظم پورہ ملک پیٹھ حیدرآباد دکن،

اسلام مین نماز راس العبادات ہے، اور قرآن مجید واحادیث نبوی مین اس کے بڑے فضائل اور دینی ودنیوی برکات بیان کئے گئے ہین، بہت سے علما نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تشریح وتفصیل بیان کی ہے، مولانا محمد علی لاہوری نے بھی نماز کی حقیقت اور اس کے فوائد وثمرات پر ایک تقریر کی تھی، اس کو کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین مقرر نے نماز کے ارکان اور اس کی دعاؤن کے اسرار وحکم کو موجودہ اصطلاح مین اس کے فلسفہ کی روشنی مین دکھایا ہے کہ نماز ہی مسلمانون کی ہر قسم کی روحانی اور مادی فلاح کا ذریعہ ہے، اس سے انفرادی تطہیر وتزکیہ بھی حاصل ہوتا ہے، اجتماعی وقومی فلاح و سعادت بھی اور حق وصداقت کا اعلاء بھی جو اسلام کا اصل مقصود ہے، مصنف کا نقطۂ نظر اور تشریحات خالص دینی ہین لیکن اتنی نفسیاتی اور دلنشین ہین کہ اس سے عقل پرست بھی انکار نہین کر سکتے، اس حیثیت سے یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، البتہ ایک دو مقامون پر کھٹک پیدا ہوئی، مثلاً فصل لربک وانحر مین، "نحر" یعنی جانورون کی قربانی کے معنی ایثار وقربانی یعنی Sacrifice لئے گئے ہین، جو محل نظر ہے، دوسرے "رفع" کی تشریح مین مصنف نے حضرت عیسیٰؑ کے رفع کے متعلق اپنے عقیدہ کی تبلیغ کر دی ہے، جس کا یہ محل نہین تھا، اس لئے کہ یہ رسالہ عام مسلمانون کے فائدہ کو لکھا ہے، لیکن اس سے اس رسالہ کی خوبی مین کوئی فرق نہین آتا،

م

1950

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت ۔ چھ روپیہ سالانہ

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخرالدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین افراد کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- عہ

جلد ٦٥ ماہ شعبان المعظم ١٣٦٩ھ مطابق ماہ جون ١٩٥٠ء عدد ٦

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ادبیات

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس نے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۰۵ صفحے قیمت: ؎

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- ؎

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت عمر

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۴۴۲ صفحے

قیمت :- ؎

منیجر

منیجر

اتفاق دیکھئے کہ میں ان سطروں کے لکھتے وقت پانیر مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تقریر چھپی ہے جو انھوں نے دہلی کی یونائیٹیڈ نیشنس اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن دہلی میں ۲۰ مئی کو کی ہے، اس میں کہتے ہیں کہ

"ملک کے نوجوانوں میں ہندو کلچر کے نعروں کی رہبری کی جا رہی ہے، جو نہایت گھٹیا عامیانہ تنگ دلانہ اور مغرورانہ ہے، ہمارے خیال میں کلچر طریق کردار، اور طریق عمل کا نام ہے، اس کے معنی جو تم ہوتے ہو نہ کہ جو تم پکار کرتے اور کہتے ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ قوم بنیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی ذہنیت کو بھی ترقی دیں، ملک کی تقسیم سے پہلے جب اسلامی کلچر کی بات کہی جا رہی تھی، تو آج سے سترہ برس پہلے میں نے اپنی کتاب آپ بیتی میں ہندو کلچر اور اسلامی کلچر پر بحث کی تھی کہ ہندو اور مسلم کلچر سے کیا مراد ہے، میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں، البتہ ہندوستانی کلچر، عرب کلچر اور ایرانی کلچر تک تو سمجھ میں آسکتا ہے،..........."

پنڈت جی نے جو بات کہی ہے وہ کانگریس کا نقطۂ خیال ہے، اور اسی پر اس کی ساری سیاست کی بنیاد ہے، ایسی صورت میں ٹنڈن جی کا مطالبہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر کانگریس کے اصولوں کے خلاف ہے، اور بجائے اس کے کہ مسلمان اس کی مخالفت میں آواز اٹھائیں خود کانگریسیوں کو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹتے ہیں،

اسی سلسلہ میں پنڈت جی نے وہ بات کہی ہے جو معارف میں بار بار کہی گئی ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا زمانہ ہمیشہ وہ رہا ہے، جب اُس نے دوسری قوموں اور ملکوں سے تعلقات پیدا کئے، اور بیرونی اثرات کو قبول کیا ہے، اور اس کے زوال کا زمانہ وہ ہے جب وہ دنیا سے اپنے کو الگ تھلگ کر کے اپنے اندر محدود ہو گیا ہے،

---

۲۳ مئی ۱۹۵۰ء کے پانیر میں وحید احمد صاحب پارلی منٹری سکریٹری یوپی کی ایک تحریر نظر سے گذری جس سے معلوم ہوا کہ ٹنڈن جی نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے، اور اپنی

مئی کے شذرات میں ٹنڈن جی کے اس مطالبہ پر کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کرلیں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لہجہ میں گو سختی ہے جس کا مجھے افسوس ہے تاہم جو بات لکھی گئی ہے، اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں، ٹنڈن جی اس صوبہ کی کانگریس کے اس وقت سب سے بڑے آدمی ہیں، کانگریس کے اصولوں میں ہندو مسلمانوں کا امتیاز نہیں، ایسی حالت میں ٹنڈن جی کا بار بار یہ مطالبہ کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ ہندو کلچر اختیار کریں کانگریس کی بولی نہیں ہندو مہاسبھا کی بولی ہے۔

—— (٠) ——

کانگریس کے بڑے لیڈروں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ہندوستان کے کل باشندے خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان یا عیسائی سب ایک قوم ہیں، اور اسی لئے انھوں نے ہندو کلچر اور مسلمان کلچر کی تفریق ماننے سے انکار اور صرف ایک ہندوستانی کلچر کا اقرار کیا ہے، ایسی صورت میں صوبہ کانگریس کے موجودہ صدر کی یہ بار بار کی رجز خوانی کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کریں، مسلم لیگ کے اس دعوی کی تصدیق ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں، اور دونوں کے دو کلچر ہیں لیکن اب ان میں سے ایک کو مٹ جانا اور صرف دوسرے کو زندہ رہنا چاہیے۔

پھر ٹنڈن جی کو چاہیے کہ آئین ہند کی اس دفعہ کو مٹوا دیں جس میں اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آئین بنانے والوں اور آئین کے ماننے والوں کے ذہنوں میں یہ چیز تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذہب، مختلف زبانیں، مختلف تمدن اور مختلف کلچر ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو زندہ رہنا چاہیے،

—— (٠) ——

ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نے آج سے بہت پہلے اپنی آپ بیتی میں بڑے شد و مد سے یہ ثابت کیا تھا کہ ہندوستان میں کوئی ہندو کلچر اور مسلمان کلچر نہیں، اور ان میں لوٹا اور لٹیا کے سوا کوئی فرق نہیں ہے، اگر ان کا یہ بیان سچ ہے تو پھر صدر صوبہ راج رشی ٹنڈن جی کے اس مطالبہ کے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندو کلچر اختیار کریں، کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

—— (٠) ——

مقالات

مسلمانون کی حکومت

مین

غیر مسلم اقوام

از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ

(۱)

اس مضمون مین بجائے اسلامی حکومت کے "مسلمانون کی حکومت" کا عنوان قصداً قائم کیا گیا ہے کیونکہ عام استعمال کے رو سے تو ہر وہ چیز جو مسلمانون کی طرف کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب ہو آج کل اس کو بھی لوگ اسلامی کہہ دیتے ہین، حتی کہ اسی بنیاد پر "اسلامی چار" "اسلامی پانی" کے الفاظ آج تک کانون مین نہ سہی لیکن حافظون مین تو اب بھی گونج رہے ہین، جب چار کے بیچنے والے اپنی چار کو بیچنے کے لئے اسلامی کے اس لفظ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے، اور اسٹیشنون کے بھشتی اسی لفظ کی پشت پناہی مین بخشش کا مستحق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے،

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام تو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ایک پیغام ہے، ایسا پیغام جس مین اپنے بندون پر حق تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ ذمہ داریان عائد فرمائی ہین، کائنات کے ماضی و مستقبل وحال کے متعلق فکری نظام عطا کیا گیا ہے، یعنی ہستی کا موجودہ نظام جس کا ایک جز خود ہم انسانون کا

ایک تقریر مین انٹر میرج یعنی ہندوستان کے مختلف فرقون کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز پیش کی ہے، مین نے یہ تقریر نہین پڑھی، اگر اس سے ٹنڈن جی کا مقصد ہندو جاتیون کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز ہے تو مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا نہین ہے، لیکن اگر اس سے مقصود ہندو مسلمانون کے درمیان شادی بیاہ کی تجویز ہے جیسا کہ مضمون نگار کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، تو مین ٹنڈن جی کی اس تحریک کو مسلمانون کی امتیازی حیثیت کو فنا کر دینے کے لئے دوسرا قدم سمجھتا ہون، شاید معلوم ہوتا ہے، کہ مسلمانون کا بحیثیت مسلمان کے جداگانہ وجود باقی نہ رہے،

لیکن مجھے اس تحریر کو پڑھ کر ٹنڈن جی سے زیادہ خود مضمون نگار کے جواب سے جو اسلام کی طرف سے انھون نے دیا ہے سخت تکلیف ہوئی ہے، مضمون نگار نے راج رشی کو ان کو اس تجویز کی بنا پر مغل اعظم کا خطاب دیا ہے کہ اکبر نے راجپوت شہزادیون سے بیاہ کر کے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، راج رشی اسی کا رواج اب اس عہد کے مغل اعظم بن کر دینا چاہتے ہین اور اس کے بعد مضمون نگار نے ہندوؤن کی مذہبی کتاب ویدکو الہامی کتاب مان کر ان کو اہل کتاب مین داخل کر کے مسلمانون اور ہندوؤن مین نکاح کے جواز کا فتویٰ دیا ہے،

مضمون نگار میرے پرانے دوست ہین، اس لئے اول ان سے مخلصانہ عرض ہے،

چیزے کہ نخواندہ تو تفسیر مکن   صیاد نہ ای اگر تو نخچیر مکن

"کتاب" قرآن پاک مین ہر اس کتاب کا نام نہین جس کو کوئی قوم اپنی الہامی کتاب مانے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس کے الہامی کتاب ہونے کی قرآن پاک نے خبر دی ہے، اور وہ صرف توراۃ، زبور اور انجیل ہین اور ان کتاب . . . والون کی بھی عورتون کا نکاح مسلمان مردون سے جائز ہے، مردون کا نکاح مسلمان عورتون سے درست نہین، اور ایسا تو ہو نہ ہو، مسلمانون سے پہلے کسی ایسی کتاب کے مدعی ہون جس کی تصدیق قرآن پاک نے نہین کی ہے، ان کو شبہ اہل کتاب کا خطاب دیا ہے، ان سے نکاح کسی طرح کا قطعاً ناجائز ہے، افسوس ہے کہ کمزور عقیدہ کا مسلمان آج اپنے کو اکثریت سے مغلوب پا کر اپنے بچاؤ کے لئے اپنے قتل نامہ پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے کو تیار ہے،

ہم ہندو مسلمانون کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہین لیکن یہ قطعاً ضروری نہین سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہکر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہین جس کی مثالین انگریزون کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان مین کثرت سے تھین، اور اب بھی ہین،

مسلمان کی فارسی اور مسلمانوں کی اردو جمع الجمع کے بعد اب خود مفرد ہو کر رہ گیا ہے ،

ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغام یعنی اسلام کا خطاب بندوں کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں بلکہ اس کے مخاطب جیسے مرد ہیں ، عورتیں بھی ہیں ، جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی ، مسافر بھی ہیں ، اور مقیم بھی ، امراء بھی ہیں ، اور وہ بھی جو بقدر ضرورت آمدنی نہیں رکھتے ، جو صحت مند اور چنگے ہیں ، وہ بھی اور صحت کی نعمت سے جو محروم ہیں وہ بھی ، باپ بھی ہیں ، اور بیٹے بھی ، ماں بھی ہے ، اور بیٹی بھی ، الغرض انسانیت کے سارے "تکلیفی مظاہر" اس خطاب کے مخاطب ہیں جن میں جیسا کہ عرض کیا گیا ، ہر طرح کے لوگ مرد و عورت ، جوان بوڑھے وغیرہ شریک ہیں ، اسی طرح حکمرانی کا اقتدار جن افراد کے ہاتھوں میں قدرت پہنچا دیتی ہے ، جنھیں حاکم کہتے ہیں ، اور وہ بھی جنھیں اس اقتدار کا کوئی حصہ نہیں بخشا گیا ہے ،

بہرحال کہنا یہ ہے کہ اس پیغام کے مخاطب جیسے حاکم ہیں ، اسی طرح اس کے مخاطب محکوم بھی ہیں ، وہ بھی ہیں جو کسی کو ملازم اور نوکر رکھتے ہیں ، اور وہ بھی جو ان نوکروں یا ملازموں سے کام لیتے ہیں ، اسلام کے اس "الٰہی پیغام" کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے مخاطب سارے تکلیفی مظاہر ہیں ، لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں ، اسی پیغام کی بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کی تعمیل کی ذمہ داری خاص خاص طبقوں پر عائد ہوتی ہے ، مثلاً بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے مخاطب صرف مرد ہیں ، اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو صرف عورتوں کی حد تک محدود ہیں ، بہت سے واجبات و فرائض ہیں جن سے بیماروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے ، یا کہنہ سال بوڑھوں سے وہ معاف ہیں ، بہت سے مطالبات کا رخ صرف مالداروں کی طرف ہے ، غریبوں کم مایہ لوگوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ، کچھ احکام ہیں جن کا پابند اسلام ان لوگوں کو بنانا چاہتا ہے ، جو دوسروں سے کام لیتے ہیں ، کچھ ذمہ داریاں ان کی بھی ہیں ، جو دوسروں کا کام کرتے ہیں ، پھر ہر منصب کے کچھ فرائض ہیں ، جو ان فرائض سے بالکل مختلف ہیں جن کے مکلف بیٹے ہیں ،

وجود ہے۔ اس کی ابتداء اور اس کے آخری انجام وانتہاء اور یہ کہ اس وقت یہ نظام جو چل رہا ہے، کیسے چل رہا ہے، کون چلا رہا ہے، انہی اساسی اور بنیادی سوالوں کے جواب کے متعلق ہین کیا سوچا جا ہے خود اس عالم کے پیدا کرنے والے نے جو علم اس راہ مین عطا کیا ہے، اس علم کو یقین وقطعیت کی قوت کے ساتھ ماننا اسی کی مذہبی تعبیر اعتقاد ہے، اور جو معلومات اس سلسلہ مین خالق کائنات کی طرف سے ہم پر کھولے گئے ہین، اُن ہی کو عقائد کہتے ہین، پھر زندگی کو اسی فکری نظام کے تحت رکھتے ہوئے صحیح انجام تک پہنچنے کے لئے ایک عملی دستور العمل یا ضابطہ پیدا کرنے والے نے عطا کیا، یہی اسلام کا عملی نظام ہے، آمنوا وعملوا الصالحات کا تعلق علم وعمل کے ان ہی دو نظاموں کے ساتھ قائم ہے،

ظاہر ہے کہ اسٹیشنوں پر بکنے والی چائے، یا تقسیم ہونے والا پانی، مندرجہ بالا دونوں باتین یعنی اسلام کے فکری یا عملی نظام سے کسی قسم کا تعلق نہین رکھتا، نہ چا آسمان سے اُتری، اور نہ پانی، اور نہ چا بنانے کا طریقہ اسلام مین بتایا گیا ہے، اور نہ پانی کو کنوئین یا تالاب سے نکالنے، مشکون مین بھرنے پشت پر اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم کے کنارے ٹہلنے پھرنے کا طریقہ، بھشتیون کو اسلام نے سکھایا ہے،

مگر یہ فرض کرکے کہ مسلمان اس چا کو استعمال کرین گے، یا اس پانی کو پئین گے بکنے والوں نے اس چا، اور پانی کا نام اسلامی چا اور اسلامی پانی رکھدیا، اور یہی مین عرض کرنا چاہتا ہون، کہ "اسلامی" کے اس لفظ کو اتنی وسعت دیکر لوگ اگر استعمال کر رہے ہین، تو یہ بالکل ایک جداگانہ اصلاح اپنی من مانی گھڑی ہوئی خود تراشیدہ اصطلاح یا ایسی اصطلاح ہے، جو خاص خاص اغراض کے زیر اثر کسی طرح چل پڑی ہے لیکن اسلام کے اس لفظ کو صرف اس پیغام اور فکری وعملی نظام کی حد تک اگر محدود رکھا جائے جو بندون کو پیدا کرنے والے خالق کی طرف سے پہنچایا گیا ہے، اور یہی "اسلام" کے لفظ کا صحیح مطلب ہو بھی پیغام پہنچانے والے پر اعتماد کرکے خدا کے جن بندون نے اس "پیغام" کو قبول کرلیا، اور اس کے مطابق جینے اسی پر مرنے کا قطعی فیصلہ جو کر چکے ہین، ان ہی کا نام "مسلم" ہے، اور اسی کی فارسی جمع لفظ "مسلمان" ہے جو

بستر جو باندھا ہو تو اس کی بندش مین اُس نے قرآن کی کس آیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس حدیث کو پیش نظر رکھا ہے، بستر کس چیز سے باندھا، رسّی سے باندھا، چمڑے سے باندھا، ہولڈر مین باندھا، پھر یہ کہ کس سواری پر سوار ہوا، زاد راہ مین اپنے ساتھ کیا کیا رکھا، یہ اسی قسم کے بے شمار سوالون کو اٹھا اٹھا کر اس پر بحث کرنا کہ مسلمان مسافر کا یہ سفر واقعی اسلامی سفر کیے جانے کا مستحق ہے بھی یا نہین خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک مناسب ہو ؟ اور ایک سفر ہی کیا ؟ ان کل قصون مین جن مین بعض کا ذکر ابھی تمثیلاً کیا گیا، کیا ہر ایک مین اسلامی وغیر اسلامی کی اس تقسیم کو جاری کرنا اور اسلامی قرار پانے والی قسم کے متعلق تنقیحی سوالات کے اٹھانے، اور اس کے ہر ہر پہلو کو اسلامی قوانین کے اساسی ماخذون اور بنیادی سرچشمون پر منطبق کرنے کی ضرورت اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ مین کیا کبھی محسوس کی گئی ہے، ہو لباس ہی کو لیجئے، چند ضوابط اسلام مین لباس کے متعلق بھی پائے جاتے ہین مثلاً مردون کو چاہئے کہ ریشم کا لباس استعمال نہ کرین، لوگ اسبال ازار کے مرتکب نہ ہون ان چند باتون کو دیکھ کر اسلامی وغیر اسلامی لباس کی تقسیم اور اسلامی کے متعلق یہ سوالات

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۰) کی اکثریت ان ہی بنیادون پر قائم ہے، جن پر اسلامی یا الٰہی حکومت کو قائم ہونا چاہئے، بنیادی کلیات کو مان لینے کے بعد ان کے تفریعی جزئیاتی قوالب تک لوگون کا پہونچنا زیادہ دشوار نہین ہے، اور میرا تو خیال ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو اسلام کے جزئیاتی قوالب بھی عموماً معلوم ہوگا کہ نئے نہین ہین، چوری کی سزا حد یہ ہے کہ قدیم ہندوستان مین بھی جیسا کہ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، بلکہ ویاس جی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ پراچین اتہاس (قدیم تاریخی قصہ) ہے، بیان کیا کہ جو ڈنڈ چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو، اس درخواست پر راجہ نے حکم دیا کہ "دونون ہاتھ کاٹ ڈالو"، دیکھو مہابھارت شانتی پرب ساتوان ادھیائے) جس سے معلوم ہوا کہ پراچین عہد کا یہ قدیم قانون تھا،

اسی سلسلہ مین احکام و قوانین کا ایک مستقل ضابطہ اسلام نے ان لوگون کے بھی سپرد کیا ہے جو زمین کے کسی علاقہ مین حاکمانہ اقتدار کے مالک ہین، اسی کے مقابلہ مین کچھ ذمہ داریان اُن کی بھی اسلام ہی نے مقرر کی ہین جن کی جان و مال عزت و آبرو فلاح و بہبود وغیرہ جیسے امور کی نگرانی کے لئے حکومت قائم ہوئی ہے،

ایسی صورت مین سوال ہوتا ہے کہ مثلاً مسافر بن جانے کے بعد جن اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف مسافرون کو توجہ دلائی گئی ہے، جیسے یہی کہ نماز مین قصر کرین، روزے ماہ رمضان سے چاہین تو موخر کر سکتے ہین یا ازین قبیل سفر کے متعلق دوسرے مشورے جو مسافرون کو دین کی طرف سے دیئے گئے ہین، اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر کو بھی دو قسمون مین تقسیم کر کے سفر کی ایک قسم کا نام اسلامی سفر اور دوسری قسم کا نام غیر اسلامی سفر رکھنے پر اصرار اور اس اصرار کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اسلامی سفر کے ہر ہر جز کا جائزہ لیا جائے، اور دیکھا جائے کہ کتاب و سنت مین اس کا ماخذ کیا ہو مسافر نے

ان گذشتہ پیغمبرون کی پیروی کرو، تاکہ تمھاری راہ نمائی ان لوگون کے طریقون کی طرف خدا کرے جو تم سے پہلے تھے،

لہ فبھداھم اقتدہ لیھدیکم سنن الذین من قبلکم،

یہ اور اسی قسم کی بے شمار آیتون مین پیغمبرون کی امت مسلمہ کو خطاب کر کے جیسا کہ ظاہر ہے یہی بتایا گیا ہے کہ کسی نئی راہ و رسم کی تعلیم نہیں، بلکہ اصولاً انہی باتون کی تجدید و تازگی یا جو بھلا دی گئی ہین ان کی یاد دہانی اسلام کے جدید پیغام سے مقصود ہے جن سے پیدا کرنے والا نسل انسانی کو ہر زمانہ اور ملک مین مطلع کرتا رہا اور اُن کی پابندی کا مطالبہ کیا ہے، زندگی کے تمام شعبون کے ساتھ حکمرانی کے اسلامی ضابطہ کا بھی یہی حال ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب کے نام سے نہ سہی قانون و آئین کے عنوان سے آج دنیا کی اکثر حکومتون کی بنیاد مین وہی چیزین نظر آتی ہین جن کا مطالبہ مسلمان حکمرانون سے اسلام نے کیا ہے، موروثی طور پر قومون مین یہ باتین منتقل چلی آرہی ہین، انسانی جان و مال عزت و آبرو کے احترام کا کون منکر ہے، ظلم و تعدی استحصال، بے جا لوٹ کھسوٹ کو دنیا کی کون سی حکومت جائز رکھتی ہے، گویا غیر شعوری طور پر آج بھی حکومتون

کی ایک مستقل قسم "اسلامی سفر" کی اصطلاح نہیں بنائی گئی،

ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ حاکمانہ اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کو بھی اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ضابطہ ضرور دیا ہے، لیکن جیسے قصر صلوٰۃ یا تاخیر صوم وغیرہ دینی مسائل کے جاننے والوں کے لئے سفر کے تمام مشکلات حل نہیں ہو جاتے، بلکہ ابتدائے سفر سے آخر تک ہر ہر قدم پر عقل و تجربہ، ضرورت وغیرہ کے لحاظ سے ہزاروں فیصلے کرنے پڑتے ہیں، اور عقل و تجربہ وغیرہ کی روشنی میں کئے ہوئے ان فیصلوں کی وجہ سے اس مسافر کا سفر جس نے "اسلامی مطالبات" کی تعمیل میں اپنے پورے سفر میں کوتاہی نہ کی ہو جیسے اس مسافر کے سفر کو نہ غیر اسلامی کہا جا سکتا ہے، اور محض اس لئے کہ دوران سفر میں وہ نماز دن میں قصر کرتا رہا، یا روزے میں تاخیر سے کام لیا، یہ یا اسی قسم کے چند گنی چنی چیزوں کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم اسلامی سفر نکالی گئی،

اسی طرح کسی علاقہ میں حکمرانی کا اقتدار جن مسلمانوں کے ہاتھوں میں آجائے، اور جن مطالبات کی تکمیل کے ذمہ دار مسلمان حکمران ٹھہرائے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ محض ان ذمہ داریوں کی تکمیل بھی اگر حکمرانی کے لئے کافی نہ ہو، تو یقیناً یہ اسلامی تعلیم کا نقص نہ ہوگا، اور مکان و زمان، حالات و ماحول وغیرہ خصوصیات کی وجہ سے حکمرانی کے سلسلہ میں ان مسلمانوں کو عقل و تجربہ کی راہوں سے جن چیزوں کو اختیار کرنا پڑے، ان کی وجہ سے وہ بیچارے اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کے طریقہ حکومت کو غیر اسلامی طریقہ حکومت قرار دیا جائے، اور جیسے یہ فتویٰ لگانا ان پر درست نہ ہوگا، اسی طرح میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ایسی حکومت جس میں زیادہ تر عقل و تجربہ کی روشنی میں نظر آنے والے حقائق ضرورۃً اختیار بھی کئے جاتے ہوں، اور چھوڑے بھی جاتے ہوں، اور ان ہی عقلی و تجربی عناصر سے حکومت کی مشینری بھری ہوئی ہو، اگر ان ہی کے ساتھ ان معدودے چند اسلامی ضوابط کو بھی اس میں شریک کر لیا جائے، جن کی تعمیل کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے کیا گیا ہے، جیسے مسافر اپنے سفر کے عقلی

کہ اس کی تراش کیا ہو، سلائی کیسے کی جائے، کیسے پہنا جائے؟ کیا کسی زمانہ مین لوگون نے ان سوالون کو اٹھایا؟ عام طریقہ اب تک یہی ہو تا رہا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ مین بھی مسلمانون کو اسلام نے جن حدود مین رہنے کا حکم دیا ہے، بس ان حدود کو تو دیکھ لیا جاتا ہے، ان حدود کے اندر رہنے والے اپنے دین کے پابند مسلمان سمجھے جاتے ہین، اور ان حدود سے تجاوز کرنے والون کو سمجھا جاتا ہے کہ اپنے دین کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہین،

پھر فرض و واجب، سنت و مستحب اولیٰ، یا حرمت و کراہت تحریمی و تنزیہی، خلاف اولیٰ وغیرہ ہونے کے حساب سے مطالبہ کی جو نوعیت ہوتی ہے، اسی کے اعتبار سے "خلاف ورزی" کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے یعنی کبیرہ گناہ کا مرتکب حدود سے تجاوز کرنے والا ہے، یا صغیرہ کا، یا صرف قابل ملامت ہے، بہرحال اتنا دیکھ لینے کے بعد اس خاص شعبہ کے جن دوسرے پہلوؤن کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کسی قسم کی تصریح نہین کی گئی ہے، بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنی اپنی ضرورتون اپنے اپنے حالات، اور دوسرے اقتضاؤن کی بنیاد پر عقل و تجربہ عمل کی جو راہ پیش کرے، اسے مسلمان اختیار کرین، اصطلاحاً انہی کو "مباحات" کہتے ہین، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سفر ہی کو لیجئے، جب پیش آتا ہے تو چند خاص باتون کے سوا ہر مسلمان کو اپنے سفر کے تمام پہلوؤن کے متعلق آزادی عطا کی گئی ہے کہ مصلحت کے مطابق جو کچھ اسکی سمجھ مین آئے اختیار کرے،

ظاہر ہے کہ کسی خاص مقام مثلاً لکھنؤ سے دلی تک ایک ہی سفر کوئی کرے، اور سفر کے سارے اسلامی مطالبات کی تکمیل اس مین کی جائے، پھر بھی اس مسافر کا یہ خاص سفر جن بے شمار امور پر مشتمل ہوگا، ان مین ایسی چیزین جن کو ہم اسلامی مطالبات کہہ سکتے ہین، ان امور کے معاملہ مین جن کا "مباحات" سے تعلق ہے، شاید آٹے مین نمک سے زیادہ اُن کی حیثیت نہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ گو سفر مین بھی آدمی کو دین کے بعض مشورون کو شریک کرنا پڑتا ہے، مگر محض اس کی وجہ سے سفر کی

الٰہی حکومت غیر الٰہی حکومت یا اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومت، حکومتون کے نام رکھنے کی یہ رسم شاید نئی رسم ہے، یا کچھ تعجب نہین کہ کلیسا اور پوپیت کی تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ نکل آئے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پینے والون کی خصوصیت کی وجہ سے چا یا پانی کا نام اسلامی چا، یا اسلامی پانی" لوگون نے جیسے رکھدیا تھا، کچھ یہی حال حکومتون کے ان نامون کا بھی ہو، اور کیا تعجب ہو کہ آیندہ بجائے اسلامی کے چا اور پانی کا نام بھی "الٰہی چا" اور "الٰہی پانی" رکھدیا جائے، اور توجیہ یہی کی جائے کہ اسلام کے ماننے والون کے ساتھ چونکہ یہ چا اور پانی مخصوص ہے، اور اسلام اللہ کا عطا کیا ہوا دین ہے، اس لئے اس چا اور پانی کا نام الٰہی چا، اور "الٰہی پانی" رکھدیا گیا،

بہرحال بات ذرا طویل ہوگئی، ورنہ کہنے کی بات صرف اسی قدر ہے کہ آیندہ جو کچھ بھی عرض کرنا چاہتا ہون، میرے سامنے یہ مشکل تھی کہ "اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت" وغیرہ الفاظ جن کا چرچا سیاست کے اس عہد مین پھیلا ہوا ہے، اور جس قسم کے توقعات ان نامون کے ساتھ قائم کرلئے گئے ہین، یا قائم کرا دئیے گئے ہین، توقعات کے اس معیار پر وہ ساری حکومتین پوری اترین گی جن کے رقبۂ حکومت مین رہنے والی غیر مسلم قومون کا اجمالی تذکرہ یہان مقصود ہے،

اتنی بات مین جانتا ہون کہ حکمرانون کا یہ گروہ مسلمان تھا، اور ان مین اگر سب نہین، تو ذاتی حیثیت سے خواہ وہ کچھ بھی ہون، لیکن حکمرانی کے سلسلہ مین ایسے ہی تھے جن کے طریقۂ عمل سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجموعہ شریعت تھا جس کی تعمیل و نفاذ کا کام مسلمان حکمرانون کے ذمہ اسلام کی طرف سے سپرد کیا گیا ہے، فقہائے اسلام نے دین اسلام کے اساسی سرچشمون سے جن اجتہادی نتائج کو پیدا کیا تھا، عموماً ان ہی کے مطابق شخصی خصومات، رفع نزاع کا کام آخر وقت تک انجام پاتا رہا، اور اسی کے ساتھ اپنے اپنے زمانہ اور اپنے اپنے ملک کے خصوصی حالات کی بنیاد پر ہر زمانہ مین عقل و تجربہ سے ہمیشہ کام لیا گیا، یہی اُن کی حکمرانیون کا عام طریقہ تھا، اب چاہئے کہ اسلامی یا الٰہی حکومت کے معیا

و تجربی عناصر کے ساتھ ان چند باتون کا بھی پابند ہو جن کا حکم دین مین مسلمان مسافرون کو دیا گیا ہے، تو مسلمان حکمرانون کے محض اس طرزِ عمل سے یعنی حکمرانی کے ان محدود سے چند ضوابط کو اپنے طریقۂ حکمرانی مین شریک کر لینے کی وجہ سے ایسی حکومت کو اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت کہنے کی وجہ بظاہر ضرورت نہین معلوم ہوتی، اور آج تک مسلمانون کی حکومت جہان کہین قائم ہوئی، جہانتک مین جانتا ہون اس کو "اسلامی حکومت" یا "الٰہی حکومت" وغیرہ نامون سے شاید کبھی موسوم نہین کیا گیا، یہ نام نہ عہد خلافتِ راشدہ مین حکومت کا ہم پاتے ہین، اور نہ اس کے بعد قائم ہونے والی حکومتون کو یہ نام کسی زمانہ مین دیا گیا، حکومت بنی امیہ، حکومتِ عباسیہ، حکومتِ غزنویہ، غوریہ، مغلیہ، عثمانیہ، اس قسم کے نام تو سننے مین آتے ہین، لیکن ان مسلمان حکمرانون نے کسی زمانہ مین اپنی حکومت کا نام "حکومتِ اسلامیہ" یا "حکومتِ الٰہیہ" رکھا ہو، کم از کم فقیر اس سے قطعاً ناواقف ہے،

بلکہ جہان تک میرا خیال ہے کلیسا کے نام سے "پوپ" کے ہاتھ مین حکمرانی کا اقتدار آہستہ آہستہ جب منتقل ہوا، اور یورپ کے عام حکمرانون پر برتری حاصل کرنے کے لئے دین کی پشت پناہی کی ضرورت پوپون نے محسوس کی، تو شاید دنیا مین یہ پہلی بدعت انھون نے قائم کی، کہ عام حکمرانون کی حکومت کے مقابلہ مین "دینی حکومت" یا "عیسائی حکومت" یا "کلیسائی حکومت" وغیرہ نام اپنی حکومت کو دیا، پھر جب کلیسا کے خلاف یورپ مین ردِ عمل ہوا، تو "کلیسائی حکومت" کے مقابلہ مین ضرورت پڑی کہ تمیز کے لئے "سکولر حکومت" یا "لادینی حکومت" ان حکومتون کا نام رکھا جائے، جو "پوپ" کے سیاسی اقتدار کو توڑ کے پھوڑ اور ان کو توڑ کر قائم ہوئی تھین،

بہرحال جیسے سفر یا لباس یا اسی قسم کی ہر وہ چیز جس کے متعلق مسلمانون کو مذہب کی طرف سے کچھ احکام و ضوابط عطا کئے گئے ہین اُن کی تعمیل کی وجہ سے الٰہی سفر، غیر الٰہی سفر، یا اسلامی سفر، غیر اسلامی سفر، الٰہی لباس، غیر الٰہی لباس، اسلامی لباس، غیر اسلامی لباس وغیرہ قسمین کچھ ان سنی اور انجانی باتین مجھ کو خیال میں گذرتا کہ

سال سے زیادہ طویل مدت جس مین دنیا کے مختلف حصون مین مسلمانون کی حکومتین قائم ہوتی رہی ہین، کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اس لئے قتل کردیا ہو کہ وہ مسلمان نہین ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کردے،

شاید نصف صدی سے مسلمانون کی تاریخ کا مطالعہ کررہا ہون لیکن میرے حافظہ مین ایسی کوئی شہادت محفوظ نہین ہے، جس کی روشنی مین اس سوال کا جواب اثبات مین دیا جاسکتا ہو ممکن ہو کہ پہلے اس سوال کی طرف توجہ نہ ہو، مگر جب سے اس کا خیال آیا ہے کتابین پڑھتا رہتا ہون لیکن کوئی تائیدی شہادت کم از کم اس وقت تک تو مجھے نہین ملی ہے، حالانکہ مسلمانون کی یہ حکومتین مشرق مین بھی قائم ہوئی ہین، اور مغرب مین بھی، اقتدار کی باگ کبھی اچھی فطرت کے لوگون کے قبضہ مین رہی تو ان ہی مین بعض غیر معتدل دل و دماغ بھی تھے، اور کیسے غیر معتدل؟

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ مین اگر کبھی کوئی چیز ہزارہا ہزار صفحات کے الٹ پھیر کے بعد ملتی بھی ہے تو وہی ہو کہ فوری محرکات نے غیظ و غضب کے جذبہ مین مغلوب کرکے بعض ناکردنی اقدامات کا ارادہ حکمرانون مین سے کسی کے اندر پیدا کیا، مگر یہ ارادہ کبھی پورا ہوا؟ میرے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہے کہ کبھی پورا نہین ہوا سب سے بڑی روک اس قسم کے فاسد ارادون کی تکمیل مین بسا اوقات خود اسلام بن گیا، معارف کے ناظرین کو شاید یاد ہوگا کچھ دن پہلے مسلمانون کی طرف سے معذرت کے وجوہ پیش کرتے ہوئے خاکسار نے ایک طویل مضمون اسی مجلہ مین شائع کرایا تھا، اس مین ان نہ پورے ہونے والے فاسد ارادون کی کچھ تاریخی مثالون کا تذکرہ کیا گیا تھا، ترکی کے بعض سلاطین کے ساتھ ہندوستان کے بعض حکمرانون کا بھی نام لیا گیا تھا، عرض کیا گیا تھا کہ اسی ہندوستان مین سکندر لودی نے کورکشیستر کی تیرتھ گاہ کے بعض رسوم مین دخل اندازی کا ارادہ کیا تھا، لیکن دربار کے ایک عالم نے بادشاہ کو اسی وقت ٹوکتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس سلسلہ مین کچھ نہین کرسکتے، لودی نے

پر وہ پوری اتر تی ہون یا نہ اتر تی ہون،

اسی جھگڑے سے بچنے کے لئے مین نے بجائے اسلامی حکومت کے مسلمانون کی حکومت کے عنوان کو قصداً اختیار کیا ہے، جیسے عام مسلمانون مین اچھے برے مذہبی مطالبات کی تکمیل مین کامیاب و ناکام سب ہی طرح کے لوگ ہین، وہ بھی تھے، اس وقت میرے سامنے اُن کی حکومت کا صرف ایک پہلو ہے یعنی غیر مسلم اقوام کا مقام اور اُن کی عام حالت ان مسلمان حکمرانون کی مملکتون مین کیا تھی ؟

(۲)

واقعہ یہ ہے کہ جنگ وجدال لڑائی بھڑائی جس وقت تک ہوتی رہتی تھی، اس کی نوعیت اس زمانہ سے بالکل مختلف تھی، جب کسی علاقہ مین حکومت قائم ہو جاتی تھی،

اگرچہ جنگ وجدال کے وقت کے قصون کے متعلق بھی بہت زیادہ غلط فہمیان پھیلی ہوئی ہین، اور کیسی غلط فہمیان ؟ عہد نبوت کی جنگی مہمون ہی کے متعلق سوچئے عوام کے تاثرات ان کے متعلق کیا ہین ؟ ان عوامی تاثرات کا مقابلہ ذرا اس واقعہ سے کیجئے کہ دس سال کی طویل مدت جس مین یہ معرکے وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے، ان مین قریش، عرب کے عام قبائل، نیز یہودیون اور عیسائیون سب ہی سے مقابلے ہوئے، اگر جانتے ہین، ان مختلف اقوام کی دس سالہ آویزشون کے متعلق کام آنے والون یعنی قتل ہونے والون کی تعداد بمشکل پانسو سے ہزار تک پہنچ سکتی ہے، ان مین عرب و یہود و عیسائی اور مسلمان الغرض جنگ کے ہر فریق کے مقتولون کی تعداد شریک ہے[1]،

خیر لڑائی بھڑائی کا قصہ تو الگ ہے، بحث اس وقت قیام امن وامان کے بعد اس زمانہ کے متعلق ہے، جب باضابطہ حکومت کسی علاقہ مین قائم ہو گئی، مین دنیا کے مورخون کو چیلنج کرتا ہون کہ ہزار

---

[1] تفصیل کے لئے منجملہ اور کتابون کے خاکسار کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جا سکتی ہے، جس مین عہد نبوت مین کام آنے والون کی فہرست بھی شریک ہے، ۱۲

کسی فوری جذبہ کے تحت قانون کے حدود سے نکلنے کا کبھی ارادہ کیا، اس سلسلہ مین ہندوستان ہی کی تاریخ کی ایک دلچسپ مثال دیجی ہے، جس کا تذکرہ برنی نے تاریخ فیروز شاہی مین کیا ہے،

جلال الدین خلجی جو خلجی خاندان کا پہلا حکمران تھا، تقدیر نے اس ترک سپاہی کو خود تخت دیا اور دلی کے تخت پر قابض ہوکر سارے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا، غوریون سے تعلق رکھنے والے حکمرانون کی حکومت پر سو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا کہ جلال الدین نے خلجی خاندان مین حکومت منتقل کردی، اس ایک صدی سے زیادہ مدت مین ہندوستان کے عام غیر مسلم باشندے جس قسم کی زندگی گذار رہے تھے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن اپنے درباریون سے کہا گیا کہ جلال الدین کہہ رہا [illegible]

ہر روز ہندوان، مندل زنان و بوق زنان در زیر کوشک می گذرند، و در جون می آیند و بت پرستی می کنند و در دار الملک باہزار نازو کرشمہ و با ثروت نعمت زیند، تلذذ ہا و تنعمہا گیرند، و در میان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند، و آشکارا و کشادہ بت پرستیہا می کنند، و طبل زنان احکام کفر و شرک را رواج می دہند،

(جلد اص ۲۱۷)

ہندو روزانہ جھانجھ بجاتے ہوے اور نرسنگھا پھونکتے ہوے کوشک (شاہی محل) کے نیچے سے گذرتے ہین، اور جمنا گھاٹ پر پہونچ کر پوجا پاٹ کرتے ہین، اور دار السلطنت مین ہزارون ناز و کرشمہ اور دولت و ثروت کے ساتھ زندگی گذارتے ہین اور ان سے لذت گیر ہوتے ہوے فرے کررہے ہین، اور مسلمانون کے درمیان عزت و فخر و سربلندی کیساتھ رہتے ہین اور کھلے بندون علانیہ بتون کی پوجا پاٹ کرتے ہین، اور ڈھول

غضبناک ہوکر تلوار کھینچ لی، اور غریب مولوی کو دھمکاتے ہوئے کہنے لگا کہ تم کفر کی پشت پناہی کرتے ہو
مولوی نے جواب میں جو کچھ کہا تھا، اس کا حاصل یہی تھا کہ میں پشت پناہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ
ان کا پشت پناہ تو خود اسلام ہے، اسی مقالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت
کی اس آخری وصیت کا بھی ذکر کیا گیا تھا جس میں ان غیر مسلم باشندوں کی جو مسلمانوں کی حکومت
میں آباد ہوں، ذمہ داری لیتے ہوئے تاکید فرمائی گئی تھی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے، ارشاد
فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن میں خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں حجیج بن کر کھڑا ہوں گا،
یعنی ذمت کی طرف سے ان حکمرانوں پر دربار الٰہی میں دعوی دائر ہوگا جن سے اس وصیت کی تعمیل
میں کوتاہی ہوگی،

ان ہی پیغمبرانہ شدید تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ عموماً اپنے زمانہ میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ
ہمیں منع کیا گیا ہے کہ

ان اصیب من معاهد ابرة
(جلد ۳ ص۲۹ اسد الغابہ)

معاہد یعنی (مسلمانوں کے قلمرو کے غیر مسلم) سے ایک سوئی بھی لیں،

مسلمانوں کو صحابہ ہی کی طرف سے یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ

اذا اخفرت الذمة اديل العدو
(جلد ۴ ص۲۳۳ اسد الغابہ)

ذمہ جب توڑا جائے (یعنی غیر مسلم رعایا جن کی حکومت نے ذمہ داری لی، اور ان کی ذمہ داری کو پورا نہ کرے گی) تو دشمن کو پلٹا دیا جائے گا، (یعنی مسلمانوں سے حکومت چھن جائے گی)

خلاصہ یہ ہے کہ بار بار اسی قسم کے بیسیوں الٰہی وثائق نے ان حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ لیا جنھوں نے

دستور اس ترک جوشیلے سپاہی کے لیے کچھ باعثِ گرانی ہوا اور گو برنی نے تصریح نہیں کی ہے لیکن ممکن ہے کہ کسی غلط اقدام کا کچھ وسوسہ بھی اس کے دل میں ابھرا ہو لیکن حسرت و یاس کے ان الفاظ میں:-

خاک بر سر ما وخاک بر بادشاہی و دین پناہی ما (ص ۲۱۷)

کے ساتھ ان وسوسوں پر خاک ڈالنے کے سوا اور بھی اُس نے کچھ کیا یا کر سکتا تھا اس کا جواب آپ کو تاریخ دے گی، کم از کم میں تو نہیں جانتا کہ غوریوں کے زمانہ سے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو دستور چلا آرہا تھا، اس میں کسی قسم کا رد و بدل کسی زمانہ میں کیا گیا ہو، کچھ بھی نہ ہوتا، تو صرف ایک یہی شاہی شہادت ان بے بنیاد افواہوں کو باد رہوا بنا دینے کے لئے کافی ہے جو زبانوں سے تو نکلتی ہیں لیکن اُن کی تائید میں کوئی شاہی بیان تو بڑی چیز ہے کسی معتبر مورخ کی ایسی کوئی شہادت بھی پیش نہیں ہوسکتی جس سے معلوم ہو کہ ہندوستان کے دور دراز مضافاتی و مفصلاتی مقامات ہی میں نہیں، بلکہ خاص دارالسلطنت میں شاہی محل سرا کے نیچے سے روزانہ پوجا پاٹ کے لئے نرسنگھا پھونکتے، ڈھول بجاتے، جمنا گھاٹ پر آتے جاتے دیکھنے کا جلال الدین جو عادی تھا، اور اس دارالسلطنت کے شہر میں مسلمانوں کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی کی تمام نعمتوں سے لذت اندوز ہوتے ہوئے جن لوگوں کو وہ پاتا تھا حکومت نے کسی جگہ کسی زمانہ میں میں کسی قسم کی عملی مداخلت ان کے اس طرز عمل میں کبھی کی ہو، خود تراشیدہ افسانوں میں نہیں، بلکہ تاریخی وثائق کی روشنی میں انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے؟ مگر جس دنیا میں "دیوانہ گفت ابلہ باور کرد" کا دور دورہ ہو، وہاں سنجیدگی کے ساتھ حقائق و واقعات کی جستجو کی توفیق لوگوں کو کیوں ہونے لگی ؟

بہرکیف درد کا یہ افسانہ تو بہت طویل ہے، اور اپنے گذشتہ مقالہ میں اس مسئلہ کے متعلق جو

سو سال سے زیادہ زمانہ کے اس عام دستور کے ذکر سے جلال الدین کی غرض کیا تھی، اگرچہ صراحۃً برنی نے اس کا تذکرہ نہین کیا ہے، مگر قرینۂ حال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے، اس کا تذکرہ تو ابھی آپ سنین گے، مگر قطع نظر اس سے میرے خیال مین غوریون کے عہد کے متعلق یہ ایک شاہی شہادت ہے جس سے اندازہ کیا سکتا ہے کہ تسلط تام اور کامل قبضہ کے بعد غوری بادشاہون نے یعنی غوری خاندان کے غلام بادشاہون نے اس ملک کے غیر مسلم باشندون کو کس حال مین رکھا،

"درمیان اہلِ اسلام مباہی و مفاخر باشند"

کے فارسی فقرے کا ٹھیک ترجمہ جیسا کہ چاہئے اردو مین ادا نہ ہو سکا مطلب اس کا یہی ہے کہ مسلمانون کے مقابلہ مین کسی قسم کی کمتری کے احساس کا موقع بھی جیسا کہ ان فقرون سے معلوم ہوتا ہے اس ملک کے غیر مسلم باشندون کو نہین دیا جاتا تھا، بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ ان کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے،

آج "سیکولر حکومت" کا دنیا مین بہت چرچا ہے لیکن مذکورۂ بالا شاہی شہادت کے روسے غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک کے جس بلند معیار کو واقعہ کے قالب مین اسی ہندوستان کے آسمان اور اسی کی زمین نے دیکھا تھا، کیا "سیکولر حکومت" اسی معیار کو پھر اس ہندوستان مین قائم کرنے مین کامیاب ہوگی ؟ توقع تو اسی کی کرنی چاہئے، خدا کرے کہ طبعی حکومت کا مطلب لوگون کی سمجھ مین آجائے، یعنی حکومت کا وہی نظام جس مین ہر بڈھی کا بال بھی محفوظ ہو خواہ اس کا تعلق اکثریت سے ہو، یا اقلیت سے،

مین یہ کہہ رہا تھا کہ اس ترک سپاہی کی جو ادنی درجہ کی ملازمتون سے ترقی کرتے ہوئے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تھا، اس کی غرض اپنے اس بیان سے کیا تھی ؟ برنی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی بادشاہی کے نشۂ اقتدار پر غوری سلاطین کا یہ قدیم

کے کم از بز و کم از بز غالہ ام کہ نہ باشد حارس از دنبالم

پھر تیر کا نشانہ و جن کی ایمانی بصیرتون پر چڑھا ہوا ہے، ان کو چونکاتے ہوئے فرماتے ہین [۱]

حارسے دارم کہ ملکش می سزد داند آن بادے کہ برمن می وزد

سرد بود آن باد یا گرم آن علیم نیست غافل نیست غائب اے سقیم

اور یہی مسلمانون کو سمجھایا بھی گیا تھا، زندان مصر مین قیدیون کو تلقین فرماتے ہوئے سیدنا یوسف علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ

مَا كَانَ لَنَا اَنْ نُشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

میرے لئے کسی طرح یہ روا نہین رکھا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی ہم شریک اور ساجھی بنائین، یہ اللہ

---

[۱] مثنوی شریف کے مندرجہ اشعار اگرچہ صاف اور سیدھے ہین، مگر فارسی سے ناواقفیت بتدریج اس حد تک پہنچ چکی ہے، کہ شاید بہت سے لوگون کی سمجھ مین نہ آئین، اس لئے خلاصہ ان کا درج کر دیا جاتا ہے، دیکھنے والون کو خطاب کر کے مولانا نے فرمایا ہے کہ

"یہ دیکھ کر کہ جیسے بکری کے بچے کا چرواہا نظر نہ آرہا ہو تم نے اسی حال مین مجھے پاکر یہ خیال کر لیا ہو کہ میرا کوئی محافظ اور نگہبان نہین ہے، ہرن کو تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا چرواہا تو کوئی نہین ہے، تم نے یہ سمجھ لیا کہ مفت یہ قیدی ہاتھ آ جائے گا، مگر یاد رکھو! کہ تمھین نظر آئے یا نہ نظر آئے بہرحال مینڈھے اور بکری کے بچون سے ہم کم نہین ہین، یعنی جیسے ان جانورون کے پیچھے پیچھے بہرحال چرواہا اور رکھوالا بھی ہوتا ہے، ہم بھی ایک رکھوالا اور اپنا پاسبان رکھتے ہین، یہ پاسبان ہمارا وہی ہے جسے صحیح معنون مین دنیا کی بادشاہت سزاوار ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے یعنی کہ اس ہوا کو بھی جو ہم پر چل رہی ہے جانتا ہے کہ وہ گرم ہے یا سرد، پس یاد رکھو کہ ہمارا یہ نگہبان نہ غافل ہے اور نہ غائب ہے، ہان تمہاری کج نظری کی وجہ سے تمھاری ایمانی بینائی کو وہ نظر نہین آرہا ہے، تم بیمار ہو،

کافی چیزون کا تذکرہ کر چکا ہے،

اب مین اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہون، میرا مطلب یہ ہو کہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کرون جن مین مسلمانون کی حکومت مین رہنے والی غیرمسلم قومون کے مختلف طبقات، اور جس طرح اس حکومت کے زیر اثر علاقون مین وہ زندگی بسر کر رہے تھے، اس کے متعلق ان تاریخی شہادتون کو درج کرون جو کتابون مین بکھری ہوئی ہین،

اس سلسلہ مین پہلی قسط ان لوگون کے حالات پر مشتمل ہوگی جنھون نے طبابت، علاج و معالجہ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا، ان کے بعد خیال ہے کہ تجارتی کاروبار کرنے والون کا ذکر کیا جائے، اسی طرح زندگی کے مختلف شعبون مین شہرت پانے والون کے حالات اگر وقت مین گنجایش نکلی تو آپ کے سامنے ان شاء اللہ آتے رہین گے،

قطع نظر ایک علمی خدمت کے ایک غرض مضمون نگار کی یہ بھی ہے کہ غیرمسلم اقوام کے ساتھ مسلمانون کی حکومتون اور ان کے حکمرانون کے طرز عمل کے متعلق جو عام غلط فہمیان پھیلی ہوئی ہین، ان کا بھی ازالہ ان شاء اللہ ان شہادتون سے ہو سکتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہو کہ زمین کے جن علاقون پر سیاسی اقتدار سے آج مسلمان محروم ہین، ان کی سمجھ مین نہین آ رہا ہے کہ اب ان کے جینے کی کیا صورت ہوگی، طرح طرح کے وسوسون مین یہ لوگ مبتلا ہین، دہشت کا نتیجہ ہے کہ جن مسلمانون یا ان کے نمایندون کے دل و دماغ ماؤف ہین، وہ بھی مستقبل کی ہیبتناک تصویرین ان کے سامنے کھینچ کھینچ کر گویا کچھ ایسا باور کرا رہے ہین، کہ سیاسی اقتدار کے بغیر کوئی قوم ہی زندہ رہ سکتی ہے؟ ورنہ کسی قوم کے افراد عارف رومی نے شاید اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والون کو خطاب کرکے فرمایا تھا کہ

تو مرا چون برہ دیدی بے شبان | تو گمان بردی کہ نبود پاسبان

بے شبان دانستہ اند آن تعمی را | رائگان دانستہ اند آن بیکی را

از خدا خواہم روز غیرنہ خواہم بخدا — کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر ست

تو اس کے سوا اپنا احساس آخر اور کیا بتائے،

پس مقصد یہی ہے کہ اپنے اندر کو تو چاہئیے کہ قرآن کی اس بخشی ہوئی ٹھنڈی اور خنک روشنی سے مسلمان جگمگاتا رکھیں اضطراب بھی پیدا ہوگا، عقلی اندیشے بھیانک شکلوں میں سامنے آ آکر اس روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف بھی ڈھکیلیں گے، لیکن محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے علم و یقین کا قطعی ذریعہ ایسا قطعی ذریعہ کہ احساس و علم کے دوسرے سارے ذرائع اس کے مقابلہ میں متہم ہو سکتے ہیں، جو قرآن کی اس روشنی میں گھومتا، اور اسی میں تہ و بالا ہوتا رہے گا وہ پائے گا کہ اس سے پیدا ہونے والی ٹھنڈک بھی اس کی روح اور قلب کی رگ رگ ریشہ ریشہ میں پیوست ہے،

"اندر" کو اس حال سے معمور رکھتے ہوئے اپنے باہر کو چاہئیے کہ

لیس للانسان الا ما سعیٰ، — نہیں ہے آدمی کے لئے مگر وہی جو اس نے کوشش کی،

یا للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن — جو کچھ مردوں نے کمایا اس سے اُن کو حصہ ملتا ہے، اور جو کچھ عورتوں نے کمایا اس سے اُن کو حصہ ملتا ہے،

یہ یا اسی قسم کی دوسری "قرآنی مسلمات" کے مطابق سرگرم عمل ہو جائیں، جن واقعات اور سرگذشتوں کا ذکر آیندہ آپ سنیں گے، ان میں آپ کو مسلسل ملتا چلا جائے گا کہ حکمرانی کے اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود اپنی محنت، محنت سے حاصل کئے ہوئے کمالات اور اپنے اخلاص و صداقت وغیرہ صفات کی مدد سے کتنے چھوٹے مسلسل بڑے بنتے چلے گئے، نہ صرف عوام بلکہ حکومت میں بھی تا

لا یشکرون، (یوسف)

کا فضل ہے ہم پر بھی، اور سارے انسانوں پر، مگر بہت سے لوگ (اس فضل اور مہربانی) کا گن نہیں گاتے،

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ پیدا کر کے ہمارے پیدا کرنے والے خالق قدیر نے دوسروں کے بھروسہ پر سر مارنے کے لئے ہمیں نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کی کفالت ہر بندہ کی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، ضرورتوں کا محتاج بنا کر اس نے ہمیں ضرور پیدا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ کرم اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ ہماری اس محتاجی کا تعلق بجز اپنی ذات کے اور کسی کے ساتھ قطعاً نہیں رکھا ہے، ہم محتاج ضرور ہیں، لیکن اسی ایک پیدا کرنے والے خالق کے جو ہمارا ذو القوۃ المتین رزاق ہے، اس ایک کے محتاج بن کر ہر ایک کی محتاجی کی ذلت و رسوائی اور دربدر مارے پھرنے کی دردسری سے آزاد ہیں، یہی اللہ کا وہ فضل ہے، جس کا گن ناشکرا انسان بہت کم گاتا ہے، اسی ناشکری کا نتیجہ ہے کہ اس ایک کی محتاجی سے لاپروائی اختیار کرنے والے ہر ایک کی محتاجی کا طوق گلے میں ڈالے مارے مارے پھرتے ہیں، فضل و کرم کی مذکورۂ بالا عجیب و غریب حقیقت کو وا شگاف کرنے کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ

ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار،

کیا بہت سے متفرق طرح طرح کے پروردگاروں کا ہونا بہتر ہے، یا جو ایک سب پر غالب و قاہر اللہ ہے، اسکی پروردگاری بہتر ہے،

جس یقین اور یقین کی روشنی کو ایمانی وجدان ان قرآنی آیتوں میں پا رہا ہے، اس کے بعد خود ہی سوچئے کہ کہنے والے نے اگر یہ کہا کہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے زمانہ مین

فنونِ جنگ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۴)

تیراندازی | توپ و تفنگ کے ساتھ تیرون کے ذریعہ سے بھی غنیم کے لشکر مین رخنہ اندازی اور سراسیمگی پیدا کیجاتی، بابر پانی پت کی جنگ کا حال خود لکھتا ہے،

"ہماری فوج مین غنیم کی آمد اور انتظام کی ترکیب دیکھ کر ذرا کھلبلی مچی کہ ٹھہرین یا نہ ٹھہرین، مقابلہ کرین یا نہ کرین، موقع کی بات کرنی چاہئے ایسون سے مقابلہ ہے، جو بے توقف چلے آتے ہین، مین نے حکم دیا کہ تولقمہ والے غنیم کے دست راست اور دست چپ سے پھر کر تیر مارنے شروع کرین، اور لڑائی مین مشغول ہون، برانغار کبھی جا پہنچے، تولقمہ والے غنیم کے پیچھے سے پلٹ کر تیرون کا مینہ برسانے لگے، جرانغار مین سے مہدی خواجہ سب سے آگے پہونچا، مہدی خواجہ کے مقابلہ مین کچھ فوج ایک ہاتھی لئے ہوئے آئی، مہدی خواجہ کی جماعت نے تیرون کی بھرمار سے اس فوج کا منہ پھیر دیا، جرانغار کی کمک کے لئے قول مین سے احمدی پروانچی، تردی بیگ، قوچ بیگ اور محمد علی خلیفہ بھیجے گئے، برانغار مین بھی لڑائی شروع ہوگئی، محمدی کوکلتاش، شاہ منصور برلاس

وززن کے حاصل کرنے مین وہ کبھی ناکام نہین ہوئے، یہ قدرت کے مقررہ قوانین ہین، ان قوانین کی پابندی بھی پابندی کے نتائج کو سامنے لائی ہے، اور ان قوانین سے لاپروائی اختیار کرنے والون کو بھی اپنی لاپروائیون کا خمیازہ بہر حال بھگتنا ہی پڑتا ہے، اور قرآنی حقیقت

مَا ظَلَمْنَا هُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، — اور نہین کیا ہم نے ان پر ظلم، بلکہ اپنے آپ پر انھون نے خود ہی ظلم کیا،

کے اقرار پر ہر اس شخص اور قوم کو مجبور ہونا پڑا ہے، جس نے اپنے آپ کو "مظلومیت" کا کبھی شکار پایا ہو،

(باقی)

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ

کا سہ ماہی رسالہ

اُردو

انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ کا سہ ماہی رسالہ اردو جس کے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہین، اپنی روایتی خصوصیت کے ساتھ جناب آل احمد سرور صاحب کی ادارت ونگرانی مین شائع ہو رہا ہے، قیمت سالانہ معہ ڈاک وغیرہ ملاکر دس روپیے، اور ایک پرچے کی قیمت دو روپیے رکھی گئی ہے، انجمن کے دوسرے رسالہ سائنس اور معاشیات کی اشاعت کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے،

انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے، اس وقت ۶ کتابین زیر طبع ہین،

خیر بہوروی

علیگڈھ

جہانگیر کو اپنی حراست میں لے لیا، شاہی جلو کے اکثر امرا، اور لشکر کے افراد جہلم کی دوسری طرف جا چکے تھے، جہانگیر نورجہاں کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا کہ مہابت خاں نے اپنی راجپوت فوجوں کی مدد سے اس کو اپنا قیدی بنا لیا، نورجہاں اپنی دانشمندی اور فراست سے مہابت خاں کی نظر بچا کر دریا کے دوسرے جانب شاہی فوج سے آملی، امرا کو غیرت دلائی، فوجوں سے برہمی ظاہر کی، اور اپنے محبوب شوہر کو قید سے آزاد کرنے کے لئے خود آگے بڑھی، امرا میں سے فدائی خاں مہابت خاں کی حرکت نازیبا سے آزردہ خاطر اور شہنشاہ ہند کی پسپائی پر بے حد خفیف اور شرمندہ ہوا، اور وہ چند سواروں کے ساتھ اپنے آقا کی رہائی کے لئے روانہ ہوا، راجپوتوں نے دریا کے پل میں آگ لگا دی تھی، فدائی خاں نے بڑی دلیری سے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا، اس کے پیچھے اس کے ہمراہی چلے دریا میں بڑا تلاطم تھا، زیادہ سوار غرقاب ہو گئے، اور صرف سات سوار فدائی خاں کے پیچھے ساحل کی طرف بڑھے، راجپوت ساحل پر سے تیروں کی بارش کر رہے تھے، مگر فدائی خاں سر بکف ہو کر کنارے پہنچا، اور سات سواروں کے ساتھ راجپوتوں پر حملہ آور ہوا، مگر وہ جہانگیر کی قیامگاہ تک نہ پہنچ سکا، مجبوراً پھر دریا عبور کر کے دوسری طرف آیا، شاہی فوج نے پایاب راستہ سے دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی، نورجہاں شہریار کی بچی اور اس کی انّکہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر دریا میں داخل ہوئی، اس کی عماری پر، دو ترکش، دو کمان، اور ایک بندوق تھی، شاہی فوج دریا میں تھوڑی دور آگے بڑھی تھی کہ اس میں کئی غار ملے، جس سے فوج کا تسلسل ٹوٹ گیا، اور وہ علٰحدہ علٰحدہ ہو گئی،

مہابت خاں کے راجپوت سپاہیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ساحل پر ہاتھیوں کی قطار کھڑی کر دی، اور تیروں کی بارش شروع کر دی، تفنگ کے گولے اور بان بھی برسانے لگے لیکن پھر بھی نورجہاں کی جان نثار اور جانباز فوج ساحل پر پہنچ گئی، اور تیر و سنان کی جنگ ہونے لگی فریقین کے لشکریوں کے خون سے دریا لالہ زار ہو رہا تھا، اسی دار و گیر میں راجپوت تیراندازوں کا

یونس علی اور صدر اللہ کو حکم دیا کہ قول سے آگے بڑھ کر لڑائی شروع کرو، استاد علی قلی بھی قول کے آگے بڑھکر فیر کرنے لگا، مصطفے توپچی دستِ چپ سے خوب گولے مارنے لگا تو لقمہ والوں نے چارون طرف سے غنیم کو گھیر لیا اور ہنگامہ پیکار گرم کر دیا"[۵۱]

پانی پت کی دوسری جنگ مین بھی اکبری فوج کے تیراندازون نے ہیمو کے لشکر مین غیر معمولی ہولناکی پیدا کر دی تھی، اس سلسلہ مین ابوالفضل کا بیان ہے:-

"وگروہ گروہ فدائیان تیرانداز از اطراف وجوانب برآمدہ دادکارزار می دادند"[۵۲]

ان ہی تیراندازون کا ایک تیر ہیمو کی آنکھ مین آکر لگا، اور اُس کے زخمی ہوتے ہی ہندستان کی تاریخ کا رُخ بدل گیا،

بیرم خان خانان جب ہندوستان کے تخت و تاج کا دعویدار ہو کر اکبر کے خلاف گوناچور (پنجاب) کے میدان مین صف آرا ہوا، تو دونون لشکرون کے درمیان وھان کا ایک کھیت تھا، جس مین کیچڑ کی وجہ سے دلدل ہو گیا تھا، لڑائی شروع ہوئی تو بیرم کے ہاتھی دلدل مین پھنس گئے، بیرم کو اپنے ہاتھیون پر بڑا بھروسہ تھا، ہاتھیون کو دلدل مین پھنستے دیکھ کر اکبر کے تیراندازون نے فائدہ اٹھایا، اور ہاتھیون پر شدت کے ساتھ تیرون کی بوچھار شروع کر دی' ایک تیرانداز نے ہاتھیون کے سرگروہ کے فیلبان پر تاک کر ایک ایسا تیر لگایا کہ وہ لڑھک کر ہاتھی کی گردن مین آکر اٹک گیا، بیرم خان نے اپنے ہاتھیون کی اس طرح پسپائی دیکھی تو دلدل سے بچ کر خشک راستے سے اُن کی مدد کو پہونچنے کی کوشش کی، لیکن شاہی فوج کے سردار آتکہ خان نے دوربینی سے کام لے کر بیرم خان کی کوشش کارگر ہونے نہین دی،[۵۳]

سنہ ۱۰۳۵ھ مین جہانگیر کشمیر سے کابل جارہا تھا، تو جھیلم کو عبور کرتے وقت مہابت خان نے

---

[۵۱] بابر نامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۶ [۵۲] اکبر نامہ جلد دوم صفحہ [۵۳] ایضاً،

مراد کے ہاتھی تک پہنچا، نفرت اور غرور مین بدمست ہو کر چلایا تو دارا کے مقابلہ مین تخت و تاج کی ہوس رکھتا ہے، یہ کہکر اُس نے مراد پر برچھے سے وار کیا، بہادر شہزادہ نے وار بچاکر راجہ کو ایسا تیر لگایا کہ وہ گھوڑے سے گر کر پھر اُٹھ نہ سکا، راجپوت اپنے سوار کو اس طرح مرتے دیکھ کر دیوانہ وار مراد کے ہاتھی پر حملہ آور ہوئے، اُن کے حملہ سے مراد کے چہرہ پر تین کاری زخم لگے، مگر وہ جانبازی اور سرفروشی کے ساتھ لڑتا گیا، اس کے تیرون سے اتنے راجپوت زخمی ہوئے کہ ہاتھی کے اردگرد زمین ارغوانی اور زعفرانی ہو گئی، مراد کا یہ ہودج دودمان تیموری کی شجاعت، جانبازی اور پامردی کی یادگار مین خزانہ عامرہ مین آخر آخر وقت تک محفوظ رہا، فرخ سیر کے زمانہ مین سادات بارہہ نے تیموری خاندان کے افراد پر استیلا اور غلبہ پانے کی کوشش کی، تو فرخ سیر کی بہن نے غصہ مین اُن سے کہا کہ ہم اس خاندان کے افراد ہین جن کی شجاعت کی یادگار یہ مشبک ہودج اب تک محفوظ ہے[1]

باجو کی جنگ مین اعظم شاہ کا سارا جسم تیرون کے زخمون سے خون آلود ہو گیا تھا لیکن اُس نے اپنے زخمون کی پروا مطلق نہ کی، اور بہادری سے لڑتا گیا، یہانتک کہ ایک گولی کے نشانہ سے جان بحق ہوا، اس کے لڑکے بیدار بخت کا بدن بھی تیرون سے چھلنی ہو گیا تھا، مگر اُس نے اپنے ہاتھی کو اس وقت تک نہین چھوڑا جب تک کہ ایک گولی سے اسکا کام بھی تمام نہ ہو گیا، اسی جنگ مین شہزادہ عظیم الشان اپنے باپ بہادر شاہ کی حمایت مین ہاتھی پر بیٹھکر لڑ رہا تھا کہ اعظم شاہ کے دو فوجی سردار خان عالم اور منور خان نے جو صف شکنی کے لئے مشہور تھے، اپنے اپنے ہاتھیون کو عظیم الشان کے ہاتھی کی طرف بڑھایا، خانِ عالم نے تین بار نیزہ سے شہزادہ عظیم الشان پر حملہ کیا، لیکن شہزادہ وار بچاتا رہا۔ اور موقع پاکر اپنے چلہ کمان سے خانِ عالم پر تیر کا ایسا نشانہ لگایا کہ وہ تڑپتا ہوا ہودج مین گر گیا، منور خان اپنے بھائی خان عالم کو ہلاک ہوتے دیکھ کر عظیم الشان پر نیزہ سے حملہ آور ہوا،

---

[1] خافی خان جلد دوم ص ۳۰،

ایک تیر نور جہان کی عماری میں شہریار کی بچی کے بازو میں جا لگا، عماری رنگین ہوگئی لیکن نورجہان نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں کی، بچی کے بازو سے تیر نکال کر زخم کو باندھ دیا، راجپوتوں نے نورجہان کے ہاتھی اور فیلبان کو تلوار اور برچھے سے زخمی کرنے کی کوشش کی، جس سے ہاتھی سراسیمہ ہوکر دریا کی دوسری طرف بھاگا، مگر کچھ فوجی ایسے تھے، جو ساحل پر پہنچ کر تیروں کی ایسی مسلسل بارش کرتے رہے، کہ راجپوت ان کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکے، اسی یورش میں فدائی خان بندگان شاہی کی ایک مخلص جماعت کو لے کر جہانگیر کی قیامگاہ تک پہنچ گیا، سراپردہ کے اندر سوار اور پیادے بھرے ہوئے تھے، اس نے دروازہ پر کھڑے ہوکر اس نے تیراندازی شروع کر دی، اس کے اکثر تیر خلوت خانہ کے صحن میں جہانگیر کے پاس گر رہے تھے، مخلص خان جہانگیر کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنے کو تیر قضا کا سپر بنا لیا، مگر پھر بھی فدائی خان کی شجاعت اور جانبازی جہانگیر کو رہا کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی،[۱]

تیموری شاہزادے یا شاہی فوج کے عہدیدار میدان جنگ میں ہاتھی کے ہودج میں ہوتے تو تیروکمان ہی سے لڑتے، اور تیروں سے زخمی ہوکر میدان جنگ سے منہ موڑنا اپنی حمیت، غیرت اور شجاعت کے خلاف سمجھتے تھے، سموگڈھ کی جنگ میں شاہزادہ مراد نے دارا کے تیراندازوں کا مقابلہ جس ہمت، دلیری، اور پامردی سے کیا تھا، وہ تاریخ ہندوستان کا ایک عجیب وغریب کارنامہ سمجھا جاتا ہے، اس کی عماری پر چار ہزار از یک تیر چلا رہے تھے، ہاتھی کا ہودج تیروں سے چھلنی ہوکر خارپشت (یعنی سیاہی) بن گیا تھا، مگر اس عالم رستخیز میں بھی مراد ہمت واستقلال کا پہاڑ بنا ہوا دشمنوں کے تیروں کا مسلسل جواب دیتا رہا، اس کا فیلبان زخمی ہوکر نیچے گر پڑا، تو اس نے فوراً ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈلوائے، راجپوت مراد کی اس ہمت وپامردی کو دیکھ کر آگے بڑھے، راجہ رام سنگھ راٹھور لڑتا ہوا

---

[۱] اقبال نامہ جہانگیری ص ۲۸۲، ۲۹۰ و مآثر الامرا جلد سوم ص ۵-۱۴۰ خافی خان جلد اول ص ۶۸-۳۹۶،

فوراً ہی ایک دوسرا تیر مارا جس سے عبدالغفار خان زخمی ہوکر دوسری طرف مڑ گیا، اسی اثنا میں سید عبداللہ خان کی مدد کو کمک پہنچ گئی جس کی مدد سے ساداتِ بارہہ نے جہاندار شاہ کے ہاتھی پر تیروں کی اتنی بارش کی کہ ہاتھی خوف زدہ اور سراسیمہ ہوکر اپنے لشکریوں ہی کو پامال کرنے لگا، اس کے بعد جہاندار شاہ کی فوج میدانِ جنگ میں نہ ٹھہر سکی[۵۱]

محمد شاہ نے ساداتِ بارہہ کے خلاف حسن پور کے میدان میں جنگ کی، تو سید عبداللہ خان بڑی دلیری اور شجاعت سے لڑا، اس کے جسم پر آہنی لباس تھا جس کی وجہ سے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا اس کے ہودج پر تیروں کی مسلسل بوچھاریں آرہی تھیں، محمد شاہ خود اس کو اپنے تیروں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا، عبداللہ خان بہادری کے جوش میں شمشیر اور سپر سے پاپیادہ لڑنے کی خاطر ہاتھی سے نیچے اتر آیا، مگر اس نے ہاتھی کا ہودج چھوڑا تو اس کے ہمراہی سمجھے کہ وہ مارا گیا، اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مگر عبداللہ خان کے قدم پیچھے نہیں ہٹے، وہ جانبازی سے لڑتا رہا کہ یکایک کسی تاک کر تیرانداز نے تاک کر اس کی پیشانی پر ایک تیر لگایا، اس تیر کی زد سے وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ کسی نے بڑھ کر شمشیر سے اس کے ہاتھ پر ایک ضرب کاری لگائی جس سے بے بس ہوکر وہ شاہی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا[۵۲]

عام طور سے ازبک[۵۳] اور تورانی تیراندازی میں بڑے مشاق اور ماہر سمجھے جاتے تھے، تورانیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے ہر تیر سے گھوڑے کی پیٹھ اس کے سوار سے خالی کر دیتے تھے، تیروں کا حملہ روکنے میں افغانی امتیازی حیثیت رکھتے تھے، عظیم الشان اور جہاندار شاہ کے درمیان جنگ جانشینی ہوئی تو اول الذکر کے افغانی لشکریوں کے اردگرد تیروں کی جو بارش ہوئی تو مورخوں کا بیان ہے کہ

---

[۵۱] خافی خان جلد دوم ص ۶۸۲، ۶۸۳، مآثر الامراء جلد اول ص ۳۲۳ و جلد سوم ص ۴۴، ۱۳۳، [۵۲] مآثر الامراء جلد سوم ص ۱۳۵-۶ سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۲۱، ۴۲۲ [۵۳] ۱۰۵۶ھ میں بلخ کی مہم میں شاہجہانی فوج پر بارہ ہزار ازبک تیراندازوں نے

شہزادہ نے اس نیزہ کے وار کو بھی رد کیا، پھر یکایک توپ کے ایک گولہ سے منور خان بھی لقمۂ اجل ہو گیا[۵۱]

دکن میں بہادر شاہ اور کام بخش میں جنگ جانشینی ہوئی تو کام بخش تیروں سے ایسا زخمی ہوا کہ اس کے ہاتھی کا ہودج اس کے خون سے گلرنگ ہو گیا، مگر اس حالت میں بھی وہ خود غنیم پر تیر چلاتا رہا، اس کے دو ترکش خالی ہو گئے تو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، اس کا لڑکا محی السنۃ بھی تیروں کی مسلسل بارش سے زخمی ہوا، ہاتھی پر فیلبان اور اس کے ہمراہی مارے گئے، وہ زخمی ہو کر خود نڈھال ہو گیا تھا، مگر اس نے میدان جنگ سے منہ موڑنا گوارا نہیں کیا، فیلبان کے مرنے پر ہاتھی خود ہانکنے لگا لیکن گولیوں کے زخموں سے بیہوش ہو گیا تو ہاتھی ادھر ادھر بہک گیا[۵۲]

۱۱۲۴ھ میں فرخ سیر سادات بارہہ کی مدد سے جہاندار شاہ کے خلاف تخت و تاج کا دعویدار ہوا تو دونوں میں آگرہ کے پاس جنگ ہوئی، اس لڑائی میں فرخ سیر کی حمایت میں سید حسین علی خان اور سید عبد اللہ خان دونوں بھائیوں نے شجاعت و مردانگی کے اعلیٰ جوہر دکھائے، جب گھمسان کی لڑائی ہونے لگی، تو سید حسین علی خان ہاتھی سے نیچے اتر آیا، اور ہاتھ میں تلوار لے کر پیادہ لڑنے لگا، غنیم کے تورانی تیرانداز جگہ کاٹ کر سید حسین علی خان کے پیچھے آ گئے، اور اس کو تیروں سے ایسا زخمی کیا کہ وہ زمین پر گر کر بیہوش ہو گیا، اس کا گرنا تھا کہ سادات بارہہ نے اس کو گھیر لیا، اور اس کے جسم کو مزید گزند سے بچانے کی خاطر خود کٹ کٹ کر مرنے لگے، فوج کے دوسرے حصہ میں سید عبد اللہ خان بھی تورانی تیراندازوں کی تاب نہ لا کر دوسری طرف رخ کرنا چاہتا تھا کہ یکایک جہاندار شاہ کی طرف سے عبد الغفار خان سید عبد اللہ خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا، اور چلّہ کمان سے ایک تیر نکال کر عبد اللہ خان کو نشانہ بنایا، لیکن موخر الذکر نے نہایت سرعت سے اپنی کمان سے ایک تیر ایسا چلایا کہ عبد الغفار خان کا تیر اس سے ٹکرا کر بیچ ہی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، سید عبد اللہ خان نے

---

۵۱ خافی خان جلد دوم ص ۵۹۰، ۵۹۱ وغیرہ ۵۲ ایضاً ص ۶۲۳، ۶۲۵

فوج ان کو طعنہ دیتی تھی کہ وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کے سبب تلواروں سے لڑنے کے بجائے توپوں اور بندوقوں سے جنگ کرنے کے عادی ہیں، اعظم شاہ جاجو کی جنگ میں شریک ہوا تو اپنی بہادری اور شجاعت کے نشہ میں مخمور ہو کر بار بار کہتا کہ توپ و تفنگ تو بازیچہ اطفال ہیں، بہادروں کا ہتھیار تلوار ہے، جنگ کا فیصلہ تلوار ہی سے ہونا چاہئے،

لڑائی جب زور شور کی ہوتی اور بہادر لشکری دلیری اور سرفروشی کے نشہ سے سرشار ہو جاتے تو وہ اپنے ہاتھی اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے نیچے اتر آتے تاکہ یہ بے قابو ہو کر دھوکہ نہ دے سکیں، پھر زمین پر پاؤں جما کر کھڑے ہو جاتے، اپنی پوشاک کے دامن کو سمیٹ کر کمر سے باندھ لیتے، اور ہاتھ میں تلوار لے کر لڑنا شروع کر دیتے، دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی پھرتی سے اپنی تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے، اور اپنی جان کی فکر مطلق نہ کرتے، یہ شجاعت اور بہادری کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی

دھرمادت کی جنگ میں اورنگزیب کے ہراول کی طرف راجپوت بڑھے، تو ذوالفقار خان نے محسوس کیا کہ بڑا نازک موقع آگیا ہے، اور دشمنوں کے یلغار کو روکنے کی ضرورت ہے، وہ اپنے گھوڑے پر سے اتر گیا، اور ہاتھ میں تلوار لے کر تنہا راجپوتوں میں کود پڑا، اور پھر قدم جما کر شجاعت اور جانبازی کا پیکر بن کر لڑا، اس کا جسم متواتر زخموں سے خون آلود ہو گیا، لیکن اس کی سپاہیانہ غیرت اور حمیت نے دشمنوں سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔[۱]

اس واقعہ کو مورخوں نے بڑے آب و تاب سے لکھا ہے، چنانچہ منشی محمد کاظم بن محمد امین عالمگیر نامہ میں لکھتا ہے :-

"ذوالفقار خان بآئین دلاوران ناموس جوئے ہندوستان کہ چون کار جنگ تنگ شود از اسپان پیادہ شدہ دل بر ہلاک می نہند واکثر اوقات بہ حسن ثبات قدم درسوخ

---

[۱] عالمگیر نامہ ص ۶۷،

افغانی اس کو پھولوں کی بارش تصور کر رہے تھے،

تیموری شہزادوں کو تیر اندازی کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی تھی، جہانگیر کی تیر اندازی کی مہارت یہ تھی کہ وہ ایک ہی تیر سے بھیڑیئے کو ہلاک کر دیتا تھا، حالانکہ مشہور ہے کہ بھیڑیئے بیس بیس تیس تیس تیر کھا کر بھی نہیں مرتے، وہ خود تزک میں لکھتا ہے:-

"ایک بھیڑیا میرے سامنے آیا، میں نے ایک تیر اس کے کمان کے پاس مارا، جو قریب ایک بالشت کے پیوست ہوگیا، وہ بھیڑیا اس تیر سے گر کر ہلاک ہوگیا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ میرے سامنے سخت کمان والے جوانوں نے بھیڑیئے کو بیس تیر، تیس تیر مارے ہیں، مگر وہ نہ مرا، اپنے بارے میں کچھ لکھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان واقعات کو سے لکھنے میں زبانِ قلم کو کوتاہ رکھتا ہوں"[۵]

اورنگ زیب اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلطان محمد کو برابر تاکید کیا کرتا تھا کہ وہ روزانہ دو گھڑی تیر اندازی اور بندوق کی مشق میں صرف کیا کرے[۶]

شمشیر زنی

جب غنیم کی صفوں میں تفنگ، تیر یا کبھی ہاتھیوں کی یورش سے انتشار، خلل اور رخنہ پیدا ہو جاتا تو سوار اپنی اپنی تلواروں کو سونت سونت کر مخالف فوجوں کے ساتھ گڈ مڈ ہو جاتے، جس کو معاصر مورخین جنگ مردانہ یا جنگ رستمانہ کہتے ہیں، اصلی شجاعت تلواروں ہی سے لڑنے میں سمجھی جاتی،

قندھار کی دوسری جنگ میں ایرانی لشکریوں کے پاس آتشیں اسلحہ کی کثرت تھی، تو شاہجہانی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۱) ایک ساتھ تیر چلا رہے تھے جس سے قریب تھا کہ شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے، مگر پھر توپ اور تیغ و سنان کی زد ان پر ایسی پڑی کہ ان کی فتح ہزیمت سے بدل گئی، خافی خان جلد ۱ ص ۲۶۵ [۵] تزک جہانگیری ص ۲۷، [۶] رقعات عالمگیری معارف پریس، ص ۱۰۲

قطب الملک سید عبد اللہ خان نے بھی (سید حسن علی خان کا بھائی) حسن پور کی جنگ میں اسی جوہر شجاعت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، لڑائی شدت پر تھی کہ سید عبد اللہ خان شمشیر اور سپر لے کر ہاتھی سے نیچے اتر آیا، اور جن دشمنوں نے اس کو گھیر رکھا تھا، ان سے نہایت دلیری کے ساتھ جنگ کرنے لگا، وہ سر سے پاؤں تک آہنی لباس میں ملبوس تھا، اس لئے اس کو زخمی کرنا آسان نہ تھا، وہ دشمنوں کو اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارتا رہا، مگر قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک اس کی پیشانی پر ایک تیر لگا، اور اسی کے ساتھ کسی نے بڑھ کر تلوار سے اس کے ہاتھ کو زخمی کیا، جس کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا[1]۔

ایک سپاہی تلوار کی ضرب جس قدر زیادہ تیزی، پھرتی اور قوت سے لگاتا، اسی قدر وہ بہادر اور دراندازہ ہونے کو کم سمجھا جاتا، اکبر اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب میں شیر کو ہلاک کر ڈالتا تھا[2]، عالمگیر نے اپنی شہزادگی کے زمانہ میں ایک مست ہاتھی کو اپنی تلوار سے زخمی کرکے اس کو پیچھے ہٹا دیا تھا، بہادر سوار گھوم گھوم کر اپنی تلواروں سے ہاتھیوں پر حملہ کرتے، اور ان کو زخمی کرکے پسپا کر دیتے، مست ہاتھی کے قریب آکر تلوار کی ضرب سے اس کی سونڈ کو اڑا دینا، اور پاؤں کو بے کار کر دینا کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی تھی[4]۔

نیزہ بازی نیزہ (سنان یا گرز یا برچھا) عموماً راجپوتوں کا ہتھیار ہوتا، مگر مسلمان سپاہی اس ہتھیار سے بھی لڑکر کبھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھلاتے تھے، مخالف سوار یورش کرکے گڈمڈ ہو جاتے، تو لمبے نیزوں اور برچھوں سے ان کی چپقلش روکی جاتی[5]، مخالف سواروں کے تیز رفتار گھوڑے کبھی گر زاور

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۴) خود را از فیل انداختہ با چندے از شجاعت پیشگان بارہہ تردد رستمانہ نمود، بعد بر داشتن زخمہائے کاری بے خبر گشتہ در معرکہ افتاد (جلد دوم ص ۱۰۳)

[1] خافی خان جلد دوم ص ۹۳۲، و سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۱۰-۴۴ [2] اکبر نامہ جلد دوم ص ۴۴ [3] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۹۰-۴۹ [4] مثال کے لئے دیکھو تزک جہانگیری ص ۴-۱۰۳، عمل صالح جلد دوم [5] اکبر نامہ

عزیمت غنیم را ہزیمت می دہند، از اسپ فرود آمدہ با معدودی پاے ہمت وجلادت بقصد نیل سرخروئی شہادت در میدان وغا افشردہ داد شجاعت ودلیری دادہ دران آذرہ ہنگامہ جوہر مردانگی گوے ثبات واستقلال از اقران وامثال بردہ اگرچہ کل زخمی از شاخسار مردی چید لیکن ببرکت توجہات والاے حضرت شاہنشاہی ومیامن حسن اعتقاد ونیکو خواہی از آسیب ہلاک ایمن ماند"[۵۲]

بہادر شاہ کی وفات کے بعد عظیم الشان اور جہان شاہ میں جنگ ہوئی، تو عظیم الشان کی طرف ممتاز خان نے اپنی شجاعت اور مردانگی کی مثال پیش کی، لڑائی تیز ہوئی تو وہ لڑتا ہوا جہان شاہ تک پہنچا اور گھوڑے سے کود کر پیادہ ہوگیا اور کبھی تیر چلاتا اور کبھی دشمنوں کو اپنی تلوار سے لقمۂ اجل بناتا، اسی بہادری سے وہ لڑتا گیا، یہاں تک دشمنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا،

سادات بارہہ لڑائی کی معرکہ میں عین قدم جما کر تلوار سے لڑنے میں بہت مشہور تھے ۱۱۲۴ھ میں سید حسین علی خان فرخ سیر کی حمایت میں جہاندار شاہ سے لڑا، تو میدان جنگ میں ہاتھی سے اتر کر اپنی شمشیر آبدار کے جوہر خوب دکھائے، مآثر الامراء میں ہے :-

"حسین علی خان در روز جنگ کہ در حوالی مستقر الخلافہ با جہاندار شاہ اتفاق افتاد باتفاق حسن بیگ صف شکن خان کہ نائب صوبہ داری اڑیسہ بود و نور الدین خان پسر بہادر خان روہیلہ بمقابل ذوالفقار خان کہ توپ وضرب زن بسیار پیش رو چیدہ ایستادہ بود ایشان تاختہ بزنجیرۂ توپخانہ در آمد، چون عرصہ بر خود تنگ دید، باین ناموس پرستان ہند پیادہ گشتہ بہ نہایت طاقت بزمین افتادہ"[۵۳]

---

۵۲ عالمگیر نامہ ص ۱۰۶۵ ایضاً ۵۳ مآثر الامراء جلد اول ص ۳۲۳ خافی خان میں ہے :-

"سید حسین علی خان چنان عرصہ کار زار تنگ گردید کہ بدستور بہادران تہور پیشہ ہندوستان

پر چڑھ گیا، جس کے بعد محمد شاہ کا فوجی سردار بے بس تھا؛[له]

۳	[illegible] صاحب	[illegible]	۱۰	[illegible]	[illegible]
	معصومی، استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ			جمہوریہ ہند برائے سعودی عرب	
۴	جناب مرزا احسان احمد صاحب	۲۸۳	۱۱	جناب غلام مصطفےٰ خاں صاحب ایم اے پی	۱۶۱، ۲۴
	ایڈوکیٹ اعظم گڈھ			ایچ ڈی لیکچرار اسلامیہ کالج کراچی،	
۵	مولانا سید بدر الدین صاحب علوی	۶۳	۱۲	جناب مولوی کبیر احمد صاحب ایم اے	۲۴۴
	استاذ شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ			صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج	
۶	سید سلیمان ندوی	۲۲۲، ۲۹۵ ۴۰۲، ۳۹۳	۱۳	جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے	۲۰۰، ۲۰۲
				لیکچرار عثمانیہ کالج، ورنگ آباد دکن	
۷	جناب سید صباح الدین عبد الرحمن	۱۲۹، ۷۰ ۲۴۵، ۱۹۵ ۴۲۵، ۳۲۵ ۴۷۱، ۴۶۰	۱۴	جناب مولوی [illegible] مجیب اللہ صاحب ندوی	۳۴۳
	صاحب ایم اے علیگ،				

له سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۸۳، مآثر الامراء جلد اول ص ۴۶۵،

کله طبقات ناصری ص ۱۲۰،

سنان ہی سے زخمی کئے جاتے تھے، ہاتھیون کو مجروح کرنے مین بھی یہ ہتھیار موثر ثابت ہوتے تھے،[۱]
مخالف سوار ہاتھیون کے قریب آکر ہودج نشینون پر نیزون اور برچھیون ہی سے وار کرتے تھے،[۲]

کرنال کی جنگ مین نادر شاہ کے ایک نیشاپوری سوار نے اپنے نیزہ کے استعمال کا ایک عجیب و غریب نمونہ پیش کیا، شدت کی لڑائی جاری تھی، کہ یہ نیشاپوری سوار محمد شاہ کے فوجی سردار سعادت خان کے ہاتھی کے پاس پہنچا، اور پھرتی سے اپنا نیزہ زمین مین نصب کیا، گھوڑے کی باگ نیزہ سے باندھ دی، اور سعادت خان کے ہاتھی کے ہودج کی جو ڈور کی پیچھے لٹک رہی تھی، اس کو پکڑ کر آناً فاناً ہودج

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۵) سترھوین سال جلوس مین ابراہیم حسین مرزا کے خلاف گجرات مین جنگ کر رہا تھا، تو اس لڑائی کے سلسلہ مین ابوالفضل رقمطراز ہے،

"درین وقت کہ (ہر طرف ہنگامۂ جان فشانی و جان ستانی گرم بود) سہ دلیرے پے از رزم آزگرو ہ مخالف بصوبت شہر یار شیر دل تاختند یکے ازان بد نہادان پیش دستی نمودہ متوجہ راجہ بھگونت داس شدہ نیزہ حوالہ کرد، راجہ پیشتر ازان با در رکاب محکم کردہ ایستادہ بود باشد کہ برچھہ خود را بآورد رساند نیزہ او خالی افتاد و راجہ برچھہ خود را بران مدبر آنچنان زد کہ حال دگر گون شدہ برگشت، (اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۵)

[۱] مثال کے دیکھو فرشتہ جلد اول ص ۴۰۴، عبدالحمید لاہوری جلد اول ص ۵۰۹ و ۴۹۰، خافی خان جلد اول ص ۲۳۸
[۲] مثلاً سموگڈھ کی جنگ مین مراد کے ہاتھی پر راجپوتون کا حملہ ہوا، تو خافی خان رقمطراز ہے :-

"درین حال راجہ رام سنگھ کہ میان راجپوتان بہ تہوری شہرت تمام داشت شہرہ مروارید بیش قیمت بر سر بستہ رخت زعفرانی با ہمہ ہمراہان بدعوی پر دلی پوشیدہ جلو ریز خود را بفیل سواری محمد مراد بخش رسانیدہ با کمانہ دگستاخانہ گفت تو مقابل دارا شکوہ ہوس بادشاہی در سرداری و برچھہ طرف محمد مراد بخش انداخت و بہ مہارت نہایت تمام بانگ زدہ گفت کہ

پر چڑھ گیا، جس کے بعد محمد شاہ کا فوجی سردار بے بس تھا[لـه]

مندرجۂ بالا اسلحہ کے علاوہ دست بدست لڑائی میں جمدھر، خنجر، کھپوا، گرز اور تیر بھی کبھی کبھی استعمال کئے جاتے تھے،

جنگی حیلے۔ جنگی حیلوں میں یہ حیلہ عام طور سے رائج تھا کہ لشکری میدان جنگ سے بظاہر بھاگتے نظر آتے، اور جب ان کے دشمن اُن کا تعاقب کرتے ہوئے کچھ دور آگے بڑھ جاتے، تو وہ پلٹ کر اُن پر حملہ کر دیتے، اس قسم کے جنگی فریب کی مثالیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ہر دور میں ملتی ہیں، شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر جو فتح و کامرانی حاصل کی تھی، اس میں اس قسم کا جنگی حیلہ بھی معاون ہوا تھا[۵۲]،

سلطان فیروز شاہ تغلق پہلی بار شمس الدین کے خلاف لکھنوتی جنگ کرنے گیا، تو وہ یعنی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۳) فیل را بنشان آں بہادر شیر صولت حملۂ او را رد نمودہ چناں تیر جاں ستاں بہ پیشانی او رساند کہ از خانۂ زین سرنگوں ساخت، (جلد دوم ص ۲۷)

۱۱۱۹ھ میں شاہ عالم اور اعظم شاہ کی جنگ جانشینی کے سلسلہ میں خافی خان لکھتا ہے،

"دہر لحظہ آتش پیکار مشتعل میگردید تا آنکہ خان عالم و منور خان کہ از دلاوران صف شکن و کن گفتہ می شدند، در مبارزت بار ہا علم شہرت برافراشتہ بودند نعرہ زناں فیل جرأت مقابل فیل محمد عظیم پیش راندند، و منور خان بے باکانہ بجلد دستانہ نیزہ طرف شاہزادہ انداخت محمد عظیم نیزۂ او را رد کرد، آں نیزہ بر جلال خان قراول رویف محمد عظیم رسید، محمد عظیم تیر بجلد کماں درآوردہ چناں بہ سینۂ حریف رساند کہ کار او ساختہ شد (جلد دوم ص ۵۹۱)

لـه سیر المتاخرین جلد دوم ص ۴۰۳، ماثر الامراء جلد اول ص ۴۶۵،

۵۲ طبقات ناصری ص ۱۲۰،

پیدل سپاہیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ آئے گا، اس طرح اس کی صفوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جائے گی، اس کے بعد میں پہاڑی کے پیچھے سے اپنی فوج کو لے کر غنیم پر حملہ کر دوں گا، اس طرح بنگالی سوار توپخانے اور پیدل سپاہیوں کی مدد سے بالکل محروم ہو جائیں گے اور وہ افغان شہسواروں کا مطلق مقابلہ نہ کر سکیں گے،

یہ ترکیب بڑی ہوشیاری اور ہوشمندی سے عمل میں لائی گئی، اور وہی ہوا جس کی امید شیر خان کو تھی، ابراہیم خان کی فوج دام فریب میں پھنس گئی،[1]

اکبر نے اپنے انیسویں سال جلوس میں داؤد کے خلاف اپنی فوج بنگال بھیجی، تو لڑائی کے درمیان شاہی فوج کے التمش اور قول کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا، ان فوجوں کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر داؤد یہ سمجھا کہ یہ ان کا محض فریب ہے اس لئے اس نے ان کا تعاقب نہیں کیا، اسی اثنا میں شاہی فوج کے داہنے بازو سے اُن کی مدد کے لئے کمک پہنچ گئی، پھر داؤد کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی،[2]

تیموری بادشاہ اس قسم کے جنگی فریب کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی لڑائیوں میں دجل و مکر کی مثالیں مطلق نہیں ملتی ہیں، کرنال کی جنگ میں نادر شاہ کے بعض دستے میدانِ جنگ سے بھاگتے نظر آئے، اس طرح کہ اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر الٹے منہ بیٹھ گئے، اور تیر اور بندوق چلاتے ہوئے اپنے گھوڑوں کو بھگا لے گئے، محمد شاہ کے سپاہی ان کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ وہ ایک کمین گاہ کے پاس پہنچ گئے، جہاں سے نادر شاہ کے سیکڑوں بندوقچی نکل کر ان پر بُری طرح حملہ آور ہوئے،

اس قسم کا جنگی فریب بڑی احتیاط اور ہوشمندی سے عمل میں لایا جاتا، اور جب بھاگتی ہوئی فوج پلٹ کر لڑتی تو اس کو دوگنی قوت غیر معمولی تیزی اور پامردی سے لڑنا پڑتا ہے،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از عباس خان سروانی، الیٹ جلد چہارم ص ۳۴۰-۱ [2] اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۲۶،

سلطان فیروز لکھنوتی چھوڑ کر پیچھے چند میل ہٹ گیا، شمس الدین کی فوج نے خیال کیا کہ سلطان فیروز پسپا ہو کر مراجعت کر رہا ہے، اس لئے وہ قلعہ سے نکل کر باہر آگئیں، اور شاہی فوج کا پیچھا کرنے لگیں لیکن اُن کو شکست کھانی پڑی،[1]

شیر شاہ بنگال میں ابراہیم خان کے خلاف سورج گڑھ کے مقام پر صف آرا ہوا، تو اُس نے بھی اپنے غنیم کو جنگی فریب ہی سے شکست دی، لڑائی شروع ہونے سے پہلے اُس نے اپنے فوجی سرداروں کو حسب ذیل ہدایتیں دیں،

"غنیم کے لشکر میں بہت سے ہاتھی ہیں، بکثرت بندوقیں اور کثیر التعداد پیدل سپاہی ہیں، لیکن ہم اُن سے اس طرح لڑیں کہ وہ اپنی اصلی صفوں کو برقرار نہ رکھ سکیں، اُن کے سواروں کو ہم بندوقچیوں سے علحدہ کر دیں، اور اُن کے پیدل سپاہیوں اور سواروں کو ان کے ہاتھیوں کے ساتھ گڈ مڈ کر دیں تاکہ ان کی فوج میں ترتیب باقی نہ رہے، میرے ذہن میں ان بنگالیوں کو شکست دینے کی ایک ترکیب ہے، سامنے ایک پہاڑی ہے، اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد کو اس پہاڑی کے پیچھے لے جا کر کھڑی کر دوں گا، لیکن تجربہ کار اور جری شہسواروں کی ایک مختصر جماعت کو جارحانہ حملہ کرنے کے لئے تیار رکھوں گا، غنیم اسی طرح لڑیں گے، جس طرح کہ پہلے لڑ چکے ہیں، ان کو اپنی شکست کا مطلق خیال نہ ہوگا، میں اپنے منتخب دستہ کو آگے بڑھاؤں گا، وہ بنگال کی فوج پر تھوڑی دیر تک تیر چلا کر پیچھے ہٹتے نظر آئے گا، ابراہیم خان کو یقین ہو جائے گا کہ اس کی طاقت ور فوج سے پسپا ہو کر افغان بھاگ رہے ہیں، ابراہیم خان کے حوصلے بڑھ جائیں گے، اور میری فوج پر اور بھی زیادہ دباؤ ڈالنے کے لئے اپنی توپوں اور

[1] تاریخ فیروز شاہی از سراج عفیف ص ۱۱۴،

پسند نہین کرتی تھیں، لیکن ان کے دشمنون کے یہان اس فریب کی مثالین ملتی ہین، مثلاً محمد تغلق نے قنوج کے پاس گنگا کے ساحل پر عین الملک کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اپنا پڑاؤ ڈالا، تو موخرالذکر نے پچھلی رات کو شاہی لشکر کے اگلے حصہ پر چھاپا مارا، لشکریون مین بڑا شور مچ گیا، سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے، اور تلوارون سے لڑائی کی جائے، تمام لشکریون نے تلوارین کھینچ لین، اور وہ دشمن کی طرف بڑھے، لڑائی کا ہنگامہ خوب گرم ہوا، عین الملک کا ارادہ بادشاہ کے خیمہ پر چھاپا مارنے کا تھا، لیکن اس کے رہبر نے اس کو دھوکا دیا، اور وہ وزیر کی جگہ آپڑا[۱]،

پانی پت کی پہلی جنگ مین بابر نے لڑائی کی ابتدا مین ابراہیم لودی کے لشکر پر شبخون مارنے کی کوشش کی لیکن اس کی تزک کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ شبخون بطیب خاطر نہین مارا، بلکہ بعض ہندوستانی امرار کے اصرار پر اپنی فوج کو شبخون مارنے کی اجازت دی، پانی پت مین اس کی فوج سات آٹھ دن پڑی رہی، اس کے تھوڑے تھوڑے سپاہی ابراہیم لودی کے لشکریون پر حملہ کرتے لیکن یہ اپنی جگہ سے نہ ہلتے، اس لئے بعض ہندوستانی امرا نے شبخون مارنے کی صلاح دی، چنانچہ چار پانچ ہزار سپاہیون کی ایک فوج شبخون مارنے کے لئے آگے بڑھی، لیکن وہ غنیم کے پاس اس وقت پہونچ سکی جب صبح ہو رہی تھی، اسی لئے وہ کچھ نہ کر سکی، اور واپس ہوگئی[۲]،

شیرخان نے چونسا کی لڑائی مین محض حیلہ و مکر سے فتح پائی، وہ ہمایون کے خلاف تین مہینے تک پڑاؤ ڈالے رہا، بالآخر اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ شاہ آباد ضلع کے مہارتھ کی سرکشی کو فرو کرنے کے لئے اپنی فوج کے ساتھ وہان جائے گا، دو دن تک وہ اپنی فوج اسی طرف بڑھاتا گیا، اور جب پچیس میل آگے بڑھ چکا تو یکایک ہمایون کے لشکرگاہ کی طرف اپنی فوج کو موڑ دیا، اور

---

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ ص ۱۸۱ [۲] بابرنامہ اردو ترجمہ ص ۲۶۵،

شبخون | غنیم کے لشکر پر رات کے آخری حصہ مین اچانک حملہ کرنا بھی ایک جنگی فریب تھا، یہ پرانا طریقہ اس وقت سے جاری تھا، جب کہ انسانون مین لڑائیان شروع ہوئین، لیکن یہ اوچھے قسم کا وار سمجھا جاتا تھا، رات کے اس اچانک حملہ کو شبخون کہا جاتا تھا، اور یہ حملہ اسی وقت کیا جاتا جب کہ غنیم کی لشکر گاہ پوری طرح محفوظ نہین ہوتی، حملہ آور کسی طرح غنیم کی لشکر گاہ مین چپکے سے گھس جاتے، اور پھر انتشار و اختلال پیدا کر دیتے، شبخون سے محفوظ رہنے کے لئے فوج چار دستون مین تقسیم کر دیجاتی،

(۱) پیدل سپاہی تیر و کمان، تلوار، نیزے اور سپر سے مسلّح ہو کر لشکر گاہ مین داخل ہونے کے راستے پر متعین کر دیئے جاتے،

(۲) داہنے بازو یعنی میمنہ اور قلب کے سپاہی اپنی جگہ پر ہوتے، اور اپنے یہان کی روشنی گُل کر دیتے تاکہ وہ دشمنون کو نظر نہ آئین، یا وہ کسی دوسری جگہ جا کر آگ روشن کر دیتے، غنیم گمراہ ہو کر وہان پہنچ جاتے، تو پھر وہ نرغے مین پھنس جاتے،

(۳) بائین بازو یعنی یسار کے سپاہی صف باندھے تیار کھڑے رہتے تاکہ غنیم کا حملہ ہو تو اس کو وہ روک سکین،

(۴) فوج کا چوتھا دستہ لشکر گاہ کو چھوڑ کر دور کے راستے پر گشت کرتا رہتا تاکہ غنیم کو کوئی مدد نہ پہنچ سکے، شبخون مارنے والے اپنے غنیم کے تمام راستون کو مسدود کر دیتے، اور چلاتے، اور شور مچاتے کہ فلان سردار مارا گیا، اور فلان آدمی قتل کر دیا گیا، اس طرح غنیم کے لشکر میں سراسیمگی اور بددلی پھیل جاتی،[1]

جو فوجین نسبۃً کمزور ہوتین وہی شبخون مارتین، سلاطین دہلی کی فوجین اس قسم کے جنگی فریب

---

[1] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح شبخون کو "کار بیدلان اور شیوۂ فریب کاران" کہا کرتا تھا[۵۱]

مغل فوج شبخون تو نہین مارتی تھی، لیکن شبخون مارنے والون کی مدافعت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار

رہتی، اس لئے وہ اپنی لشکرگاہ کو محفوظ کرنے کے لئے اس کی چارون طرف یا تو کانٹے بچھا دیتی،

یا مٹی کی دیوار کھڑی کر دیتی، یا خندقین کھود دیتی، [۵۲]

معارف: - یہ مقالہ انگریزی مین بھی اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) کے ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء

کے مختلف نمبرون مین شائع ہوا ہے،

---

[۵۱] تزک جہانگیری ص ۱۹ [۵۲] اکبرنامہ جلد ۳ ص ۴۲۵، و ۵۳۵، بادشاہ نامہ جلد سوم ص ۲۴۹،

بڑی خاموشی اور تیزی سے ہمایون کے سر پر آدھمکا، مغل فوج بالکل غافل ہوکر رات کی ٹھنڈی ہواؤن مین مزے کی نیند سورہی تھی، افغان یکایک حملہ آور ہوئے، تو ہمایون کے کسی لشکری کو نہ تو مسلح اور نہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونے کا موقع ملا، ہمایون اپنی فوج کو جمع نہ کرسکا، اور جب اس کے سپاہی سراسیمہ ہوکر منتشر ہوگئے تو اُس نے خود میدان جنگ چھوڑ دیا اور اس کو اتنا بھی موقع نہ مل سکا کہ اپنے اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے سکے، [۵۱]

اکبر شبخون مارنے کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، وہ ابراہیم حسین مرزا کے خلاف احمد آباد اور بڑودہ کے درمیان دریاے مہندری کے پاس معرکہ آرا ہوا، تو اس کے پاس زیادہ لشکری نہ تھے، اس کے فوجی سردار جلال خان نے اس کو مشورہ دیا کہ جب تک ہمارے پاس کافی فوج نہ پہونچ جائے دن مین لڑائی لڑنا مناسب نہین، بلکہ رات کو شبخون مارنا چاہئے، لیکن اکبر نے شبخون مارنے کی صلاح کو پسند نہین کیا کیونکہ شبخون جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے، "صورت تلبیس و تزویر داشت" اکبر نے اپنے لشکریون کی ہمت بڑھائی اور اُن سے کہا، کہ دن کا کام رات پر اٹھا رکھنا بالکل مناسب نہین، ہم جیتی اور ہوشمندی سے کام لیکر رزم آرا ہوجائین ہم مین سے ہر ایک شخص قوی دل ہوکر لڑے، اور یہ طے کرلے کہ ہر شخص کم از کم ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اُتارے گا، [۵۲]

احمد آباد کے حوالی مین محمد حسین مرزا کے خلاف اکبر صف آرا ہوا تو اس لڑائی مین بھی اس کو شبخون مارنے کا مشورہ دیا گیا، لیکن اس مشورہ کو اس نے حقارت سے ٹھکرا دیا، اس موقع پر ابوالفضل لکھتا ہے، :-

شبخون بود پیشۂ بے دلان   ازین ننگ دارند خیل یلان [۵۳]

---

[۵۱] تاریخ شیر شاہی از عباس خان سروانی ایلیٹ جلد چہارم ص ۳۷۵-۳۷۴،

[۵۲] اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۳ [۵۳] ایضاً ص ۵۱،

(۲) سب سے بڑی دشواری جو محاکاۃ اور تخئیل کے مسئلہ مین پیش آتی ہے، یہ ہے کہ حواس خمسہ ظاہری و باطنی مین سے ان کا تعلق کس قوت سے ہو ؟ یا ان کے مترادف اسماء کون کون ہین، حواس ظاہری قوت باصرہ، قوت سامعہ، قوت لامسہ، قوت ذائقہ، قوت شامہ ہین، حواس باطنی حس مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متصرفہ ہین، متصرفہ کی دو حیثیت متفکرہ اور متخیلہ ہین، محاکاۃ مصدر ہے، یہ ایک فعل ہے، فاعل یا قوت فاعلی نہین، یہ کسی قوت فاعلہ موثرہ کا فعل و اثر ہے، دوسرے الفاظ مین قصہ یا حکایت بیان کرنا ایک فعل ہے، بیان کرنے والا بیان کا غیر ہوتا ہے، دونون ایک چیز نہین، ایک ذات ہو اور ایک اس کی صفت، صفت محتاج ہے ذات کی، ایسے ہی بیان کو بیان کرنے والے کی ضرورت ہے، محاکاۃ اگر بمعنی محاکی یعنی بیان کرنے والا لئے جائین، تو بھی مذکورۂ بالا دسون حواس مین سے اس کا تعلق معلوم کرنا دشوار ہے۔

لغت مین کسی کے قول و فعل کی بجنسہ نقش کشی کرنے کا نام محاکاۃ ہے، بیان کرنے والی قوت کا نام محاکاۃ نہین، گمان غالب یہ ہے کہ جس کلام کی بنا گزشتہ ہوے قصون اور افسانون پر ہو اس مین متخیلہ کی ریشہ دوانی ضروری ہے، اس لئے محاکاۃ بھی متخیلہ کا ہی کارنامہ ہے،

(۳) تخئیل کے معنی ہین تصویر خیال الشیئ فی النفس یعنی صورت ذہنیہ یا قلبیہ کی نقش کشی کا نام تخئیل ہے، یہ بھی مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی مین لیا جا سکتا ہے، متخیلہ کوئی قوت باطنی نہین گو متصرفہ کی ایک قسم ضرور ہے، اگر تخئیل سے مراد متخیلہ ہے، تو چندان دشواری نہین، اس لئے کہ متخیلہ وہ قوت دماغی ہے، جو عقل کو پس پشت ڈال دیتی ہے، اور من گھڑت اور فرضی داستانون کی سخن سازی مین مصروف رہتی ہے، تاکہ غیر متین لوگ اس سے لطف اندوز ہون متخیلہ کا ابلہ فریب زربفت جھوٹ اور باطل کے تار و پود سے طیار ہوتا ہے،

راقم کی راے ناقص مین یہ ہو کہ محاکاۃ اور تخئیل دونون قوت متخیلہ کے در کے بھکاری ہین، انکے

محاکاۃ و تخئیل

از

جناب مولوی کبیر احمد صاحب ایم اے صدر شعبۂ فارسی بریلی کالج

لغت مین کسی کے قول و فعل کی ہو بہو نقل کرنے کا نام محاکاۃ ہے، اصلیت کا عنصر محاکاۃ مین غالب رہتا ہے، ارسطو کے نزدیک اعلیٰ درجہ کا کلام وہ ہے، جو واقعہ اور نفس الامر کے مطابق نہ ہو، اور جس کو حقیقت و اصلیت سے سروکار نہ ہو، جس کا دار و مدار جھوٹی اور گڑھی ہوئی داستانون پر ہو، جس کی غرض و غایت عیش و طرب کا جذبہ پیدا کرنا ہو، دورِ حاضر کے ماہرین کی رائے مین شاعری یا کلام کی بنیاد محض محاکاۃ پر نہین، بلکہ تخئیل و محاکاۃ دونون پر ہے، ارسطو اور اس کے رقیب دونون نے شاعری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، مگر کسی سے بھی تسلی و تشفی نہین ہوتی، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محاکاۃ اور تخئیل دونون کا مفہوم سمجھ مین نہین آتا، سمجھ مین نہ آنے کی دو ہی وجہین ہوسکتی ہین، یا تو سمجھانے والون سے فروگذاشت ہوئی یا انھون نے تعقید کا پہلو اختیار کیا، اگر یہ نہین تو اُن کے سمجھانے کا معیار اس قدر بلند و ارفع ہے کہ کم فہمون کی سمجھ مین نہین آتا ہے، ان مین سے جو سبب بھی ہو، مگر یہ امر مسلم ہے کہ متقدمین اور متاخرین کے کسی طبقہ نے محاکاۃ اور تخئیل کی صحیح تعریف نہین بتلائی، کہین یہ کہا گیا کہ تخئیل کی تعریف ویسی ہی مشکل ہے جیسے شعر کی، کہین قوت اختراع کے نام سے نامزد کی گئی، کہین یہ کہا گیا کہ محاکاۃ کی ساری گلکاری و رونق تخئیل کی بدولت پائی جاتی ہے، محاکاۃ بے تخئیل جسدِ بے روح کی مانند ہے،

خوبی اخلاقی قوتوں کے اعتدال پر قائم ہے،

باطنی قوی (۱) قوتِ شہوانی طلب منفعت کی جانب مائل کرتی ہے (۲) قوتِ غضبی رفع ضرر کی طرف رغبت دلاتی ہے (۳) قوتِ نطقی عقلی، ملکی، یہ صرف انسان کو عطا کی گئی ہیں، اس کے دو مقصد ہیں، علمی ترقی، اس اعتبار سے اس کو عقل نظری کہتے ہیں، دوسرے جسمانی قوتوں کو حدِ اعتدال پر قائم رکھ کر ان سے کام لینا، اس حیثیت سے اس کو عقلِ عملی کہتے ہیں جذبات اور عقل یہ دونوں انسان کے لئے ضروری ہیں، لیکن جذبات یعنی قوتِ شہوی اور غضبی کو عقل کے تابع رہنا چاہئے، مثالی عقل کی ترقی جذبات کو فنا کر دیتی ہے، اور مدنیت و انس انسان میں باقی نہیں رہتا، اسی طرح اگر جذبات ہی کی پرورش ہوتی رہے تو عقلی ترقیاں نیست و نابود ہو جاتی ہیں، اور انسان کا شمار احمقوں کے زمرہ میں ہونے لگتا ہے، اس لئے عقل و جذبات میں شیر و شکر کا سا امتزاج ضروری ہے، عقل کو حرکت دینا جذبات کا کام ہے اور جذبات کو حدِ اعتدال پر قائم رکھنا عقل کا کام ہے، اخلاقی قوتوں کے حسن و دلفریبی کا راز یہی ہے، محض عقلی ترقی کی بے اعتدالی کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت موجودہ دور کی عقلی ترقیاں ہیں، جن سے انسانیت پامال ہو رہی ہے، ایثار و قربانی، رحم و کرم، سچائی، وفاداری وغیرہ انسانی ہمدردی کے جذبات فنا ہو چکے، بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کا نظریہ نسیاً منسیاً ہو چکا، قوتِ نطقی، قوتِ شہویہ و غضبیہ کا لقمہ بن چکی ہے، یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ عقل جسمانی قوتوں کو حدِ اعتدال پر قائم رکھنے سے قاصر ہے، انسانی ہمدردی کہیں باقی نہیں رہی ہر قوم، خاندانی، قومی و وطنی عصبیت میں مبتلا ہے، اور عقلی ترقی کے باعث انسانی شرافت کی دھجیاں اڑ رہی ہیں، جذبات کی افراط و زیادتی کے بُرے نتائج یہ ہیں کہ جس زمانہ میں یورپ میں علمِ کیمیا، طبعیات، ریاضیات، فلکیات، معدنیات وغیرہ علم و فن کے ہر شعبہ میں تلاش و تحقیق کا

دامن مین جو کچھ بھی ہے وہ سب تخیلہ کے دست نوال وفضل کا نتیجہ ہے، تخیلہ اور محاکات دونون مفہوم کے اعتبار سے ایک ہین، گو نام جداگانہ ہین، غرض وغایت بھی دونون کی ایک ہے، یعنی عیش و طرب کی جذبہ آفرینی، البتہ چند باتون مین بظاہر مختلف نظر آتے ہین، یون سمجھئے کہ دونون کی منزلِ مقصود ایک ہے، گو راستے جدا جدا ہین،

(۴) سب سے پہلا مصنف جس نے فنِ بلاغت مین کتاب لکھی ارسطو ہے، اس کی راے مین شاعری کی بنیاد محاکاۃ پر ہے لیکن دورِ حاضر کے ماہرین کے نزدیک شاعری مین محاکاۃ اور تخئیل دونون کی ضرورت ہے، ارسطو نے یہ کتاب شباب کے زمانہ مین لکھی تھی، خود شاعر نہ تھا، یونان کے مشاہیر شعراء سوفاکلیس و ہومروس کی نظمین نشاط انگیزی کے لئے لکھی گئی تھین، جن مین جھوٹ کا عنصر غالب تھا، اس لئے ارسطو نے اپنے دور کی شاعری کا تذکرہ محققانہ طور پر کتاب مذکور مین کیا ہے، سکندر اعظم کا زمانہ یونانی تاریخ کا دورِ زرین ہے، یونانیون کا تعیش و تمدن اس زمانہ مین عروجِ شباب پر تھا، ناز و نعمت کی بہتات تھی، بزمِ عیش کا دور دورہ تھا، ایسے زمانہ مین جب کہ زندگی کے ہر شعبہ مین فطرتِ انسانی تکلفات کی ایجادات کی طرف مائل تھی، شاعری کی بنیاد کس طرح سادگی اور سچائی پر رہ سکتی تھی، ایک زمانہ تک بلاشبہہ یونانی اپنی شاعری مین سچے جذبات کی ترجمانی کرتے، اور حقیقی شاعری کی شاہراہ پر گامزن رہے، لیکن جب اُن کی زندگی مین تکلفات بڑھے تو سچی اور فطری شاعری اُن کو پھیکی معلوم ہونے لگی، اور اس مین رنگ آمیزی اور حیرت انگیز واقعات کا اضافہ شروع ہوگیا، اور جب طبیعتین جھوٹ کی خوگر ہوگئین، تو ایوانِ شاعری کا سنگِ بنیاد جھوٹ پر رکھا گیا،

(۵) محاکاۃ اور تخئیل پر تفصیلی بحث سے پہلے اخلاقی قوتون کا تذکرہ ضروری ہے،

ظاہری صورت کا حسن و جمال اعضاء کے تناسب پر موقوف ہے، اور باطنی صورت کی

مرکز ہے،

(۲) خیال، خزانہ حسِ مشترک، دماغ کے اگلے حصہ کا جوف آخر،

(۳) واہمہ، محسوسات کے معانی جزئیہ کا ادراک دماغ کے جوفِ اخیر کا پہلا حصہ،

(۴) حافظہ، ذاکرہ، مسترجعہ، ادراک، خزانہ قوت واہمۂ دماغ کے آخری حصہ کا جوف آخر،

(۵) متصرفہ، (جنس) متفکرۃ متخیلہ (نوع) اوسط دماغ،

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کسی کے قول و فعل کی بلا کمی بیشی ہو بہو نقش کشی کا نام محاکاۃ ہے، جسم کی ہو بہو تصویر شیشہ کھینچ سکتا ہے، بشرطیکہ شیشہ شفاف اور اعلیٰ درجہ کا ہو، بہت سے شیشے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جس میں کثیف جسموں کا پورا نقش نہیں اترا کرتا، بلکہ چھوٹا جسم بڑا، بڑا چھوٹا، سیدھا ٹیڑھا اور ٹیڑھا سیدھا معلوم ہوتا ہے، قوتِ خیالیہ بھی ایک آئینہ ہے جس میں غیر مادی یا لطیف اشیاء کا عکس منعکس ہوتا رہتا ہے، اس لئے محاکاۃ کی تعریف کے مطابق کسی قول و فعل کی ہو بہو صورت کشی مشکل ہی نہیں، بلکہ محال ہے، اس لئے کہ جب شیشہ میں قوت ایجاد و اختراع کا وجود نہیں، اور وہ بھی ہو بہو نقش کشی سے عاجز ہے، تو قوتِ خیالیہ بدرجۂ اولیٰ اس فریضہ کی انجام دہی سے قاصر رہے گی، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے شیشہ میں جسم انسانی کی صورت کشی بلا کم و کاست ہوتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، اس تصویر میں بہت سی صفتیں معدوم ہوتی ہیں، مثلاً (۱) جسمیت (۲) حیوانیت (۳) ناطقیت، اس لئے کہ آنکھ تو موجود ہوئی ہے، مگر بینائی سے محروم، کان موجود ہوتے ہیں، مگر شنوائی معدوم، ہاتھ پیر پائے جاتے ہیں، مگر حرکت کا پتہ نہیں، ناک موجود ہے، مگر قوت شامہ ندارد، زبان گو دکھائی دے، مگر گویائی اور صفتِ چاشنی سے ناآشنا،

خلاصہ یہ ہے کہ جب جسمانیات کی ہو بہو صورت کشی دشوار ہے، تو قول و فعل کی نقش کشی تو اور بھی

سلسلہ جاری تھا، نئی نئی ایجادات ہورہی تھین علمی ترقی کا آفتاب نصف النہار پر تھا، عین اس زمانہ مین ہندوستان قوتِ شہوی کی راجدھانی تھی، بٹیر بازی، مرغ بازی، شطرنج بازی، کبوتر بازی وغیرہ کی گرم بازاری تھی، ہر فرد عیش وطرب مین مست تھا، ہندوستان کی ساری آبادی کا میلان فنون لطیفہ رقص وسرود وغیرہ کی جانب تھا، ہزل وتمسخر اس کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا، عیش پرستی اُن کی سرشت مین داخل ہوگئی تھی، اُن کی عمر عزیز مفید کامون کے بجائے لہو ولعب مین برباد ہورہی تھی، اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ سب کو معلوم ہے،

غرض ہندوستانیون کو جذبات کے غلبہ نے تباہ کیا، اور یورپ کی تباہی عقل پرستی کے ہاتھون ہوگی، جس کے آثار نمایان ہین،

روحِ انسانی یا نفس ناطقہ تمام اعضاے جسمانیہ کی حاکم مدرک و عالم ہے، اس لئے عرض نہین، مدرک کلیات ہے اس لئے جسم وجسمانی نہین، کیونکہ کل کی کلیت کسی جسم مین قائم رہنے سے باقی نہین رہتی، اس کی تقسیم اس نقشہ سے ظاہر ہوگی،

روح انسانی

قوت عاقلہ یا عقل		عاملہ
نظری	عملی	
مثلاً اللہ تعالیٰ کو رحیم وکریم ماننا	مثلاً ظلم قابل ترک عدل قابل اختیار ہے	وہ قوت ہے جس کے ذریعہ رُوح انسانی کا کام قوی اور اعضاے جسمانیہ پر تسلط ہوتا ہے،

تمام امور کلیہ جزئیہ مادیہ مجردہ سب کی مدرک انسان مین روح انسانی ہے، اس بحث کو سمجھنے کے لئے حواس خمسہ باطنی کی تشریح ضروری ہے،

حواس خمسہ باطنی (۱) حسِ مشترک، خزانہ حواس ظاہری، دماغ کا اگلا حصّہ، اس کا

کا خزانہ ہے، اور مشاہدات اور ادراکات کا سارا ذخیرہ قوتِ خیال مین موجود رہتا ہے، قوتِ بیان اس سرمایہ کو عقل کی مدد سے ..... ایک ہی ترتیب و رنگ سے جلوہ گر کرتی ہے، قوتِ خیال کے دو فرائض ہین،

(۱) وہ تمام انسانی ادراکات کی خزانچی ہے،

(۲) قول و فعل کی تصویر کشی کے بعد اس کو قوت متصرفہ یا مفکرہ کی مدد سے حسن ترتیب کیساتھ قوتِ گویائی کے سپرد کر دیتی ہے، اور وہ اس مین لحن و موسیقی کا اضافہ کرکے سامعین کے کانون تک پہنچاتی ہے،

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ آنکھون نے جس طرح کسی فعل کو ہوتے ہوئے دیکھا، کان نے قول کو جس طرح سنا، زبان کو جو ذائقہ ملا، ہاتھون اور ناک کو جو لطف و اذیت حاصل ہوئی، حواس خمسہ کے ذریعہ یہ احساس حسِ مشترک کے خزانہ مین داخل ہو گیا، اور حسِ مشترک نے یہ سارا ذخیرہ صورت کشی کے لئے خیال کے کیمرہ کے حوالہ کر دیا، قوتِ خیال اسی سرمایہ کو قوتِ مفکرہ کی مدد سے الفاظ کی سلک گہر مین پرو کر قوتِ بیان یا گویائی کے حوالہ کر دیتی ہے، وہ اس پر لہجہ و لحن کا غازہ و گلگونہ مل کر سامعین کے سامنے پیش کر دیتی ہے، گویا حواس خمسہ گلچین یا عطا کنندہ گل ہین، حس مشترک خزانچی گل، قوتِ متفکرہ اس کی امین یا مالن ہے، اور قوتِ بیان اس سہرہ کو عطر آگین کرکے حاضرین کے حلقۂ گوش مین ڈالتی ہے، اس سلسلہ مین اس امر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جیسے انسان کی عمر چار حصون طفلی، شباب، کہولت اور پیری مین تقسیم ہے، ویسے ہی عقل انسانی کے چار درجے ہین، عقل ہیولائی، عقل بالملکہ، عقل مستفاد اور عقل بالفعل، اول الذکر قابل التفات نہین، صرف آخری دو کام کے ہین،

۸- محاکاۃ اور تخیل کی مفصل بحث کے بعد اس کی مزید توضیح ان الفاظ مین کیجا سکتی ہے کہ

محال ہے، البتہ کمی بیشی کے ساتھ ممکن ہے، اور اس کا دارومدار مصور یا شاعر کی قوتِ خیال پر ہے، اس نے اگر اصلیت کو قائم رکھتے ہوئے، قوتِ خیالیہ سے اس مین تصرف کیا ہو، اور بقدر استطاعت جسم یا قول وفعل کی محاکاۃ کی ہے، تو اعلیٰ درجہ کا مصور یا شاعر کہلانے کا مستحق ہے، اور اگر اصلیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، اور صرف قوتِ خیال کے زور سے ایک فرضی تصویر دلون کو لبھانے کے لئے تیار کی ہے، تو ایسی مرقع کشی مصوری کے نگارخانہ مین تحسین وآفرین کی مستحق ہو تو ہو مگر عالم شاعری مین اس کی داد نہین مل سکتی، اس لئے کہ دراصل وہ کسی کے قول وفعل کی نقش کشی نہین ہے، اور نہ اس کو محاکاۃ اور اصلیت سے کوئی سروکار ہے، بلکہ وہ محض ایک خیالی طلسم ہے، جس کو ڈراما یا طلسمی نظم یا سوانگ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے، مگر شعر کے زمرہ مین داخل نہین کیا جا سکتا، البتہ جس قول یا فعل کی ترجمانی اس طرح کی جائے کہ اس مین قوتِ خیالیہ کی رنگ آمیزی کے ساتھ ساتھ حقیقت اور اصلیت کا پہلو بھی نمایان ہو، تو اس کو شعریت کا تمغہ مل سکتا ہے،

(۷) محاکاۃ مین خود قوتِ فاعلیہ موجود نہین، یہ دراصل کسی فاعل کا فعل اور کسی مؤثر کا اثر ہے، اور وہ قوتِ گویائی یا بیان ہے، جو ہر انسان کو منجانب اللہ عطا ہوتا ہے، محاکاۃ مین سب سے پہلے قول یا فعل کا نقشہ دماغ یا ذہن مین کھنچتا ہے، تصور شوق کا مادہ پیدا کرتا ہے، شوق ارادہ پر تصرف کرتا ہے، ارادہ قوتِ بیان کو حرکت مین لاتا ہے، اور ان تمام قوتون کی مدد سے محاکات کا فعل وجود مین آتا ہے، قول وفعل کا تصور دراصل قوتِ خیال مین پیدا ہوتا ہے، قوتِ خیال ایک آئینہ خانہ ہے، جس مین قول وفعل کی صورتین منعکس ہوتی رہتی ہین، اور جس طرح جسم کی تصویر کشی کی خوبی کا دارومدار آئینہ کی خوبی پر ہے، ایسے ہی فعل وقول کی نقاشی کا انحصار قوتِ خیالیہ کی قوت پر ہے، شاعر کی قوتِ خیال مین اسی قدر رفعت اور بلند پروازی ہوگی، جس قدر شاعر ذکی الحس ہوگا، جس طرح حواسِ خمسہ کا خزانہ حسِ مشترک ہے، اسی طرح خیال حسِ مشترک

ادا کیا جاتا ہے، تو شعر بن جاتا ہے، دیکھئے اس شعر مین کئی سطرون کا مفہوم صرف نصف سطر مین ادا کیا گیا ہے، اور اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ کہ اس سے روح لذت گیر ہوتی ہے، اب اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، خواجہ صاحب کی قوتِ متفکرہ نے پیر کے بجائے ساقی کا لفظ اختیار کیا ہے، جس سے مفہوم مین بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے، اور عام میخوار بھی اس کو پڑھ کر اور سُن کر لطف اندوز ہو سکتے ہین "لگ رہا ہے چل چلاؤ" سے وہ یہ مراد لین گے کہ محفلِ رندان کے اختتام کا وقت قریب ہے، بزم درہم برہم ہونے والی ہے، اس لئے جو وقت بھی باقی ہے، اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے، اور خواجہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کوچ کا وقت قریب ہے، ایسے وقت مین اور بھی مرشد کی توجہ کی ضرورت ہے، اور بیان کی اس سادگی مین تاثیر کی یہ فسون گری قوتِ متفکرہ کی بدولت ہے، جس نے شاعر کی زبان سے اس جذبہ کی پوری تصویر کھینچدی ہے، محاکاۃ کی حد یہین تک ہے، جہان تک نقل مین اصل کی مطابقت کا سوال ہے، چل چلاؤ، بس چل سکے، ساغر چلے، ساقی اور ساغر کے الفاظ کا انتخاب اور اس کی خاص ترتیب وغیرہ متفکرہ سے متعلق ہے، لیکن اگر خواجہ صاحب کے ذہن مین ذکرِ الٰہی اور اس سے لطفِ اندوزی کا کوئی تصور نہین تھا، تو اس شعر کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ کوئی میخوار عالم مستی مین ساقی سے کہہ رہا ہے کہ جب تک مجھ مین شراب نوشی کی سکت باقی رہے، پلاتا چلا جا، کیونکہ بادہ کشی کا زمانہ ختم ہونے کو ہے، معلوم نہین پھر بادہ نوشی کی نوبت کب آئے، اس صورت مین خواجہ صاحب کی اس مرقع کشی کا شمار شعر کی فہرست مین ہوگا، اور اس کی بنیاد متفکرہ یا محاکاۃ کے بجائے متخیلہ قرار پائے گی، اس لئے کہ خواجہ صاحب کے دماغ مین بادہ کشی کا کوئی نقش موجود نہین بلکہ وہ دوسرون کے خیال کی نقل کر رہے ہین، جب یہ مسلّم ہے کہ یہ سب کارنامے قوتِ متخیلہ کے ہین تو محاکاۃ کے بجائے متفکرہ اس کی علت کیون نہین قرار دیجاتی، اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کے قول و فعل کی ہو بہو نقش کشی کا نام محاکاۃ ہے اور

فرض کیجئے، زید کے اعلیٰ جود وکرم کو دیکھ کر کسی خاقانی زمن کے دل مین جذبۂ تحسین وآفرین پیدا ہوتا ہے، تو اس کے جود وکرم کا جو تصور اس کے دماغ مین موجود ہے، اگر وہ اس کو اپنی قوتِ متفکرہ کی مدد سے قوتِ بیان وتحریر یا محاکاۃ کے ذریعہ عمدہ عبارت مین صفحۂ قرطاس پر کھینچ دے، تو وہ اعلیٰ درجہ کے قصیدہ سے نافرد ہوگا،

مثلاً خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

خواجہ صاحب اپنے پیر ومرشد کے حلقہ مین بیٹھے ہوئے ہین، ان کی توجہ سے خواجہ صاحب کا دل ذکرالٰہی مین مصروف ہو جاتا ہے اور اس سے ایک وجدانی کیفیت ان پر طاری رہتی ہے، جو اس قدر سرور انگیز ہے کہ اس سے علٰحدگی اور دوری خواجہ صاحب کے لئے ممکن نہین، ایسی صورت مین اپنے مرشد سے خطاب کرتے ہین کہ اجل کا کوئی وقت معین نہین، ممکن ہے، ابھی آجائے، یا آپ کی توجہ کسی دوسری جانب مائل ہو جائے، اس لئے التماس ہے کہ تادمِ مرگ آپ کی توجہ مجھ پر ایسی ہوتی رہے کہ مین ذکرالٰہی سے لطف اندوز ہوتا رہون، یہ نقشہ خواجہ صاحب کے دل مین کھچا، اور اسکی وہ ترجمانی کرنا چاہتے ہین، جس کو میری قوتِ خیالیہ نے کئی سطرون مین پھیلا کر بیان کیا ہے، لیکن چونکہ قوتِ متفکرہ کا اعلیٰ رنگ اس مین موجود نہین ہے، اس لئے اختصار نہین، جدتِ ادا نہین، قوتِ بیان کی افسون گری نہین، سادگی نہین، وزن نہین، قافیہ نہین، جوش نہین، اس لئے اس کو شعر کا لقب نہین دیا جاسکتا، لیکن اسی خیال کو جب ان الفاظ مین،

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس مین حاضری لنڈن کلکتہ، لنڈن وغیرہ کے نقش تو انشا کی قوت حافظہ وخیال مین محفوظ تھے لیکن ایسا کوئی نقش اُن کے خزانۂ خیال مین نہین تھا کو کوئی گھوڑا ۵۰۰ گھنٹہ مین ۵۰۰۰۰۰ ہزار میل کی مسافت طے کرتا ہو، انشا کی قوتِ واہمہ کی طلسم سازی نے ایک ایسا گھوڑا طیار کیا ہے، جس کو حقیقت واصلیت سے کوئی تعلق نہین، اس مین محاکات وخیال کی ترکیب نہین، بلکہ تفریق وجدائی اور محض واہمہ کی کار فرمائی ہے، اور اس قسم کے اشعار سے وہی طبیعتین لطف اُٹھا سکتی ہین، جو تخیلہ اور واہمہ کے سحر مین گرفتار ہین،   (باقی)

شعر العجم حصہ اوّل

فارسی شاعری کی تاریخ جس مین شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیون اور ان کے خصوصیات اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور اُن کے کلام پر تنقید وتبصرہ ہے۔ قیمت: ہے ر

شعر العجم حصہ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک) اور تنقید کلام

قیمت: ہے ر،

شعر العجم حصہ چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے، کہ ایران کی آب وہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور شاعری کے تمام انواع واقسام مین سے مثنوی پر تبصرہ، قیمت ہے ر،

"منیجر"

یہاں اصلی نقش وتصور نہ تو خواجہ صاحب کے دماغ مین تھا نہ کسی اور کے دماغ مین اور جب تصور و احساس نہو تو شوق کا پایا جانا محال ہے، اور بغیر شوق کے ارادہ کا وجود نہین ہو سکتا لیکن اگر ارادہ نہ تھا تو پھر شعر کیسے کہا گیا، کیونکہ بلا ارادہ کسی فعل کا صدور ممکن نہین، جو فعل بلا ارادہ ہو وہ طبعی کہلاتا ہے، اور طبعی فعل یا وہ فعل جو بلا ارادہ صادر ہو شعر کی تعریف سے خارج ہے نتیجہ نکلا کہ ارادہ بلا شوق وتصور کے بھی ممکن ہے،

فعل کی دو قسمین ہین (۱) اختیاری (۲) اضطراری یا جبری فعل بالارادہ کو اختیاری اور غیر ارادی کو اضطراری یا جبری کہتے ہین،

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس شعر کے مادی تصور کی صورت مین خواجہ صاحب نے اس کے کہنے کا ارادہ ضرور کیا لیکن دوسرے کی طرب انگیزی کے لئے یا جبری طور پر اس لئے کہ اس مین شاعری کے دو عناصر یعنی تصور اور شوق موجود نہین تھے، صرف ارادہ وتخیلہ نے اس کو خلعت وجود عنایت کیا، اور وہ بھی حقیقی واصلی نہین، بلکہ نقلی ومصنوعی، اس طرح تخیلہ کی مصوری سے یہ نقش طیار ہوا ہوگا، اس صورت مین روح غائب نا پائی جب اصلیت اور روح کا پتہ نہ ہو تو شعر کی بنیاد محاکاۃ یا نری قوت تخیلہ پر ہوگی، مگر تخیلہ کا ایوان صرف کذب کی نقش آرائی سے تیار ہوتا ہے جس کی اثر انگیزی صرف زبان تک محدود رہتی ہے، دل تک اس کی رسائی نہین ہوتی، مگر اس شعر کی افسون گری، جدت ادا اور تاثیر بے اختیار دل کو کھینچتی ہے اس لئے اس شعر کی بنیاد محض تخیلہ یا دوسرے الفاظ مین کذب پر نہین ہو سکتی کہ جھوٹ مین تاثیر نہین پیدا ہو سکتی،

قوت تخیلہ یا واہمہ کی مثال گھوڑے کی تعریف مین انشار کا یہ شعر ہے،

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا

حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن مین نفن

اشاعت کی جانب توجہ نہین کیجاسکی، اس کے لئے ہزارون مطبوعہ اوراق کی دیدہ ریزی سے چھان بین کرنے کے علاوہ مخطوطات سے بھی مواد لینا ہے، جن مین سے بعض نہایت نادر ہین، مثلاً ابن سمجون کی جامع الادویۃ المفردۃ یا ابن سیدۃ کی المحکم وغیرہ،

مجھے آکسفرڈ مین چند ماہ ہوئے اپنے ایک سابق جرمن استاذ کی زبانی معلوم ہوا کہ استانبول مین ایک کامل نسخے کا پتہ چلا ہے، اس کے متعلق جرمن انجمن مستشرقین شاخ استانبول کے ناظم ڈاکٹر ہلموت رتر سے معلومات حاصل ہو سکتے تھے، لیکن وہ اب استانبول چھوڑ کر وطن کی خدمت کے جذبہ سے فرانکفورت کنار ماین کی جامعہ مین شعبۂ مشرقیات کے صدر بن کر چلے گئے ہین، انھین وہین خط لکھا، کچھ عرصہ کے بعد جواب ملا کہ افواہ صحیح ہے، لیکن مخطوطہ کامل نہین، بلکہ اصل کا ایک ٹکڑا ہے، اور اس پر سویڈن کے ایک مستشرق کام کر رہے ہین،

پھر آخر الذکر کو خط لکھا آج کی صحبت مین ماخذ اطلاعات ان ہی کا خط ہے، ڈاکٹر برنارٹ لیوین جامعۂ اپسالا کے کتب خانہ مین کسی عہدے پر مامور ہین، اور آج کل ابن المعتز کے کلام کی اشاعت مین مصروف ہین، وہ ۲ر فروری ۱۹۵۰ء کے خط مین لکھتے ہین،

"یہ واقعی ایک حیرت انگیز اتفاق ہے کہ اس قیمتی کتاب (کتاب النبات للدینوری) کے مختلف ٹکڑے تقریباً ایک ہی وقت مین دستیاب ہوئے، اور اہلِ علم کے ہاتھون مین پہنچے ہین، جن مین ایک آپ ہین، اور ایک اس دور دراز سویڈن مین"

ڈاکٹر لیوین نے ازراہ عنایت اپنے نسخے کے چند اوراق کا فوٹو بھی خط مین منسلک کیا ہے، اب تجویز یہ ہے کہ نئے ٹکڑے پر دونون کام کرین، اور دونون ٹکڑے ایک ساتھ شائع ہون، اگر کوئی خلافِ توقع حادثہ نہ بھی پیش آئے، تو بھی اس کام مین کچھ عرصہ لگے گا، اس لئے اہلِ علم کی آگاہی کے لئے فی الحال چند معلومات عرض کئے جاتے ہین،

کتاب النبات دینوری

از

جناب محمد حمید اللہ صاحب پیرس

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف دسمبر ۴۹ء)

کچھ عرصہ ہوا معارف میں اس موضوع پر چند باتیں عرض کی گئی تھیں، اور مدینہ منورہ کے ایک مخطوطے کا ذکر کیا گیا تھا، جو دینوری کی کتاب النبات کے تین بابوں پر مشتمل ہے آج ایک مزید ٹکڑے کی دستیابی کی خوشخبری دینی ہے،

بمبئی کے مرحوم دو لسانی رسالہ العروۃ کے شمارۂ دوم میں ترمذی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، معلوم نہیں اُن کے معلومات کا ماخذ کیا تھا، لیکن وہ نادر چیز نہیں، بلکہ مدینہ منورہ کے مذکورہ صدر مخطوطے ہی سے متعلق ہے، میں نے ۱۳۶۶ھ کے آغاز میں اس کی نقل لی تھی، ترمذی صاحب اور انکے ممدوح کو نہ معلوم اس کا پتہ کب چلا، البتہ ترمذی صاحب کی یہ اطلاع اردو دان طبقہ کے لئے شائع کرنی ہے کہ مصر کے ممتاز عالم نباتات ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے دینوری کے اقتباسات مختلف کتب لغت وغیرہ سے اکٹھا کئے ہیں، اور ان کو شائع کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ شائع ہو گئے تو انھی کو اولیت حاصل ہو گی، باقی اکٹھا کرنے کی حد تک اس سے پہلے بھی متعدد اصحاب نے یہ کوشش کی، اس مقالہ کے پہلے نمبر میں زلبربرگ کا ذکر ہے، جس نے اب سے کوئی چالیس اکتالیس برس پہلے کوشش کی تھی، راقم الحروف نے بھی کئی سو صفحوں میں ایسا ہی مواد جمع کیا ہے، لیکن ناتمام ہونے کے باعث

حروف تہجی کی ترتیب اُن کی جدت نہ تھی، بلکہ دینوری کا ہی کی نقالی اور خوشہ چینی تھی، میں اپنے مقالے کی پہلی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ ابن سمجون اور ابن البیطار وغیرہ نباتات پر اپنے پیشرؤں کے بیانات جمع تو کرتے ہیں لیکن آغاز عموماً دینوری کے بیان سے کرتے ہیں، اور ابن البیطار کے ہاں بعض وقت یہ فقرہ ملتا ہے،" قال الغافقی قال ابوحنیفۃ الدینوری" اس کی توجیہ یہ کرنی پڑتی ہے کہ ابن بیطار نے دینوری کے اس بیان کو جو حروف تہجی کی ترتیب پر نہیں بلکہ مستقل مقالات کی صورت میں ہے اور جس کی تلاش آسان نہیں ہے، کبھی اپنی یادداشت کی مدد سے اور کبھی غافقی کے آسان ذریعہ سے کتاب مفردات میں نقل کیا ہوگا، کتاب النبات کا نودستیاب شدہ ٹکڑا اگر پوری طرح سامنے آجائے خاص کر اس کا حصۂ دوم اور اس کا ابن البیطار وغیرہ سے مقابلہ کیا جائے، تو اس پہلو پر زیادہ بہتر رائے قائم کی جا سکے گی،

میں نے مقالہ گذشتہ میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ کتاب النبات للدینوری کے کون کونسے اقتباس مخصص ابن سیدہ کی کس کس جلد میں ہیں، ڈاکٹر لیوین کے بیان کی روشنی میں مخصص کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ متعلقہ ابواب اس کی چھٹی جلد میں ہیں، چنانچہ ص ۲۹ پر بعینہ ہمارے عنوان کا باب" ومن انحاء صنعۃ القسی" ہے، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب تو مخطوطہ اُپسالا کے الفاظ میں نہیں ہے لیکن باب السہام متعدد فصلوں کے ساتھ موجود ہے، ہمارا پانچواں باب" من اسماء اشتھا ق" ممکن ہے وہی ہو جس کو ابن سیدہ نے ص ۱۵ پر" اسماء ضروب السّھام وصفاتھا" کے عنوان سے لکھا ہے،

ہمارے سامنے مخطوطہ اُپسالا کے پہلے باب کا پہلا ورق ہے، ابن سیدہ کے ص ۲۹ سے اس کا مقابلہ کرنے پر نظر آیا کہ مخطوطہ مدینۂ منورہ کی طرح، اس حصہ میں بھی ابن سیدہ نے بہت ہی کم حصہ نقل کیا ہے، اور دینوری کے بے شمار بیانات حذف کر دیئے ہیں، جو اس لئے ناگزیر تھا کہ ابن سیدہ کا موضوع و مقصد جدا تھا،

یا مخطوطہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے جس مین (۲۳۴) ورق یا (۴۶۸) صفحات ہین، خط نہایت نفیس، اعراب لگا اور جلی ہے، جن چند صفحون کا فوٹو آیا ہے، اس مین کہین تاریخ نہین ہے، لیکن اندازاً سات آٹھ سو برس پہلے کا نسخہ معلوم ہوتا ہے،

یہ ٹکڑا کتاب کے جزء خامس پر مشتمل ہے، ابتدائی پندرہ ورق غائب بیان کئے جاتے ہین، ورق ۱۶ سے جو متن شروع ہوتا ہے، وہ ڈاکٹر لیوین کے الفاظ مین یون ہے،

ورق ۱۶ تا ۲۶ ب	من الخاء صنعۃ القسی	(کمان سازی کی قسمین)
" ۲۷ ب تا ۳۵ ب	من صفات النبل	(تیرون کی صفتین)
" ۳۶ تا ۴۰ ب	ھما فی القدح	(تیرون کا لکڑی کا حصہ)
" ۴۰ ب تا ۵۱	ما یحمل علی القداح	(تیرون مین لکڑی کے حصہ پر چڑھائی جانے والی چیز)
" ۵۲ تا ۷۱	من اسماء السہام	(تیرون کے لئے عربی مترادفات)

اس کے بعد مخطوطے مین ایک اچنبھا ہے، ڈاکٹر لیوین کے الفاظ یہ ہین،

"ورق ۷۱ تا ۲۳۴ مین نباتی نام حروف تہجی پر مرتب ہین، اور الف سے ن تک یہی ترتیب ہے، اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب النبات دو بڑے حصون پر مشتمل رہی ہے، پہلے حصہ مین مستقل مقالے تھے، جو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کئے گئے تھے، اور دوسرے حصہ مین ایک قاموس تھی"،

اس تفصیل سے متعدد اہم مسائل حل ہوتے ہین، اگرچہ اُپسالا کا نسخہ بھی اپنی جگہ کامل نہین ہے لیکن خوش قسمتی سے یہ وہ ٹکڑا ہے، جہان کتاب کی ایک اہم خصوصیت یعنی اس کی تقسیم نمایان ہے، اسی طرح اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن سمجون، الغافقی اور ابن البیطار کی جڑی بوٹیون مین

ملفوظات حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتیؒ

از

جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے پی ایچ ڈی لکچرار اسلامیہ کالج، کراچی

حضرت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی علیہ الرحمۃ المتوفی ۹۹۸ھ کے ملفوظات بحر الحقائق کے متعلق حکیم شمس اللہ قادری صاحب کی "تاریخ زبان اردو" (طبع لکھنؤ ۱۹۳۰ء ص ۲۴-۲۵) اور مولوی عبد الحق صاحب کی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" (ص ۲۵-۲۶) سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے مریدوں نے وہ مجموعہ سوال و جواب کے طرز میں مرتب کیا تھا، سوالات فارسی میں ہیں، اور حضرت موصوف کے جوابات ہندی (اردو) میں، مجھے جناب مولانا راشد برہان پوری کے یہاں ایک مختصر مخطوطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو مذکورۂ بالا ملفوظات "بحر الحقائق" کے علاوہ ہے، اس میں ۴۴ صفحات ہیں، اور آخر میں یہ عبارت ہے:-

"تمت هذا الملفوظ شاہ وجیہ الحق والدین الخلیفۃ الکامل المکمل للشیخ محمد غوث قدس اللہ سرہما وافاض علینا فیضہما آمین آمین آمین، (کاتب الحروف محمد اسحٰق ولد مرزا محمد)"

یہ کاتب مخطوطہ یعنی محمد اسحٰق اسی ملفوظہ کے مرتب (محمد) کا بیٹا معلوم ہوتا ہے، مرتب نے ص نمبر ۲ میں اپنا نام اس طرح دیا ہے،

"یقول العبد الفقیر الحقیر محمد........ چون کسے را دیدمے کہ اکثر اوقات بتلاوت می گذارد فرمودندے تلاوت کہ می کند، چرا شغل نمی کند؟ دیگر سے را فرمودندے اے

بہرحال اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مخطوطے اور نئے مخطوطے کا کوئی حصہ مشترک نہیں ہو اور دونوں مل کر کتاب کے معتدبہ حصہ پر مشتمل ہوجاتے ہیں، بعض پرانے مولفوں نے کتاب النبات للدینوری کے ذکر میں لکھا ہے، کہ وہ "ست مجلدات کبار" میں تھی، ڈاکٹر لیون کے بیان کے مطابق اُن کا مخطوطہ الجزء الخامس پر مشتمل ہے، اگرچہ جزء اور مجلد ایک ہی چیز نہیں ہیں لیکن موجودہ دونوں مخطوطے مل کر ڈیڑھ جلد نہیں تو ڈیڑھ جسزء ضرور بن جاتے ہیں، گو یہ معلوم نہیں کہ اصل میں کتنے جزء تھے، پانچ تھے، یا کم، یا زیادہ،

نوائے حیات

(طبع دوم)

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے۔ اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۲ صفحے، قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ۸ ہے،

ابن خلدون

مصر کی یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے فرنچ رسالہ کے عربی ترجمے کا ترجمہ جس میں ابن خلدون کے سوانح زندگی اور اس کے فلسفۂ اجتماعی کی تشریح و تنقید ہے،

ضخامت ۲۵۹ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

یا استفادہ؟ فرمودند، ہمین رسول کی لوگ یعنی مَن کَانَ معموراً بفیض الرسول لا یحتاج الیٰ استفادۃ مِن غَیرِہٖ،

(۳) می فرمودند، دست خضر محکم گرفتہ گفتم کہ حالِ گجرات (در قحط) چنین شدہ است، بسامان کے خواہد بود، بگو مید، گفتند آنچہ خدائے تعالیٰ اخفا کردہ است، ظاہر نکیجی، ظاہر نکیجی، دست بزور خلاص کنانیدہ بعدہ در مجلس درس حاضر نہ شدند۔

(۴) گفتم بارہا میل شود کہ این قفص تن بشکند، فرمودند، چرا بشکند؟ خاصا بنجرا ہی،

(۵) سألتُ عن تفضیل الولی علی النبّی، فرمودند، کہری نادان، کہری نادان، (کہرے = پکے)

(۶) می فرمودند، رات دن خدا جنو کی مدح کرے، (انبیا کی تعریف و تفضیل کے سلسلے مین فرمایا تھا)

(۷) میان شیخ صالح (مرید) خواستند کہ کسب کتابت کنند، فرمودند ما شطار یم، ما را کسب چہ مناسب؟ از ہر جا کہ بگیریم بخوریم، و در توحید مستغرق باشیم، بعقل زاہدانہ چرا مقید شویم، اگر قوتی شبہہ باشد، حیلہ کنید، یعنی از بقال استقراض کنید، پرسیدم کہ اشیا را اگر مظاہر تصور کنیم، چونست؟ فرمودند:- نہ نیرون تو ذوق نہووے،

(۸) می فرمودند- فیض حضرت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بہ شاہ مردان علیؓ رسیدہ و از ایشان بحضرت شیخ محمد غوث (گوالیری) قدس سرہ، و از ایشان بمن رسیدہ..... فرمودند، فلان درویش گفتہ کہ بایزیدؒ در میان اولیا چنانست کہ در میانِ انبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم، از مختلف الحرمت سوال کردم، فرمودند اتقیاء و علماء، سلاطین را بر عمل آن فتویٰ دادہ اند، باز فرمودند، آنچہ روایت در فقہ یا بد چرا نہ کند، بہو نداج ہو دی، سو نکری، (بھونڈا جو ہوے سو نہ کرے)، یعنی متفق الحرمت نباشد

می آرد، چرا شغل نمی کند"

اس عبارت کے علاوہ جگہ جگہ شطاریہ طریقے کے ذکر و شغل کی تاکید ملتی ہے، منتخب التواریخ، اور سبحۃ المرجان وغیرہ کے حوالے حکیم شمس اللہ قادری اور مولوی عبدالحی صاحب کی کتابون مین ہین، لیکن حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار مین کچھ ذاتی تعلقات اور استفادات کا حال بھی ہے فرماتے ہین،

"وفات او درسنہ سبع وتسعین وتسعمائۃ در صحن خانقاہ خود (احمد آباد) آسودہ است، محرر سطور در وقتے کہ بقصد زیارت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بدان دیار رسید، بہ ملاقات وے مستسعد شد، وبعضے از کار و اشغال سلسلۂ عالیۂ قادریہ مشرف گردید، اکنون جانشین او خلف صدق او ست شیخ عبداللہ موصوف است بعلم وحلم وریاضت وعزلت وہمت وعفت وسائر اخلاق درویشان"، (اخبار الاخیار ص ۱۵۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت وجیہ الدین اپنے شیخ حضرت محمد غوث گوالیری (المتوفی ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء) کی طرح قادریہ اذکار کی طرف بھی مائل کرتے تھے،

مرزا محمد کے اس مخطوطے مین سوال وجواب تو نہین ہین، لیکن جو ملفوظات ہین، ان مین جابجا ہندی (اردو) کے فقرے ملتے ہین، اردوے قدیم کے شائقین کے لئے ایسے بعض مقامات ملفوظ کی قدیم کتابت مین پیش کئے جاتے ہین:۔

(۱) می فرمودند۔ نزد ما شریعت وحقیقت است، طریقت نیست یعنی تکمیل بطریقت، گفتم چنانچہ آنحضرت عہد ترک بیگانہ دینداران کردہ اند، فقیر ہم کند، فرمودند چرا؟ آیا دنیاداران بیگانہ اند، دنیاداران اپنچ ہین (ہم ہی ہین)

(۲) می فرمودند۔ حضرت خضر وفقیر از مجلس درس جدا شدہ سخنان می کردیم، پرسیدہ شد، افادہ بود

(۱۸) می فرمودند، میاں صبغۃ اللہ (کہ از اولیاے گجرات) چھوڑ دی (چھوڑ دے) یعنی مسودۂ تحشیۂ شرح مُلّا (کہ شیخ وجیہ الدین نوشتہ بودند) تو ادیتی میرا جیو نکلی،

(۱۹) کسے از بندہ قرض می خواست یک ہون یا دو ہون) حضرت میاں عبد اللہ (پسر شیخ وجیہ الدینؒ) مائل بر آں بود ند کہ پرتاب بدہند، فرمودند، تمھی ایہان رہتی ہو، یعنی با اہل محلہ خود بے مروتی نباید کرد، و در آغاز صحبت، چون زیادہ ادب از بندہ دیدند فرمودند کسے کہ تعظیم من نکند من ہم تعظیمے نکنم، عزیزے نباید حضرت عطا محمد در وقت موت آنحضرت را طلب می کردند، فرمودند، ہون مَرون تو بھی کوئی نہ آدو، از تواضع مفرط و تکبر خالی بودند،

(۲۰) و بندہ را فرمودند میاں صاحب را پرسید کہ شما شراب می خورد بر گفتند آری، فرمودند ولیون کیان منصان ہوتیان ہین)

(۲۱) شکوہ کردم کم عقلی خود را، فقال منجھتی اَدکی عقل ھی (مجھ سے زیادہ عقل ہے)

(۲۲) .... قبولِ استدعاے ثمانی سوال کردم و گفتم کہ تفرقہ می دہد فرمود ند فقیر پر فرض تو نہین ....

اس مخطوطہ مین صرف مذکورۂ بالا (خط کشیدہ) فقرے ملتے ہین، ان کے علاوہ بہت سے صوفیانہ مسائل کا تذکرہ ہے، ردّ و سلبِ توجہ و استمداد، ذکر و شغل وغیرہ کے متعلق کیفیات اور واقعات ملتے ہین، حضرت شیخ کی اہلیہ "بی بی نازو" کے استغراق کا حال لکھا ہے کہ اُن کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہوا، لیکن اُنھین غم کا احساس بھی نہ ہوا، بعض متوسلین میاں ابوجی، شیخ عبد الحکیم اور شیخ عبد القیوم وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے، ایک صاحبزادے غوث اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ بادشاہ اکبران کو اپنے دربار مین بُلا رہا تھا، لیکن بے نیاز باپ نے جانے کی اجازت نہین دی، اُسی زمانہ کے سید محمد جونپوری المتوفی سنہ ۹۱۰ھ کے فرقۂ مہدویہ کے متعلق ہے :-

مکرر فرمودند، کہ ہر چیزے کہ مہیج ذوق وشوق باشد صوفی آن را ترک نکند، بملاحظہ اختلاف، بھونڈا ہوے سو ترک کرے

(۹) ...... گفتم کسے را کہ کشف خود نمی شود، در اعمال چون اختیار کند، فرمودند استخارۂ مسنون منقول کند وپس گو کشف نباشد، اپنون کون کیا فائدہ؟

(۱۰) می فرمودند کسے کہ منکر توحید و وحدتِ وجود باشد، او را تصور نقشِ اللہ و شغل طاقچہ باید فرمود، چون عمل کند، آپین جھکہ مار کر قبول کرے گا،

(۱۱) فرمودند کہ از مغلان بیاموزید کہ اسپ را می خورانند و می دوانند، دعوتِ سہ اربعین شما را کافی است، تمہاری بلا ریاضت کرے،

(۱۲) می فرمودند کہ سلوک شطاری از جملہ سلوک اسہل واز ہمہ انفع، بارہا مردم را وصیت می کردند بتاکید کہ یک گہری یا دو گہری یا چار گہری (گھڑی) در حضور ہر شغل می بودہ باشید،

(۱۳) کسے گفت کہ میان شیخ محمد فضل اللہ (برہان پوری) ترک درس کردند، فرمودند جب ترقی پکڑینگی، آپین درس کہین گی،

(۱۴) می فرمودند شیخ محی الدین ابن عربی را در امرِ فرعون مجتہد مخطی گفتند (کہ فرعون را مومن گفتہ بود)

فرمودند شیخ عربی فرشتہ بود، مثل او متقی، بر زمین پیدا شدن عجب است، اما شیخ عربی کا تقوی کہان تیرا امکان کہان (صاحبِ ملفوظ نے یہان یہ مفہوم لکھا ہے، کہ مرتبہ ما از ایشان زیادہ است)

(۱۵) می فرمودند خلفاے حضرت شاہ عالم (گجراتی - المتوفی ۸۸۰ھ) گفتند کہ اگر خدمت کنید فائدہ خواہد شد، میری تا ئین کی خدمت کی جاتی ہے، (خدمت کسے را دل نمی توانم کرد)

(۱۶) می فرمودند، سب چھوڑ بیٹھی تو سب فائدہ ہو جاتے

(۱۷) می فرمودند، وہ کیا ہوئی جو احمد آباد کے بازار مین ...... برہنہ اللہ اللہ گویان بگردد،

تلخیص و تبصرہ

حصولِ مسرّت کا طریقہ

ایک ماہرِ نفسیات (Andre Maurios) نے ایک مقالہ مین یہ بتانے کی کوشش کی ہے، کہ انسان کس طرح خوش رہ سکتا ہے، وہ لکھتا ہے۔

زندگی مین مسرّتین خارجی حالات سے حاصل نہین ہوتی ہین، بلکہ ان کا انحصار قوتِ ارادی پر ہی عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصیبت و علالت ظلم وستم اور ملک مین جنگ وجدال کی حالت مین مسرّتون کا حاصل ہونا ناممکن ہے، لیکن زیادہ تر رنج والم خیالی ہوتے ہین حقیقی نہین، ایک مشہور ڈاکٹر نے تجربون کی بناپر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کے یہان جتنے مریض آتے ہین، ان مین ہر دس مین سے آٹھ کو مطلق کوئی شکایت نہین ہوتی، ان کو کسی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ ان کو مرض لاحق ہوگیا ہے، خیالی مرض سے اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے، جتنی اصلی مرض سے ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات خیالی مرض زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے، بہت سے ایسے آدمی ہین جنھین راتون کو نیند محض اس لئے نہین آتی کہ وہ آیندہ واقعات کے تاریک پہلو سے خوفزدہ رہتے ہین، کبھی وہ یہ سوچتے ہین کہ اگر بازار کی حالت خراب رہی تو اُن کی ساری تجارت بگڑ جائے گی، کبھی اُن کو یہ خیال آتا ہے کہ سکہ کی قیمت کی کمی کی وجہ سے ممکن ہے، کہ ایک نئی عالمگیر جنگ شروع ہوجائے، کبھی اس تصور سے پریشان خاطر رہتے ہین کہ ان کا معاشقہ ناکام نہ ہوجائے، اسی طرح وہ اور بہت سے خیالی خطرات سے خواہ مخواہ رنج والم مول لیتے ہین لیکن آیندہ واقعات کو سوچ سوچ کر رنجیدہ ہونا عقلمندون کا

"می فرمودند کہ مردم تہدیہ عجب جاہلانند کہ اعتقاد ایشان آن کہ ہر کہ بگرسنگی میرد ہمان بزرگ می فرمودند کہ بدترازر وافض اند، می فرمودند کہ بعضے آشنایان کہ میل بتقیدٔ تہدیہ داشتند دبر ہمان عقیدہ مردند، توجہ کردم تا براحوال ایشان مطلع شوم احوال ایشان را بنہایت بد دیدم"

یہاں الفاظ کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر ہم صوفیۂ کرام کے ملفوظات کا بغور مطالعہ کریں تو اُن کے ذاتی رجحانات کے علاوہ اُن کے عہد کے بہت سے تاریخی واقعات اور حالات کے متعلق بھی اشارات مل سکتے ہیں۔

سلسلۂ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اب تک اس کتاب کے چھ۶ حصے شائع ہو چکے ہیں، اور ساتواں زیر تالیف ہے،

قیمت بڑی تقطیع	قسم اول	قسم دوم	قیمت چھوٹی تقطیع	قسم اول	قسم دوم
حصہ اول	.	.	حصہ اول	ھے	
حصہ دوم	ھے		حصہ دوم	۶ے	
حصہ سوم	۴ے	صہر	حصہ سوم	لعہ	
حصہ چہارم	لعہ	معہ	حصہ چہارم	۸رھے	
حصہ پنجم	۴ے	صہ	حصہ پنجم	صہر	
حصہ ششم	ے	صہ	حصہ ششم	لعہ	۸معہ

منیجر

خواہ مخواہ کفِ افسوس نہ ملا کرے گا، اوہام مین مبتلا نہ رہے گا، اور دل مین تمناؤن اور آرزوؤن کا ہجوم پیدا نہ ہونے دیگا تو پھر کوئی وجہ نہین کہ وہ خوش نہ رہے، بعض اشخاص فطری طور پر خوش رہتے ہین اور بعض فطری طور پر رنجیدہ اور ملول رہنے کے عادی ہین، مثلاً اگر موسم غیر معمولی طور پر ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ایک شخص ٹھنڈک سے لطف اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، اور بار بار موسم کی تعریف کرتا ہے لیکن دوسرا شخص ٹھنڈک سے خوفزدہ رہتا ہے کہ کہین غیر معمولی ٹھنڈک سے اس کو کوئی بیماری نہ ہو جائے،

طبیعتون مین رجائیت اور قنوطیت کا پیدا ہونا خانگی ماحول پر بھی منحصر ہے، جن ماں اور باپ کے درمیان محبت اور یگانگت اور یکجہتی ہوتی ہے، تو ان کے بچے عموماً خوش اور مسرور رہتے ہین، وہ زندگی کے تاریک پہلوؤن کی جانب بالکل نگاہ نہین ڈالتے، ان کو اگر زندگی مین ناکامی بھی ہوتی ہے تو وہ مایوس ہو کر مغموم نہین ہوتے، لیکن جن ماں باپ کے درمیان طبیعت کی یکجہتی نہین پائی جاتی اُن کے بچون سے عموماً مسرت کا مادہ مفقود ہو جاتا ہے،

ایک جھگڑالو بیوی کا شوہر عام طور پر قنوطیت پسند ہوتا ہے، اس کو زندگی مین کوئی روشن پہلو نظر نہین آتا، لیکن جھگڑالو بیوی کا قنوطیت پسند شوہر بھی قوتِ ارادی سے اپنی طبیعت کا رنگ بدل سکتا ہے اگر حسبِ ذیل باتین پیشِ نظر رکھی جائین تو طبیعت در اسکے ساتھ ساتھ کیرکٹر کا بھی رنگ بدل سکتا ہے،

ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام کرتے رہنا چاہئے، اس سے اس کو برابر خوشی حاصل ہوتی رہے گی،

جب سقراط جیل مین تھا، اور اس کو موت کی سزا دی جانے والی تھی تو سزا سے پہلے اُس نے موسیقی کا شغل شروع کیا، کسی نے پوچھا، موت کے سامنے موسیقی کی تفریح سے کیا فائدہ؟ سقراط نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ موت سے پہلے اس کی لذت سے آشنا ہونا چاہتا ہون،

جس چیز پر اپنا کوئی اختیار نہ ہو اس کے لئے ملول خاطر ہونا فضول ہے، بعض لوگ اس لئے مغموم رہتے ہین کہ ایران مین سیاسی واقعات اُن کی خواہش کے مطابق ظہور پذیر نہین ہو رہے ہیں،

کام نہین،

حقیقی مصیبت بھی مسرت مین تبدیل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ صحیح معنون مین قوتِ ارادی موجود ہو، اگر کوئی علیل ہے تو وہ اس علالت کا بھی بہترین مصرف لے سکتا ہے، مثلاً وہ اس کے ذریعہ اپنے مین صبر و تحمل کے اوصاف پیدا کر سکتا ہے۔ یا علالت کی تنہائی مین مطالعہ یا غور و فکر مین اپنے وقت کو مفید طریقے سے گذار سکتا ہے،

بہت سی ایسی مثالین ہین کہ مصیبتون نے اُن کے مبتلا اشخاص کو جری اور بہادر بنا دیا، اور وہ محض آلام و مصائب کی وجہ سے اپنی روح کے نگران بن کر دوسرون کے رہنما اور رہبر ثابت ہوئے بہادر آدمیون سے ان کی موت بھی ان کی خوشی چھین نہین سکتی، سقراط کو جب جیل مین اس کی قسمت کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو اس وقت بھی وہ مسرور اور باوقار رہا۔ اور اس کی مسرت اور وقار سے اس کے ساتھیون کی ہمت قائم رہی،

خارجی اثرات سے حصول مسرت مین کچھ مشکلات ضرور ہین، لیکن ان کی وجہ سے مسرت کا حصول ناممکن نہین، لیکن اگر کوئی شخص اپنے کو ہر حال مین تکلیف دینے اور رنج ہو جانے ہی کے لئے آمادہ ہو تو پھر اس کا کوئی علاج نہین، اس کے لئے دنیا کی ہر چیز باعثِ تشویش ہو سکتی ہے، بعض خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہین جن کو دولت و ثروت، عمدہ صحت، اچھی رفیقۂ حیات، اور خوبصورت اولاد، ساری نعمتین حاصل ہوتی ہین، پھر بھی وہ اس خوش قسمتی پر ناز نہین کرتے، ان کو ہمیشہ یہی پریشانی رہتی ہے کہ کہین ان کی دولت برباد نہ ہو جائے، ان کی صحت بگڑ نہ جائے، اور اُن کے بچے بیمار نہ ہو جائین، ایسے لوگون کو دنیا کی کوئی چیز مسرت نہین بخش سکتی، ہان اگر کوئی شخص خوش رہنا چاہتا ہے، تو وہ چھوٹی چھوٹی باتون سے بھی خوش رہ سکتا ہے، خوش رہنے کے لئے صرف ذہنی سکون ضروری ہے، اور ذہنی سکون قوتِ ارادی سے حاصل ہو سکتا ہے، اگر ایک شخص ارادہ کر لے کہ وہ ہر بات پہ

کتب بینی کا شغف

ڈاکٹر جانسن کا قول تھا کہ جو شخص روزانہ چار گھنٹے کتابوں کا مطالعہ کرے، وہ یقیناً صاحب علم ہو جائے گا، لیکن اب ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ جن کو پڑھنے کا اتنا غیر معمولی ذوق رہا ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو یقین کرنا مشکل ہو جائے گا، جیسے کہ لارڈسن کے بارہ میں مشہور ہے کہ جب وہ آکسفورڈ میں تعلیم پا رہا تھا تو اس وقت اس نے وہاں کے کتب خانہ کی ساری کتابیں پڑھ ڈالی تھیں، کہا جاتا ہے کہ اس نے چھ سال میں پچاس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا یعنی اوسطاً (۲۰) کتابیں روزانہ پڑھتا تھا، وہ تین سال تک رات دن ایک کرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا، نیند آتی تو اسی گلدستہ پر تھوڑی دیر سو رہتا، اٹھ کر دو گھنٹے مسلسل پڑھتا تھا، بڑی ضخیم اور بڑی کتاب کو دو گھنٹہ میں پڑھ ڈالتا تھا،

لارڈسن کے بعد مشہور ولیم ہارکسن فی کول کا نمبر ہے، وہ برٹش ... کا لیڈر تھا، اس کے ذاتی کتب خانہ میں بیس ہزار کتابیں تھیں، کتب خانہ پر اتنا حاوی تھا کہ جس کسی کتاب کو چاہتا آنکھ بند کر کے اٹھا لیتا، اور اگر کسی کتاب سے کوئی اقتباس لینا ہوتا، تو اسی صفحہ کو کھولتا جس میں وہ ہوتا، وہ جب کسی سفر میں جاتا، تو استعمال کے ضروری کپڑے چھوڑ دیتا لیکن کتابیں ضرور ساتھ لے لیتا، اس کی ہر جیب میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی، ہر سال ہزاروں کتابیں پڑھتا، اور بڑی تیزی سے ان کو ختم کرتا، اس کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ ایک پیراگراف یا ایک پورا صفحہ صرف ایک مرتبہ نظر ڈالنے میں یاد ہو جاتا، مشہور ہے کہ جتنی دیر میں کوئی دوسرا شخص ایک جملہ پڑھتا، اتنی دیر میں وہ ایک صفحہ ختم کر دیتا، اس کا خود بیان ہے کہ وہ نصف گھنٹہ میں بیس ہزار الفاظ پڑھ سکتا ہے، دن بھر میں دو کتابیں ختم کرتا تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر ہفتہ ۳۵ ہزار الفاظ بھی لکھا کرتا تھا،

یا انڈونیشیا کے انقلابات سے ان کو دکھ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ گھر بیٹھے نہ ایران کے لئے کچھ کرسکتے ہیں نہ انڈونیشیا کو مدد دے سکتے ہیں، پھر ان کے لئے رنجیدہ ہونا بالکل بیکار ہے، تمام ملکوں کے واقعات سے باخبر رہنا تو بالکل صحیح ہے لیکن وہاں کے ناخوشگوار واقعات کے لئے کڑھنا اور پریشان ہونا بالکل غلط ہے،

ماضی کی غلطیوں کو ہمیشہ بھلائے رکھنا چاہئے، بہت سے افراد ایسے ہیں، جو اگر ماضی کی ناگوار باتوں کو بھلا دیں تو بہت خوش رہ سکتے ہیں، میاں بیوی کے تعلقات کی خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دونوں اپنے دلوں میں گذشتہ باتوں کے متعلق کچھ نہ کچھ خلش رکھتے ہیں، اور یہ خلش بات بات پر ظاہر ہوتی رہتی ہے جس سے دونوں کے تعلقات کی خرابی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، جو شخص ماضی کی ناگوار باتوں کو دل میں پرورش کرتا رہتا ہے، وہ لوگوں کو اپنا دشمن زیادہ بناتا ہے اور دوست کم، عقلمند آدمی ماضی کی ناخوشگواریوں کو نظر انداز کرکے صرف حال سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں،

مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ رکھنا بھی صحیح نہیں، مآل اندیشی اور دور بینی بھی ضرور ہیں [illegible] کا ایسا ہوائی قلعہ کھڑا کرنا ایک احمقانہ فعل ہے، آئندہ واقعات پر مطلق کسی کو قابو نہیں ہوتا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ زندگی کے آئندہ واقعات پر قابو حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا، بڑا وصف یہی ہے کہ انسان زندگی کے تغیرات پر قابو پا سکے اور اپنے کو ہر وقت طمانیت میں رکھے، یہ طمانیت اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب انسان ذہنی انتشار اور اختلال سے بالکل آزاد ہو اور [illegible] اپنی ذات پر منحصر ہے، اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ اپنی ذات ہی سے خوشی حاصل کی جا سکتی ہے، کوئی دوسرا شخص کسی کو خوشی عطا نہیں کر سکتا،

ص ع

کتاب ساتھ لیجاتا، وہ کہا کرتا کہ ایک کتاب میں خواہ وہ کیسی ہی خراب کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ اچھی باتیں ضرور مل جاتی ہیں، اس لئے کسی کتاب کا مطالعہ رائگان نہیں جاتا،

ایسے لوگوں کا حافظہ بھی غیر معمولی قوی ہوتا ہے، سر جیمز میکن ٹوش کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب اسنے نہ پڑھی ہو اور جب کسی مصنف کی کسی رائے کا ذکر آجاتا، تو وہ بلا تکلف اس رائے کے اصلی الفاظ کو دہرا دیتا، اور جس کتاب کے جس صفحہ پر وہ رائے ہوتی، اس کو بھی بتا دیتا،

ڈاکٹر سموئیل کلارک کی جیب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی، اور وہ جو کچھ پڑھتا، اس کو یاد رکھتا، بن جانسن کو بہت سی کتابیں زبانی یاد تھیں، رابرٹ براوننگ بعض اقتباسات اپنے حافظہ سے اس طرح دہراتا کہ معلوم ہوتا کہ اصل کتاب دیکھ کر پڑھ رہا ہے،

جیرمی بنتھم کو بھی بچپن ہی سے کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا اور جب وہ پانچ سال کا تھا تو لوگ اس کو فلسفی کہا کرتے تھے، بلکہ پانچ سال کی عمر سے بھی پہلے ایک دن وہ مشہور مورخ ریپن کی کتاب تاریخ انگلستان پڑھتا دکھائی دیا، ایزک ڈنٹیں تین سال کی عمر میں آسانی کے ساتھ انجیل پڑھ لیتا تھا، جب اس کو کوئی پیسے دیتا تو وہ اپنے باپ کے پاس دوڑ کر جاتا، اور کہتا ان پیسوں سے مجھکو کوئی کتاب خرید کرا دیجئے، اسی عمر میں جوتھن سولفٹ انجیل کے مشکل حصوں کو آسانی سے پڑھ لیتا تھا، "ص، ع"

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا ان کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات، اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے، قیمت سے ر "منیجر"

آئرلینڈ کا ایک پروفیسر ہر چوبیس منٹ مین ایک ناول ختم کر دیتا تھا، اور جس دن چھٹی ہوتی تو اس دن نصف درجن ناول ضرور پڑھتا،

میکالے نے تین ہی سال کی عمر مین کتابون کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، اور اسی عمر سے زیادہ تر کتابی الفاظ بولا کرتا تھا، ایک بار اس نے اپنی بہن کو ایک خط مین لکھا کہ اس کی خواہش ہے کہ اسکو کسی بڑے کتبخانہ مین دفن کر دیا جائے، اور بیداری کی حالت مین کوئی لمحہ بھی اس کی نظرون سے کتاب علحدہ نہ ہو، ایک بار جب وہ لندن سے آئرلینڈ جا رہا تھا، تو راستے ہی مین ریخ کی ایک ضخیم کتاب (Lives of Emperors) کا بیشتر حصہ ختم کر دیا، ۱۸۳۴ء مین ہندوستان آرہا تھا، اس سفر مین وہ صرف کھانے کی میز پر تو کسی سے بول لیتا، ورنہ سارا وقت یونانی لاطینی اسپینی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی کتابین پڑھتا رہتا، وہ لندن اور سورے کی سڑکون پر گھومتے وقت بھی کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا، ایک بار ورسسٹر اور میل ورن کے درمیان ٹہلنے کے دوران مین اوڈیسی کی چودہ کتابین ختم کر دین، وہ جب کسی کتب فروش کی دوکان پر پہنچ جاتا، تو دوکان کی تمام کتابون پر ایک نظر ڈال لیتا، اور جب تک دوسرے خریدار ایک کتاب خریدنے مین لگے رہتے وہ کتابون کا ایک ڈھیر خرید لیتا،

مشہور مورخ گبن جب اپنی تاریخ رومن امپائر لکھ رہا تھا، تو روزانہ بارہ گھنٹے پڑھا کرتا تھا، اس کو مطالعہ مین ایسی لذت ملتی تھی کہ کہا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان کی ساری دولت کے بدلے بھی اس لذت سے کنارہ کش نہین ہو سکتا،

کارلائل کا دعوی تھا کہ کوئی کتاب خواہ کیسی ہی ادق اور کیون نہ ہو، وہ تھوڑی سی دیر مین اس کی مشکلات کو حل کر کے اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے،

روما کے قدیم عہد مین پلینی کو بھی کتابون سے بڑا شغف تھا، وہ غسلخانہ مین بھی پڑھنے کے لئے

ادبیات

غزل

از جناب شفیق جونپوری

کون کرتا تجھے اے خانۂ ویراں آباد
تا قیامت رہے میری شبِ ہجراں آباد

حسن کی گرمیٔ بازار فقط عشق سے ہے
چند دیوانوں سے ہے کوچۂ جاناں آباد

انقلابات تو آتے ہی رہیں گے ساقی
تو سلامت رہے میخانے کی گلیاں آباد

زلفِ جاناں شبِ فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو
تیری نکہت سے رہے شامِ غریباں آباد

دیکھتے جائیے اجڑے ہوئے غم خانہ کو
تھا اسی گھر میں کوئی بے سر و ساماں آباد

اے فلک تجھکو مبارک مہ و انجم کی ضیا
آنسوؤں ہی سے رہے دیدۂ گریاں آباد

دیکھیے گا میری شوریدہ فراقی کو دنیا
کون کرتا ہے دیارِ غم و حرماں آباد

چاندنی ہو کہ نہ ہو شمع جلے یا نہ جلے
تیری بستی رہے میرا دلِ سوزاں آباد

کر گئے تیرگیٔ غم کے حوالے تم بھی
نہ ہوئی میری غریبی کی شبستاں آباد

نہ سہی بالشِ زر زانو کا سہارا نہ سہی
تیری آغوش رہے اے غمِ جاناں آباد

آہ اس گھر کی تباہی کا سماں کیا کہیے
کر چکا ہو جسے کوئی رخِ پنہاں آباد

بلبلیں چپ ہوں میں گلزار پہ چھایا ہو سکوت
ہائے کس گل نے کیا شہرِ خموشاں آباد

تجھ سے روشن تھا مرے دل کی امیدوں کا چراغ
تو کہاں جا کے ہوا اے مہِ تاباں آباد

مطبوعات جدیدہ

آثار ابوالکلام آزاد نفسیاتی مطالعہ | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۲۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت نفیس قیمت تحریر نہین، پتہ: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکشنز لمیٹڈ نیشنل ہاؤس اپالو بندر بمبئی نمبرا،

یہ معلوم و مسلم ہو کہ جس طرح ہر زمانہ کا ادب اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہو جس مین اس دور کی خصوصیات نظر آتی ہین، اسی طرح اشخاص کی تحریرین ان کی نفسیات کا آئینہ ہوتی ہین جن سے ان کا نفسیاتی مرقع تیار کیا جا سکتا ہو، مصنف نے اس کتاب مین اسی نقطۂ نظر سے مولانا ابوالکلام کی تحریرون سے ان کی نفسی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے، یہ بھی اصحاب علم و نظر سے مخفی نہیں کہ مولانا مجتہدانہ دل و دماغ رکھتے ہین، اور ان کے علم و فن، تحریر و تقریر، افکار و تصورات، زندگی کے ہر شعبہ مین انفرادیت کا بانکپن، اور عبقریت کی شان پائی جاتی ہے، جو اُن کی تحریرون مین بھی نمایان ہے، مصنف نے تذکرہ، الہلال، البلاغ اور غبار خاطر کی تحریرون سے علم و فن، دین و ملت، قومیات، سیاسیات اور مولانا کی نجی زندگی مین جہان تک ان کی دسترس ہو سکی ہے، مولانا کے فکری اجتہادات اور انفرادیت کے جلوے دکھانے کی کوشش کی ہے، لیکن جیسا کہ خود مصنف کو اعتراف ہو کہ مولانا کی شخصیت عام انسانون سے اس درجہ مختلف ہو اور اس پر انفرادیت کے اتنے تو بہ تو حجابات پڑے ہین کہ محض نوک قلم سے اُن کو ہٹانا آسان نہین ہے، اور مولانا کی حریم عظمت عام نگاہون کی رسائی سے اتنی دور ہے اور اُن کی شانین اتنی مختلف ہین کہ ہر نگاہ وہان تک نہ پہنچ سکتی ہے، اور نہ ان کا احاطہ کر سکتی ہے

بیمارِ عشق نزع مین لیتا ہی ہچکیان   پر تولتا ہے مرغِ غریب الوطن ابھی
فصلِ جنون پھر آگئی عمرش دراز باد   تیار ہو رہا تھا نیا پیرہن ابھی
ہر دگی زبانِ دہر پہ کل میری داستان   سُن لیجئے فسانۂ گنگ و جمن ابھی
تکمیلِ ذوقِ عشق ہوئے شامِ زندگی   ہی ناتمام قصۂ دار و رسن ابھی

کیا روحِ نجم بادِ مخالف نے پھونک دی
سونی پڑی تھی محفلِ شعر و سخن ابھی

غزل

از

جناب ندیم جعفری ڈیرہ غازیخان

حسرتِ دید بہ امکانِ نظر باقی ہی   یہی الزامِ تمنا میرے سر باقی ہی
رات دن آگ برستی ہی نشیمن پہ مرے   ابھی ہنگامۂ صد برق و شرر باقی ہی
عاشقی موردِ الزام نہ ٹھہرے جبتک   غلبۂ حسنِ مراعاتِ نظر باقی ہی
آبِ سادہ ہوئے ہر چند سرشکِ گلگون   ابھی فریاد مین کچھ رنگِ اثر باقی ہی
کشتیِ عشق کو تا ساحلِ مقصد لے چل   جوشِ گریہ اگر اے دیدۂ تر باقی ہی
ڈھل چکی رات وہ آئے ہین نہ آئینگے کبھی   دل کو امید مگر تا بہ سحر باقی ہی

سجدہ ریزی کے لئے کیون نہ ہون مجبور ندیم!
چلدیئے وہ، کششِ راہ گذر باقی ہے

سے بعض پہلوؤن پر نگاہ کھٹکتی ہے، لیکن جن لوگون کو اس قسم کی کتابون کا ذوق ہو، یہ تلخیص اُن کے مطالعہ کے لائق ہے، از مولانا عبد الرحمٰن کے متوسلین کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت قابل قدر ہے،

دلائل صدق رسالت از مولانا عبد القدوس صاحب رحمانی، تقطیع بڑی ضخامت ۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ ناظم شعبۂ نشر و اشاعت مدرسہ جھنڈا انگڑو ڈاکخانہ رامدت گنج ضلع بستی،

اس کتاب مین جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل دیئے گئے ہین، کتاب کے شروع مین رسالت کی ضرورت، وحی، عصمت انبیاء، رسول کریم صلعم کی بشریت پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد آپ کی نبوت کی صداقت کے مفصل عقلی نقلی اور تاریخی شواہد و دلائل جمع کر دیئے ہین، اس موضوع پر پرانے مذہبی لٹریچر کو چھوڑ کر اس مین بھی موجودہ مذاق کے مطابق اردو مین بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اگر مصنف اس پر نگاہ ڈالے ہوتے، تو یہ کتاب اس سے بہتر شکل مین اور زیادہ مفید ہوتی، موجودہ شکل مین بھی وہ عام مسلمانون کے لئے مفید ہے،

ہدیۃ الحکمۃ مرتبہ مولوی عبد الشاہد خان شروانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ، پتہ زاویہ علیہ محمد علی منڈو بالاسے قلعہ علی گڈھ

ہندوستان کے پرانے علمی دور کے آخر مین مولانا فضل حق خیر آبادی، اور اُن کے صاحبزادے مولانا عبد الحق معقولات کے امام تھے، اور اس کے بیشتر درسی سلسلے انھی پر منتہی ہوتے ہین، مولانا عبد الحق نے اس زمانہ کے مبتدی طلبہ علم سنجیدہ علوم پر اردو مین کچھ لکھا تھا، جن مین سے فن منطق اور فلسفہ پر دو رسالے ہدیۃ الحکمۃ اور یادگار رسالہ اردو مین لکھے تھے، جو مصنف کی وفات کے بعد ۱۳۲۳ھ مین شائع ہوئے تھے، لیکن اب وہ نایاب ہین، اس لئے اس سلسلہ کے

ہر شخص صرف اپنی حد نظر تک ان کو دیکھ سکتا ہے، اس لئے مصنف کا قلم زور انشاء کے باوجود کامل معقولی سے قاصر رہا تاہم حسنِ عقیدت اور حسنِ انشاء کے زور سے اس سے بہتر تصویر ممکن نہ تھی، اس لحاظ سے کتاب مولانا کے ساتھ مصنف کے نفسیات اور کمالِ فن کا بھی مرقع ہے، اور اس سے اردو ادب لطائف میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے،

نور الرحمن از جناب مولوی نور الرحمن صاحب بچھرایونی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۴ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے مرتبہ (۱) شاہ خلیل الرحمن صاحب سجادہ نشین، درگاہ مولانا عبد الرحمن صاحب ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ (۲) اردو بک اسٹال بچھرایون ضلع مراد آباد،

حضرت مولانا شاہ عبد الرحمن صاحب موحد لکھنوی المتوفی ۱۲۶۵ھ اپنے دور کے جلیل القدر صوفی درویش کامل اور وحدۃ الوجود کے بڑے عارف و مبلغ تھے، ترک و تجرید میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا، اُن کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ باختصاص مولوی نور اللہ صاحب بچھرایونی نے اُن کے حالات و ملفوظات میں ایک کتاب نور الرحمن تبویب انجان فارسی میں لکھی تھی، جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے لیکن اس کی زبان اور ضخامت کی وجہ سے ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لئے مولوی نور الرحمن صاحب نے جو مولوی نور اللہ صاحب کے احفاد امجاد میں ہیں، بڑے سلیقہ سے اردو میں اس کے اہم ابواب کی تلخیص کی ہے، اس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح، اخلاق و سیرت، ارشاد و ملفوظات اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر مولانا کے خیالات وغیرہ جملہ ضروری حالات آگئے ہیں، اور اردو دان طبقہ کے لئے بھی اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہوگیا ہے، وحدۃ الوجود کی بحث اردو میں غالباً ناقابلِ فہم ہونے کی وجہ سے اصل فارسی میں رہنے دی گئی، درحقیقت اس قسم کے مباحث عوام کیا خواص کے لئے بھی نہیں ہیں، بلکہ شخصی ذوق و وجدان سے تعلق رکھتے ہیں، مذہبی نقطہ نظر

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت تعلیم سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- [illegible] صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشا کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت :- [illegible] صفحے،

قیمت :- [illegible]

منیجر

ایک ہونہار فرزند مولوی عبدالشاہد خان نے اُن کو دوبارہ مرتب کرکے شائع کیا ہے، انکی خوبی کے لئے مصنف کا نام نامی پوری ضمانت ہے، گو ان کی زبان آج سے نصف صدی سے بھی پہلے کی ہے، تاہم فن کے مسائل کو پرانے ژولیدہ طرز کے بجائے سلیس اور سلجھے ہوئے انداز مین سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، اب ان علوم کا چرچا کم بلکہ ختم ہوگیا ہے تاہم یہ دونون رسالے تاریخی یادگار کی حیثیت سے قابل قدر ہین، اور عربی مدارس کے طلبہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتے ہین، کتاب کے شروع مین مرتب کے قلم سے مصنف کے خاندانی حالات، اور فن منطق و فلسفہ کی مختصر تاریخ ہے،

چھان بین از جناب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ، پتہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ،

مصنف کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، وہ فن شاعری مین استادی کے ساتھ اردو زبان کے بھی مشہور و مستند ادیب و نقاد ہین، مذکورۂ بالا کتاب اُن کے پندرہ ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، ان تمام مضامین مین اُن کی ادبی بصیرت و دیدہ وری نمایان ہے، اردو شاعری اور زبان و ادب کی اصلاح و ترقی اور دور جدید کے گمراہ ادیبون کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے، امید ہے کہ ادبی حلقہ مین یہ مجموعہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا،

آسان حج مترجمہ جناب عبدالرزاق سعید صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ:- ادارہ تبلیغ الاسلام نمبر ۲، اٹن ٹن پورہ اسٹریٹ بمبئی نمبر ۹،

یہ سید امیر محمد بن اسمٰعیل یمانی کے ایک عربی رسالہ کا جو مسائل حج پر ہے، اردو مین ترجمہ ہے، اس مین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حج کی روشنی مین مناسک حج اور اس کے مسائل بیان کئے گئے ہین، اسی کے ساتھ مناسک حج اور مدینہ طیبہ کی حاضری کے آداب پر ایک اردو نظم بھی ہے، گو رسالہ مختصر ہے، لیکن مفید ہے،

"ض م"

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۱

ستمبر ۱۹۵۵

معارف

مجلس المصنفین کا علمی ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت: چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگان دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت:- ؎

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) **منیجر**

جلد ۶۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

باب المراسلہ والمکاتبہ

استفسار وجواب

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح قدیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیرِ طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۵۵ صفحے قیمت: ؏

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۲۳ صفحے

قیمت:- ؏

مجلد

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۴۹ء سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت ؏

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت:- ۳۳۲ صفحے

قیمت:- ؏

مجلد

سخن فہم اور سخن گو تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف، ایک مجموعۂ مضامین مقالات شروانی اور دیوان فارسی، ان کی علمی یادگار ہیں، نادر کتابوں کا بڑا شوق تھا خود اپنی تلاش و محنت اور زر کثیر صرف کر کے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، اس کو اپنی زندگی میں مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے،

ان کی ذات میں جدت و قدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے، ان کا وطن علی گڈہ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکوں کے حامی و مددگار تھے لیکن اس کے سحر سے مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب میں بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے، قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی، ان کی تحریروں میں جہاں اس کا ذکر آجاتا، اور ان کی بہت کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھیں، ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار و گفتار نشست و برخاست ہر چیز میں تہذیب و نفاست نمایاں تھی، بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے، بڑھاپے کے نور نے اس میں اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کر دی تھی، زندگی کے تمام معمولات میں وضعداری کی شان تھی، پوری زندگی کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا، اُن کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگوں کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا، لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے اور ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے اُن کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، جو اُن کے بعد وراثۃً ارکان دار المصنفین کے حصہ میں آئے اور

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہو گئی جس سے مدتون بزم کمال منور رہی یعنی ۱۱ راگست کو نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر مین اس خاکدان سفلی کو الوداع کہا، عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والون کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہو جاتی ہے، مولانا شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات انہی مین ہے، وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل، فضل و کمال، دین و تقوی، وقار و متانت، اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، اکامل ساٹھ سال تک مسلمانون کی قومی زندگی سے وابستہ رہے، اس لئے اُن کی وفات شخصی نہین بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرقع کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے،

—— ◦ ——

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیاوی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے، اور اپنے اوصاف مین دورِ زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے شیدائی اور سرپرست تھے، اُن کی پوری زندگی علمی مشاغل مین گذری، مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ان کا نمایاں حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرستہ العلوم، مسلم یونیورسٹی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین، معاون و مددگار، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری، انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دار المصنفین کے صدر نشین تھے، عرصہ تک ریاست حیدرآباد کے شعبۂ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے، اُن کے خدمات کی فہرست بہت طویل ہے، کوئی علمی و تعلیمی ادارہ اُنکی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف مین ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی،

—— ◦ ——

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج،

از مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

یہ ثابت ہونے کے بعد کہ جزیہ موجودہ معاشی معیار سے ایک بہترین محصول ہے، آیندہ یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام کے علماے معاشیات نے اس پرکس حیثیت سے بحث کی ہے، ہم نے جہاں جزیہ کے سات نظریات بیان کئے ہیں، وہین مبسوط کے حوالہ سے یہ بھی دکھایا ہے کہ جزیہ کی حیثیت محصول مکان کی ہے، یہ حیثیت کس طرح نمایان کی گئی ہے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

معاشیات کے متعدد مسائل کی طرح محصول مکان کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے، تاہم مختصراً بعض اہم پہلوؤن پر روشنی ڈالی جاتی ہے، محصول سے مراد مکان کی ملکیت کا خراج ہے لیکن اسلام نے غیر مسلمون کے ساتھ جو رعاتیین کی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ مکان کو غیر مسلم کی ملکیت[1] تصور کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ملکیت کا محصول طلب نہین کرتا، بلکہ سکونت کا محصول مانگتا ہے، اس طرح زمین کے متعلق مکاندار کی اصل پوزیشن کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلام وصولی محصول کے وقت اس کو گرایہ[2] دار فرض کر لیتا ہے،

[1] مبسوط ص ۸۱ جلد ۱۰ قانما الیسکن دار نفسہ یہ مصنف کا نظریہ ہے۔ [2] ایضاً ص ۸۸ جلد ۱۰ ولا یسکن مین المسلمین فی دار الغیر الا بکراء یہ معاشی علمار کا خیال ہے،

آخر تک برابر قائم رہی، وہ دار المصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کیساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی جب آتا ہوتا تو بلا لحاظ عمر و مرتبہ ہر شخص کی قیامگاہ پر جاکر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت و حالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملیگی

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دور اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملے گا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اَللّٰھُمَّ صبب علیہ شَآبِیبَ رِضْوَانِكَ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

دار المصنفین کے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، اس لئے آئندہ کسی نمبر میں انکے تفصیلی حالات پیش کئے جائینگے۔

اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا تھا، کہ سیوہارہ کے کسی تاجر کتب نے سر اقبال مرحوم کی بعض کتابیں چھپوائی ہیں لیکن پھر اخبار الجمعیۃ کے بیان سے معلوم ہوا، کہ کتابیں حیدرآباد کے کسی تاجر نے چھپوائی تھیں اور سیوہارہ کے تاجر نے صرف اُن کے ٹائٹل چھپوائے ہیں، جس نے بھی کتابیں چھپوائی ہوں ہندوستان کے کسی شخص کا پاکستان کی کتابیں چھپوانا صد درجہ نازیبا اور بڑا اخلاقی جرم ہے، اگر یہ صورت قائم رہی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفوں اور علمی و تجارتی اداروں کو بڑا نقصان پہنچے گا، اور قانونی بندش کے بغیر محض اخلاقی اثر سے اس کا انسداد نہیں ہو سکتا، اور دونوں ملکوں کا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے اس لئے انکی حکومتوں کو اس کی جانب توجہ کرنا چاہئے، اور ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ایک ملک کی کتابیں بغیر اجازت کے دوسرے ملک میں نہ چھپ سکیں، اور اخبارات کو ایسے جری اور بددیانت ناشروں کا پردہ فاش کرنا چاہئے، کہ اس سے کچھ تو ان کو عبرت حاصل ہو۔

اسلام کو اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہین کہ اوس نے فرقہ وارانہ محصول غیر مسلمون پر قائم کیا تھا، اور اس طرح معاشی حیثیت سے ایک فاش غلطی کی تھی، نظریۂ ثنویت کے یہ مبلغین جب اس الزام کا اعادہ کرتے ہین تو ان کے چہرون پر فرحت و انبساط کی لہرین دوڑنے لگتی ہین، ہم الزامی جواب کے طور پر اگرچہ اس سلسلہ مین انگلستان کی تاریخ کے اس دور کو پیش کر سکتے ہین جس مین ٹیوڈر خاندان حکمران تھا، لیکن ایسا کرنے سے صرف ایک عیب کی پردہ پوشی ہوگی، جس کو ممکن ہے کہ معاشیین کے لائق اور تعلیم یافتہ دماغ اپنی توہین خیال کرین، اس لئے ہم اصل حقیقت پر متوجہ ہوتے ہین،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ محصول کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان مین دو لفظ پہلے سے موجود تھے، خراج اور جزیہ، اور دونون فرقہ واری اور ذلت کے مفہوم سے خالی تھے، اسلام کے بعد زمین کے محصول کا اصلاحی نام خراج رکھا گیا، جو (Land Tax) کا مرادف ہے، انسانون کی آمدنی کے محصول (Income Tax) کے دو نام رکھے گئے،

(۱) اگر وہ بار سیکڑہ کی شرح یا دوسری شرحون سے قائم کیا گیا ہو، اور اس کا طریقہ آج کل کے محصول مجموعی (Plural Taxation) کا ہو تو اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور یہ مسلمانون سے لیا جاتا ہے، اس مین بہت سی چیزون کی زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی زکوٰۃ دینے والون پر مساوی بار پڑتا ہے)

(۲) اور اگر محصول مجموعی کے طرز پر ہونے کے باوجود مختلف طبقون کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف شرحون سے قائم کیا گیا ہو، تو اس کا نام جزیہ ہے، اور غیر مسلمون سے لیا جاتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ اور جزیہ کے نامون کا فرق، فرقہ وارانہ جذبات کی وجہ سے نہین پیدا ہوا بلکہ شرح محصول کے اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے جس طرح انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، امپیریل ٹیکس، پرسنل اینڈ فرنیچر ٹیکس وغیرہ علٰحدہ علٰحدہ نام شرحون کے مختلف ہونے کی وجہ سے رکھے گئے ہین،

اور اس پر ہلکا ٹکس لگتا ہے، پھر دوسری رعایت یہ بھی ہو کہ ۲۰۰ درہم سے کم آمدنی والے پر کرایہ کا کوئی محصول نہین اور وہ مستثنیٰ ہے،

مسلمان معاشی علما نے محصولِ مکان کے نظریہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فقیر کو مکان کے لئے ایک درہم (چار آنہ) ماہوار دینا کافی ہے، متوسط الحال کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے، اس لئے اس کا دوگنا (دو درہم یا آٹھ آنے ماہوار) ہونا چاہئے، اور جو بہت بڑا غنی ہو، اس کی بھی یہی حالت ہو، (یعنی اس کو متوسط الحال سے بھی زیادہ بڑے مکان کی ضرورت ہوتی ہو) اس لئے دو درہم کا دوگنا چار درہم یا ایک روپیہ ماہوار اس کا کرایہ ہونا چاہئے، یہ نظریہ مبسوط (ص ۸۰، جلد ۱۰) مین درج ہے، اور اس کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو مالی حالت کا معیار فرض کیا گیا ہے،

گذشتہ عنوان مین جن چھ قانونون کا حوالہ دیا گیا ہے، جزیہ محصول مکان ہونے کے بعد بھی ان کا پابند نظر آتا ہے، مثلاً اس کی پیداآوری یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم سے کم مالیت والون پر عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی مقدار معقول رہتی ہے، کفایت یہ ہو کہ اس کی فراہمی مین زیادہ خرچ نہین پڑتا، نہ مقدار معین سے زیادہ دینا پڑتا ہے نہ ترقی دولت اور مرفہ الحالی مین مزاحم ہے، کیونکہ اس کی شرح مناسب ہو، عدل یہ ہو کہ کرایہ مکان (دراصل خود مکان) کی حیثیت مکاندار (اب کرایہ دار) کی مالی حالت کے مطابق ہے، (بلکہ دراصل مکان کی حیثیت کرایہ سے بدرجہا زیادہ ہے) تغیر پذیری یہ ہے کہ معاشی ترقیون کے ساتھ مکانات کی قیمت اور کرایہ بڑھتا رہتا ہو، تعین خود اختیاری ہے، سہولت ظاہر ہے،

کیا جزیہ فرقہ وارانہ محصول ہو؟ | معاشیات مین یہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک مین فرقہ وارانہ محاصل قائم کئے جائین، ہمارے ملک کے سفری پرندے جو بقول مسٹر ہینڈ ہندوستان کے ذریعہ انگلستان کو تونگر بنانا چاہتے ہین[۵]

---

[۵] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص ۴۳، از جے سی، کمان، ریا ایم اے، بی ڈی ایس سی، مترجمہ قاضی محمد حسین بحوالہ انڈین اوسکلگ،

۲۵ ہزار سے لے کر زیادہ	ا رفی روپیہ

۱۹۱۸ء میں سوپر ٹیکس (Super tax) حسب ذیل ہوگا،

۲۵ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک	۱۰ رفی روپیہ
۵۰ " ایک لاکھ	۲ " "
ایک لاکھ " ڈیڑھ لاکھ	۲۰۳ "
ڈیڑھ لاکھ " دو لاکھ	۳ " "
دو لاکھ سے لیکر ڈھائی لاکھ تک	۳۰۳ "
ڈھائی لاکھ " اوپر	۴ " "

یہ بھی واضح رہے کہ اس میں عورتیں، بچے، پاگل، بوڑھے، اپاہج، اور ہر صاحب آمدنی جو ایک ہزار سے اوپر کماتا ہو سب شامل ہیں، ٹیکس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے، جو ایک ہزار روپیہ سے کم آمدنی رکھتے ہیں، وہ مستثنیٰ ہیں، خواہ تندرست ہوں یا بیمار، عورتیں ہوں یا مرد، بوڑھے ہوں یا بچے،

جزیہ کی شرح یہ تھی، (اور ہمیشہ یہی رہی)

نو نصاب رقم ﷲ تک	۱۲ رسالانہ
ﷲ سے لے کر ڈھائی ہزار تک	۱۳ رسالانہ
ڈھائی ہزار سے " اوپر	عہ "

یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ عورتیں، بچے، اور مخبوط الحواس جزیہ سے بالکل مستثنیٰ تھے، ان کے علاوہ اور لوگ جن کا کاروبار چلتا ہو خواہ اس کو وہ خود چلاتے ہوں، یا کارندوں کے ذریعہ سے انجام پاتا ہو،

ف معارف: انکم ٹیکس کی موجودہ شرح اس سے کہیں زیادہ ہے، جو شاید مضمون نگار کو معلوم نہ ہو سکی، اس حساب سے انکم ٹیکس کا بار سلطنتِ اسلامی کی شرح سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے،

کیا جزیہ بھاری محصول ہے؟ زکوٰۃ اور جزیہ کا بلا واسطہ متزاید محصول جو اسلام نے مسلمان اور غیر مسلمون پر لگایا تھا، اگرچہ شخصی حکومتون کے زمانہ مین رائج نہین ہوسکتا تاہم یہ اسلام کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ اس کے تمام ادوار حکومت (یعنی جمہوریت و شخصیت) مین یہ محصول ہمیشہ قائم رہا، اور آج کل کے سرمایہ دارون کے علی الرغم اوس زمانہ کے دولتمندون نے اوس کو بطیب خاطر برداشت کیا، اس محصول کا تقرر دو مختلف اصول کو پیش نظر رکھ کر ہوا ہے،

(۱) اسلامی سلطنت چونکہ مسلمانون کی قومی سلطنت تھی اس لئے محصول متزاید ([illegible]) کی شکل اختیار کی گئی جس مین آمدنی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ محصول کی رقم برابر بڑھتی جاتی ہے گو شرح ایک ہی رہتی ہے، اور اس محصول کا بار دولتمند طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے،

(۲) اسلامی سلطنت چونکہ غیر مسلمون کی قومی سلطنت نہ تھی اس لئے محصول متزاید کی دوسری شکل پسند کی گئی جس مین ہر طبقہ کی الگ الگ حسب حیثیت ایک ایک شرح ہوتی ہے تاکہ مجموعی طور پر کسی ایک طبقہ پر زیادہ بار نہ پڑے، اور رقم محصول مین شرح کی وجہ سے اضافہ نہ ہوسکے،

چونکہ یہ دونون محصول (زکوٰۃ اور جزیہ) آج کل کی اصطلاح مین انکم ٹیکس ([illegible]) کہے جا سکتے ہین، اس لئے مناسب ہوگا کہ انکم ٹیکس سے جزیہ کا موازنہ کیا جائے تاکہ معترضین کو یہ نظر آسکے کہ آج کل کا یہ مقبول ٹیکس اسلام کے اس ناپسندیدہ محصول پر کیا فضیلت رکھتا ہے؟

انکم ٹیکس کی شرح ۱۹۱۶ء تک یہ تھی،

ہزار سے کر دو ہزار سے کم تک	۴ پائی فی روپیہ
۲ ہزار ״ ۵ ہزار ״ ״	۵ ״ ״
۵ ہزار ״ ۱۰ ہزار ״ ״	۶ ״ ״
۱۰ ہزار ״ ۲۵ ہزار ״ ״	۹ ״ ״

کہ میرے بعد اُن کو کسی شخص کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"۔

اور اپنے خلیفہ کو عین اُس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے، غیر مسلموں کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی،[۵]

"اور میں اس کو اُن لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں، جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے کہ اُن سے جو معاہدہ ہے وہ پورا کیا جائے، اور اُن کی حمایت میں لڑا جائے، اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے"،

ان احکام اور اعلانات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں ہمیشہ غیر مسلم رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا،

جزیہ کی شرح جس قدر کم تشخیص کی گئی تھی، اس کا بیان ابھی ہو چکا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جزیہ کی یہ شرح مجموعی آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کرکے تخمینی دولت و ثروت کے لحاظ سے سہولتہً مقرر ہوئی تھی ورنہ اندرونی طور پر بعض صوبوں میں گذشتہ معیار دولت کے علاوہ بعض اور معیار بھی پائے جاتے تھے، اور انہی کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اسی بنا پر شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط (ص ۸۰، ج ۱۰) میں لکھا ہے، کہ

"یہ ممکن نہیں ہے کہ مال کا کوئی (صحیح) اندازہ کیا جا سکے، کیونکہ وہ شہروں کے (حالات کے) مطابق مختلف ہوتا ہے"،

اس کا یہ مطلب ہے کہ غرباء، متوسطین اور امراء کی دولت کا جو معیار ۲۰۰، ۱۰ ہزار، اور زیادہ کی شکل میں قائم کیا گیا ہے، وہ دراصل غربت و تموّل کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے، کیونکہ بعض صوبے زیادہ متمول ہیں، بعض اُن سے کم، اور بعض ان سے بھی کم، اس لئے ہر جگہ کا معیار بالکل مختلف ہوگا، اسی نکتہ کا خیال کرکے امام ابو جعفر (طحاوی) کہتے ہیں،[۶]

"ہر شہر کا عرف معتبر ہے جس شخص کو لوگ اپنے شہر میں فقیر یا متوسط، یا غنی شمار کریں، وہ دیسا ہی سمجھا جائے گا، اور یہی صحیح مذہب ہے"۔

---

[۵] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما جاء فی قبر النبیؐ [۶] فتاوائے عالمگیری ص ۲۴۴، ج ۲

جزیہ ادا کرتے تھے،

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے، تو ۲ پائی فی روپیہ کے حساب سے اس کو سال میں ۱۲/۲ انکم ٹکس ادا کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے جزیہ کی رقم صرف ۳ سالانہ ہوگی، اسی طرح اگر ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپیے ہیں تو ان کا انکم ٹکس ۴ر فی روپیہ کے حساب سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور جزیہ صرف ۱۲ر!

ناظرین انصاف فرمائیں کہ سوا لاکھ کی رقم گران ہے یا بارہ روپیے! اور انکم ٹکس رعایا کے لئے سہل و مفید ہے یا جزیہ ؟

جزیہ کا اثر معاشیات اسلامیہ پر — شاید اس موازنہ سے یہ خیال پیدا ہو کہ جزیہ کا بار امرا پر بہت کم پڑتا تھا لیکن متوسطین اور غربا اس کے بار کے نیچے دبے ہوئے تھے، اس لئے سلطنتِ اسلامیہ کی معاشی حالت کا سرسری طور پر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اسلامی سلطنت کے زیر سایہ معاشی حیثیت سے کس حالت میں زندگی بسر کرتے تھے،

مسٹر ہوبسن (J. A. Hobson) نے کام اور دولت (Work and Wealth) میں اندازۂ تونگری کے لئے پیمانۂ زر کے بجائے انسانی خوشحالی کے ایک درجہ کو پیمانہ بنانا پسند کیا ہے[۱] لیکن اسلام نے ایک درجہ کے بجائے انتہائی درجہ کو پیمانہ بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا، چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پایۂ تخت کے ایک دور افتادہ صوبہ (عراق) کی سب سے کمزور آبادی (بیوہ عورتوں) کی بہترین معاشی حالت کو وفات سے ۴ روز قبل ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا،[۲]

"اگر خدا نے مجھکو زندہ رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسی حالت میں چھوڑ جاؤں گا،

---

[۱] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص، از جے سی، کمار پا مترجمہ قاضی محمد حسین [۲] صحیح بخاری کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ

پروفیسر جدوناتھ سرکار نے اپنی تاریخ دانی کے زعم مین جزیہ کے متعلق جو | ادوناتھ سرکار کا مغالطہ

لکھا ہے، اس مین پے درپے بہت سی غلطیان کی ہین جن کا دور کرنا ضروری ہے، سب سے پہلی غلطی بلکہ سب سے

ظلم یہ ہے کہ انھون نے جزیہ کا نام (Poll Tax) رکھا ہے، جو نہ صرف غیر مسلمون بلکہ خود

سانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے، پروفیسر صاحب نے اگر یہ لفظ خود ایجاد کیا، یا اس کے استعمال مین علماے یورپ

ن تقلید پسند کی، تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے لیکن اگر اس کا جواز کسی اسلامی سند کی بنیاد پر ہے، تو واضح ہونا چاہئے

کہ طبری وغیرہ نے جو "جزیۃ الجماجم" یا "جزیۃ الرؤس" کا لفظ لکھا ہے، وہ علَم نہین ہے، یعنی اُس ٹکس کا یہ نام نہین ہے

بلکہ اس ٹکس سے پہلے چونکہ زمین کی پیداوار اور محصول کا ذکر آگیا ہے، اور آخر مین اس کا نام آیا ہے، اس لئے

دوسری پیداوار مثلاً گیہون، جو، تر کاریون وغیرہ کی طرح انسانون کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ ذکر کے

بغیر یہ کیونکر معلوم ہو سکتا تھا، کہ کس چیز کا محصول ہے ؟ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ذہن مین رہنی

چاہیے کہ طبری نے یہ الفاظ نوشیروانی محصول کے تذکرہ مین لکھے ہین، اس لئے اسلامی عہد کے جزیہ کی نسبت

ان کا اطلاق ثبوت طلب ہے،

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھون نے جزیہ کی رقم کا نہایت غلط اندازہ لگایا ہے، اور جزیہ کی | دوسرا مغالطہ

مقدار کی زیادتی کو مثال کے طور پر گجرات کے صوبہ مین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہان سالانہ

پانچ لاکھ روپیے کی آمدنی تھی[۱]، اور اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ انڈیا آف اورنگ زیب کے بیان کے

مطابق (جس کا حوالہ حاشیہ ص ۴، ۲، تاریخ اورنگزیب مین ہے،) تقریباً ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) مین گجرات

کی تحصیل محض یا محاصلِ خام (Gross Revenue) ۱۴۵ لاکھ روپیہ (ایک کرور پینتالیس لاکھ

روپیے) سالانہ تھی جس مین اور جزیہ کی آمدنی مین ۳ ½ فیصدی کا تناسب ہے، جو اُن کے نزدیک بہت

زیادہ ہے اس کے متعلق چند باتین عرض کرتا ہون،

---

[۱] مرآۃ احمدی ص ۲۹۰، ج ۱

اس نقطۂ نظر کے مطابق تشخیص جزیہ میں جو تغیر پیدا ہوا، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا،

پہلی صدی ہجری میں **شام** کا صوبہ ذرائع آمدنی زیادہ رکھتا تھا۔ اس لئے زیادہ خوشحال تھا، یمن کا صوبہ معاشی حیثیت سے اس کی برابری نہیں کرسکتا تھا، اس لئے دونوں صوبوں کے جزیہ کی شرح مختلف رکھی گئی، شام میں فی کس ۴ دینار سالانہ، اور یمن میں ایک دینار سالانہ وصول کیا جاتا تھا، اس کا سبب جب مشہور تابعی مجاہد سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ

"دولت مندی کی بنا پر ایسا کیا گیا"[1]

پانچویں صدی کے آخر میں اسلامی سلطنت کے دو صوبوں **عراق** اور **ترکستان** کی معاشی حالت کے متعلق ایک تصریح ملتی ہے شمس الائمہ سرخسی مبسوط (ص ... ج ۱۰) میں لکھتے ہیں کہ

"عراق میں پچاس ہزار کا مالک متوسط الحال سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے ملک میں دس ہزار درہم کا مالک غنی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ امام کی رائے پر چھوڑنا چاہئے"

اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ صوبوں کے معیار دولت کا صحیح اندازہ امام کر سکتا ہے اور وہی شرح جزیہ کو مالی حالت پر منطبق کرنے کا بھی مجاز ہے، مثلاً جس صوبہ میں ۲۰۰ درہم سے لے کر ۱۰ ہزار تک کا مالک متوسط سمجھا جاتا ہے، وہاں وہ اس رقم پر چھ روپے سالانہ جزیہ دیگا لیکن عراق میں چونکہ پچاس ہزار کا مالک بھی متوسط ہے، اس لئے وہاں پچاس ہزار پر چھ روپے لئے جائیں گے، اور اس کے اوپر بارہ درہم امراء کی شرح جزیہ ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر کسی صوبہ کی استعداد پیداوار بڑھتی جاتی ہے اسی قدر جزیہ کا بار ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور یہ اسلامی حکومت کی منفعت بخش پالیسی کا ایک بین ثبوت ہے، (موجودہ انکم ٹکس میں جس قدر استعداد پیداوار بڑھتی ہے ٹکس کا بار بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے، جو غریبوں پر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔)

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الجزیہ والموادعة،

کی طرح کثرت سے محصول نہ تھے، بلکہ اکثر محصول معاف کر دیئے گئے تھے،) جزیہ کو اگر فوجی محصول مانا جائے، (جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے) تو اس ۳ ½ فی صدی محصول کا موازنہ اس ۳۲ کروڑ روپے سالانہ سے کرنا چاہئے، جو ہندوستان کے فوجی انتظام پر حکومت برطانیہ صرف کرتی ہے، اور جو محاصل خالص (Net Revenue) کا ۴۳ فی صدی ہے،[1]

غالباً محصولوں کی یہ تعداد اور تناسب حیرت دور کرنے کے لئے کافی ہوگا،

تیسرا مغالطہ | تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھوں نے اشخاص کی آمدنی سے جزیہ کی شرح کا تناسب معلوم کرکے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ غرباء پر اس کا بہت زیادہ بار پڑتا تھا، اس کے لئے انھوں نے غریب کی شرح چھ روپیہ فی صدی، متوسط کی چھ فی صدی سے ۴ فی صدی تک (یعنی ۲۰۰ درہم سے ۱۰ ہزار درہم تک حسب مدارج) اور امیر کی ۱۲ فی ہزار شرح بتلائی ہے (ص ۲۰۰ جلد ۳) اگرچہ آج بھی امراء کے بہ نسبت غرباء پر محصول کا بار جس قدر زیادہ پڑتا ہے، اس کی شہادت میں فرد ورلیڈ رمسٹر میکڈانلڈ، سابق صدر اعظم ... حکومت برطانیہ کے اقوال گورنمنٹ آف انڈیا میں درج ہیں، اور سر اسے کولن، اور سر ولیم ہنٹر وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے تاہم موجودہ انکم ٹکس کی شرح سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ اس کی شرح ایک ہزار روپیہ سے لے کر ۲ ہزار سے کم تک ۴/۱ پائی فی صدی پچیس ہزار سے زیادہ کی ۴/۱۲ فی صدی، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی عہ فی صدی اور ڈھائی لاکھ سے اوپر کی عہ فی صدی ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جزیہ کی سب سے کم شرح (بقول پروفیسر صاحب) ۱۲ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی سب سے کم شرح عہ ۴/۱۲ پائی فی ہزار ہے، اسی طرح جزیہ کی سب سے زیادہ شرح ۴۸ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی آخری شرح ۱۰ فی ہزار ہے، ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جزیہ میں اگر ایک طبقہ کسی قدر زیادہ بار برداشت کرتا تھا، تو انکم ٹکس میں ہر طبقہ

---

[1] محاصل خالص ۷۵ کروڑ اور محاصل خام ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے دیکھو معاشیات ہند صفحات ۲۷۰، ۲۷۷، ترجمہ برنی، یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے،

(۱) گجرات کے جزیہ اور اس کے تناسب پر تمام ہندوستان کے جزیہ اور اس کے تناسب کو قیاس نہین کیا جا سکتا، کیونکہ گجرات مین اگرچہ ہندوؤن کی اکثریت تھی، تاہم پنجاب، کشمیر، اور سندھ وغیرہ مین مسلمان زیادہ آباد تھے، اس لئے ان صوبون مین جزیہ کی آمدنی کم اور نہایت کم ہو گی، اور تناسب بھی ۳½ فیصدی سے بہت کم ہوگا،

(۲) گجرات کے جزیہ کا تناسب دکھاتے وقت گجرات کی زکوٰۃ کا "تناسب" بھی دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ بقول پروفیسر صاحب (ص ۲۰۴، ج ۳) گجرات مین بہت زیادہ مسلمان آباد تھے،

(۳) زکوٰۃ کی شرح ڈھائی فی صدی ہے، اور وہ مختلف قسم کے چیزون سے وصول کی جاتی ہے، اس لئے مسلمانون کی ایک بڑی آبادی مین اس کی مقدار گجرات کے جزیہ کی رقم کے قریب قریب ہو سکتی ہے اور تناسب بھی شاید وہی ہو سکتا ہے، اس بنا پر اورنگ زیب پر مسلمانون کی پاسداری اور ہندوؤن کی طرف سے ذاتی تغافل کا الزام غلط ہے،

(۴) گجرات کے جزیہ اور محاصلِ خام کا تناسب صرف ۲/۷ فیصدی ہے، جو بہت کم ہے لیکن پروفیسر صاحب اس پر بھی متحیر ہین، حالانکہ اگر اُن کو محصولون کی اس تعداد اور تناسب کا علم ہوتا، جو آج کل حکومت برطانیہ کے اندر رائج ہین، تو اُن کی حیرت سکون و خاموشی سے بدل جاتی، مثلاً مطالبات وطن (Home Charges -) کی رقم کو لے لیجئے، جو ہر سال انگلستان چلی جاتی ہے، وہ پرمتھ ناتھ بنرجی کی تصریح کے مطابق، مجموعی مداخل (یعنی دو ارب ایک کرور روپیہ) مین چالیس فی صدی سے زیادہ ہے[1]، افیون، نمک، اسٹامپ، چنگی و آبکاری، ابوآب، کروڑگیری، انکم ٹکس، رجسٹری، جنگلات، ریلوے وغیرہ سے پچاس کرور روپیہ سے زیادہ وصول ہوتا ہے، جو مجموعی مداخل (دو ارب ایک کرور) کا کم از کم پچیس فی صدی ہے، یہ واضح رہے، کہ اورنگ زیب کے زمانہ مین آج کل

[1] معاشیات ہند ص ۲۹۵، مترجمہ مولوی محمد الیاس برنی،

(۳) جزیہ سے غریب طبقہ دیر مین متاثر ہوتا ہے، اور متوسطین و امرا پر کچھ اثر نہین پڑتا لیکن انکم ٹکس مین سب سے زیادہ امرا تباہ ہوتے ہین، اور متوسطین و فقرا بھی بربادی سے محفوظ نہین رہتے،

(۴) بیس سال مین اگر جزیہ پچاس کی جائداد یا آمدنی کو برباد کرسکتا ہے، تو اسی قدر عرصہ مین انکم ٹکس ۵ لاکھ کی رقم اور جائداد پر پانی پھیر سکتا ہے،

چوتھا مغالطہ | چوتھا مغالطہ، تیسرے مغالطہ کی دوسری شکل ہے یعنی ادنھون نے جزیہ کی شرح اور غلہ کے نرخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب طبقہ مظلومی کی انتہائی حد تک پہنچا ہوا تھا کیونکہ ایک غریب کی شرح ٹکس اس کے سال بھر کے مصارفِ طعام کے برابر تھی، (تاریخ اورنگزیب جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

اس "تاریخی دیانت" کی "تحلیل" کے لئے حسب ذیل امور ذہن نشین ہونے چاہئین،

(الف) جیسا کہ مسٹر ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ نے "ہندوستان وفاتِ اکبر کے وقت"[1] مین لکھا ہی، آج کل ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہین ہی،

(ب) بقول مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی اس زمانہ مین جماعتِ کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف اٹھارہ شلنگ یعنی للعہ فی کس ہے، (معاشیاتِ ہند ترجمہ برنی ص ۴)

(ج) مورلینڈ کی تصریح کے مطابق اگرچہ عہد مغلیہ و برطانیہ مین آمدنی کے اوسط کے لحاظ سے کوئی فرق نہین ہے، تاہم اجناس کے نرخ مین سات گنے کا فرق پیدا ہوگیا ہے، (اکبر تا اورنگ زیب[2])

(د) ۶۲۳ھ (مطابق ۱۳۰۰ھ) کے نرخ سے ایک من گیہون کی قیمت ایک روپیہ تھی (معاشی

---

[1] ترجمہ مولوی حبیب الرحمن خان ایم اے، ال ال بی ہاشم "ہند کی معاشی حالت شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت" ص ۲۹۲ [2] ترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، ہاشم معاشی حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب" ص ۲۲۵ ص ۲۴۶،

محصول کے بار گران سے دبا ہوا ہے، اور جزیہ مین غربا اگر محصول سے کچھ پریشان ہو سکتے تھے، تو انکم ٹکس سے امرا اس سے کہین زیادہ پریشان ہو سکتے ہین، شاید پروفیسر صاحب بار کے اس "تناسب" کو حساب لگاتے وقت بھول گئے تھے،

اگر تمام طبقون کو یکجا کر کے اس بار کا اوسط نکالا جائے، تو جزیہ کا اوسطاً صرف ۲ رفی صدی ہوتا ہے (کیونکہ متوسطین کا سب سے کم اوسط یہی ہے) لیکن آج کل محصول کا بار اوسطاً آمدنی کے نو فیصدی (یعنی ۹ فیصدی) رہتا ہے،[۱] ناظرین ۲ رفی صدی اور ۹ رفی صدی کے تناسب پر غور فرمائین،!

سر جادو ناتھ نے غربا کے متعلق جو متن لکھا تھا، ہمارے "ارسطو" نے اس پر ایک پرلطف شرح تصنیف فرمائی ہے، "ارسطو کہتے ہین"، تقریباً ۲۰ سال مین ساری جائداد ہی غائب غلہ ہو جائے گی" (آریہ گزٹ) اُن کی خدمت مین یہ عرض ہے کہ

(۱) معاشیات کے رو سے جزیہ پر جہان نظر ڈالی گئی ہے، وہان یہ لکھا ہے کہ چونکہ جزیہ بلا واسطہ متزاید ٹکس ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ شرح کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آمدنی کا بھی اضافہ ہو، مثلاً اگر ایک شخص کے پاس پہلے سال ۲۰۰ درہم موجود ہین، تو وہ غربا کا جزیہ (۱۲ درہم) ادا کرے گا، لیکن اگر اس کے پاس آیندہ سال صرف ۵۰ درہم رہ گئے ہین، تو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا، اسی طرح اگر ایک متوسط نے پہلے سال ۲۴ درہم جزیہ ادا کیا، اور آیندہ سال اس کا سرمایہ فقرار کے برابر ہو گیا تو اس سے متوسط کا جزیہ وصول نہ کیا جائے گا، بلکہ فقرار کا محصول لیا جائے گا، اس کی تصریحات فقہ کی کتابون مین موجود ہین، اس بنا پر جزیہ کی وجہ سے جائداد کے تلف ہونے کا خطرہ نہین،

(۲) جزیہ مین غریب پر پہلے سال جو بار پڑتا ہے وہ آمدنی کا سولہوان حصہ ہے یعنی پچاس پر سے لیکن انکم ٹکس مین پہلے ہی سال امیر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ (شرح اعلیٰ مین) نکل جاتا ہے یعنی ۵ لاکھ پر سوا لاکھ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غریب پر جزیہ سے تباہی (اگر آمدنی مین اضافہ نہو) بہ تدریج اور دیر مین آتی ہے، اور انکم ٹکس پہلے ہی سال امیر کی کمر توڑ دیتا ہے،

---

[۱] معاشیات ہند پرمتھ ناتھ بنرجی ص ۲۰۹، مترجمہ مولوی الیاس برنی،

نہین کرسکتا، [۵]

(۳) اگر جزیہ اور انکم ٹکس وغیرہ کا اوسط نہ نکالا جائے، بلکہ ان کی پوری شرح کے مطابق پوری رقم فرض کر لی جائے، تو عہد مغلیہ مین للعہ کا غلہ ۵ مالگذاری، اور ۳ جزیہ ادا کرکے ۹ پائی پس انداز ہونگے، اور سر جادو ناتھ کے حساب سے اس رقم کو دوگن کرکے بھی وہ صرف دس آنے ۶ پائی کا قرضدار ہوگا لیکن عہد برطانیہ مین ۱۳ کا غلہ، عار مالگذاری اور ۱۳ پائی انکم ٹکس ادا کرکے وہ ۱۳ پائی کا قرضدار ہوجائے گا (واضح ہو کہ محصول مین صرف انکم ٹکس کی رقم رکھی گئی ہے، اور بہت سے محصول جو اس زمانہ مین ادا کرنا پڑتے ہین، ان کا حساب نہین لگایا گیا ہے) اور جادو ناتھ صاحب کے حساب سے اس پر ۱۳ سالانہ کا ایسا وزنی بوجھ پڑے گا، جس سے چند ہی سال مین اس کی ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد بالکل ہی غائب ہوجائے گی، اس سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، جزیہ والا صہ کی جائداد یا آمدنی مین جس قدر مطمئن تھا، انکم ٹکس والا ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد مین بھی اتنا مطمئن نہین ہے، (جزیہ اور انکم ٹکس بالترتیب صہ اور ہزار سے کم پر نہین ہین)

پہلے اور تیسرے حسابون کے لحاظ سے عہد مغلیہ مین نصف آمدنی سے کچھ کم رقم پس انداز رہتی ہے، صرف دوسرے حساب کے روسے پانچ آنے دس پائی کا قرض رہتا ہے، جو ۳ وین حصہ سے کسی قدر زائد ہے، بخلاف اس کے عہد برطانیہ مین پہلے اور تیسرے حساب کے مطابق سال کی پوری آمدنی صرف غلہ کے لئے بھی کافی نہین ہوتی، بلکہ للعہ کی مزید ضرورت ہوتی ہے، اور مالگذاری و محصول وغیرہ کے لئے علحدہ قرض لینا پڑتا ہے، جو دوسری صورت حساب مین سالانہ آمدنی کا پورا دوگنا، اور تیسری صورت حساب

---

[۵] معارف:- یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، جب یہ ہوش ربا گرانی نہ تھی، ورنہ اگر آج کل کے نرخ سے حساب لگایا جائے، تو ۹ من غلہ کی قیمت دوسو روپیے کے قریب ہوئی، اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے،

حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب، مترجمہ ہاشمی ص ۲۴۶ لیکن ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) کے نرخ سے اس کی قیمت چار روپیہ ہے، (سات گنے کا فرق اس لئے نہین ہے کہ ہم نے مغلیہ کے گران نرخ اور برطانیہ کے ارزان نرخ کو لیا ہے،)

(۵) محصولِ زمین بزمانۂ اکبر کے لحاظ سے ۱۰ بسوہ کی مالگذاری عہ تھی، (۱۰ بسوہ مین ۴ من ۲۰ ار غلہ بآسانی پیدا ہو سکتا ہے، مالگذاری ثلث پیداوار ہوتی تھی، دیکھو آئین اکبری ص ۲۰۷ ج ۱) اور آج کل کے مطابق عا ہے، (بحساب للعہ فی بگھہ)

(و) اگرچہ اورنگ زیب کے زمانہ مین محصول کا بار فی کس وہ نہ تھا، جو آج کل ہے، کیونکہ اُس نے بہت سے محصول معاف کر دیے تھے، تاہم اس زمانہ کے سرکاری حساب کے مطابق ہم دونون زمانون (مغلیہ و برطانیہ) مین محصول کا بار فی کس ۱۱؍۴ پائی فرض کئے لیتے ہین.

اب یہان سے ۳ طریقہ پر حساب شروع ہوتا ہے،

(۱) اگر غلہ کے مصارف فی کس ۴ من ۲۰ ار سالانہ (بحساب ۱۰ ار روپیہ) رکھے جائین، تو عہ ۱۴ سالانہ آمدنی والا شخص عہدِ مغلیہ مین للعہ کا غلہ عہ مالگذاری اور ۱۱؍۴ پائی محصول ادا کرکے ۵ پائی کپڑے وغیرہ کے لئے بچا سکتا تھا لیکن عہدِ برطانیہ مین وہ عہ کا غلہ عا مالگذاری اور ۱۱؍۴ پائی محصول دیکر ۱۱؍۴ پائی کا قرضدار ہو جائے گا،

(۲) اگر غلہ کا حساب فی کس ۹ من رکھا جائے، جو سرکار نے (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۰۰) رکھا ہے، تو عہدِ مغلیہ مین لعہ کا غلہ عا مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور ۱۱؍۴ پائی محصول پر خرچ کرنے کے بعد وہ صرف پانچ آنے دس پائی کا قرض دار ہوتا ہے جس کو وہ معمولی سی محنت سے ادا کر سکتا ہے لیکن عہدِ برطانیہ مین عہ کا غلہ للعہ مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور ۱۱؍۴ پائی محصول پر صرف کرکے وہ عہ ۱۱؍۴ پائی کا قرض دار ہو جائے گا، جو سال بھر کی آمدنی کا پورا دوگنا ہے، اور جس کو وہ سال بھر محنت کرکے بھی ادا

ی کے ماخذون مین جزیہ کی "نرم تحصیل" کے متعلق مذکور ہین، مثلاً مرآۃ احمدی (ص ۳۲۱ ج ۱) مین اورنگزیب"

دیوان صوبہ کے نام یہ حکم مذکور ہے،

"دنیز حکم والا بنام دیوان صوبہ مذکور دریافت گرکسانیکہ بعد وضع جزیہ پیش اداواے آن یکسال

برآنہا گذشتہ وسال دوم درآمدہ باشد اگر بے تساہل متصدیان سال اول نداده باشد موافق

قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ اصل را اعتبار نمودہ، جزیۂ سال اول از آنہا نگیرند، وجزیۂ سال

دوم بگیرند، واگر از راہ تمرد جزیۂ سال اول ادا نکردہ باشد، موافق صاحبین ہر دو سال

از آنہا ستانند"

اس سے زیادہ رعایت کیا ہوسکتی ہے کہ تحصیلدارون کے مطالبہ کے باوجود اگر غیر مسلمون نے جزیہ

نہین دیا ہے، تو وہ معاف کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ نہ دینا "سرکشی" کے باعث نہ تھا؛

(یہ گرہ آگے کھولی جائے گی)

خود پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ (ص ۲۰۳) مین ایشور داس ناگر کی کتاب فتوحات عالمگیری

(باب) سے نقل کیا ہے کہ

"شہنشاہ (اورنگ زیب) نے حیدرآباد فتح کرنے کے بعد وہان ایک سال کے لئے جزیہ، سائر

اور تمام محاصل معاف کر دیئے، کیونکہ گورنر نے یہ اطلاع دی تھی کہ رعایا غربت کی وجہ سے محصول

ادا کرنے کے قابل نہین ہے، اور اگر محصول لیا گیا تو ملک برباد ہو جائے گا"

ایشور داس ناگر گجرات کے "شیخ الاسلام" کے دفتر مین ملازم تھا، اور پٹن مین رہتا تھا، اس کی کتاب

کو سرکار نے اپنی تاریخ (جلد اول) کے دیباچہ مین مستند قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود انھون نے متن

مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ حمیدالدین خان نیمچہ کی احکام کے حوالہ سے (جس کا سرکار نے انگریزی

مین ترجمہ کیا ہے) اس کے متضاد یہ واقعہ لکھا ہے کہ

کی ایک شکل مین تین گنے سے کچھ اوپر ہو جاتا ہی[۱]

ان حسابات سے ظاہر ہو گا کہ سرکار نے جو یہ لکھا ہے کہ جزیہ مین غریب طبقہ کے سال بھر کے مصارف طعام غائب ہو جاتے تھے، وہ کسی حسابی اصول پر مبنی نہین ہے، بلکہ ایک ساحرانہ خطابت ہے، جو صرف عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کام مین لائی گئی ہے ۔ ۔

پانچوان مغالطہ | پانچوان مغالطہ جزیہ کی "تحصیل" کے متعلق ہے، جس کو انھون نے سخت تحصیل سے تعبیر کیا ہے، اور اس سلسلہ مین چند واقعات لکھکر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جزیہ کی وصولی مین اورنگ زیب کے حکم سے اتنا تشدد ہوتا تھا کہ غیر مسلم رعایا شورش، مظاہرہ، بلکہ بعض اوقات بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی،

اس مغالطہ مین پہلی قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ باقاعدہ تحصیل کو "سخت" تحصیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور امیر عبدالکریم محصلِ جزیہ برہان پور کو سخت وصول کنندہ (a strict collector) کے لقب سے یاد فرماتے ہین، حالانکہ جس کتاب سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے، اس مین میر عبدالکریم کے متعلق یہ الفاظ آئے ہین،

"میر عبدالکریم را کہ ضابطہ واستادزادۂ پادشاہ می شد وبحلیۂ فضیلت ودیانت آراستہ بود"

(خافی خان ص ۲۷۸ ج ۲)

کیا ضابطہ ہشیار اور باقاعدہ شخص کو سخت (strict) کہتے ہین؟

دوسری چیز یہ ہے کہ پروفیسر جادوناتھ نے جزیہ کی سخت تحصیل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا ذکر غائب کر دیا ہے، جو تاریخی دیانت کے خلاف ہے، (تفصیل آگے آتی ہے)

تیسری قابلِ گرفت بات یہ ہو کہ پروفیسر صاحب نے ان واقعات کو بالکل فراموش کر دیا ہے جو

---

[۱] اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہو۔

ہوئی ؟ بلاشبہہ فیروز شاہ نے جب برہمنون پر جزیہ تشخیص کیا تھا، تو اُن کی طرف سے پُر امن نافرمانی ہوئی تھی اور بھوک ہڑتال چند روز تک قائم رکھی گئی تھی، لیکن چونکہ برہمنون کا جزیہ سے استثنا سلاطین قدیم کی غلطی تھی، اس لئے فیروز شاہ نے کچھ پروانہ کی، اور خود ہندوستان نے برہمنون کو سمجھا کر بھوک ہڑتال سے باز رکھا[۱]، اور پھر عرصہ تک جزیہ کے خلاف کوئی آواز نہین اٹھائی گئی، لیکن اورنگزیب کے زمانہ مین دفعۃً ایک ہیجان پیدا ہوا، جس نے ملک کے متعدد حصون مین آگ لگادی، فیروز شاہ کے زمانہ کے برہمن تو اپنی امتیازی شان قائم نہ رہنے پر ناراض تھے، اورنگزیب کے زمانہ کے ہندوؤن کو کس بات کا گلہ ہوسکتا تھا ؟

علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۴۷) مین اس سوال کا یہ جواب دیا ہے، کہ چونکہ یہ محصول (جزیہ) ایک مدت سے موقوف ہوچکا تھا، اوس کا نئے سرے سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہوسکتا تھا؟" لیکن جب یہ واقعہ ہے کہ جزیہ نہایت قدیم محصول تھا، اور ہندوستان صدیون سے اس کا عادی تھا، اور اورنگزیب نے سنہ ۱۰۷۰ھ سے لے کر سنہ ۱۰۹۰ھ تک تمام خلاف شریعت محصول اور نذرانے بند کردیئے تھے[۲]، اور اُن کے بجائے نہایت خفیف محصول (جزیہ) سنہ ۱۰۹۰ھ مین جاری کیا تھا تو پھر ایسے محصول کی اتنی شدید مخالفت اور اس کے خلاف بغاوتین سمجھ مین نہین آتین،

سرجادوناتھ سرکار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ محصول "ذلت" کی ایک علامت تھی جس سے بغض وحسد کے جذبات مین ہیجان پیدا ہوتا تھا، نیز تحصیل کی شدت بھی مظاہرون اور بغاوتون کا باعث تھی، آخری بات کا جواب اسی عنوان مین اور پہلی جز کا گذشتہ صفحات مین آچکا ہی،

لیکن حقیقت یہ ہی کہ ان بغاوتون سے اسلامی سیادت کی مخالفت مقصود تھی، ہم نے اوپر لکھا ہی کہ بلاواسطہ ٹکس سے سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے، اور جزیہ اس کا شاہد عدل ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بیداری ہندوؤن مین پیدا ہوئی، سب سے پہلے فیروز شاہ کے زمانہ مین برہمنون نے سیاست مین قدم رکھا

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۸۲، ۳۸۳ [۲] یہ واقعات خافی خان نے لکھے ہین، اور الفنسٹن کی تاریخ مین اس کا تذکرہ کیا ہی،

"چونکہ جزیہ کی تحصیل کا کام سختی سے ہوتا تھا، اس لئے ہندو تاجر دکن کو چھوڑ کر چلے گئے، اور غلہ کی کمی فوجِ شاہی میں محسوس ہوئی، اس وقت اورنگزیب نے امراء کی رائے کے مطابق دکن کا جزیہ معاف کیا"

حیرت ہو کہ اس روایت کے استناد اور پہلی روایت کے عدم استناد کی نسبت کوئی رائے نہ رکھنے کے باوجود سرکار نے خواہ مخواہ اس روایت پر کیونکر اعتماد کر لیا ؟ کیا ایک مورّخ کی حیثیت سے تحقیق کی کی ذمہ داری اُن کے سر نہ تھی !

ان گزارشوں کے بعد اب اصل مغالطہ کی جانب توجہ کیجاتی ہو لیکن اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر سرکار کی حسب ذیل عبارت پیش نظر رہنی چاہئے،

"قدیم مسلم فرمانروایانِ ہند کے زمانہ میں جزیہ برہمنوں کو مستثنیٰ کر کے تمام ہندوؤں پر مقرر ہوا تھا، جو اس مبصرانہ اور مسالمانہ نظام میں معاف رکھے گئے تھے، جس کو سندھ میں محمد بن قاسم نے پیدا کیا تھا، فیروز شاہ نے اپنی پیرانہ سالی میں اس امتیاز کو مسترد کر دیا، اور برہمنوں پر دوسرے کفار کی طرح محصول لگایا، اکبر کی دانشمندانہ سیاست دانی نے اس محصول کو منسوخ کر دیا اور ذلت کی ایک ہیجان انگیز علامت کو رعایا کی اکثریت سے ہٹا دیا، ایک صدی کے بعد اورنگزیب نے اس سیاست کو پلٹ دیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۰، ۳)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ آغازِ حکومتِ اسلامیہ سے لے کر عہدِ اورنگزیب تک برابر ہندوستان میں جاری رہا، صرف اکبر کی حکمتِ عملی کے سبب سے سو برس تک اس کا نفاذ نہیں ہوا، اورنگزیب نے پھر قدیم دستور کے مطابق اس کو جاری کر دیا،

اب سوال یہ ہو کہ وہ محصول جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے تھا، اور جس پر غیر مسلم رعایا نے کبھی شور نہیں مچایا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں اس کے متعلق ناراضی پیدا

ان واقعات کی روشنی میں جزیہ کی تحصیل میں باقاعدگی، یا پروفیسر جدوناتھ کے الفاظ میں تشدد کا

سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے جس کو ہم بتفصیل لکھتے ہیں،

(۱) **مقاومتِ مجہولہ**: اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوؤں نے آزادی کے لئے جو لڑائی

شروع کی، اس کی ابتدا "فیرمند شاہی" برہمنوں کی تقلید میں مقاومتِ مجہولہ یا پرامن ترک موالات سے کی

گئی، سرجادوناتھ نے لکھا ہے، کہ ۲ راپریل ۱۶۷۹ء (یکم ربیع الاول ۱۰۹۰ھ) سے تمام سلطنت میں

جزیہ کا قانون نافذ ہوا، جب یہ خبر پھیلی تو دہلی اور مضافات کے صدہا ہندو جمع ہو کر جمنا کے کنارے

قصر شاہی کے سامنے جاکر کھڑے ہوئے، اور جزیہ کی منسوخی کے لئے شور مچایا، اس کے بعد جمعہ کے دن

نماز کے وقت باب قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک سڑک پر دہلی شہر اور چھاؤنی کے ہندو کھڑے ہوئے

اس کے بعد بھی چند روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ میں سیواجی کا خط آیا، (تاریخ اورنگزیب

ص ۱، ۲، ۳، ۲۷۲) ظاہر ہے کہ ان شورشوں میں جزیہ کی آمدنی کم ہوگئی ہوگی،

(۲) **بغاوت**: چونکہ عالمگیر کی رعایا مسلح تھی، اس "پرامن" مقابلہ نے جنگ کی شکل بہت جلد اختیار

کرلی، اور رانا راج سنگھ والی جے پور اس تحریک کا سرگروہ بن گیا، رانا کو "سیواجی" نے اپنے خط میں ہندوؤں

کا سردار لکھا ہے، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۸۹، Appendix VI) سیواجی پہلے

سے مخالف تھا، اور مرہٹہ حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس تحریک میں شامل ہوا، اورنگزیب کے

نام ایک سخت خط لکھا، ان دو کے علاوہ راجپوتانہ کے بہت سے راجا مخالف ہوگئے، پھر دکن کی رعایا بگڑ گئی،

اور ایسی سرکشی اختیار کی کہ تحصیلداروں کے تقاضہ کے باوجود جزیہ دینا بند کر دیا، خافی خان لکھتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) بتلاتا ہے کہ اس خط میں بہت سے ٹکڑے الحاقی ہیں، اس کا لکھنے والا اورنگزیب کا معاصر اور کمزور حریف سیواجی نہیں معلوم ہوتا، بلکہ آج کل کا "مصلح" اور ملک کا "نجات دہندہ" سیواجی معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس خط میں راج سنگھ کو ہندوؤں کا لیڈر کہا گیا ہے، اور اس جملہ پر خود سرجادوناتھ کو بھی اعتراض ہے، اور جنوری ۱۹۰۸ء کے ماڈرن ریویو میں انھوں نے اس پر تنقید بھی لکھی ہے اس لئے اس خط کی صحت بہت مشکوک ہے، ملاحظہ ہو اعتنائے ملکہ جعلی ہے،

اور ہمارے اس زمانہ کے لیڈروں کی طرح اُس زمانہ مین بہت سے لیڈر پیدا ہو گئے، جنھون نے پرامن ترک موالات کا مقاطعۂ جزیہ کی شکل مین آغاز کیا، جس سے شہر کے تمام ہندوون کو اُن سے ہمدردی پیدا ہوئی، بعد مین شاید آگے چل کر یہ چنگاری اندر اندر سلگ کر اور بھڑکتی، لیکن اکبر کی حکمت عملی نے اس کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے، خود اس محصول ہی کو موقوف کر دیا[۱]، اور یہ آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی، اورنگزیب کے زمانہ مین راجپوتانہ کے راجپوتون اور مہاراشٹر کے مرہٹون نے از سر نو اس آگ کو ہوا دی، جس پر جزیہ کی دوبارہ تشخیص نے تیل کا کام دیا، اور سیواجی، مہارانا چتوڑ اور راجہ جسونت[۲] وغیرہ نے سلطنتِ مغلیہ کے خلاف وہ فضا پیدا کی کہ راجپوتانہ کی طرح دکن بھی اس سے متاثر ہوا، اور مختلف مقامات مین مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی، سیواجی نے جزیہ کے متعلق بارگاہِ سلطانی مین جو خط بھیجا تھا، اس کو سرجادوناتھ نے نقل کیا ہے[۳]، راجپوتانہ کے راجاؤن کی سرکشی کے واقعات خافی خان وغیرہ نے قلمبند کئے ہین، گجرات والون کی مخالفت کا پتہ اس فرمان شاہی سے چلتا ہے، جو دیوان صوبہ کے نام آیا تھا، اور مرآۃ احمدی کے حوالہ سے اوپر نقل ہو چکا ہے، برہانپور اور دکن کے ہنگامون کا تذکرہ خافی خان مین ہے، اور سرکار نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے،

---

[۱] گو کہ اس کے بجائے اور دوسری قسم کے محصول بڑھا دیئے، جن پر ہمیشہ مغلون کے عہد حکومت مین اورنگزیب کے زمانہ تک عمل رہا۔ [۲] خافی خان ص ۲۶۱، ۲۶۲، ج ۲، [۳] سیواجی کے اس خط کے متعلق سخت اختلاف ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ مین اس کو سیواجی کی طرف منسوب کیا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مسودہ مین شمبھوجی کا نام آیا ہے، آرم (Orme.) کے اقتباسات مین جسونت سنگھ اور ٹاڈ (Tod) نے مہارانا راج سنگھ کا نام لیا ہے، شمبھوجی اور جسونت تو تاریخون کی وجہ سے خارج از بحث ہو جاتے ہین، البتہ اندرونی شہادت اور خود نوشت سوانحی تفصیلات راج سنگھ کے بجائے سیواجی پر منطبق ہوتے ہین، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خط کا مضمون نیلا پربھو نے بنایا تھا جو سیواجی کا فارسی کاتب تھا، لیکن تحریر کا انداز

محجزیہ تمام بلدۂ برہان پور سال گذشتہ بست وشش ہزار روپیہ داخلِ خزانۂ سرکار گشتہ

خانہ زاد در مدتِ سہ ماہ از پورجات نصف بلدہ یک لک وہشت ہزار روپیہ عائد سرکار

ساختہ" (خافی خان ص ۲۷۹)

آدھے شہر کے مواضعات سے تین ماہ مین ایک لاکھ ۸ ہزار روپیہ وصول ہوا، جو میر عبد الکریم کے حسنِ انتظام

کا نتیجہ تھا، حالانکہ اُن سے پیشتر برُہان پور کے تمام مواضعات کا سالانہ جزیہ ۲۶ ہزار وصول ہوا تھا، پروفیسر

سرکار کے نزدیک یہ حاکم کی سختی کا نتیجہ تھا، حالانکہ خافی خان کے مطابق یہ اس وصف کا کرشمہ تھا، جو لفظ

"ضابطہ" کے اندر جھلک رہا ہے "ضبط" کے معنی ہین کسی چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا،

(۳) **رقم جزیہ کی معافی**:- تیسری چیز جس نے جزیہ کی آمدنی پر اثر ڈالا یہ تھی کہ بعض رحم دل اور

سادہ لوح مسلمان حکام نے ہزارون ہندوؤن کو غیر مستطیع سمجھ کر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا، حالانکہ وہ غیر مستطیع

نہ تھے، ان حکام مین سے ایک امانت خان بھی تھا، خافی خان (ص ۳۷۷ و ۳۷۸) اس کے متعلق لکھتا ہے،

"آمار وزرے رشید خان دیوانِ خالصہ کہ با امانت خان بارۂ سوے مزاج چشمی داشت، پروانہاے

معافی جزیہ را کہ امانت خان با دست آویز ہاے مختلف بہنود نوشتہ میداد و بادشاہ در اجراے

جزیہ نہایت تقید بود از نظر گذرانیدہ، عرض نمود کہ از نصف ہنود بیشتر را امانت خان سندِ عدم

مزاحمت جزیہ دادہ خلافِ مرضی بظہور آمد"،

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤن کی آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا

گیا تھا، پھر آمدنی کیون کم نہ ہو جاتی؟

اورنگ زیب نے اسی موقع پر امانت خان سے فرمایا تھا کہ

"در مقدماتِ دیگر مالی و ملکی آنچہ سندِ معافی بر مردم میدہند مختارید، اما جزیہ کہ بہزار دشواری

بر کفار جاری ساختہ ایم، معاف نمودن آن بدعت، و باعثِ برہم خوردن بندوبستِ جزیہ می گردد"

(خافی خان)

" ازانکہ کفار بلدہ و پرگنات در اداے جزیہ بسیار بسختی یا منصوب کردہٗ پادشاہی پیش می آمدند

و ہیچ پرگنہ نبود کہ رعایا بہ امداد فوجداران و مقدمانِ سرکش جنگ و ہنگامۂ فساد ننماید"

(صـ۲۷، جلد ۲)

گجرات کی رعایا مین بھی بعض ایسے سرکش موجود تھے. چنانچہ "شہنشاہ" کے فرمان بنام دیوانِ صوبۂ

مین یہ فقرہ بھی ہے،

" داگر از راہِ تمرد جزیۂ سالِ اول ادا نہ کردہ باشد" (مراۃ احمدی ص ۳۲۱ ج ۱)

غور کرو! وہ رعایا جو سلطنت کے تحصیلدارون کے ساتھ زیادتی کرے، سرکش چودھریون، اور فوجدارون کے جتھون مین شامل ہوکر آمادۂ فساد ہو، اس کا جزیہ نہ دینا، کیا غربت اور مسکنت کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ ایسی سرکش رعایا کے متعلق اگر اورنگزیب نے یہ حکم دیا کہ تحصیلدارون کی مستعدی اور طلب و تقاضے کے باوجود جس نے جزیہ نہ ادا کیا ہو، اور سرکشی کی نیت بھی نہ رہی ہو، تو اس کا جزیہ (بقایا) معاف کردیا جائے، اور جس نے سرکشی سے جزیہ بند کیا ہو اس سے وصول کیا جائے، تو اس مین کیا بے انصافی ہوئی؟ اور اگر یہ بے انصافی تھی، تو سر جدوناتھ کو "انصاف" کی کوئی مثال تاریخ ہند سے پیش کرنی چاہئے تھی.

سر جدوناتھ نے اعتراض کیا ہو کہ دکن کی رعایا سے بجبر جزیہ وصول کیا جاتا تھا، بے شبہ میر عبدالکریم کے ساتھ سوار اور پیادے گئے تھے، اور کوتوال کو بھی حکم پہنچا تھا کہ "جو ادائے جزیہ مین سستی کرے، اس کو سزا دی جائے" (خافی خان ص ۲۷۸، جلد ۲) اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی رعایا تحصیلدارون پر سختی کرتی تھی، اور سرکش فوجدارون اور چودھریان سے اس معاملہ مین مدد لیتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، جسے معترض نے نظر انداز کر دیا ہے،

اس سرکشی کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی پر جو اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک صوبہ (دکن) کے ایک واقعہ سے کرنا چاہئے، میر عبدالکریم امین جزیہ برہان پور، بارگاہ سلطانی مین اطلاع دیتے ہین،

لیکن یہ جواب معترض کے لئے اس بناپر کافی نہیں ہے، کہ وہ ساری ذمہ داری عالمگیر کے ضعیف کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہیں، وہ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس حصول (جزیہ) کا مقصد اسلام کی اشاعت اور کفر کا ازالہ تھا، حالانکہ یہ مقصد اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہاں سے نکلتا ہے کہ عالمگیر کی یہ رائے تھی، جزیہ کا فرمان اگر بلفظہٖ موجود ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ الفاظ خود عالمگیر نے لکھوائے تھے تو بے شبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا، لیکن عمالِ حکومت کے منشی اور محرر یا اوس زمانہ کے مورخ اپنے جذبات کو اگر فرامین شاہی یا اپنی عبارتوں کی تمہید میں ظاہر کریں، تو اُن کا ذمہ دار عالمگیر کیسے قرار پائے گا ؟ مآثر عالمگیری یا مرآۃ احمدی جس کو بھی اٹھا لیا جائے، الفاظ خود مصنفین کے ہیں، اس لئے عالمگیر اُن کی بناپر مورد الزام نہیں ہو سکتا۔

(۲) جزیہ زائد ٹکس تھا جس سے صرف مسلمان محفوظ تھے، یہ غلط ہے، اورنگ زیب نے جزیہ کی طرح وصولی زکوٰۃ کا فرمان بھی نافذ کیا تھا، جو مرآۃ احمدی وغیرہ میں درج ہے، اس لئے پروفیسر صاحب کے الفاظ کو ذرا بدل کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے "کہ زکوٰۃ زائد ٹکس تھا جس سے صرف ہندو محفوظ تھے"

(۳) ملازمین سلطنت جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اس خیال میں سرکار اور ارسطو متفق ہیں، ارسطو نے فوج میں امرائے جزیہ کی موجودگی سے جن کا ذکر ۱۲ جولائی ۱۷۰۲ء (۱۱۱۴ھ) کے اعلان میں ہے یہ استدلال کیا ہے کہ فوج میں ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ امرائے جزیہ کی موجودگی کے کوئی معنی نہیں ہیں، لیکن مرآۃ احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) میں اورنگ زیب کے اس حکم کی موجودگی میں جو عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ہے،

"از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکند سوائے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

ارسطو کے خیال کی کوئی اصلیت نہیں رہتی، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ فقدی صورت

سرکار نے اس فرمان کو اورنگزیب کی سختی اور وصولی جزیہ مین تشدد پر محمول کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ جزیہ کی آمدنی بہت کم رہ گئی تھی، اور انکم ٹکس کے طور پر غیر مسلمون کا وہی ایک محصول تھا، اس لئے بادشاہ نے تاکید کی کہ اور معاملات مین معافی کی سند دینے کا اختیار ہے لیکن جزیہ مین ایسا نہین کرنا چاہئے سرکار نے بڑا دشواری اور "بدعت" کے الفاظ کو بڑی اہمیت دی ہو لیکن اس مین کیا چیز خلاف واقعہ ہے ؟ کیا شورشون، بغاوتون اور مظاہرون نے جزیہ کے نفاذ مین دشواری نہین پیدا کی تھی ؟ اور کیا پرانے اور صحیح دستور کو اٹھا دینا بدعت (نئی بات) نہین ہے،؟

ناظرین! گذشتہ تینون صورتون سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ جزیہ کے باقاعدہ نظم ونسق کا کیا سبب تھا؟ واقعات شاہد ہین کہ پُرامن مقابلہ "بغاوتون اور جزیہ کی معافی کے سبب سے آمدنی کم ہوگئی تھی، اس لئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا تھا، سرجادوناتھ نے سبب کو مسبب اور مسبب کو سبب قرار دیکر معاملہ کو بالکل اُلٹ دیا ہے، انھون نے لکھا ہے کہ چونکہ محکمہ مین سختی تھی، اس لئے گذشتہ واقعات پیش آئے، حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ چونکہ واقعات پیش آئے اسلئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا،

بعض اور غلط فہمیان گذشتہ پانچ بڑے مغالطون کے علاوہ پروفیسر جادوناتھ کی بعض خوش فہمیان اور بھی ہین، مثلاً

(۱) جزیہ اشاعت اسلام کا ذریعہ تھا، اس کا جواب اگرچہ علامہ شبلی مرحوم نے نہایت معقول اور دلچسپ دیا ہے کہ.

"ایسا ہلکا ٹکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی ۔۔۔۔ کیا دنیا مین ایک شخص نے بھی اوس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا ؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا ؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے"!!

(مقالات شبلی مضمون الجزیہ ص ۲۳۰ ج ۱)

اعجاز القرآن

اور

اس کے وجوہ اور دیگر متعلقہ امور

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈہ

عم محترم جناب مولانا سید محمد بدر الدین علوی صاحب نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی فرمایش پر اس مقالے کو انگریزی زبان مین لکھا تھا مضمون کی اہمیت کی وجہ سے بعض اصحاب نے اصرار کیا کہ اس کو اردو کے سانچے مین ڈھال کر ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جائے، موصوف نے اسے منظور فرما کر مجھے ترجمے کی خدمت پر مامور فرمایا، مین نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع اصل کی خوبی ترجمے مین باقی رہے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے اس لئے کہ یہ میری پہلی علمی کوشش ہے"

"محمد فخر الدین علوی بی اے علیگ"

کلام پاک کو اپنے متبعین کی بے نظیر عقیدت حاصل ہے، بہت سے مسلمانون نے پوری کتاب کو حرف بحرف حفظ کرنے کے علاوہ اپنی ساری زندگی مختلف طریقون پر اس کی خدمت کے لئے وقف کردی، ان کے لئے کلام پاک علوم کا گنجینہ رہا ہے، محض پچھلے علوم ہی کا نہین، بلکہ ان نئے علوم کا بھی جن کا سرچشمہ صرف قرآن ہی ہے، قرآن پاک کے علوم پر بحیثیت مجموعی اور ہر فن پر علحدہ علحدہ کتابین لکھی گئی ہین، اس مضمون مین

مین ملازمین سلطنت سے جزیہ لیا جاتا تھا، اور نہ خدمت کی صورت مین، بلکہ اُن کی خدمات پر اُن کو الٹا معاوضہ ملتا تھا، فوج مین امراے جزیہ کی موجودگی کے ایک اور معنی بھی ہوسکتے ہین یعنی امیر جزیہ کے ساتھ امداد کے لئے فوج ہو، جیسا کہ میر عبدالکریم کے ساتھ فوج بھیجی گئی تھی، کیونکہ رعایا باغی تھی، اور یہ تو بہر صورت ممکن ہے، کہ فوج مین جزیہ کا کوئی دفتر ہوتا ہو تا کہ باغی علاقون کے قبضہ مین آنے کے بعد جزیہ وصول کیا جاسکے،

(باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آرڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجاسکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندہ ہین، اُن کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائینگی، جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگالین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"منیجر"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین

اس مین سندھ کا جغرافیہ مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت ۳؎،

"منیجر"

متاخرین میں سے جنھوں نے اس موضوع پر لکھا ان میں مشہور متکلم امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ،
ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ .... ابن سراقہ شاطبی متوفی ۶۶۲ھ قابلِ ذکر ہیں، کشف الظنون سے
معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، زملکانی ۷۲۷ھ، دورِ حاضر کے
مصری عالم مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، ایسے علما جنھوں نے اس موضوع
پر سرسری طور پر قلم اٹھایا، اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی صحیح تعداد بیان نہیں کی جا سکتی، ان میں ایسے جنھوں نے اس
موضوع پر بہت لطافت کے ساتھ عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) ماوردی متوفی ۴۵۰ھ جنھوں نے رسالہ اعلام النبوۃ میں اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ لکھا ہے،

(۲) علامہ عبدالقاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ علمِ بلاغت کے بانی عالم ہیں کی کتاب دلائل الاعجاز میں قرآن مجید کے اعجاز پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے،

(۳) قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفا نے قبولیتِ عامہ حاصل کی، بہت سے علما نے اس کی شرحیں لکھیں،

جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا، یہ مضمون علامہ جرجانی، علامہ باقلانی، ماوردی اور قاضی عیاض کی تصانیف سے ماخوذ ہے،

قرآن شریف کے اعجاز کے معنی

علامہ جرجانی نے اس اعجاز کی تشریح اس طرح کی ہے، قرآن پاک کی طرف سے عربوں کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کریں لیکن انھوں نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا، اور اس سے روگردانی کر کے تلوار سے لڑنا پسند کیا، اگر قرآن پاک کی مثال لانا اُن کے بس کی بات ہوتی، تو یہ اُن کے لئے مقابلہ لڑائی کے زیادہ آسان تھا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے کہ قرآن پاک کی وہ کونسی خصوصیت تھی

ان سب کا مفصل ذکر ممکن نہین، اس لئے اس مضمون مین صرف اعجاز قرآنی پر بحث کی جائے گی کہ اس کی مثال پیش کرنے سے کیون انسان قاصر رہا ہی،

اس علم کی ابتدا اور ترقی۔ قرآن خود اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز پیش کرنی محال ہی اور مندرجۂ ذیل آیات اس دعوی کا اعلان کرتی ہین،

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ، پس ان کو اس جیسا اسلوب بیان پیش کرنا چاہئے،

(۲) قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات، کہدو کہ اس جیسی دس سورتین بنا کر لائین،

(۳) وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم، اگر تمھین اس مین کچھ شبہ ہے، جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورۃ بنا لاؤ، اور اپنے حمایتون کو بھی بلالو،

نزول وحی کی تیئیس سالہ مدت مین اس تحدی کا نہ تو کسی مخالف نے مقابلہ کیا، اور نہ اس جیسا کلام پیش کیا، اس طرح قرآن شریف کے اعجاز کا عقیدہ قائم ہو گیا، جو تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک اسی صورت سے قائم رہا، تاآنکہ معتزلہ پیدا ہوئے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کی بلاغت کے مثل لانا ممکن ہے، اس زمانہ کے عوام عربی زبان مین مہارت نہ رکھتے تھے، اور بلاغت کا کیا ذکر وہ جملے کی صحیح و غلط شکل مین بھی تمیز نہ کر سکتے تھے، اس لئے اہل سنت نے پیش بندی کے طور پر وجوہ اعجاز تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس موضوع پر پہلے مصنف محمد بن یزید واسطی متوفی ۳۰۶ھ تھے، ان کے بعد مشہور عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ ہوئے جنھون نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا ذکر خود اپنی کتاب الحیوان مین کیا ہے، ان کے بعد رمانی نحوی متوفی ۳۸۲ھ کا ابھرتا ہے، اسی زمانے کے ایک دوسرے محدث خطابی متوفی ۳۸۸ھ ہوئے جنھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، علامہ باقلانی متوفی ۴۰۳ھ اس موضوع پر بہترین مصنف تسلیم کئے گئے ہین،

پکارا گیا، اور اس کو اپنا کام انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد تعمیل حکم کی خبر بصیغۂ مجہول یہ ظاہر کرنے کے لئے دی گئی ہے، کہ پانی خود اپنے اختیار سے زمین میں جذب نہیں ہوا، بلکہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا، پھر تعمیل حکم کے بیان سے واقعہ کی تائید لائی گئی ہے، اور اس کشتی کے بیان سے جس کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے، اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے، بلاغت کی رو سے یہ طرز بیان واقعہ کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، آخر میں لفظ قیل کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ جملے کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو جائے، یہ تمام خوبیاں سننے والے کے دماغ پر عظمت طاری کرتی ہیں محض سادہ الفاظ کی مدد سے ہی نہیں بلکہ ان عجیب و غریب مضامین سے بھی جو ان الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں،

علامہ جرجانی نے اپنی رائے کو اسی کتاب میں ایک اور جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جب عربوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن پاک کی مثل بنا لائیں، اس وقت اُن کو قرآن کی وہ مخصوص خوبیاں جو اپنی عبارتوں میں وہ نہیں پیدا کر سکتے تھے، ضرور معلوم رہی ہوں گی" کیونکہ یہ مہمل بات ہے کہ کوئی شخص اپنے فعل کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح اس کام کو نہیں کر سکتے، قرآن کی یہ خاص خوبی محض اس کے الفاظ حروف اعراب اور مسجع جملوں ہی میں مخصوص نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی، اس لئے وہ خوبی محض ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے نامعلوم تھے"

یہاں علامہ جرجانی نے اپنے بیان کی تائید میں اشتعل الراس شیبًا کی تشریح کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سر ضعیف العمری سے چمک نکلا، تا وقتیکہ کلمہ راس کو معروف باللام نہ بنایا جائے، اور اس کو اشتعل کا فاعل نہ قرار دیا جائے، اور دونوں کلموں کے ساتھ شیبًا کو حالت نصبی میں بصورت نکرہ اضافہ نہ کیا جائے،

جس نے اہلِ عرب کو اس کی نظیر لانے سے قاصر رکھا؟ کیا وہ قرآن مجید کے صحیح، عمدہ اور خوبصورت مضامین تھے یا محض الفاظ؟ اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی مثال وہ نہ لا سکے؟ ان سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہون گے،

قرآن شریف کے مخالفین نے اس کی شستگیِ الفاظ، اُن کی ترتیب، بیان کی خصوصیات، آیات کا غیر معمولی آغاز و اختتام، الفاظ کی روانی، واقعات کا بیان، اسلوب نصیحت اور یاد دہانیون اور دلائل کو خوب دیکھا، اور اس کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر غور کیا، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو اپنی جگہ پر غیر موزون ہو، یا جس پر اعتراض کیا جا سکتا ہو، اور اس کی تصحیح کیجا سکتی ہو، ان خصوصیات کی وجہ سے کسی شخص کو بھی اس کی مثال لانے کی ہمت نہ پڑی، علامہ جرجانی کے جوابون کا خلاصہ یہ ہو کہ الفاظ اور مضامین دونون نے مجموعی طور پر وہ خوبی پیدا کر دی جس نے کلام پاک کو ناقابلِ مثال بنا دیا،

علامہ جرجانی ایک طویل بحث کے بعد مندرجۂ ذیل آیت کی خوبیون کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیان کی توضیح کرتے ہین کہ

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ	کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی سوکھ لے اور
أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ	اے آسمان پانی کو روک لے پانی کم ہو گیا
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا	اور حکم کی تعمیل ہو گئی، اور کشتی جودی کی پہاڑی
لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝	پر رُک گئی، اور کہا گیا کہ ظالمون پر لعنت ہو،

ان آیات کا حُسن اُن کے الفاظ اور جملون کی مخصوص ترتیب سے ظاہر ہے، موقع کی اہمیت کی وجہ سے زمین کو حرفِ یا سے پکارا گیا ہو، یا ایتھا سے نہین، اس کے بعد آگے اور پیچھے کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ابلعی کو لیجئے، یہان پانی کو کافِ خطاب سے منسوب کیا گیا ہے، جو زمین کی طرف اشارہ کرتا ہو، یہ طرز خطاب بڑی خوبی کیساتھ منتخب کیا گیا ہے، اور ابلعی الماء کا سادہ طریقہ نہین اختیار کیا گیا، اس کے بعد آسمان کو

متعلق ہونے کے باوجود عربون کے مروجہ طرز بیان سے علحدہ تھا، ان کے مروجہ طرز مین صرف دو چیزین تھین، نثر اور نظم، نثر کی دو قسمین تھین، مسجع اور غیر مسجع، نظم کی بہت سی قسمین تھین، شاعری بلند پایہ فن تھا، لیکن نثر ہر ایک کے بس کی تھی، قرآن اُن مین سے کسی قسم کی نثر یا شاعری سے مشابہت نہین رکھتا، کیونکہ آیات کے آخری حروف شعر کے قافیون اور نثر کے سجع سے مختلف تھے، ان بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا، جو اہلِ عرب کے بس سے باہر تھا، اور معاصر اہلِ عرب اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوئے،

(۳) عرب مین ایسے بلیغ کلام کا وجود نہ تھا جس مین نازک خیالات اور پختہ حقائق بیان کئے گئے ہون، اور اسالیب بیان مین طول کے باوجود باہم مشابہت بھی ہو، یہ صحیح ہو کہ عقلا نے اچھے اچھے جملے بھی کہے، اور شعرار نے اشعار بھی، مگر ان جملون اور اشعار مین اختصار کے باوجود بھی خامیان موجود تھین، اس کے برعکس قرآن پاک ہر قسم کے نقائص سے پاک ہی،

(۴) قرآن شریف کے طرزِ ادا مین نہ کوئی اختلاف ہی اور نہ بیان مین کوئی نقص ہے، اگرچہ اس مین قصے، نصیحتین، دلائل، حقائق، قوانین، معذرت، وعدے وعید، محاسنِ اخلاق کی تعلیم اور دوسرے مختلف قسم کے مضامین ہین، اور کسی ایک تحریر مین ان تمام خوبیون کا مجتمع ہونا ناممکن ہے، مختلف لوگ بیان کی مختلف شاخون مین ماہر ہوتے ہین، مثلاً شاعر جو مدح کرنے مین ماہر ہو وہ ہجو کا ماہر نہین ہو سکتا، اور جو شخص ہجو نگاری مین بلند پایہ ہوگا، وہ مدح مین کمتر ہوگا، اگر بعض مرثیہ گوئی مین بہتر ہین، تو دوسری اصنافِ شاعری سے بے بہرہ ہین، بعض رجز مین مہارت رکھتے ہین، تو دوسرے اقسام پر قادر نہین بعض اونٹوں اور گھوڑون کے اوصاف، رات کے سفر، باغ، شراب اور جذبات کی مصوری کرنے مین استاد مانے گئے ہین، اگر امرؤالقیس سواری کا بیان کرنے مین مشہور ہے، تو نابغہ ڈرانے اور ترغیب دلانے مین ماہر ہے، اسی طرح تقریرون پیامون اور دوسرے قسم کے بیانات مین اختلاف ہی،

جملے میں کوئی خوبی نہیں پیدا ہوگی، کیونکہ جو مضمون بیان ادا کیا گیا ہے وہ اسی طرز کے ساتھ مخصوص ہے،

وجوہ اعجاز | علامہ باقلانی کی رائے کے مطابق قرآن کے اعجاز کی تین خاص وجوہ ہیں، انھوں نے آخری وجہ کو دس قسموں میں تقسیم کرکے کل تعداد بارہ تک کر دی ہے، ماوردی نے اُن کی تعداد بیس قرار دی ہے، امام قاضی عیاض چار وجہیں بتاتے ہیں، مگر آٹھ کا اضافہ کرکے انھوں نے بھی تعداد بارہ تک پہنچا دی ہے، اُن سب کی میزان چالیس ہوتی ہے، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) الفاظ کی صحت اور ان میں آپس کی ایسی مشابہت جو عربوں کی رسائی سے باہر تھی، اہل عرب زبان میں غیر معمولی مہارت کے باوجود بھی قرآن کی مثال پیش نہ کرسکے، حالانکہ یہ دعویٰ ۲۳ سال تک قائم رہا، ولید بن مغیرہ نے جو مکہ کا بڑا آدمی تھا، آنحضرت صلعم کو آیہ

اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ — بیشک اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے،

پڑھتے ہوئے سُن کر کہا "اس بیان میں مٹھاس اور حسن ہے، اُس کا زیرین حصہ پانی میں ڈوبا ہوا اور بالائی حصہ پھلوں سے لدا ہوا ہے، اور یہ انسان کا کلام نہیں ہے"، ایک بدوی کسی شخص کو آیت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ — تمھیں جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اعلان کردو۔

تلاوت کرتے ہوئے سُن کر سجدے میں گر گیا، اور کہا کہ میں اس کی فصاحت کے سامنے سجدہ کر رہا ہوں، ایک رومی بطریق نے جو اچھی عربی جانتا تھا کسی مسلمان کو یہ آیہ پڑھتے سنا،

وَمَنْ یُّطِعِ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَ اللہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ — کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہیں جو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت اور خدا کا...

تو کہا کہ صرف ایک آیت میں دنیا و آخرت کے وہ تمام مسائل موجود ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے،

(۲) قرآن شریف کی حیرت انگیز عبارت اور اس کا غیر معمولی طرز بیان جو مختلف مضامین سے

(ج) آیات کی ساخت مین حسن ہے، اور غیر موزون بندشون کا کہین وجود نہین، اوزان مین مشابہت ہے،

(۷) عربی زبان مین متعدد اسالیب بیان ہین، مثلاً تفصیل و تطویل، اختصار، اجتماع و افتراق اور استعارہ وغیرہ، یہ تمام اصناف قرآن پاک مین موجود ہین، جب اُن کے قرآنی استعمال کا مقابلہ دوسرون سے کیا جاتا ہے، تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔

(۸) قرآنی خیالات جو مذہب اور شرع کی بنیاد ہین، اس استدلال و مباحثہ اور ایسی ہم آہنگی نزاکت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین کہ اس کی مثال انسانی کلام مین ملنا ناممکن ہے، اس مین اگر بہت سے معمولی اور جانے بوجھے ہوئے خیالات ہین، تو بہتیرے نئے اور غیر معمولی بھی ہین، جدید خیالات کے مقابلہ مین جانے بوجھے ہوئے خیالات کے لئے الفاظ منتخب کرنا آسان ہے، اور معمولی تخیل کے لئے بہت عمدہ الفاظ کے استعمال کے مقابلہ مین بلند اور بہترین تخیل کے لئے بہترین الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اسی کے ساتھ اگر الفاظ خیالات کے مطابق ہون، اور خیالات الفاظ کے، اور دونون اپنی جگہ پر بے مثال ہون جیسا کہ قرآن مین ہے، تو اس کی ندرت اور کمال فصاحت مین کوئی شبہہ نہین ہو سکتا،

(۹) کلام کا اصل حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی نظم یا نثر مین اس کا اقتباس دیا جائے اور اس وقت اس کی خوبی ہیرے کی طرح چمکے، قرآنی اقتباسات کو جب اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، تو ان کی خوبی اور نمایان ہو جاتی ہے، اور وہ دوسرے کلام مین نگینہ کی طرح چمک اٹھتے ہین،

(۱۰) عربی مین حروف تہجی ۲۹ ہین، اور قرآن کی وہ سورتین جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہین ۲۹ ہین، اور ان حروف مقطعات کی تعداد جو ان مین لائے گئے ہین، ۱۴ ہے، شاید ایسا اس لئے ہو کہ قرآن اُن کی زبان کے الفاظ سے مرکب ہے، یہ حروف بعد کے نحویون کی رائے کے مطابق دو قسم کے ہین، مہموسہ اور مجہورہ، دس مہموسہ ہین، اور باقی انیس مجہورہ، دونون قسمون مین سے نصف نصف سورتون

ایک شخص اپنی دلچسپی کے کسی خاص مضمون مین اپنے ہنر کا مظاہرہ کرسکتا ہے لیکن جب وہ کسی اور موضوع کو ہاتھ لگاتا ہے تو پیچھے رہ جاتا ہے، اور اس کی عبارت کی خامی نمایان ہوجاتی ہے، اسی بنا پر مندرجۂ بالا شعرا جن کی برتری اُن کے خاص مضامین مین مسلم ہے دوسرے مضامین مین کمتر سمجھے گئے ہین، ایک ہی جملہ جس میں کوئی بندش نہ ہو، ادا کرنے والون کے اختلاف سے اختلاف پذیر ہوجاتا ہے، قرآن پاک اپنی تمام تفصیلات مین ایسی منضبط قوت کا حامل ہے، جو تمام نقائص سے پاک ہے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کیجا سکتی جس مین قرآن پاک اپنی فصاحت کے یکسان معیار کو قائم نہ رکھ سکا ہو، ایک ہی مضمون کو بار بار دہرانے مین طرز بیان کا یکسان رہنا ناممکن ہوتا ہے لیکن قرآن مضامین کی تکرار کے باوجود بھی اپنے معیاری طرز بیان سے کبھی نہین ہٹا، اور اپنی بلاغت قائم رکھی،

(۵) فصحا کی عبارتون مین جہان وہ مختلف جملون اور خیالات کو آپس مین ملاتے اور جدا کرتے ہین ایک نمایان بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اُن کی یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنی زبان کے اسالیب بیان کے مطابق کسی مضمون کو اس کے ابتدائی درجہ سے آغاز کرکے انتہا تک پہنچاتے ہین، یا اس کے برعکس انتہا سے ابتدا ریں لیجاتے ہین، یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جب کسی مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانے یا کسی مضمون کو غیر دلچسپ اور مشکل بنانے کی کوشش کرتے ہین لیکن قرآن مین اس قسم کی کوتاہی نہین بلکہ اس کے ہر قسم کے بیانات مین مناسبت ہی،

(۶) آیاتِ قرآنی کی ساخت سے تین خصوصیات ظاہر ہوتی ہین،

(الف) الفاظ کا اس طریقہ سے استعمال کہ وہ موثر ہون،

(ب) خیالات کی ایسی جامعیت جو ابتدا ہی سے واضح ہین، اور ان کے سمجھنے کا دار و مدار آیت کے اختتام پر نہین ہے، اور خیالات اور الفاظ مین بھی مطابقت ہے، اس مین نہ کمی ہے اور نہ زیادتی،

ہو اس آیت میں دو امر دو نہی کے صیغے، دو خبریں اور دو بشارتیں ہیں،

(۱۳) ایک ہی سلسلہ میں مختلف اقسام کے مضامین کا یکجا کرنا جو انسانی طاقت سے باہر ہے، قرآن میں بعض وقت یہ خوبی ایسے الفاظ کے استعمال سے پیدا کی گئی ہے جن کی مختلف تشریحات ممکن ہیں،

(۱۴) اطلاعات اور پیشین گوئیاں جو آیندہ سچی ثابت ہوئیں، مثلاً یہی دعوی کہ مخالفین کبھی بھی قرآن کی مثال لانے میں کامیاب نہ ہوں گے یا جنگِ بدر کے بارے میں کفار کی شکست کی پیشینگوئی،

(۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدیم صحیفوں سے ناواقف تھے، آپ کو اُن لوگوں سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا جن کو ان صحیفوں کا علم تھا، مگر قرآن میں پچھلی قوموں کے قصے ابتدائے آفرینش یعنی آدم و حوا کا قصہ، اُن کا جنت میں قیام اور پھر وہاں سے نکلنا، طوفانِ نوح اور فرعون کے قصے، انبیاء علیہم السلام کی سوانح اور خصوصیت کے ساتھ ان واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے جن کے بارے میں امتحاناً دریافت کیا گیا تھا، یہ تمام بیانات اصلی واقعات کے مطابق تھے، اُن کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے علم پر نہ تھی

(۱۶) لوگوں کے دلوں کے راز جن کو وہ چھپاتے تھے، اور جنھیں کوئی بھی معلوم نہ کر سکتا تھا، قرآن نے کھول دیئے، مثلاً

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا،	یعنی جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا،
اور:- وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ ان دو میں سے ایک گروہ تمھارے لئے ہوگا، اور تم نے یہ چاہا کہ تمھارے لئے وہ گروہ ہو جو غیر مسلح ہے۔

یہاں جن رازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر نہیں تھے،

کے شروع مین لائے گئے ہین، حروف کی ایک اور تقسیم بھی ہے حلقی و غیر حلقی، پہلے حروف تعداد مین چھ ہین، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین لائے گئے ہین، ایک تیسری تقسیم بھی ہے شدیدہ اور مطبقہ، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون قسمون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین موجود ہین، یہ تقسیمین نزول قرآن کے بہت بعد دریافت ہوئی ہین، اس لئے اس متاخر الکشاف کے مطابق سورتون کا افتتاح اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہو کہ قرآن انسان سے بالاتر ہستی کا کارنامہ ہے،

(۱۱) قرآن کا طرز بیان سادہ آسان اور غیر مانوس بندشون اور الفاظ سے پاک ہے، اس کی ترکیب مین کہین گنجلک نہین، اس کے مضامین ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، مگر اس سادگی کے باوجود بھی قرآن کی تمثال نہین لائی جاسکتی کسی بھی انسانی کلام مین یہ خوبی نہین پائی جاتی، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اچھے شاعرون کی نظمون تک مین غیر مانوس الفاظ اور دور افتادہ خیالات بہت پائے جاتے ہین، اور اُن کی ساری کی ساری نظمون مین یکسانی نہیں پائی جاتی، اور ان مین اچھی، بُری، اور اوسط درجہ ہر قسم کی عبارتین ہین،

(۱۲) طویل مضامین اور خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقہ سے ادا کئے گئے ہین، مثلاً آیہ:-

لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ ، یعنی قصاص مین تمھارے لئے زندگی ہے،

کا القتل انفی للقتل سے موازنہ آیہ کی برتری ثابت کرتا ہے اس کی دوسری مثال

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی بھیجی کہ اس کو
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ	دودھ پلاؤ، اور جب تم اس کے بارے مین
وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَادُّوْهُ	خوف زدہ ہو تو سمندر مین پھینک دو، اور نہ ڈرو
اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ	مت اور نہ رنجیدہ ہو، ہم اُس کو تمھارے پاس
	پھر واپس لائین گے، اور اس کو پیغمبرون مین

.............اَمْ هُمُ المُصَیْطِرُوْنَ، یا وہ خود اپنے خالق ہین یا وہ اپنے (تقدیری) معاملات کے خود مالک ہین"

تو اُن کا دل ہیبت سے لرز گیا، اور وہ سمجھے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو ئی، اس طرح اُن کے دل مین ایمان راسخ ہو گیا،

(۲۳) قرآن کے مختلف حصّے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت و مطابقت رکھتے ہین، اور اس مین مختلف اقسام کے مضامین کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اور جب اس کا انداز بیان ایک موضوع سے دوسرے کی طرف جاتا ہی، تو اس تبدیلِ موضوع مین بھی خوبی ہوتی ہے، اور بے لگاؤ نہین معلوم ہوتا، حالانکہ دونون مضمونون مین بڑا اختلاف ہوتا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی سورہ مین جو مختلف مضامین پیش کرتی ہے کہین بھی کوئی خلا، یا بے تعلق تبدیلی نہین معلوم ہوتی، قرآن پاک جگہ جگہ اپنے موضوع کا رُخ وعدے سے وعید کی طرف، ترغیب سے ترہیب کی طرف، ماضی سے مستقبل کی طرف، قصّون سے امثال کی طرف اور حکم سے نزاع کی طرف بدلتا ہے، لیکن اس سے مضمون مین کوئی ناموافقت نہین پیدا ہوتی، جو نہایت ہی مشکل امر ہی، اور موضوع بدلتے وقت غیر موزونیت کا ہونا لازمی ہے، اسی لئے بہت سے شعرا، ایسے مواقع پر ناکام رہتے ہین، بحتری گو عمدہ بندش اور خوبی بیان مین مشہور ہے لیکن جب وہ غزل سے مدح کی جانب آتا ہی تو اس تبدیلی کو وہ مناسب طور پر نباہ نہین سکتا، اور اس مین ناکام رہتا ہی،

(۲۴) قرآن پاک کی نقل و روایت مین اس توجہ سے کام لیا گیا ہے، کہ اس کے الفاظ، مضامین و ترتیب مین تغیر کا کیا ذکر حرکات تک مین بھی ذرہ برابر تغیر نہین ہوا، ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگون کی بس یہی کوشش رہی، کہ قرآن پاک اُن کے پاس بعینہٖ اسی حالت مین بغیر ذرہ برابر تغیر کے محفوظ رہے جس مین ان تک پہنچا،

(۲۵) آیات کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے قرآن مجید کے مخصوص طرز بیان مین کسی قسم کا فرق نہین پیدا ہوتا، انسانی کلام مین اس قسم کا تفاوت ہونا لازمی ہے،

(۱۷) قرآن مین علم وحکمت کے ایسے اصول موجود ہین جن سے عرب نابلد تھے،

(۱۸) قرآن مین خالق کے وجود، اس کی توحید اور معاد کے ثبوت اور دوسری جماعت سے مقابلہ اور اس کی تردید کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کئے گئے ہین جن کو ایک امی خود اپنی انسانی کوشش سے پیش نہین کرسکتا،

(۱۹) مضامین کو پختگی کے ساتھ ایسے آسان طریقہ سے بیان کرنا کہ سہولت بیان کی وجہ سے کلام مین عامیانہ پن پیدا نہ ہو، اور غیر مانوس مضمون بھی مشکل نہ معلوم ہو، جملے کی ساخت مین آسانی اُس کو عامیانہ بنا دیتی ہے اور نادر ترکیبون کا استعمال مشکل بنا دیتا ہے، دونون کا یکجا ہونا غیر مانوس تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام باتون کو بڑی خوبی سے نباہا ہے، اور جہان بھی آسان اور نادر مضمون کو یکجا کیا گیا ہے، وہان ان مین پوری مطابقت ہے اور کوئی اجنبیت نہین معلوم ہوتی،

(۲۰) قرآن کو یاد کرنا اور اُس کو اپنے حافظہ مین محفوظ کرلینا آسان ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی کتاب یا صحیفہ قرآن کی برابری نہین کرسکتا، قرآن کو حفظ کرنے مین کسی شخص کی خصوصیت نہین، خواہ وہ عرب ہو یا عجم، بالغ ہو یا نابالغ، ہر ایک بڑی آسانی کے ساتھ یاد کرلیتا ہے، ابتدا ے اسلام ہی سے ایسے لوگون کی ایک بڑی جماعت ہوتی آئی ہے، اور اب بھی موجود ہے، جس نے قرآن کو حفظ کیا ہے، اور کرتی ہے،

(۲۱) قرآن ایک غیر فانی معجزہ ہے، جو ابدالآباد تک رہے گا،

(۲۲) قرآن شریف مین رعب کا ایک ایسا عنصر ہے، جس سے سننے والون اور خصوصیت کے ساتھ کفار کے دل بہت مرعوب ہوتے ہین، جیسا کہ محدثین کے روایت کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے،

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انھون نے کفر کی حالت مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز مین سورہ طور تلاوت کرتے سنا، جب آپ اس آیت پر پہنچے،

ام خلقوا من غیر شیئ ام ھم الخالقون   کیا اُن کی تخلیق بغیر کسی خالق کے ہوئی ہے

اسی کو لینا چاہئے، اس مسئلہ مین اختلاف ہو کہ قرآن مین سجع ہے یا نہین، علماء کی ایک جماعت جو سجع کو حسن بیان اور فصاحت کا جزو تصور کرتی ہے، اس خیال کی ہے کہ قرآن مین سجع ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت

قَالُوْآ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى، ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے،

مین ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھا گیا ہے، حالانکہ معکوس ترتیب عموماً استعمال ہوتی ہے، جیسا کہ دوسری آیتون مین ہے، مگر یہ تبدیلی (یعنی ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھنا) سجع کی غرض سے کی گئی ہے، سجع کا تقاضا ہو کہ اس جگہ الف مقصورہ ہو، یہان یہ نہین کہا جا سکتا کہ یہ تغیر بے ارادہ ہوا ہے، جیسا کہ اس جگہ کے لئے کہا جاتا ہو، جہان کوئی قرآنی آیت وزن شعری کے مطابق پڑ گئی ہو، جس کی مثالین بہت ہین،

علامہ باقلانی کی رائے سجع کے خلاف ہو، وہ لکھتے ہین "قرآن مین سجع ہونے کی جو یہ دلیل پیش کیجاتی ہو، وہ پوری طرح صحیح نہین معلوم ہوتی، اول یہ کہ قرآن مین اگر سجع ہوتا، تو وہ عربون کے طرز بیان سے جداگانہ نہ ہوتا، اور اس صورت مین اس کی مثال لانا ممکن ہوتا، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ قرآن کا سجع بھی غیر ممکن المثال ہے، لیکن قرآن کو شعر ماننے کی صورت مین بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی، اور پھر اس کے کوئی معنی نہ رہ جائین گے کہ قرآن شعر نہین ہو، دوسرے یہ کہ سجع شاعری کی بنیاد ہے، یعنی وہ شاعری کا پہلا درجہ تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے شاعری کی موجودہ صورت اختیار کر لی، قرآن مین شاعری کی مذمت اور اس سے احتراز کا اعلان اس شدت سے کیا گیا ہے کہ دونون مین دور کا تعلق بھی نہین مانا جا سکتا، اور قرآن مین سجع ماننے کی صورت مین اس تردید کا زور باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، تیسرے یہ کہ جاہلیت کے کاہن سجع سے واقف تھے، خود قرآن شریف اور حدیث نبوی

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یعنی یہ کسی کاہن کی تصنیف نہین ہے،

دونون نے اس کا انکار کیا ہے، ایک مرتبہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے جنین کے بارے مین کہا:-

(۲۶) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والے اس سے کبھی نہین گھبراتے، اور یہ ان کے لئے ہمیشہ تازہ اور نیا رہتا ہے، جو انبساط اور حسن بیان کا نتیجہ ہے، یہ خوبی کسی کلام مین نہین پائی جاتی، خواہ وہ کتنا ہی شیرین کیون نہ ہو،

(۲۷) جب ایک شخص بلاغت کے مطالعہ مین مشغول ہوتا ہے، تو وہ اس مین ماہر ہو جاتا ہے، اور فصاحت مین عبور حاصل کرلیتا ہے یعنی فصاحت اس کے مطالعہ کو وسیع کرتی ہے، لیکن قرآن پاک اُس شخص کو فصیح و بلیغ نہین بناتا، جو اس کو مسلسل پڑھتا رہتا ہے، اور اس مین لگا رہتا ہے، یہ خصوصیت صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہو (تاکہ دوسری بلاغت کی کتابون سے ممتاز رہے)

(۲۸) قرآن شریف مین اگر کوئی بھی اضافہ کیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ تمیز کی جاسکتی ہے، اور اگر الفاظ مین کوئی تبدیلی کیجائے، تو وہ بھی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، اور چھپائی نہین جاسکتی،

(۲۹) قرآن کے مخالفین اس کی مثال لانے سے قاصر رہے، باوجودیکہ اس کا یہ دعوی اب بھی قائم ہے، اور اس کی مثال لانے سے اپنی ناقابلیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہوگئے،

ان کا حسد کچھ کام نہ آیا، اور انھون نے اس کی مثال لانے سے مایوس ہو کر تلوار سے لڑنے کو ترجیح دی، جس کے نتیجہ مین اُن کے آدمی قتل و غارت ہوئے اور قیدی بنائے گئے،

(۳۰) علامہ ماوردی کے نزدیک سب سے آخری وجہ الصرفہ ہے، یعنی خود قرآن نے اپنی مثال لانے سے مخالفین کا منھ پھیر دیا، اس بارہ مین اختلاف ہے کہ آیا قرآن کی مثال لانا اُن کے بس ہی مین نہ تھا، یا یہ کہ ان مین اس کی صلاحیت تھی، مگر سلب کرلی گئی تھی، پہلا عقیدہ معتزلہ کا ہے اور دوسرا اہل سنت کا، چونکہ فلسفیانہ نازک مسئلہ ہے، اس لئے مین اس بحث مین نہین پڑنا چاہتا،

کیا قرآن مین سجع ہے؟ پچھلے صفحات مین بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن پاک کا ایک جداگانہ طرز بیان ہے، جسے نہ تو نثر کہا جاسکتا ہے، اور نہ نظم، اب اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے، نثر چونکہ عموماً مسجع ہوتی تھی اس لیے پہلے

آیاتِ قرآنی کے آخری حروف فواصل خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص طرز کے ہین، ان مین اور سجع و شعر کے قافیہ مین کوئی چیز مشترک نہین، ایک آیت مین ہارون کو اوّل اور موسیٰ کو بعد مین اور دوسری جگہ اس کے برعکس رکھنے کی وجہ سجع نہین، بلکہ اس سے مقصود ایک مفہوم اور ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ مین بیان کرنا ہے، جو لوگ فنِ بیان کے ماہر ہین، وہ جانتے ہین کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ اور مختلف طریقون سے بیان کرنا کتنا مشکل ہی اس مین فصاحت کا قائم رکھنا مشکل ہوجاتا ہے، قرآن پاک نے ایک ہی قصہ کو مختلف الفاظ اور مختلف پیرایون مین بار بار بیان کرنے کے باوجود اپنی فصاحت کے معیار کو قائم رکھا ہی اور تکرار کی وجہ سے اس کی بلاغت مین کہین بھی خامی نہین پیدا ہوئی، اور یہ تنوع بھی اس خوبی کا ایک رُخ ہے جس نے قرآن کو معجزہ بنا دیا، الفاظ کو آگے پیچھے رکھنے کا مقصد دوسرا ہے، اور سجع سے فواصل کی یہ ظاہری مشابہت آیاتِ قرآنی کو حقیقۃً سجع کے زمرے مین نہین لاسکتی،

قرآن شاعری نہین شاعری کے تمام اصناف عربون مین عام تھے، یہان تک کہ لڑکے بھی نظمین کہا کرتے تھے، اور اس مین کوئی دقت نہین محسوس کرتے تھے، پچھلے صفحات مین یہ بات بار بار کہی جاچکی ہے کہ قرآن پاک کا طرز بیان شاعری سے مختلف ہے، اور یہ فرق قرآن کے معجزہ ہونے کی وجہ ہے ورنہ اگر قرآن شعر ہوتا تو اس کی مثال لانا ممکن ہوتا،

قرآن بڑے زور و قوت سے اس بات کا اعلان کرتا ہی کہ وہ شعر نہین ہے، حسب ذیل آیات اس کی شاہد ہین،

(۱) وَمَا علمناہُ الشّعر :- ہم نے رسول کو شعر نہین سکھایا،

(۲) وَمَا هُوَ بقول شاعرٍ :- اور یہ کسی شاعر کا کلام نہین،

قرآن پاک کی آیتون مین یہ کہا گیا ہے کہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن پاک ایک شاعر کا کلام ہے، اس اعتراض کی تحقیق بہت آسان ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جب مخالفین قرآن اس کے طرز بیان

کیفَ ندی مَن لا شرب وَلا اکل — اس کا انتقام کیسے لین جس نے کھایا نہ پیا،

وَلا صاح فاستھل الیس دَمہٗ — اور نہ آواز کی، کیا اس کا خون بغیر انتقام

قد یطلُ، — کے رہے گا؟

آنحضرت صلعم نے جواب مین فرمایا :-

"اَسجاعۃ کسجاعۃ الجاھلیۃ — یعنی کیا یہ جاہلیت کی سی سجع ہے، یا کاہنون

اَوَ اسجعًا کسجع الکہان — کی سی،

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم سجع کو برا سمجھتے تھے،

اب ان آیات کا سوال رہ جاتا ہے جو بظاہر سجع معلوم ہوتی ہین، لیکن درحقیقت وہ سجع نہین ہین بعض موقعون پر قرآنی ترکیب سجع کے طرز کی ضرور ہے، مگر وہ حقیقۃً سجع نہین، سجع کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مین الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اور معنی و مضامین کی کم، اور قرآن مین زیادہ اہمیت معنی کی ہے، اور ان دونون مین بڑا فرق ہے،

اس کے علاوہ سجع جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک مخصوص طرز ادا کا نام ہے جس مین اگر ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا جائے، تو کلام انمل و بے جوڑ ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری فصاحت خاک مین مل جاتی ہے، جیسا کہ اگر شاعری مین اس کے اصول کا خیال نہین کیا جاتا، تو وہ شعر نہین رہ جاتا، اور اس کی فصاحت بھی ختم ہو جاتی ہے، بعض آیات قرآنی جن کو سَجَع کہا گیا ہے، وہ دراصل سجع کے اصولون کے مطابق نہین ہین کیونکہ اُن کے بعض جملے چھوٹے اور بعض اتنے بڑے ہین کہ سجع کا حرف اس وقت آتا ہے، جب کہ دوسرا جملہ پچھلے کا دوچند ہو جاتا ہے، جو سجع کے لئے ناپسندیدہ اور فصاحت کے خلاف ہے، اس سے قرآن کی فصاحت مین خلل ماننا پڑے گا، جس کو اس کے مخالفین بھی نہین کہتے، اگر ایسا ہوتا تو مخالفین خاموش نہ رہتے، انھون نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا، اور اس کو سحر کبھی نہ کہتے اس لئے سجع کو آیات قرآنی پر منطبق نہین کیا جا سکتا،

یا یہ   استقی الماء یا غلام سریعا،   یعنی اے لڑکے مجھے پانی جلدی پلا،

یہ جملے وزن کے مطابق ہین، مگر ایسا ارادۃً نہین کیا گیا اس لئے اُن کو شعر نہین کہا جا سکتا، اس کے علاوہ دوسری شرط کہ شعر مین ایک سے زیادہ بیت ہونی چاہئین، قرآن پاک کی آیات پر منطبق نہیں ہوتی، دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شعر ہوتا، تو یہ حقیقت یقیناً مخالفین قرآن کے علم مین ہوتی، اور بغیر کسی پس و پیش کے وہ یہ سمجھتے کہ قرآن شعر ہے، اور یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ پچھلے لوگون نے وہ سمجھا جس کو معاصرین نہ سمجھ سکے تھے، ایک اور جواب یہ ہے کہ اگر مخالفین قرآن نے اس کو شاعری سمجھا ہوتا، تو انھون نے اس کا مقابلہ کیا ہوتا، کیونکہ تمام اصنافِ شاعری پر انھین قدرت حاصل تھی، قرآن شریف کی مثال لانے سے اُن کی عاجزی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ قرآن کو شاعرانہ کلام تصور نہ کرتے تھے،

قرآن کے معارضین تاریخ مین ایسے چند لوگون کے نام بھی ملتے ہین، جنھون نے پچھلی ۱۴ صدیون کے دوران مین یا تو خود قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا دوسرون نے اُن کی تصنیف کو قرآن کے مقابلہ مین پیش کیا، ایسے لوگ دو قسم کے ہین (۱) وہ جنھون نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا، اور جھوٹا الہامی کلام بھی پیش کیا (۲) وہ جنھون نے محض فن کی حیثیت سے کچھ لکھا، اور انھون نے یا دوسرون نے سمجھا کہ اس کو قرآن شریف کے مقابلہ مین پیش کیا جاسکتا ہے پہلی قسم کے لوگون مین پانچ نام لئے گئے ہین، اُن کے اس مشن کا نتیجہ خود ان کے انجام سے ظاہر ہے، ان مین سے دو تو بغیر کسی کامیابی کے مارے گئے، دو مسلمان ہو گئے، اور پانچوان اپنی معمولی حالت پر آگیا،

(۱) مسیلمہ یمامہ کا رہنے والا تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام مین پیغمبری کا دعویٰ کیا، اُس نے مدینہ آنے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ڈھونگ رچایا، اس سے اس کا مقصد بادشاہت کا حصول تھا، چنانچہ اُس نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین صلح کی یہ شرط پیش کی کہ آپ اس کو اپنا شریک بنالین یا اپنا جانشین مقرر کر دین، اس کا یہ دعوی تھا کہ رحمان نامی فرشتہ اس پر قرآن لایا تھا جس مین فصلین اور

پر متحیر ہوئے، قرآن کو بے اصل اعتراضات پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ انھون نے کبھی کہا کہ یہ شاعری ہے، اور کبھی دعویٰ کیا کہ کسی کاہن کا کلام ہے، علامہ باقلانی کا خیال ہے کہ ان اعتراضات سے مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو شاعری ہی کی کوئی صنف سمجھتے تھے، (مگر پورے طور پر نہین) جس سے وہ آشنا نہ تھے، اس پر شعر کا اطلاق انھون نے اس وجہ سے کیا تھا کہ قرآن فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، یعنی جس معنی مین فلسفیون نے شعر کو لیا ہے اگرچہ اہلِ عرب کے نزدیک شاعری کی تعریف دوسری تھی، ایک اور ضعیف وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ عوام نے اوزان شعر سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو شعر کہہ دیا،

قرآن مین ایسی آیات بھی ہین جو وزن مین مصرعہ سے مطابقت رکھتی ہین، علامہ باقلانی نے ان آیات کو مع اوزان کے پیش کیا ہے، اختصار کے خیال سے یہان صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

وجفان کالجواب وقدور راسیات — اور پانی کے بڑے بڑے برتنون جیسی نا ندین

. . . . — اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگین، (سلیمان

. . . . — کے تابع جنات اُن کے لئے بنایا کرتے تھے)

لیکن اس اعتراض کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کہتے کسے ہین، شعر کی تعریف ہے کہ

"وہ کلام جو اراداۃً مقفیٰ رکھا گیا ہو، اور جو وزن پر منطبق ہو، اور جو اپنی جگہ پر مکمل تخیل پیش کرنے کیساتھ ساتھ ایک سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو شعر کہا جاتا ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ شعر کے لئے دو شرطین ہین ایک یہ کہ وزن اور قافیہ ارادۃً ہو، اور دوسری یہ کہ اس مین ایک ایسے زیادہ اشعار ہونے چاہئین، اور قرآن پاک کی بعض آیات غیر ارادی طور پر علم عروض کے مطابق ہین، جیسے بعض اوقات روزمرہ کی گفتگو مین بھی اتفاقاً کوئی فقرہ شعر کے وزن پر ہو جاتا ہے، جیسے کوئی کہے :

اغلق الباب واتنی بالطعام — یعنی دروازہ بند کر لو اور میرے لئے کھانا لاؤ،

محض فرقہ بندی کے جذبہ اور بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے کرنے لگے، اس کی صرف ایک وحی یا قوت نے نقل کی ہے، خلیفہ اوّل نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، فریقین مین جنگ ہوئی، اور انجام کار طلیحہ شکست کھا کر ملک شام کو بھاگ گیا، اس کے بعد پھر مسلمان ہو گیا، اور جنگ قادسیہ میں بڑی شجاعت دکھلائی،

(۴) قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح بنت حارث اپنے ننہالی خاندان بنو تغلب مین رہتی تھی، یہ قبیلہ عیسائی تھا، سجاح نے اُن کے مذہبی گیت یاد کرکے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پیغمبری کا دعویٰ کر دیا، قبیلہ کے چند لوگون نے اس کی پیروی کی، ان کو ساتھ لے کر اس نے خلیفہ اوّل کا مقابلہ کیا، راستہ مین بعض قبیلون سے لڑی اور بعض سے صلح کی، اسی زمانہ مین مسیلمہ کی قوت بھی بڑھ رہی تھی، وہ سجاح کے اس پروپگنڈے کا حال سُن کر خوفزدہ ہوا، اور اس سے مل کر شادی کا پیام دیا، سجاح نے منظور کر لیا، اور دونون کی شادی ہو گئی، سجاح نے بھی اپنی وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہین کیا بلکہ اسود اور طلیحہ کی طرح اس کا صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اور کچھ مسجع عبارت بھی تیار کر لیتی تھی، مسیلمہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا دعویٰ ترک کر دیا، اور دوسری مرتبہ اسلام مین داخل ہو کر اپنی بقیہ زندگی ایک مسلمان کی حیثیت سے گذار دی،

(۵) مشہور شاعر احمد بن الحسین متنبی نے جو ۳۵۴ھ مین مارا گیا، اپنی زندگی کے ابتدائی ایام مین پیغمبری، اور اپنے اوپر ایک قرآن نازل ہونے کا دعویٰ کیا، کچھ لوگ اُس کے پیرو ہو گئے، لیکن بعد مین وہ اس دعویٰ سے باز آ گیا، اور اپنی بقیہ زندگی ایک معمولی انسان کی طرح گذار دی،

دوسری قسم کے لوگون مین چار نام بتائے گئے ہین :-

(۱) نضر بن حارث یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصر تھا، اس کی لڑکی کے اشعار حماسہ مین درج ہین، اُس نے پیغمبری کا دعویٰ تو نہین کیا لیکن کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس نے اہل عجم کی تاریخ اور ان کے

جملے تھے، اس کا دعوی تھا کہ منصب پیغمبری بھی کہانت کا جزء ہے، اس لئے اس کا کلام کاہنوں کی سجع کے مشابہ تھا، اس کا نمونہ یہ ہے :-

الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل (یعنی ہاتھی! ہاتھی کیا ہے، اور تم نے یہ کیسے

لہٗ ذنبٌ وبیل وخرطوم طویل، جانا کہ ہاتھی کیا ہے، اس کے ایک سخت دم ہے

اور لمبی سونڈ،

اس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا کلام احمقانہ اور ذلیل خیالات سے بھرا ہوا تھا، اس کے انجام نے ثابت کر دیا کہ نہ وہ پیغمبر تھا اور نہ اس کا کلام وحی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفۂ اول نے ایک بہت بڑی فوج بھیجکر اس کا خاتمہ کرایا، اُس نے اپنا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا، جو اس کا ذکر زندہ رکھتا اور صرف مسلمانوں کی تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے،

(۲) اسود عنسی، اس کا نام عبہلہ تھا، یمن کا رہنے والا تھا، اپنی فصاحت و بلاغت، خطابت، شاعری، سجع اور کہانت میں مشہور تھا، اُس نے آنحضرت صلعم کے آخری عہد میں دعویٰ کیا کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، جب مفروضہ وحی اس پر نازل ہوتی تو وہ اپنے سر جھکا لیتا، اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو اٹھا کر کہتا، وہ (خدا) مجھ سے یہ باتیں کہتا ہے، یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چوبیس گھنٹے قبل مارا گیا،

(۳) طلیحہ بن خویلد قبیلۂ اسد کا آدمی تھا، اور عرب کے بہادروں میں گنا جاتا تھا، وہ اپنے قبیلے کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اس کے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، جن میں وہ بھی تھا، جب وہ وطن واپس آگیا، تو پیغمبری کا دعوی کر بیٹھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبیلہ میں بڑا مرتبہ حاصل کر لیا، اس کا دعوی تھا کہ کوئی ذوالنون نامی اُس پر وحی لاتا تھا، لیکن اس نے بھی اس کو قرآن نہیں کہا، اس کے ساتھ کچھ فصیح لوگ تھے، جو اس کا اتباع

فی مجاراۃ السور والآیات لکھ کر قرآن کا مقابلہ کیا، لیکن معری پر دہریون کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہے، اس الزام کے خلاف ایک بین ثبوت یہ بھی موجود ہے کہ خود معری نے اپنی کتاب الغفران مین اپنے خیالات کا یون اظہار کیا ہے،

واجمع ملحد ومهتد ان هٰذا الکتاب	ملحد اور مومن سب ہی اس بات پر متفق ہین
الذی جاء بہ محمد صلی اللہ علیہ	کہ محمد کی لائی ہوئی کتاب اپنے معجزے کی وجہ
وسلم کتاب بھر بالاعجاز ولقی	سے سب پر چھا گئی، اور اپنے دشمن کا مقابلہ
عدوہ بالارجاز ماحوی علی	سزادہی کے ساتھ کیا، یہ کتاب کسی خاص
مثال ولا اشبہ غریب الامثال	نمونے پر تیار نہین کی گئی، غیر مانوس طرز بیان
ما ھو بالقصد الموزون ولا رجز	سے مشابہت نہین رکھتی، یہ نہ تو مقفی نظم ہے اور
ولا شاکل خطابۃ العرب ولا	نہ رجز، اسے نہ تو عربون کی خطابت سے کوئی
سجع الکھنۃ،	مشابہت ہے اور نہ کاہنون کی سجع سے"،

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے مقابلہ مین پیش کی گئی ہے، اس کا نام الفصول والغایات ہے اور یہ الفاظ "فی مجاراۃ السور والآیات" محض تہمت کی بنیاد پر اضافہ کر لئے گئے ہین،

مصر کے ایک جدید رسالہ الزہرا جلد اول ص ۲۱۰۳، ۳۱۰، اور ۵۰۹ مین اس کتاب کا ذکر آیا ہے، اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرز قرآن شریف سے بالکل مختلف ہے، معری پر قرآن کے مقابلہ کا الزام لگانا بالکل غلط ہے، ذاتی اور ملحدانہ خیالات سے قطع نظر اس نے قرآن کے بارے مین بڑی عمدہ رائے دی ہے،

رحمت عالم

ایسے قصے بیان کرکے جن سے عرب بالکل واقف نہ تھے، قرآن کا مقابلہ کیا، اس دعویٰ کی حماقت کی بنا پر کسی مؤرخ نے اس کی عبارتون کا نمونہ تک دینا گوارا نہین کیا،

(۲) ابن مقفع اپنے زمانہ کا فصیح و بلیغ مصنف تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو قرآن کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا لیکن پھر جو کچھ لکھا تھا، چاک کر دیا، اور اس کو ظاہر کرنے مین بھی شرم محسوس کرنے لگا، دہریون کا خیال ہے کہ اس کی الدرۃ الیتیمہ قرآن کے مقابلہ مین لکھی گئی تھی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہین ہے، کہ ابن مقفع نے کبھی قرآن کے مقابلہ کا دعویٰ کیا ہو، یہ محض دہریون کی من گھڑت ہے کہ اُس نے قرآن کا مقابلہ کیا تھا، اُس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارہ مین متہم تھا،

(۳) راوندی موسوم بہ احمد بن یحییٰ ابو الحسین متوفی ۲۹۳ھ یہ بھی دہریہ تھا، اُس نے مذہب کے خلاف بہت سی کتابین لکھین، اور کہا جاتا ہے کہ التاج لکھ کر قرآن کا مقابلہ بھی کیا، ابو الفدار کا بیان ہے کہ مسلمان علما نے راوندی کے تمام دلائل کی تردید کی، خاص کر اس دعوی کی کہ اُس نے قرآن کا مقابلہ کیا مگر اس کا کوئی ثبوت نہین کہ اُس نے قرآن کے مقابلہ کے لئے التاج لکھی تھی، قیاس یہ ہے کہ اُس نے دوسری کتابون کی طرح اس مین بھی اعجاز قرآنی کے خلاف دلائل پیش کئے ہون گے، معری نے اپنی کتاب الغفران مین راوندی کی التاج کے بارے مین لکھا ہے:

واما التاجه فلا یصلح ان یکون نعلا وهل تاجه الا کما قالت الکاهنة اُفّ وتُفّ؛	رہی اس کی کتاب التاج تو وہ جوتی ہونے تک کے قابل نہین، اس کی کتاب التاج کی کوئی حقیقت نہین، بجز اس کے جیسا کہ کاہنہ نے اسپر تُف کیا ہے،

(۴) ابو العلار معری متوفی ۴۴۹ھ کے بارے مین کہا جاتا ہے کہ اُس نے الفصول والغایات فی

کے نام سے میرے بیس پچیس مضمون کا مجموعہ چھپا ہے، اس میں یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے کہ تحقیق کے میدان مین ایک قدم کی اور وسعت پیدا ہوجائے،

رصدخانہ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ مہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالون پر مشتمل ہے، پہلا طب مین ہے، دوسرا تصوف مین، اور تیسرا نجوم مین، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر مین یدِطولیٰ رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے اور منجم بھی، اب ذیل مین تینون رسالون کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱۔ پہلے رسالہ کا نام السّبع الثوابت ہے یہ طب مین ہے اور عربی زبان مین ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے کسی معاصر طبیب نے السّبع السیارات کے نام سے سات مسئلون کی تحقیق مین ایک رسالہ لکھا تھا اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب مین السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ مین جن سات مسئلون پر بحث ہے، وہ یہ ہین، دوا، دوسرے کی حقیقت، معتدل کے معنی، خلط کی تعریف، اخلاط کی تعداد، مرکب اور مفرد اعتبار کے بیان مین، کھوڑیون کے کچھ حصہ مین کیا کھوکھلا پن ہے، ادھیڑ عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ ۱۱۱۹ھ مین لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام الرّسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیۃ الحقیقیۃ ہے یہ تصوف مین وحدۃ الوجود کی تحقیق مین ایک عربی رسالہ ہے جس مین اس مسئلہ کے باب مین چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۱۵ھ ہے،

۳۔ تیسرے رسالہ کا نام مُدخل ہے، یہ فارسی نظم مین نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع مین اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب مین

---

[۱] پتہ: شفیق رحمہ، سکونت کلان، بہار شریف پٹنہ اور محمد سلیمان اشرف ۶/۳ بقیا پوکھر روڈ کلکتہ ۱۴،

مُلّا خیر اللہ مُہندس کے چند نئے رسائل

از

سید سلیمان ندوی

استاد مُلّا احمد معمار کے جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عمارتیں بنوائی تھیں، اور انکی فاضل و نامور اولاد کے احوال پر جو مقالہ میں نے کچھ سال پہلے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف میں چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس میں اضافہ کی گنجایش نہ تھی لیکن چونکہ تلاش و تفحص برابر جاری رہی، اس لئے ان میں سے بعض کی مزید تصنیفات ہاتھ آتی رہیں، جن کی بنا پر اُن کے متعلق معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد مُلّا لطف اللہ مہندس کی تصانیف میں ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] میں ملا جو فصاحت و بلاغت کے فن میں فارسی میں شاہزادی زیب النسأ کے لئے مصنف نے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف میں اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہے، ندوہ ہی کے کتب خانہ میں اتفاق وقت سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالون کا ایک قلمی مجموعہ کئی سال ہوئے کہ نظر سے گذرا تھا، مین نے اس کی یادداشت لے لی تھی، لیکن اس کی تکمیل اس لئے نہ ہو سکی کہ دل و دماغ اب ان مباحث سے اُچاٹ ہو چکے ہیں، اور اب کوئی اور رنگ طبیعت پر غالب ہے مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے مضامین سید سلیمان ندوی

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابون مین،

[2] واحد علی سندیلوی کی کتابون مین،

در ہزار است دیکصد و پنجاہ نظم این چند گوہر دل خواہ

پہلے شعر مین مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے مین اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہین بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر مین اس کا نام مذکور ہے، یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر مین ہے :-

"از تصانیف نادر العصر معلم عالمیان مرزا ابو الخیر عرف خیر اللہ غفر لہ ذنبہ بقلمہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخون کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابون کی تصنیف مین رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل مین اس کی تصنیفات کے سنین یکجا لکھدیئے جاتے ہین،

۱- الرسالۃ القدسیۃ	۱۱۱۸ھ	۴- مُدخل فی النجوم	۱۱۵۰ھ
۲- ابیع الثوابت	۱۱۱۹ھ	۵- تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۳- شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۷ھ کے بعد	۶- حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمین یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور مین تھا، پھر یہ دلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ مین مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرموی لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود مین ایک بستی ہے، سمجھ مین نہین آتا کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام مین چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرسالہ

بندۂ ذرہ وار خیراللہ که نه دارد به اہلِ دنیا راہ

لیکن از محض فضلِ لطف وعطا شاہ والا نژاد بحبر سخا

بازوے داور زمین و زمان وارثِ حاکمِ مکین و مکان

مرشدِ فیض بخش، دین پرور قبلۂ اہلِ حق بلند اختر

دوسرے شعر مین "لطف وعطا" مین ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اُس کے باپ کا اور عطاء اللہ اس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعرون مین غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ مین لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اس کے شہزادون مین سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا؛ اس وقت اُس کے شہزادون کے نام پیشِ نظر نہین، اس لئے تعیین نہ کر سکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف والتاریخ" کے عنوان سے ہے، جس مین مؤلف نے اپنے بزرگون کا حال بتایا ہے،

یہ مہندس شہیر در افواہ والد این فقیر لطف اللہ

کسب این علم از پدر فرمود نادر العصر آن که احمد بود

ہست از علمِ این حقیر نحیف در ریاضی رسالہ ہاے شریف

در ریاضی مہین برادرِ من چند تصنیف ہست در ہر فن

ہم ازین ذرہ وار تصنیفات ہست کز رنج جہل واد نجات

باب المراسلۃ والمکاتبۃ

طنز لطیف

از

ازجناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری حکومت صوبہ متحدہ

راج رشی ٹنڈن جی نے چند دنوں سے ہندو مسلمانوں میں ازدواج کی تحریک شروع کی ہے، اس کی مصلحت جو بھی بیان کیجائے لیکن ٹنڈن جی کے خیالات کے پیش نظر اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ شادی بیاہ کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم کرلیا جائے یا کم از کم ان کا کلچر بدل کر ان کی امتیازی حیثیت ختم کردیجائے، وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری نے بھی اس تحریک کے بارے میں پائنیر میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے جن سے بظاہر ٹنڈن جی کی تجویز کی تائید ہوتی تھی، اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی اس کی مخالفت میں شذرات لکھے تھے اب وحید احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کا مضمون طنزیہ و مزاحیہ تھا، اور اس میں انھوں نے ٹنڈن جی کی تجویز کا مذاق اڑایا تھا، اس کو سنجیدگی پر محمول کرنا معترضین کا قصور فہم ہے لیکن عجیب اتفاق ہے یا معترضین کی بدذوقی کہ ان میں سے کسی کو بھی طنز اور سنجیدگی میں امتیاز نہ ہوسکا، اور سب نے اسے سنجیدگی پر محمول کرکے اس کی مخالفت میں مضامین لکھے، لیکن لکھنے والے کو اپنی تحریر کی تشریح کا زیادہ

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر مین حاشیہ شرح چغمنی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح مین اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے دیکھیے تصریح ص ۱۳، و ۲۴، مطبوعہ مجتبائی،

امام الدین نے تصریح مین (ص ۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے، جس کا ذکر گذشتہ مضمون مین نہین آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑون اور گہرے غارون کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اُس کے جواب مین محقق طوسی اور تعلب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتوین حصہ سے اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہین محقق رومی نے شرح چغمنی کے حاشیہ مین اس جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب مین یہ رسالہ لکھا ہے،

امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھی، یہی احساس تھا جس کے ماتحت وہ مضمون لکھا گیا تھا، میرے مضمون کی سرخی تھی Tandon ji The grand mughal یہ سُرخی بولتی ہوئی تھی، اس کا ترجمہ "مغل اعظم ٹنڈن جی" نہیں ہوسکتا، بلکہ ٹنڈن جی مغل اعظم کے بھیس میں" ہوسکتا ہے، اردو میں میں نے اپنے اس مضمون کی سُرخی "ٹنڈن جی کی اپج" رکھی تھی، اور یہ مضمون قومی آواز اور ذوالقرنین میں شائع ہوا تھا، مذاق سلیم اور فراست ان سُرخیوں سے ثابت کر رہی ہیں کہ مجھے اکبر اعظم پر بھی اعتراض تھا، چہ جائیکہ ٹنڈن جی، اب میں اس کو کیا کروں کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں ٹنڈن جی کو اعزازی لقب اکبر کا دے رہا ہوں، میں نے اس مضمون میں مزاح اور طنز آمیز ظرافت سے کام لے کر ٹنڈن جی کو جواب دیا تھا کہ اکبر نے بھی یہی تحریک شروع کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہم مذہب اس سے خفا ہوگئے، مگر تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہوگیا، اسی طرح ٹنڈن جی سے اُن کے ہم مذہب خفا ہوجائیں گے، اور راج رشی کا لقب چھین لیں گے، مگر تاریخ میں اُن کی خوبیاں یادگار رہیں گی، ابھی تک ٹنڈن جی زبان و کلچر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، اب اس نئی تحریک سے ان کے گذشتہ منصوبوں کی تردید خود بخود ہوجاتی ہے، کیونکہ مشترکہ شادی سے نئی زبان اور نئے کلچر اب وجود میں آئیں گے، لیکن مسرت ہے کہ غلط روی نے ٹنڈن جی کو صحیح راستہ پر لگا دیا، اور یہ نئی تحریک شروع کر دی .... مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب سے شادی کا جواز پہلے سے موجود ہے اب مسلمان اگر کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ ہندو اہل کتاب ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں، تو ہم ان کی تحریک کو لبیک کہنے کو تیار ہو سکتے ہیں، ...... ہر قوم اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے گئے ہیں، ہندوستان میں بھی کوئی نبی آیا ہوگا، ..... وغیرہ وغیرہ،

ملاحظہ ہو کہ باہمی شادی پر مسلمانوں کے متعلق کتنے بریک لگا کر میں نے بات کہی ہے، گویا اس امر میں میں مفتی و مفسر نہیں بنا ہوں، بلکہ مستفسر کے حدود میں رہا ہوں،

معارف :- مذکورہ انگریزی فقرے کا یہ مفہوم صرف مضمون نگار ہی کے ذہن میں آسکتا تھا،

حق ہے اس لئے ہم کو وحید احمد صاحب کے بیان کے ماننے مین تامل نہین ہی، اور اس سے مسرت ہوئی

کہ الحمدللہ اس مسئلہ مین وہ جمہور مسلمانون کے ہم عقیدہ ہین، وہ اپنا یہ جواب اخبارات مین بھی

شائع کرا چکے ہین، اس کے بعد **معارف** مین اس کی اشاعت کی ضرورت نہین تھی لیکن ان کا

اصرار ہے، اس لئے شائع کیا جاتا ہے، باقی انھون نے مسلمانون کی جس ذہنیت اور احساس کمتری

کی جانب اشارہ کیا ہے اس کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہین، ع :-

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

البتہ اس دعا مین ہم اُن کے ساتھ شریک ہین، کہ "اللہ تعالیٰ مسلمانون کو قوتِ ایمانی عطا فرمائے آمین"

"م"

جناب محترم ایڈیٹر صاحب رسالہ معارف :-

السّلام علیکم،

رسالہ معارف مین "مختلف فرقون مین شادیان" والا بصیرت افروز نوٹ دیکھا، مسرت ہے کہ ایک

مغالطہ کی وجہ سے ایک خاص مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت آپنے گوارا فرمائی لیکن افسوس ہے کہ اس نوٹ

کی بنیاد میرے پانیر والے مضمون پر رکھی گئی ہے، اگر آپ اجازت دین، اور گستاخی معاف کردین تو مین

وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ میری تحریر آپ کی نظر سے نہین گذری، بلکہ کسی اور صاحب نے آپ سے اس کا تذکرہ

کیا ہوگا، ورنہ نہ اس قدر مغالطہ پیدا ہوتا، اور نہ آپ کو سخت تکلیف پہنچتی، مین کہہ سکتا ہون کہ آپ کی

اس سخت تکلیف کے باعث وہ سخن فہم ہین جنھون نے آپ کو وہ مضمون سنایا، اور مین نہین ہون، مگر ہان ہمہ

مجھے سخت ایذا ہوئی، اور میری گردن شرم سے جھکی جارہی ہے، اس امر کی کہ باعثِ تکلیف مین نہین ہون

میرے مضمون کی وضاحت بہترین شہادت ہوسکتی ہے،

آپ کا آخری قیاس صحیح ہے جو آپنے میرے مضمون سے سمجھا کہ ٹنڈن جی کی یہ تحریک مسلمانون کی

استفسار و جواب

تقویم الابدان

قاضی نورالدین حسین صاحب } مکرمی جناب مدیر صاحب معارف اعظم گڈھ،
راچند دیپ چند لائبریری بھروچ بمبئی، } سلام مسنون

براہ کرم ذیل کے استفسار کا جواب بذریعہ معارف تحریر فرما کر مشکور فرمائیں، صوبہ گجرات کے ایک قصبہ انکلیسر (ضلع بھروچ) مین ایک رئیس سید محمود علی بن سید غلام علی انعامدار صاحب کے کتب خانہ مین طب کی ایک عربی قلمی کتاب تقویم الابدان مصنفہ و مرتبہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ (کتابت ۸۵۳ھ) کا نایاب نسخہ ہے، حضرت قبلہ ... مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے مذکور کتاب کے متعلق نقوش سلیمانی مین اپنے سفرنامہ مین ذکر فرمایا ہے، اس راقم الحروف نے بھی معارف کے گذشتہ جولائی ۱۹۲۹ء کے پرچہ مین ضمیمہ گجرات کے کتب خانہ کے عنوان والے مضمون مین حکیم روح اللہ بھروچی جہانگیری کے کتب خانہ کی کتابکے ذکر مین اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کتاب کے کہان کہان نسخے موجود ہین، اور آیا یہ کتاب طبع ہوئی ہے یا نہین، وہ تحریر فرما کر مشکور و ممنون فرمائین، مذکورہ کتاب حسب ذیل حصص مین منقسم معلوم ہوتی ہے، ۹ × ۱۵ جلد والون مین واضح خط سے لکھی گئی ہے، کل صفحات ۲۰۷ ہین،

(۱) تقویم الابدان (نقوش سلیمانی مین تقویم الادویہ مسطور ہے) صفحہ ۹۶،

یہ شگفتہ ڈھنگ میں نہیں سمجھ سکتا کہ متانت و سنجیدگی کا کبھی بھی پہلو اختیار کر سکتی ہے، اس اظہار کے بعد باعثِ مغالطہ ہونے کا مجھے اعتراف ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے؟ احساس کمتری کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ نظر قطعی بندھ کر رہ گئی ہے، لہذا تمنا اور دعا ہے کہ خداوند کریم مسلمانوں کو اپنی رحمت سے قوتِ ایمانی مرحمت فرمائے، اور اُن کے صدقہ میں مجھ گنہگار کو، آمین،

مجھے اُمید ہے کہ میری اس معذرت اور وضاحت کا تذکرہ رسالہ معارف میں شائع فرما کر میری خفت و ندامت کو دور کرنے کی سعی فرمائیے گا،

نیازمند:۔ "وحید احمد"

انتخاباتِ شبلی

یعنی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصولِ تنقید کی تشریح کی گئی ہے،

(مرتبہ:۔ سید سلیمان ندوی)

ضخامت:۔ ۲۲۰ صفحے

قیمت:۔ دو روپے چار آنے

"منیجر"

ادبیات

دورِ حاضر

اور

اُسوۂ فاروقی

از جناب یحییٰ اعظمی

بنا عدل و اخوت کی جہان مین جس نے محکم کی
وہ جس نے زندہ سنت کی شہنشاہِ دو عالم کی

تمنا سرورِ دین کو بھی جس کے خیر مقدم کی
ضرورت ہے جہان کو پھر اُسی فاروقِ اعظم کی

کہ ظلمت ہر طرف چھائی ہے پھر باطل پرستی کی
مگر حد ہو گئی ہے نوعِ انسانی کی پستی کی

کوئی بھی انتہا ہو اس کے اخلاقی ذمائم کی
کہ انسان سے کہین بہتر ہوا عادات بہائم کی

کرے شرح آہ کوئی کس طرح اسکے عزائم کی
کہ آغشتہ بخون ہے داستان اس کے جرائم کی

کیا ہے تازہ اُس نے عصرِ نو مین دورِ چنگیزی
ہے کھیل اس کا تیمور اور معصوموں کی خونریزی

صف آرا ہین گھٹائین نیرِ حق کے مقابل مین
نہ جانے کا وشین کب کی بھری ہین قلبِ باطل مین

تشتت رونما ہے ملتِ بیضا کی محفل مین
پریشانی سی ہے ہر بندۂ توحید کے دل مین

عزیمت ہے نہ وہ عہدِ سلف کی شان باقی ہے
نہ اس کا نعش لاتحزن پہ اب ایمان باقی ہے

(۲) مختصر لجالینوس فی علاج الامراض و مزاج الطبائع .... الخ صـ۱۲

(۳) تقویم الصحت بالاسباب رر صـ۴۲

(۴) تقویم الادویہ المفردۃ والاغذیہ رر صـ۵۳

کاتب (۱) حمد بن عمر بن جبار، ابتدا بسم اللہ کے بعد...... کتاب تقویم الابدان،

بعد اوۃ الامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابھۃ والیۃ

...... والازمنۃ والبلدان..... الخ

اختتام:- تم کتاب تقویۃ الابدان بعون اللہ تعالیٰ وحسن توفیق

علی ید الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفرانہ (۱) محمد بن عبد الجبار

الدرزقنی وقد وقع فراغ تحریرہ فی منتصف ذی القعدۃ سنہ ثمان

وثمانین خمسمائۃ والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ...... اجمعین،

معارف: تقویم الابدان کوئی نایاب کتاب نہین ہی، اس کا ایک حصہ چھپ بھی چکا ہے،

اس کی تصحیح سلیمان الدخیل نے کی تھی، اور امیر ابن الرشید امیر نجد کے ایجنٹ رشید پاشا نے ۱۳۳۳ھ مین

دمشق مین اس کو چھپوایا تھا، ہندوستان کے بہت سے کتب خانون مین اس کے قلمی نسخے پائے جاتے

ہین، پٹنہ لائبریری، کتب خانہ ریاست رامپور اور سبحان اللہ لائبریری مسلم یونیورسٹی مین اُس کے قلمی

نسخے موجود ہین، اور کتب خانون مین بھی ہون گے، اس کتاب کا لاطینی ترجمہ بھی ۱۵۳۲ء مین اسٹرا

برگ سے شائع ہو چکا ہے،

لغات جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری معہ ضمیمہ مسعود عالم صاحب ندوی،

قیمت ۸/ ضخامت ۲۵۷ صفحے

"منیجر"

سکھا دے جو جہانِ نو کو آئینِ جہانبانی | بتا دے جو زمانہ کو رموزِ فقر و سلطانی
وہ جس کا شہرۂ آفاق دورِ عدلِ لاثانی | بلند اک بار پھر کر دے مقامِ نوعِ انسانی

ہو قلب دہر پہ سکہ رواں اس کی جلالت کا
مساوات و اخوت کا صداقت کا عدالت کا

غزل

از جناب فضل اختر سیتاپوری

سما گیا ہے کچھ ایسا جمالِ جانانہ | مری نگاہ میں رقصاں ہے آئینہ خانہ
تری نگاہ وہی ہے اثر جداگانہ | کہ جس سے ہے کوئی دیوانہ کوئی فرزانہ
فروغِ سجدۂ اخلاص کا یہ عالم ہو | کہ بڑھ کے چومے قدم کعبہ ہو کہ بتخانہ
حیات اس پہ نہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے | نکل گیا حدِ فرزانگی سے دیوانہ
حیات و مرگ کے پھر اُٹھ کھڑے ہوئے جھگڑے | یہی ہے حشر یہی حشر کا ہے افسانہ
اب اس مقام پہ ہے عشق کی جنون خیزی | کہ حُسنِ یار ہوا آپ اپنا دیوانہ
کبھی یہ سوچتا ہوں کاش وہ مرے ہوتے | کبھی یہ کہتا ہوں اچھا ہو جو ہیں بیگانہ
چراغ لے کے بڑھا رہنمائی کو شعلہ | قریب شمع دکھائی دیا جو پروانہ
سکونِ حُسن کا اور بیقراریاں دل کی | ہر ایک چیز کا اسلوب ہے جُداگانہ
میں رازِ عشق چھپاتا ہوں اور نہیں چھپتا | مرا سکوت بنا جا رہا ہے افسانہ
پیامِ یار تو دیتی ہیں دھڑکنیں دل کی | نگاہِ شوق سناتی ہے دل کا افسانہ

کرشمہ اس نگہِ مست کا ہے یہ اختر
چھلک رہا ہے جو چھلکا ہوا تھا پیمانہ

جہان مین کیا یہی مسلم کے جینے کا قرینہ ہے کہ خودداری کا اس کی چور چور آبگینہ ہے
پڑا موجِ بلا مین آکے اُمّت کا سفینہ ہے نشیمن خوفِ غیر اللہ کا مومن کا سینہ ہے
اکھڑتا جا رہا ہے پائے عزمِ استوار اس کا
کہ شیوہ بن گیا ہے رزمِ ہستی سے فرار اس کا

نہین کیا یاد اسے لاتقنطوا کی نصِ قرآنی نہین کیا یاد اُسے کم من فئۃ کا عہدِ ربانی
بتائے کوئی پھر ہے کس لئے یہ ضعفِ ایمانی رہی ہے اس سے پہلے کیا یہی شانِ مسلمانی
ملین گے تم کو ایک ایک حرف سے اس کے سبق اب بھی
کتب خانون مین ہین تاریخ ماضی کے ورق اب بھی

مسلمان کے لئے یہ دور دورِ سرفرازی ہے کہ رنج و ابتلا مومن کی شانِ امتیازی ہے
حقیقت مین اسی کا سب یہ فیضِ کارسازی ہے کہ دنیا مین ابھی تک سرخرو دینِ حجازی ہے
ملا ہے بہرہ اس کو روئے گلگونِ شہادت سے
کہ تاریخ اس کی ہے تابندہ تر خونِ شہادت سے

ہمارے کارنامون سے ہے دہر اب تک پر آوازہ حنین و بدر کی ہے داستانِ فخر ابھی تازہ
زمانہ کو ہو پھر زورِ یداللّٰہی کا اندازہ خداوندا مرتب کر دے پھر ملت کا شیرازہ
ہمارے بازوؤن مین پھر وہی اگلی سی قوت دے
وہی جوشِ شجاعت دے وہی ذوقِ عزیمت دے

اٹھادے پھر کوئی فاروق یثرب عصرِ حاضر سے جہان مین کردے بزمِ عدل و صدق آراستہ پھر سے
نہین کچھ بھی یہ مشکل تیری قدرت کے مظاہر سے خداوندا سبھی ممکن ہے تیرے دستِ قادر سے
عمر جیسا جلیل القدر پھر دنیا مین پیدا کر
جلالِ عہدِ فاروقی جہان مین پھر ہویدا کر

سے زیادہ نہیں پھیل سکا ہے، معلومات کی کمی کی وجہ سے ایک اہل قلم اپنے کو چند اوراق ہی میں محدود کر دینے پر مجبور سا پاتا تھا، لیکن ہم جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے معین الارواح میں حضرت خواجہ صاحب کے مفصل اور مبسوط حالات لکھنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کے شروع میں جناب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ام اے پی، ایچ ڈی، ڈائرکٹر اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا طویل دیباچہ ہے، پھر فاضل مؤلف کا معروضہ ہے، جس میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جدید ذوق کے مطابق اگر ان ماخذوں کے مصنفین کے نام اور سنین تالیف بھی لکھدیئے جاتے، تو بہتر تھا، فاضل مؤلف نے اپنی محققانہ کتاب میں مسالک السالکین کا حوالہ کثرت سے دیا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، اور کس زمانہ میں لکھی گئی ہے، شاید یہ تیرہویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے، حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے میں .... حال کی کسی تصنیف کو بکثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے،

ماخذوں کے سلسلہ میں فاضل مؤلف نے ان کتابوں کی بھی فہرست دی ہے، جوان کو دستیاب نہیں ہو سکیں، ان میں خیر المجالس، مونس الارواح، مراۃ الاسرار، تواریخ فیروز شاہی (شاید ضیاء الدین برنی، اور شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی مراد ہو) . . . .

. . . . اور اکبر نامہ اور سیر العارفین کے نام بھی ہیں، یہ کتابیں تو ایسی ہیں کہ تھوڑی سی تلاش اور جستجو کے بعد ہر اچھے کتب خانہ میں مل سکتی تھیں،

حاشیہ میں ماخذوں کا حوالہ دیتے وقت صفحوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، صرف کتابوں کے نام لکھ دیئے گئے ہیں، آج کل کی تحقیق و تدقیق میں صفحوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، فاضل مؤلف اگر صفحوں کا بھی حوالہ دیدیتے، تو ان کی تحقیق میں وزن پیدا ہو جاتا،

پوری کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں سوانح مبارکہ، دوسرے میں سیرۃ مقدسہ، تیسرے

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین

ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے ان ہی کے فیوض سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہوا، اور ان کے وصال کو سات سو برس سے زیادہ گذرے، لیکن ان کی روحانی برکات کا سرچشمہ ابھی تک جاری ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک فارسی یا اردو زبان کی کسی کتاب میں اُن کے مبسوط حالات زندگی نہیں ملتے، تذکروں میں زیادہ تر یا تو اُن کے کشف و کرامات یا اُن کے اوراد و وظائف کی تفصیلات ملتی ہیں، اب سے پہلے ان ہی چیزوں کی زیادہ تلاش رہتی تھی، اسلئے تذکرہ نویس اُنہی کی تفصیل لکھ کر اپنے ناظرین کی تشنگی بجھاتے تھے لیکن اب جب کہ زمانہ کا ذوق بدل گیا ہے، صوفیۂ کرام سے عقیدت رکھنے والا گروہ ان کی سیرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حالات زندگی پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ چند اوراق

ملنے کا پتہ :- منیجر شعبۂ اشاعت معینی گدڑی شاہی انجمن جوالرہ، اجمیر شریف : قیمت :- صہ

در ودہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے۔"

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ)

مذکورۂ بالا دعوی کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہیں ہوتی، تاریخ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے:-

"وخود بغزنین آمدہ شمس العارفین عبدالواحد را کہ پیر شیخ نظام الدین ابوالموید ست دریافتہ بلاہور آمد واز آنجا بدہلی تشریف آورد، چون اژدحام خاص وعام از حد گذشت وآن بندگی از ان متنفر بود، ہر آئینہ از آنجا نیز متوجہ بلدۂ اجمیر شد، ودہم ماہ محرم ۵۶۱ھ احدی وستین وخمسمأۃ سایہ وصول بر آن خطہ انداخت وسید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود وبصلاح وتقوی آراستہ در سلک اولیاء اللہ انتظام داشت وسلطان قطب الدین ایبک اورا داروغہ آن بلدہ ساختہ بود، قدوم شیخ را باعزاز واکرام تلقی فرمود، چون از علم وتصوف و اصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت، صحبت خواجہ را نعمت شگرف دانستہ اکثر اوقات مجلس شریف حاضر می شد وبسیارے از کفار اجمیر ببرکت انفاس آن پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند وآنانکہ ایمان نیاوردند، محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد وعد بحضرت اوی فرستادہ وخواجہ در عہد شمس الدین التمش دو مرتبہ جہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی بدہلی تشریف برد۔" (جلد دوم ص ۳۷۷)

فرشتہ کے مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنین سے لاہور آ کر وہاں سے دہلی آئے، یہاں لوگوں کا ہجوم بڑھا، تو اس جگہ سے متنفر ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں بتاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ پہنچے، پھر فرشتہ یکایک سید حسین مشہدی کا ذکر کرتا ہے، جن کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر کا داروغہ مقرر کیا تھا، سلطان قطب الدین ۶۰۲ھ میں تخت نشین ہوا، فرشتہ نے اکتالیس برس کے وقفہ کے حالات کو صرف ایک سطر میں قلمبند کر دیا ہے، لیکن مذکورۂ بالا اقتباس سے

مین حلقۂ ارادت، چوتھے مین آپ کی درگاہ اور مراسم، پانچوین مین آپکے درباری اور چھٹے مین تاریخ اجمیر درج ہے،

پہلے حصہ مین حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو آج تک حضرت خواجہ کے کسی سوانح نگار نے نہین کی، گو ان سنین کے تعین کرنے مین فاضل مؤلف نے زیادہ تر قیاسات ہی سے کام لیا ہے، جو ممکن ہے کہ صحیح ہون، اور اگر ان مین تسامح بھی ہو گیا ہو، تو آیندہ جب کوئی اہل قلم حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے گا، تو ان سنین سے اس کو واقعات قلمبند کرنے مین بڑی مدد ملے گی،

کتاب کے مطالعہ سے حضرت خواجہ کی سیاحت کا بہت ہی واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، فاضل مؤلف کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ اپنی سیاحت کے دوران مین چار بار ہندوستان آئے، ممکن ہو یہ صحیح ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے، اور اُن کا وصال ۶۳۳ھ مین ہوا، بہتر برس کے طویل وقفہ مین بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون، اور پھر واپس آئے ہون، اُن کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہر سال حج کے لئے جاتے تھے (ص ۵۰) حج ہی کے ایسی مین بلادِ اسلامیہ کی سیاحت بھی کرتے ہون، اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان نہین تشریف لائے ہون گے، لیکن اس سلسلہ مین فاضل مؤلف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین،

حضرت خواجہ کے پہلی بار ہندوستان آنے کے ذکر کے سلسلہ مین لکھتے ہین،

"غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر بتاریخ ۱۰ محرم الحرام ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا، (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)

مگر اس زمانہ مین چونکہ رونق اسلام صرف لاہور اور ملتان تک تھی، اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنے والے کے لئے قیام و سیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس

نظام الدین ابو المؤید کہے ہیں وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی، پھر وہاں سے روانہ ہو کر لاہور میں آئے، اس ایام میں پیر علی ہجویری قدس سرہٗ ...... کا انتقال ہو چکا تھا لیکن شیخ حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعد الدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہیں، زندہ تھے، اُن سے اور خواجہ صاحب سے بے حد دوستی اور محبت ہو گئی، کچھ دنوں تک وہاں قیام فرما کر پھر وہاں سے متوجہ دار الخلافہ دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے، چند عرصہ تک وہاں قیام فرمایا، وثاق متبرکہ جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہاں کہ قبر شیخ رشید مکی کی ہے اور آج تک اس زمانہ کی نشانیوں میں سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرضکہ دہلی میں ہجوم خاص وعام اہل اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا، تب آپ نے طرف دار الخیر اجمیر کے سفر کیا اگرچہ اس زمانہ میں اجمیر شریف میں اہلِ اسلام کی رونق شروع ہو گئی تھی لیکن غلبہ کفار نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفہ وقت سلطان قطب الدین ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف میں داروغگی کی خدمت پر ممتاز فرمایا تھا، (حصہ اول ص ۱۲)

سیر العارفین کے مندرجۂ بالا اقتباس سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد ہوئے جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (۵۸۶ھ) میں داخل بھی ہوا،

ورود ہند بار چہارم کے بارہ میں فاضل مؤلف ارقام فرماتے ہیں،

حسب خزینۃ الاصفیا بموجب ارشاد حضرت قطب صاحب جب آپ خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے، اس وقت قباچہ بیگ اور کفار مغلوں کے درمیان جنگ شعلہ زن تھی، اور قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استعانت باطنی سے قباچہ بیگ نے فتح پائی، چونکہ حسب منتخب التواریخ یہ جنگ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد قباچہ بیگ اور کفار مغلوں سے ۶۱۱ھ میں ہوئی۔

معین الارواح کے فاضل مؤلف کا یہ دعوی ثابت نہین ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے تو لاہور اور ملتان تک آکر پھر مراجعت فرمائی، فرشتہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے اجمیر مین آکر قیام پذیر ہو گئے،

حضرت خواجہ کے دوسری بار ورود ہند کے سلسلہ مین فاضل مؤلف رقمطراز ہین،

"حسب دلیل العارفین آپ کے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤن کی ملکیت تھی، اور حسب مسالک السالکین و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر مین پرتھوی راج کی حکومت تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخری بار حملہ کرکے اجمیر فتح کیا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کیا، چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ مین ہوا، اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ مین ثابت ہے"

حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۸ھ مین اجمیر آئے، تو دونون سنہ مین اجمیر ہندوؤن ہی کی ملکیت تھی، لیکن اجمیر کا ہندوؤن کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہین کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے،

"ورود ہند بار سوم" کے بارہ مین فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہین،

"صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) مین واصل بحق ہوا اس زمانہ مین آپ وارد ہند ہوئے"

فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ مین لکھا ہے کہ ان کو سیر العارفین دستیاب نہین ہو سکی، (ص، د) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۰۱ء مین شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے، اس مین حضرت خواجہ کے اجمیر شریف مین نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ مین ہے :-

"بعدہ خواجہ صاحب شہر غزنی کی طرف متوجہ ہوئے، اور شیخ عبد الواحد غزنوی پیر شیخ

یعنی در اجمیر می روم ہر کسے را وداع کرد، دعا گو بر در راہ بودیم، بعد ازان در اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر از ان ہند و آن معمورہ وآباد و مسلمانی چنان نبود، چون قدم مبارک خواجہ انجا رسید، چندان اسلام ظاہر شد، کہ ان را حد نبود" (ص ۵۵-۵۴)

اب سمجھ مین نہین آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کیا سیر الاقطاب اور خزینۃ الاصفیاء کے بیانات کو قابلِ قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر مین خزینۃ الاصفیا، کا ایک بہت ہی واضح بیان ہو جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہو کہ حضرت خواجہ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ مین اجمیر وارد ہوئے، اور وہین مستقل قیام فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ بیان ملاحظہ ہو،

"من بعد حضرت خواجہ از بلخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد فائز لاہور شد تا دو ماہ فراز پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہ معتکف ماند بعد حصول فوائد باطنی از لاہور روانہ دہلی گشت و چندے در دہلی قیام پذیر ماندہ بتاریخ دہم ماہ محرم سال پانصد و شصت و یک رونق افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصی کہ تشرفِ ارادت آنحضرتؒ مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار بود کہ اول ازان مذہب شیعہ داشت و بعد ازان تائب شدہ و مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید، و من بعد ہزار در ہزار از صغار و کبار بخدمت آن محبوب کردگار حاضر شدہ، مشرف بشرف اسلام و ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالی شان روشن گشت" (ج ۱ ص ۲۵۹)

عاجز راقم کے ان معروضات سے معین الارواح کے لائق مؤلف کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انھون نے حضرت خواجہ کے چار بار ہندوستان آنے کے سلسلہ مین جو دلائل پیش کئے ہین وہ صحیح نہین ہین،

(باقی)

لہذا غریب نواز کا چوتھی بار وارد ہندوستان ہونے کا سال بھی یہی ہے"۔

مذکورۂ بالا بیان خزینۃ الاصفیاء کی حسب ذیل روایت سے مرتب کیا گیا ہے جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ذکر میں درج ہے،

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان وارد ہندوستان شد، خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس تشریف می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند، و لشکر بے شمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ بایشان نیست برائے خدا امداد فرمائید، اتفاقاً خواجہ قطب الدین دران وقت تیرے بدست خود داشت حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن جنید از و فارغ بنشین، قباچہ ہمچنان بعمل آورد و در لشکر دشمن متنفسے نماند کہ زخم بر باد نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار بفرار نہادند" (ج ۱ ص ۲۶۰)

خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب (ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے، انھوں نے یہ خبر سنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہیں، تو مرشد کے شوق ملاقات میں وہ بھی ہندوستان روانہ ہوگئے، ملتان پہونچے، وہاں سے دہلی آئے، اور دہلی سے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی لیکن ان کو حکم ملا کہ وہ وہیں قیام کریں، لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت میں آئے، دلیل العارفین کی مجلس یازدہم میں ہے،

"بعد خواجہ درین خواہد رسید چشم پر آب کرد، فرمود مسافری شوم، جائیکہ مدفن ما خواہد بود

مضامین کی تحریر کے وقت کتاب کی شکل مین اُن کی اشاعت کا خیال نہین تھا، اس لئے اس موضوع سے متعلق معلومات کا پورا استقصار اور مضامین مین ترتیب نہین ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو دوران مطالعہ مین جو معلومات حاصل ہوتے گئے، ان کو قلم برداشتہ لکھتے گئے، اور ناشرین نے اسی طرح انکو شائع کردیا، ورنہ مصنف جیسے وسیع النظر کے قلم سے یہ کتاب اس سے زیادہ جامع اور مرتب شکل مین ہوتی لیکن موجودہ شکل مین بھی وہ بہت مفید اور دلچسپ ہے،

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ مین | مرتبہ جناب اصغر علی صاحب عابدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن،

کمیونسٹ، اشتراکی نظام کو دنیا کے سارے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل، حریت و آزادی، عالمگیر انسانی و معاشی مساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور مادی پہلو سے انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہین، ممکن ہے کارل مارکس، انجلس اور لینن کی متخیلہ اشتراکیت مین یہ خوبیان رہی ہون لیکن سوویٹ حکومت مین جو اشتراکیت عملاً قائم ہے، اس مین سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیان ہین جس کا اعتراف سچے کمیونسٹو نے بھی کیا ہے، اور اس کے متعلق انگریزی اور اردو دونون زبانون مین بہت سے مضامین لکھے گئے ہین، مرتب نے ان کو اس کتاب مین جمع کردیا ہے، ان مین دلائل وشواہد سے دکھایا گیا ہے کہ موجودہ روسی اشتراکی نظام ریاست، معاشیات، اخلاق و معاشرت ہر پہلو سے بدترین استبدادی نظام ہے، اس مین کسی قسم کی مساوات کا وجود نہین بلکہ شخصی آزادی تک مفقود ہے، اور وہ ساری اخلاقی قدرین ختم کردی گئی ہین جن کو دنیا اب تک مانتی چلی آتی ہے، اور خود اس کے نظام اخلاق کی بنیاد تمامتر جبر و استبداد، مکر و فریب اور حیوانیت پر ہے، اس کتاب سے روس کی اشتراکیت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانون کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہین،

مطبوعاتِ جدیدہ

ہزار سال پہلے از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ پتہ:- انجمن ثمرۃ التربیۃ دار العلوم دیوبند،

مسلمانون کے دورِ عروج مین اُن کو علمی تلاش و تحقیق اور نئے نئے اکتشافات اور اس کے لئے سیر و سیاحت کا شوق اتنا غالب تھا کہ انھون نے اس زمانہ مین جب سفر مین بڑی دشواریان تھین، زمین کا چپہ چپہ چھان مارا، اور اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہین تھا، جہان اُن کے قدم نہ پہنچے ہون یورپ کے برف پوش پہاڑ افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا، اور ایشیا کے مرغزار یکسان اُن کی جولانگاہ تھے، ان مین سے بہت سے اہلِ علم و قلم سیاحون نے اپنے سفر کے مشاہدات و نتائج کتابی شکل مین قلمبند کئے، ان مین سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، ابن بطوطا، ناصر خسرو کے سفرنامے، ابوجعفر خوارزمی، ابن رستہ، ابن خرداذبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، ابن حوقل اصطخری، بشاری مقدسی اور ادریسی وغیرہ کے جغرافیے چھپ کر شائع ہو چکے ہین جو اس زمانہ کے جغرافی اور تمدنی حالات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہین، **فاضل مصنف** نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ مین اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرنامون اور جغرافیہ کی کتابون کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو غالباً رسالہ دار العلوم مین شائع ہوا تھا، اسی کو کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا ہے، اس مین ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقون کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی، لیکن غالباً

تصنیف سمجھنا چاہئے، جن لوگوں کو سرسید اور حالی سے واقفیت ہے، وہ اس قسم کا تصور بھی نہیں لا سکتے، سرسید کو شعر و شاعری سے کیا علاقہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ مسدس کے خیالات سرسید کے ہیں، تو یہ بھی صحیح نہیں، مولانا حالی مسلمانوں کے تدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ سے سرسید سے کم واقف اور ان کی زبون حالی سے ان سے کم متاثر نہیں تھے کہ مسدس کے خیالات کو سرسید کا القاء سمجھا جائے، یہ صحیح بات ہے کہ مسدس سرسید کی تحریک سے لکھی گئی ہو یا اس کی تصنیف کے دوران میں مولانا حالی سرسید سے بھی صلاح و مشورہ کرتے رہے ہوں، لیکن اس سے مسدس کو سرسید کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا، اس قسم کا علمی افادہ و استفادہ اہل علم میں عام ہے، بہرحال یہ کتاب لطف و دلچسپی سے خالی نہیں ہے، نام کی جدت و فصاحت خصوصیت کیساتھ مصنف کے حسن ذوق کا نمونہ ہے،

جمہوریہ ہند کے دستورِ اساسی کا خاکہ | از جناب محمد ہاشم صاحب قدوائی ایم اے لکچرار شعبہ پولٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲، صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:- ایجوکیشنل ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علی گڈھ،

جمہوریہ ہند کے دستور کا متن خاصہ ضخیم ہے، اور غالباً ابھی اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا ہے، لائق مرتب نے اردو میں اس کا خلاصہ لکھا ہے، اس میں دستور کی مختصر تاریخ اس کی خصوصیات، شہریت، اس کے حقوق و فرائض، مملکتی پالیسی کے اصول، ہند یونین کے اجزاء، اور اس کا نظام، مرکزی حکومت، پارلیمنٹ، ریاستوں، ریاستی مجالس قانون ساز، عدلیہ، ہائیکورٹ، ماتحت عدالتوں، پبلک سروس کمیشن وغیرہ سے متعلق دستور کے تمام آئین و قوانین کا پورا خاکہ آگیا ہے، زبان صاف اور سلیس ہے، یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن عام اردو خوانوں کے مطالعہ کے لائق بھی ہے،

حبیبِ خدا، چاند ستارے اور مہاجرین و انصار، از جناب الیاس احمد صاحب مجیبی

کلیل بین غلیل از جناب ناطق گلاوٹھوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰ صفحے، کاغذ، کتابت
وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ :- کوثر بک ڈپو معسکر بنگلور،

عرصہ ہوا رسالہ خیام لاہور میں یہ بحث چھڑی تھی کہ حالی کے اس شعر

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں | بس اتباعِ مصحفی و میر کر چکے

میں پیرویِ مغربی سے کیا مراد ہے، یورپ کے خیالات کی تقلید یا مغربی شاعر کی، اس بارہ میں ادیبوں اور سخن سنجوں کی رائیں مختلف تھیں، جناب ناطق کے نزدیک یورپ کے خیالات کی تقلید مراد تھی، اور اس صورت میں مغربی کی "ی" کو مولانا حالی کی غلطی پر محمول کرنا ناگزیر تھا، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی تھی اور مسدس کی مخالفت کے زمانہ کی یہ روایت بھی نقل کر دی کہ وہ مولانا آسی کی تصنیف ہے، اس پر اعتراضات ہوئے، اس کے جواب میں انھوں نے جو خط اڈیٹر خیام کے نام لکھا تھا، اس کو کلیل بین غلیل کے فصیح نام سے شائع کیا ہے، اس میں حالی اور دورِ جدید کے دوسرے شعراء، ادیبوں اور نقادوں کی نااہلیت، پارٹی بندی، رشک و رقابت، پروپیگنڈے، اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پر جو مذکورہ بالا امور سے متعلق ہو سکتے ہیں، اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، اور اس لپیٹ میں بعض پرانے اساتذہ تک آگئے ہیں، شعر و ادب میں مصنف کے صاحب نظر ہونے میں کلام نہیں، انھوں نے موجودہ زمانہ کے معیار علم و شاعری کے متعلق بہت سی باتیں صحیح لکھی ہیں، اگر وہ سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کرتے، تو اُن کی یہ تحریر وقیع اور غور و توجہ کی مستحق ہوتی، لیکن غیر سنجیدہ اور حریفانہ انداز تحریر، دوسروں کی تنقیص کے ساتھ خود اپنے قلم سے اپنے کمالات کے اظہار کی بناء پر یہ کتاب بھی پارٹی بندی اور پروپیگنڈے کے دائرے میں آگئی ہے، مصنف نے ایک دلچسپ روایت یہ بھی نقل کی ہے، کہ مسدس حالی کی تصنیف میں سرسید کی محنت اور کاوش کو زیادہ دخل تھا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسدس اُن کی تصنیف ہے، یا کم از کم اس پر اُن کی اتنی اصلاح ہے کہ گویا ان کی

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت
مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے
اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ
ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اس
میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی
ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر
فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ
مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی
خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم
موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملت،
نظم سیاست، صنف لطیف (یعنی عورت) فنون لطیفہ
اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- [illegible]

منیجر

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعر و
شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی
کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی سرپرستی سے جگمگا اٹھا،
جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء
اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری
اور انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموریہ
کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی
روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر
نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں
اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں،
دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں
گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس
کتاب میں ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت:- ۵۰۴ صفحے،

قیمت:- [illegible]

منیجر

تقطیع اوسط، ضخامت علی الترتیب ۱۹۲، ۱۶۰، ۱۶۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲ عہ، ۱۲ عہ، ۱۲ عہ، پتہ :- اردو گھر ۴ مارٹن روڈ کراچی،

بچکانی کتابون کے مصنف کی حیثیت سے مجیبی صاحب کو خاص شہرت حاصل ہے؛ انھون نے مسلمان بچون کی اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے دار المصنفین کی کتابون کی مدد سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین اور صحابۂ کرام کی سیرت پر متعدد مختصر اور مفید کتابین لکھی ہین، جو بہت مقبول ہوئین، مذکورۂ بالا تینون کتابین اُن کے نئے اڈیشن ہین، اس مین مصنف نے بہت سے مفید اور نئے اضافے کئے ہین، جیسا کہ ان کتابون کے نام سے ظاہر ہے، پہلی کتاب سیرت نبوی پر ہے، دوسری خلفاے راشدین اور تیسری اکابر مہاجر و انصار صحابہ کے حالات ہین، ان مین ان بزرگون کے سوانح کے ساتھ اُن کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤن اور اُسوۂ حسنہ کو خصوصیت کے ساتھ نمایان کیا گیا ہے، زبان بہت صاف، سادہ اور آسان اور انداز بیان بچون کے ذوق کے مطابق، یہ پورا سلسلہ مسلمان بچون کے پڑھانے کے لائق ہے،

زندگی کے سایے، مترجمہ جناب احمد ندیم قاسمی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ :- لاجپت راے اینڈ سنز، اردو بازار دہلی،

امریکہ کی مشہور افسانہ و ناول نگار خاتون پرل بک کو چین سے بڑی دلچسپی ہے، وہ وہان رہ بھی چکی ہین، اور چینی زندگی کے مختلف پہلوؤن پر انھون نے بہت سے افسانے لکھے ہین، زندگی کے سایے اُن کے سات افسانون کا ترجمہ ہے، ایک افسانہ اطالوی افسانہ نگار ماگینز یو سلونے کا ہے، یہ سب افسانے دلچسپ اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگون کے پڑھنے کے لائق ہین، جن کو چین مین امریکہ کی سیاست سے دلچسپی ہو، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم مترجم نے کل ۱۹ سال کی عمر پائی جس مین عموماً قلم پکڑنا بھی نہین آتا، ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے، تو ادبی صف مین نمایان جگہ حاصل کرتے لیکن موت نے اس کا موقع نہین دیا،

"م"

معارف
مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ
مرتبہ
سید سلیمان ندوی
شاہ معین الدین احمد ندوی
قیمت:- چھ روپیے سالانہ
ناشر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی ادارون نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیون نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب مین داخل کرلیا، اس لئے چند برسون کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافون کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہین، اور بعض زیر طباعت ہین، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۹۵ صفحے قیمت: [illegible]

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- [illegible]

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیون کی سیاسی تاریخ، قیمت معہ/

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۴۳۲ صفحے

قیمت :- [illegible]

شذرات

کانگریس کی صدارت مین ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستون نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی خوشیان منائین کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، قوم پرستون کو تشویش پیدا ہوئی، دیکھین فرقہ وارانہ مسائل مین کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، لیکن ہندستان کی فلاح کا صرف ایک ہی راستہ ہے، سیکولر حکومت تمام فرقون کے حقوق مین قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی اور پاکستان و ہندستان کے تعلقات مین خوشگواری، اسکے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائیگا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کیطرف لیجائیگا، اسلئے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے بہی خواہ ہین تو انکو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑیگا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد گو ابھی انکا لب ولہجہ بدل چلا ہے اور ادھر انھون نے جو تقریرین کی ہین ان مین وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور یہ انہین بھارت کے نمایندے نہین معلوم ہوتے، بلکہ انکی زبان سے غیر مذہبی حکومت، مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، مسلمانون کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کی باتین نکلی ہین، بلکہ بعض تقریرون مین تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہانتک کہا ہے کہ ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانون نے مل کر بنایا ہے اور انکا وطن الہ آباد کے مسلمانون کا کلچر ایک ہے، اگر وہ بھی اسکو مانتے ہین تو پھر انکے اور مسلمانون کے نقطۂ نظر مین کوئی اختلاف نہین رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہین کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانون کے میل جول سے بنا ہے، اور جسمین دونون کے اثرات ہین اور اسی کو ہندوستان کا کلچر ہونا چاہیے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہے، اس نعرہ کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہے، اگر وہ حقیقۃً اتحاد چاہتے ہین تو انکو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے، اتحاد کے معنی ایک دوسرے مین ضم ہوجانے کے نہین ہین، اس کے بغیر بھی اتحاد ہوسکتا ہے، اور ہوگا، یہ بات ٹنڈن جی کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان ہندستان ہی مین رہینگے اور پورے اتحاد و ہمدردی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھینگے۔

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

کلام مجید لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، اس کے لفظی اور ظاہری اعجاز پر گذشتہ مہینہ مولانا سید بدرالدین صاحب علوی کا مفید مضمون شائع ہو چکا ہے لیکن ارباب بصیرت کی نگاہ میں اس کا اصلی اعجاز معنوی ہے جس نے دلوں کی کایا پلٹ دی، اس لئے اس مہینہ اعجاز القرآن کے اس پہلو پر مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا فاضلانہ مقالہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ دونوں پہلو سامنے آجائیں، "م"

اعجاز قرآنی کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اعجاز قرآنی کی نوعیت کیا ہے؟ معجزہ چونکہ دلیل نبوت ہے اور دلیل کی قسمیں اور اُن کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہیں، اس لئے معجزہ کی بھی مختلف قسمیں ہیں،

بعض دلیلیں ایسی ہوتی ہیں جن سے صرف مدلول علیہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن اُن سے دل میں ترغیب و ترہیب یا دوسرے قسم کا اور کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوتا،

مثلاً اگر ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ فلاں مقام پر کچھ لوگ موجود ہیں جن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں

اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی مین ہے اور اس زمانہ مین تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہو ہزارون لاکھون بوڑھے بیل اور ناکارہ گائین کہان جائین گی، ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا، رہے مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہین اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوون کو روکنا چاہیے، جو بوڑھی گائین قصایون کے ہاتھ خفیہ بیچدیتے ہین،

صوبہ بمبئی اگرچہ اردو زبان کے مرکز یو۔ پی اور دہلی سے دور ہے، اور وہان کی صوبائی زبانین گجراتی اور مرہٹی ہین لیکن ہر زمانہ مین وہان اردو زبان و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا مذاق رہا ہے اردو کے بہت سے اخبارات و رسالے نکلتے ہین، اردو کی خدمت کے لیے متعدد ادبی ادارے قائم ہین، ان مین مشہور انجمن اسلام کی خدمات خصوصیت کے ساتھ اہم ہین، اسی سلسلہ مین ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب مرحوم پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی نے ۱۹۴۸ء مین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا مقصد گجرات کے قدیم اردو ادب کی تحقیقات، وہان کے کتب خانون مین اس کے قلمی نوادر کی تلاش اور ان کی فہرست کی ترتیب، اردو کے ریسرچ اسکالرون کی علمی اعانت ہے، یہ ادارہ وقتاً فوقتاً اردو کے فضلاء سے مقالات بھی پڑھاتا رہتا ہے، اسکے لائق کارکنون نے گذشتہ جنوری سے ایک سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے نام سے جاری کیا ہے، اسکا مقصد تقریباً وہی ہے جو پرانی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا تھا، اس وقت تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہین، اور ہر نمبر اردو زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین و معلومات پر مشتمل ہے، اسکے روح رواں ہمارے پرانے رفیق پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہین، امید ہے کہ ان دونون صاحب ذوق فضلاء کی نگرانی مین یہ رسالہ ترقی کریگا، اور رسالہ اردو کے پاکستان منتقل ہوجانے سے جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہوجائے گی۔

کا معجزہ پیش کیا جائے گا، اُن کے دل میں پیغمبر کی صداقت کے یقین کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی طرف خود بخود مائل ہوں گے۔

علامہ ابن تیمیہ ان دونوں قسم کی دلیلوں کا فرق بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی دلیل کے متعلق لکھتے ہیں :-

وھٰذہ الطریق اکمل وابلغ	مقصد کے حاصل کرنے کا یہ کامل ترین اور
فی حصول المقصود فانھا	موثر ترین طریقہ ہے، کیونکہ وہ پیغمبروں
تفید العلم بصدقھم و	کی صداقت کے علم کے ساتھ اُن کی پیروی
الرغبۃ فی اتباعھم والرھبۃ	کی رغبت دلاتا ہے، اور ان کی مخالفت
من خلافھم،	سے ڈراتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے مجموں مثلاً عیدین میں سورۂ قاف اور سورۂ اقتربت الساعۃ اور جمعہ میں سورۂ قاف پڑھتے تھے، کیونکہ ان سورتوں میں توحید اصول دین اور نبوت اور معاد کے اثبات کے ساتھ پیغمبروں کے پیروں اور اُن کے مخالفین کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔[۵۱]

اس لئے قدرتی طور پر ان واقعات کا اثر پڑتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ دوسری قسم کی یہ دلیل جس کی بہترین مثال قرآن مجید ہے پہلی دلیل کی طرح بالکل سادہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ترغیب و ترہیب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے یہ دلیل جس قدر زیادہ موثر ہوگی اُسی قدر اُس کی معجزانہ حیثیت زیادہ نمایاں ہوگی، اور قرآن مجید اس حیثیت

---

[۵۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۲۷۳، ۲۷۴۔

تو اس سے اس مقام پر اُن لوگون کے موجود ہونے کا علم تو اس کو ہوجائے گا، لیکن اس کے دل مین اُن لوگون کے بغض، و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا، پیغمبرون کے عام مادی معجزے اسی قسم مین داخل ہین کہ اُن سے صرف اُن کی صداقت کا علم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی صداقت کے تسلیم کرلینے کے بعد اُن کے اوامر و نواہی اور وعدہ و وعید کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کے معجزات کا بالذات نہین، بلکہ بالواسطہ اثر ہے، خود ان معجزات مین ترغیب و ترہیب کا کوئی عنصر شامل نہین،

۲- اس کے بخلاف بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین، جو مدلول علیہ کے علم کے ساتھ ترغیب و ترہیب اور بغض و محبت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہین، مثلاً اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دوست واحباب، اعزۂ و اقارب اور اہل وعیال موجود ہین تو اس کو اس مقام پر صرف اُن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل مین اُن کی محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ بے اختیار اُن سے ملنے کا مشتاق ہوگا،

اسی طرح اگر اس سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دشمن یا ڈاکو موجود ہین، جو تم کو مار ڈالینگے یا تمھارا مال لوٹ لینگے، تو اس کو صرف دشمنون اور ڈاکوؤن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے دل مین خوف کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ وہان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا،

قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے اور اس حیثیت سے اس کو تمام گذشتہ پیغمبرون کے معجزات پر فضیلت حاصل ہو کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہی پر دلالت نہین کرتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے پیغمبرون کے پیرؤن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اُن کی کیونکر مدد کی؟ اُن کو دشمنون سے کیونکر بچایا؟ دنیا مین کیونکر اُن کا بول بالا کیا؟ اور آخرت مین اُن کو کس طرح سرفراز کیا؟ اس کے بخلاف جن لوگون نے پیغمبرون کی تکذیب کی، وہ کیونکر تباہ و برباد کئے گئے؟ اور دین و دنیا مین متوجب لعنت ہوئے؟ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جن لوگون کے سامنے اس قسم

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی، اور مقام برک الغماد تک پہنچ گئے، تو راستے مین ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا مل گیا، اور پوچھا کہ "کہان کا قصد ہے"؟ انھون نے کہا کہ "مجھکو میری قوم نے گھر سے نکال دیا ہے، اب دنیا مین گھوم پھر کر اپنے خدا کی عبادت کرونگا" لیکن ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقی فضائل گن گن کر کہا کہ "تم جیسا شخص گھر بار سے نکالا نہین جا سکتا، مین تمھارا ضامن ہوتا ہون، واپس چلو اور اپنے شہر مین اپنے خدا کی عبادت کرو"۔

چنانچہ ابن الدغنہ نے سرداران قریش کو اس پر راضی کر لیا، اور انھون نے اس کی ضمانت کو اس شرط پر منظور کر لیا، کہ "وہ اپنے گھر ہی مین اپنے خدا کی عبادت کرین اور قرآن اور نماز پڑھین لیکن اس کا اعلان نہ کرین، کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف مائل ہوجائینگے" اس شرط پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک عمل کیا، لیکن اس کے بعد اپنے گھر کے صحن مین انھون نے ایک مسجد بنائی، جس مین نماز پڑھتے تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، جس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ مشرکین کی عورتین اور ان کے بچے ان کے اوپر ٹوٹے پڑتے تھے، اور ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کفار گھبرا گئے، اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے ابوبکر کو صرف اس شرط پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے گھر مین خدا کی عبادت کرین لیکن انھون نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا ہے، اور اپنے گھر کے صحن مین ایک مسجد بنا لی ہے، اور کھلم کھلا اس مین نماز ادا کرتے ہین، اور قرآن پڑھتے ہین، ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف نہ مائل ہوجائین، تم ان کو منع کر دو، اگر وہ صرف اپنے گھر مین عبادت کرنے پر اکتفا کرنا چاہین تو کر سکتے ہین لیکن اگر وہ علانیہ عبادت کرنا چاہتے ہین تو تمھاری ضمانت کو منسوخ کردین"، ابن الدغنہ نے اُن کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا، تو انھون نے اس کو نامنظور کر دیا، اور اُن کی ضمانت منسوخ کر دی،

سے حد اعجاز تک پہونچ گیا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ خود کہتا ہے،

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	کرتے، تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر-۳)	سے دب جاتا، اور پھٹ جاتا،

اگرچہ قساوتِ قلبی کی وجہ سے کفار نے اُس کے معجزانہ اثر کو قبول نہیں کیا، تاہم اُن کو یہ یقین تھا کہ یہ ایک موثر کلام ہے، اس لئے اُس کے اثر کے روکنے کے لئے بعض سفیہانہ تدبیرین اختیار کین، مثلاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور یہ کافر لوگ کہتے ہین کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ	کو سنو ہی مت، اور اس کے بیچ مین غل
تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ ۴-)	مچا دیا کرو، شاید تم ہی غالب رہو،

امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین کہ "کفار کو یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید لفظاً و معنیً دونون حیثیتون سے کامل ہے، اور جو شخص اس کو سنے گا، وہ اُس کے الفاظ کی جزالت سے واقف ہوجائیگا، اور اس کی عقل اس کے معانی کا احاطہ کرے گی، اور وہ یہ فیصلہ کر دے گی کہ یہ کلام حق ہے اور اسکا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے انھون نے لوگون کو اُس کے سننے سے روکنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ آپس مین یہ کہنے لگے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب وہ پڑھا جائے تو شور و غل کرو اشعار پڑھو اور دوسرے قسم کے خرافات بکو تاکہ قاری کی قرأت مین گڑبڑی پیدا ہو جائے، قریش باہم ایک دوسرے کو یہی سکھاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا، کہ اس طریقہ سے لوگ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکین"،

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے متعلق متعدد شہادتین موجود ہین، مثلاً کفار و مشرکین پر تو اس کا یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیتون کو سُن کر اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے، اور اُن کے دلون مین اسلام کے قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری باب الہجرۃ مین ہے کہ

اور حضرت جبیر بن مطعمؓ نے اس کو سنا تو ان کا دل اڑنے لگا، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے[1]۔

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ شاعر اور اپنی قوم کے سردار تھے، وہ مکہ میں آئے، اور سرداران قریش سے ملے، تو ان لوگوں نے کہا کہ تم شاعر اور اپنی قوم کے سردار ہو، اس لیے ہم کو خوف ہے کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے ملے، اور اسکی بعض باتیں تم پر اثر کر دیں، کیونکہ اس کی باتیں جادو کا اثر رکھتی ہیں، اور وہ ان کے ذریعہ سے باپ، بیٹے، اور میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتا ہے، سرداران قریش نے یہاں تک اس پر اصرار کیا، تو انھوں نے دل میں ٹھان لیا کہ میں مسجد میں داخل ہوں گا، تو کان بند کر لوں گا، چنانچہ انھوں نے کان میں کپڑا ٹھونس لیا، اور مسجد کے اندر گئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپ کے قریب کھڑے ہوگئے، اور بے ساختہ قرآن مجید کی بعض آیتیں سن لیں تو دل میں کہا کہ میں ہوشیار آدمی ہوں، اور برے اور بھلے میں امتیاز کر سکتا ہوں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ضرور سنوں گا، اگر وہ اچھی ہیں تو ان کو قبول کروں گا، ورنہ ان سے احتراز کروں گا، اس لیے کان سے کپڑا نکال کر پھینک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن مجید سننے لگے، ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی اس سے بہتر کلام نہیں سنا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر چلے تو وہ بھی ساتھ ہو لیے، اور آپ کے گھر تک گئے، اور قریش کی ممانعت کا پورا قصہ کہا (اور کہا) باوجود اس ممانعت کے میں نے بے ساختہ آپ کی بات سن لی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حق ہے، میرے سامنے اپنا دین اور اپنے اوامر و نواہی پیش کیجئے، آپ نے ان کو دعوت اسلام دی، اور وہ مسلمان ہو گئے[2]۔

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے لئے نکلے لیکن مسجد میں آپ کی زبان مبارک سے چند آیتیں سنیں اور ان سے متاثر ہوئے، پہلے تو ان کے دل میں شکوک پیدا ہوئے، اور قریش کی طرح دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاعر ہیں، کاہن ہیں، لیکن جب آپ نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور مع فتح الباری [2] استیعاب تذکرہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ

لیکن باوجود اس شور وغل اور روک تھام کے قرآن مجید کے اثر کا کلیۃً ازالہ نہ ہوسکا، اور متعدد لوگ قرآن مجید کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہوئے، اور متعدد لوگوں نے اس کے اثر سے اسلام قبول کیا، مثلاً:-

حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اُتری،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ، (نحل-۱۳)	خدا عدل واحسان اور قرابتداروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور بدکاری، بُرائی اور ظلم سے روکتا ہے، وہ اس لئے یہ نصیحتیں کرتا ہے کہ شاید تم لوگ اس کو قبول کرلو،

تو اس کے سننے کے ساتھ ہی ایمان اُن کے دل میں گھر کر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو محبوب[1] ہوگئے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے، جب اس آیت تک پہنچے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَا یُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَائِنُ رَبِّکَ اَمْ ھُمُ الْمُسَیْطِرُوْنَ، (طور-۲)	کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہوگئے؟ یا یہ لوگ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا آسمان اور زمین کو انہی لوگوں نے پیدا کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ اُن کے دل میں ایمان نہیں، کیا اُن کے پاس خدا کے خزانے ہیں؟ کیا یہ لوگ سرپاہ کار ہیں

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اص ۳۱۸،

اشکبار ہو جاتی تھیں، اور اُن کے بدن کانپ اٹھتے تھے۔

اس اثر پذیری کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام کے دلوں میں خوف و خشیت کا ایک مستقل جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس لئے وہ ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ عہدِ نبوت میں ہم لوگ اس خوف کے مارے عورتوں سے ہنسی خوشی کی باتیں نہیں کرتے تھے کہ مبادا اس بارے میں کوئی آیت نازل نہ ہو جائے،

صلح حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا، جواب نہ ملا تو آگے نکل گئے اور دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے، ایک دن رسول اللہ صلعم کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ آ نکلے، تو آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا، ھم الاخسرون ورب الکعبۃ، وہ لوگ گھاٹے میں ہیں، وہ گھبرا گئے کہ میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی،

بالخصوص جن آیتوں میں کسی فعل پر عذاب کی دھمکی دی جاتی تھی، صحابۂ کرام ان سے اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ	جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ	اس کو خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ان
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (توبہ)	کو سخت عذاب کی بشارت دو،

تو تمام صحابہ پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے، حضرت مالک بن ثعلبہؓ کا جو ایک دولتمند صحابی تھے، گذر ہوا، تو آیت کو سن کر ان پر غشی طاری ہو گئی، ہوش میں آئے، تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا یہ آیت اُن لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے، جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، ارشاد ہوا، "ہاں"، بولے شام تک مالک کے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہ ہوگا، چنانچہ

سورہ ختم کر چکے، تو یہ تمام شکوک دور ہوگئے، اور اسلام ان کے دل میں پوری طرح جاگزین ہوگیا،[۱]

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جب سورہ کھیعص کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو وہ رو پڑا، اور اس کی داڑھی تر ہوگئی، پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں،[۲]

اشخاص سے الگ کفار کی جماعت قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہو کر اسلام لائی، حبش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس عیسائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی، اور اُن کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا،[۳]

حضرت ابوعبیدہ بن حارث، حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسد، حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ اور حضرت عثمان بن مظعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو اُن لوگوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا،[۴] لیکن مسلمانوں پر قرآن مجید کا اثر اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا، خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

تقشعر منه جلود الذين يخشون	جس سے ان لوگوں کے جو اپنے رب
ربهم ثم تلين جلودهم و	سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں،
قلوبهم الى ذكر الله،	پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے
(زمر - ۳)	ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں،

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابہ کرام جب قرآن مجید پڑھتے تھے تو اُن کا کیا حال ہوتا تھا؟ بولیں وہی جس کو خدا نے اُن کا وصف قرار دیا ہے، یعنی اُن کی آنکھیں

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ [۲] ایضاً جلد ۱ صفحہ [۳] ابن ہشام مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱۲،
[۴] اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ بن عبد الاسد،

ولسلیمن الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر واسلنا لہ عین القطر ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ یعملون لہ ما یشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیت اعملوا آل داود شکرا وقلیل من عبادی الشکور

(سباء - ۲)

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی، اور ہم نے ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں بعضے وہ تھے، جو ان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے، اور جنات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے تھے جو ان کو منظور ہوتا، بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو، اور میرے بندوں میں شکر گذار کم ہی ہوتے ہیں

والشیطین کل بناء وغواص وآخرین مقرنین فی الاصفاد

(ص - ۳)

اور جنات کو بھی ان کا تابع کر دیا، یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے،

تابع اور متبوع دونوں کے قالب روح میں کوئی مذہبی اور اخلاقی اثر نہیں پیدا کرتے، بلکہ سرے سے ان کو منصب نبوت ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جن وشیاطین کی یہ اطاعت پیغمبرانہ اطاعت نہ تھی، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کا نتیجہ تھی، اور وہ ان سے اسی طرح کام لیتے تھے

شام تک انھون نے اپنی کل دولت خیرات کر دی، قرآن مجید کا یہی اثر ہے جس کو خطابی نے قرآن مجید کا ایک وجہ اعجاز قرار دیا ہے، اور اس نکتہ آفرینی پر اُن کو ناز ہے، چنانچہ فرماتے ہین کہ مین قرآن مجید کے وجہ اعجاز کے متعلق ایک بات کہتا ہون جس سے اور لوگون نے غفلت برتی ہے، اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب مومن پر پڑتا ہے کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم مین ہو یا نثر مین باوجود خوف وہیبت پیدا کرنے کے دل مین لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہین پیدا کرتا، جو قرآن مجید پیدا کرتا ہے خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

اس کے خلاف دنیا کے بعض معجزے تو بالکل بے اثر تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ معجزے:-

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِينَ وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ

(انبیاء - ۲)

اور ہم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس مین ہم نے برکت کر رکھی ہے (مراد ملک شام سے) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہین اور بعض بعض شیاطین ایسے تھے کہ سلیمان کے لئے (دریاؤن مین) غوطہ لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر دین) اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کیا کرتے تھے اور

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۲۱

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا

(جن - ۱)

آپ کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے، کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا، پھر انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتاتا ہے، تو ہم تو اس پر ایمان لے آئے، اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گے

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ، فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ

(احقاف - ۴)

اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سنتے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے، کہنے لگے کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے بھائیو! تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا

جس طرح غزوات میں گرفتار ہونے کے بعد کافر قیدیوں سے لیا جاتا ہے[۵۱]

البتہ جن و شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو اطاعت کرتے تھے، وہ اس اطاعت سے مختلف تھی، جو وہ کاہنوں اور جادوگروں کی کرتے تھے، کیونکہ کاہنوں اور جادوگروں کو جن و شیاطین ناجائز کاموں میں مدد دیتے تھے،

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اُن سے جائز اور مُباح کام لیتے تھے، اس لئے یہ ایک دنیوی احسان تھا جس پر خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے[۵۲]

غرض معجزہ کی یہ وہ قسم ہے جو شرعاً نہ محمود ہے نہ مذموم، اس سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ ایک احسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، ورنہ ایک فعل عبث اور تماشا بن جاتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص بلا ضرورت شیر کے اوپر سوار ہوتا ہے، یا پل کے موجود ہوتے ہوئے پانی کے اوپر چلتا ہے، تو یہ ایک فعل عبث اور محض تماشا ہے[۵۳]

لیکن معجزہ کی ایک قسم اور ہے جو اس سے اعلیٰ و اشرف ہے، اور وہ صاحب معجزہ اور اس کے پیرووں کو نیکی اور پرہیزگاری پر آمادہ کرتی ہے،

معجزہ کی یہی قسم منصب نبوت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، اور قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ تھا، جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی اطاعت قبول کی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مطیع ہو گئے تھے، لیکن دونوں اطاعتوں کے نتائج مختلف تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ اطاعت سے ان کو ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ملا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ اطاعت کا جو نتیجہ ہوا اس کو قرآن مجید نے خود انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

---

۵۱ کتاب النبوات لابن تیمیہ، صفحہ ۱۳۱،

۵۲ کتاب المعجزات والکرامات لابن تیمیہ، صفحہ ۶ ۵۳ ایضاً صفحہ ۵ ۵۴ ایضاً صفحہ ۱۲

ڈال سکتا ہے کہ ان کو بیمار کرسکتا ہے، اُن کو تندرست بنا سکتا ہے، اُن کو مار ڈال سکتا ہے اور اُن کو محتاج اور دولت مند بنا سکتا ہے، اسی طرح دوسری قسم کے معجزات کا صاحب معجزہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے لگتا ہے، اور کتاب و سنت کا پابند ہو جاتا ہے، پھر دوسروں پر وہ یہ اثر ڈالتا ہے کہ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اور لوگ شرعی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں لیکن معجزات کا تعلق جہاں تک علم و قدرت سے ہے اگر وہ موجود نہ ہوں، تو اس سے کسی مسلمان کو کوئی دینی نقصان نہیں پہنچتا، اگر ایک شخص کو غیبی امور کا علم حاصل نہ ہوا اور مادیات اس کے زیر اثر نہ ہوں، تو اس سے خدا کے نزدیک اس کا درجہ کم نہیں ہو سکتا لیکن اگر کوئی شخص امور دینیہ کا پابند نہ ہو، تو اس سے اس میں ایک ایسا نقص پیدا ہو جاتا ہے جس سے یا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا، کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم اور اس کی پابندی کا حکم دینا ایسی چیز ہے جس سے آدمی کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن کائنات کا علم حاصل کرنا، اور اس پر اثر ڈالنا، تو اس قسم کی چیزیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں، جب وہ دین میں شامل ہوں ورنہ کبھی کبھی اس سے آدمی گنہگار بھی ہو جاتا ہے،[1]

معجزات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے پیغمبروں کا دعوائے نبوت ثابت نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں معاش و معاد کا سیدھا راستہ دکھاتا ہوں لیکن وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں، تو یہ دلیل گو کتنی ہی عجیب و غریب ہو، لیکن اس کو دعوی کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اس کا یہ دعوی تو صرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے، جب وہ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتائے اور

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۸، ۹،

ان دونون اطاعتون کا مقابلہ کرکے علامہ ابن تیمیہ کتاب النبوات مین ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ جن وانس کے ساتھ ہمارے پیغمبر کا معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے معاملہ سے زیادہ مکمل ہے کیونکہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت شاہانہ اقتدار کی وجہ سے کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پیغمبرانہ اطاعت تھی[1] دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنون کو فرمانبردار بنا کر اُن سے چند مُباح کام لیتے تھے لیکن ہمارے پیغمبر اُن کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے، اس لئے آپ کی پیروی کرکے وہ سعادت مند ہوگئے تھے اور پیغمبر کے لئے اور ان کے لئے زیادہ کامل ترین طریقہ ہے[2] لیکن بہت سے معجزے ایسے بھی ہوتے ہین جن کا اثر خود صاحب معجزہ پر بھی پڑتا ہے اور دوسرون پر بھی وہ اثر ڈالتے ہین لیکن بااین ہمہ قرآن مجید کے روحانی اثر کے مقابلہ مین اُن کا درجہ بہت کم ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ خداوند تعالیٰ کے کلمات کی دو قسمین ہین

۱۔ ایک کلماتِ کونیہ جن مین تمام کائنات داخل ہے، انبیاء کے مادی معجزے ان ہی مین شامل ہین،

۲۔ دوسرے کلماتِ دینیہ جن مین قرآن، خدا کی شریعت اور اس کے اوامر و نواہی شامل ہین اور بندہ کا کام یہ ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، اور اس پر عامل ہو جس طرح کلماتِ کونیہ کے متعلق بندہ کا کام یہ ہے، کہ تکوینی امور کا علم حاصل کرے، اور اُن پر اثر ڈالے،

پہلی قسم کے معجزات سے تکوینی امور کا اور دوسری قسم کے معجزات سے شرعی امور کا علم حاصل ہوتا ہے، اور پہلی قسم کے معجزات مادیات پر اثر کرتے ہین، اور دوسری قسم کے معجزات شرعیات پر، اور جس طرح پہلی قسم کے معجزات کا خود صاحبِ معجزہ پر تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے ہوا مین اُڑ سکتا ہے، اور آگ کے اندر گھس سکتا ہے، اور دوسرون پر وہ اُن کے ذریعہ سے یہ اثر

---

[1] کتاب النبوات ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۱۰،

اس کا یہ اثر ہوا کہ عورتون نے اپنے تہ بند اور متفرق کپڑون کو پھاڑ کر ڈوپٹے بنائے اور اُن سے آپ کو سیاہ چادرون سے اس طرح ڈھانپ لیا کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سرکوون کے آشیانے بن گئے ہین،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ ناپ جوکھ مین سخت خیانت کرتے تھے، اس پر سورہ ویل للمطففین نازل ہوئی، اور لوگ دیانت سے کام لینے لگے،

اصحاب صفہ کی معاش کا بہت کچھ دار و مدار انصار کی فیاضی پر تھا، یہ لوگ کھجور کے خوشے لاکر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، اصحاب صفہ آتے تھے، اور چھڑی سے اُن کو ہلاتے تھے، جو کھجورین ٹپک پڑتی تھین اُن کو کھا لیتے تھے، لیکن انصار مین کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو سڑے گلے خوشے لاکر لٹکا دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات		مسلمانو! اپنی بہترین کمائی اور بہترین
ماکسبتم وممااخرجنالکم من الارض	(بقرہ)	پیداوار سے صدقہ دو، بُرے مال کو
ولاتیمموالخبیث منہ تنفقون،		خیرات نہ کرو،

اس کے بعد دفعۃً اس حالت مین انقلاب پیدا ہو گیا، اور تمام لوگ بہترین کھجورین لانے لگے،

اسلام کے فرائض و اعمال مین جہاد سب سے خطرناک کام ہے لیکن صحابۂ کرام کو قرآن مجید ہی کے اثر نے جہاد پر آمادہ کیا تھا، اور اسی اثر کی بدولت وہ سخت سے سخت جنگی خطرات مین ثابت قدم رہتے تھے، ایک بار قسطنطنیہ مین رومیون سے مسلمانون کا مقابلہ ہوا، رومی بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے متصل صف زن تھے، ایک مسلمان نے جرأت کرکے حملہ شروع کیا، تو لوگ پکارے "ہان ہان اپنی جان کو ہلاکت مین ڈالتے ہو" حضرت ابو ایوب انصاریؓ ساتھ تھے، بولے "یہ آیت تو ہم انصار کے بارے مین نازل ہوئی ہے" جب اسلام نے قوت حاصل کر لی تو ہم لوگ اپنی معاش کے کام

لوگوں کو ان کا پابند بناتے، لیکن یہ اعتراض کلمات کونیہ یعنی مادی معجزات پر ہوتا ہے، کلمات دینیہ یعنی قرآن مجید پر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتاتا ہے اور لوگوں کو ان کا پابند بناتا ہے، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کے ساتھ نہایت گہرا ربط و تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہی آپ کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی،

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہی خداوند تعالیٰ کی شریعت اور اس کے دینی کلمات ہیں، اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے، دعوت بھی ہے، اور معجزہ بھی ہے[1]،

بہرحال قرآن مجید ایک معجزہ ناطق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیتا ہے وہ زبان قال ہو لیکن اور انبیاء کے مادی معجزے صرف زبان حال ہیں زبان قال نہیں، وہ پانی کے اندر چلنے، ہوا میں اڑنے اور آگ میں گھسنے کی طاقت تو نہیں پیدا کرتا، لیکن نیک کاموں پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے، جو دین و دنیا دونوں میں مفید ہیں، مثلاً جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران - ۱۰)	تم لوگ جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں کو نہ خرچ کروگے نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے،

تو حضرت ابو طلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ خدا ہمارا مال مانگتا ہے آپ گواہ رہئے کہ اریحا میں میری جو زمین ہے میں اس کو ان کے نام پر وقف کرتا ہوں"، زمانہ جاہلیت میں عرب کی عورتیں نہایت بے پروائی کے ساتھ دوپٹہ اوڑھتی تھیں، اس لئے سینہ اور سر وغیرہ کھلا رہتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	عورتوں کو چاہئے کہ اپنے دوپٹوں کو سینے پر ڈال لیں

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۱۰،

اجتماعیت کا قرآنی تصوّر

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

کائناتِ ہستی فطرت کی عجوبہ زایون اور جدت طرازیون کی آماجگاہ ہے اور اس جہانِ رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین ورپرکشش واقع ہوئی ہے کہ اس مین نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتین اُبھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہان تاب ہی جو پوری کائنات کو اپنے جلو مین لئے ہوئے ہی، صحن گلشن کا حسین منظر ہو یا لق و دق صحرا کی نا محدود وسعت، شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلین ہون، یا دشت وحشت خیز کی خاموش، اُداس پرسکون خلوتین، صبح حیات کی مسکراہٹین ہون، یا شام زندگی کی وحشتناکیان، آبشارون کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑک، بزم طرب شادی کے نغمہ ہائے مسرت ہون، یا مجلس تعزیت کی دلدوز آہین، یہ سب کچھ دلِ خود آگاہ و حقیقت شناس کی نظر مین ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیان ہین، ایک ہی نور مطلق پر اُن کی انتہا ہوتی ہے،

وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون،	زمین اور خود تمھارے وجود مین اہل یقین ایمان کے لئے نشانیان ہین، کیا تم دیکھتے نہین ہو؟
(الذّاریات)	
اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ	بلا شبہ اس مین نصیحت و عبرت ہے اس کیلئے

دھندے میں مشغول ہوگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَانفقوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ (بقرہ - ۲۴) — اور خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو،

اس لئے اصلی ہلاکت یہ ہے کہ ہم معاش کے کاروبار میں مشغول ہو جائیں، اور جہاد کو چھوڑ دیں، راوی کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، حضرت ابو ایوب انصاریؓ ہمیشہ مصروف جہاد رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں وفات پاکر مدفون ہوئے، جنگ یمامہ میں جب حضرت سالمؓ کو علم عطا کیا گیا، تو ایک شخص نے کہا کہ ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے، اس لئے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں، بولے تو میں اس حالت میں قرآن مجید کا بدترین حامل ہون گا، چنانچہ انھوں نے علم کو داہنے ہاتھ میں لیا، جب وہ کٹ گیا، تو بائیں ہاتھ میں لیا، وہ بھی کٹ گیا، تو علم کو سینے سے چمٹا لیا، اور یہ آیت پڑھنے لگے،

وَمَا محمد الا رسول ... وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر، (آل عمران - ۱۵) — محمد صرف ایک پیغمبر ہیں ..... اور بہت سے پیغمبر گذرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے علماء نے جنگ کی ہے،

(باقی)

الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهِ
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا
لِنُحْیِیَ بِهِ بَلْدَةً مَیْتًا وَنُسْقِیَهُ مِمَّا
خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَاَنَاسِیَّ کَثِیْرًا ،

(الفرقان - ۵)

اُسی نے زمین کے اندر پھیل جانے کی غرض
سے دن بنایا، وہی ذات ہے جس نے ہواؤن
کو بھیجا، جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی
ہین، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا،
تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیون کو آباد کرتے
اور یہ پانی اپنی مخلوق مین سے چارپایون، اور
بہت سے لوگون کو پلائین ،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ
بَیْنَهُ ثُمَّ یَجْعَلُهُ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ
یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهِ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهِ
مَنْ یَّشَاءُ وَیَصْرِفُهُ عَنْ مَّنْ یَّشَاءُ
یَکَادُ سَنَا بَرْقِهِ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

(النور)

کیا تم نے نہین دیکھا کہ اللہ تعالی بادلون
کو چلاتا ہے، پھر اُن کو جمع کرتا ہے پھر اُن کو
تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن کے
اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑون کی
بلندی کی جانب سے برف (جو فضا مین ہوا
سرد سے منجمد ہوتی ہے) اتارتا ہے، پس یہ
برف جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے اور جس سے
چاہتا ہے پھیر لیتا ہے، قریب ہے کہ بجلی (جو بادلون
کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے) کی چمک آنکھون کی
[illegible]

عالم ارض و سما کے اس وسیع تر نظام افادہ و اشتراک اور اُس کے حسین و جمیل مناظر مین اہل بینش کے لئے
جو چیز وجہ کشش ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصود
کی جانب رواں دواں ہے، چارون طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ذرہ سے لے کر پہاڑ

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ جو اپنے پہلو مین حساس دل رکھتا ہے،
(ق) یا پوری طرح متوجہ ہو کر کان ... لگاتا ہو

ارض وسما کی یہ کائنات جو روز مرہ ہمارے مشاہدہ مین آتی ہے، اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہو اور اپنے کام اور وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیائے عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے مگر پردۂ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر حقیقت پر نگاہ ڈالئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاق گیر نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے، اور ہر وجود شخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہو، عالم لاہوتی ہو یا کائنات ناسوتی محفل انجم ہو، یا جہان نباتات ارضی، نظام سحاب و باد و باران ہو، یا سلسلۂ کوہ و بیابان، غرض اس عالم کی ہر چیز ہمہ گیر نظام کائنات کی ایک کڑی ہے یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہو جس کا وجود وبقا کارخانہ کے وجود وبقا پر موقوف ہے،

قرآن کریم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور اُن کی اجتماعی تاثیر وافادیت مین غور وفکر کی دعوت دیتا ہے عالم افلاک، عالم جو سما اور ہمارے جہان رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیاء کے معنوی اور افادی تعلق و ربط کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ بیشتر مقامات مین قرآن خود ہی اشیائے عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان مین ذکر کرتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ	کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہین دیکھا کہ اُس
شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ	نے سایہ کو کیسے پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اسکو
عَلَیْهِ دَلِیْلًا، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا	ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل
قَبْضًا یَّسِیْرًا، وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ	قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی
الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ	طرف کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمھارے لیے
النَّھَارَ نُشُوْرًا، وَھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ	رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا،

يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ، (آل عمران ۱۱)

کرے گا تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ،

بلکہ ایسی چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے، درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے، اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا پاؤں کی رگڑ سے ذرہ ہائے خاک میں تحلیل ہوا یا ہوا ئے تند و تیز اس کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک ؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے لگ حاصل کر رہی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود ہی کو باقی نہیں رکھ سکتی ،

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ و دستور اور نظام اطاعت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہان کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف کار ہے

خلافت آدم کا مفہوم | نوع انسانی اس عظیم الشان کارخانۂ قدرت کا ایک فعال اور موثر عنصر ہے، عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامۂ ایجاد و تخلیق کی نو بہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے رنگا رنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجود موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں، اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگی اور وحشت انگیز ہوتی، آخر یہ حضرت انسان ہی تو ہیں جس کی پیدائش پہ دیار عشق میں ہنگامہ و شور اٹھا، جہان حسن میں تہلکہ بپا ہوا، اور فطرت نے ممکنات وجود کی تمام راہیں اس کے لئے وا کر دیں،

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے لیکن خود انسان کیا ہے اور عالم امکان میں اس کا مقام و موقف کیا ہے ؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع

تک، آب جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمان کی بلندی تک، عالم نباتات سے لے کر جہانِ مہر و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے، گویا وہ کیف و مستی کے عالم میں مستانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے،

وابرح مایکون الشوق یوما

اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے، یا دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے، جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے، دورِ عصر حاضر کے کچھ حواس باختہ اور خود ساختہ مفسرین اسلام کو نازی ازم اور فیسی ازم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست، اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملی قوانین (انٹرنیشنل لاز) کا مجموعہ تصور کرتے ہیں، لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے، ایک ہمہ گیر اور آفاقی نظام اطاعت ہے، کائناتی دستور حیات ہے اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے،

افغیر دین اللّٰہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون، (آل عمران)	ترجمہ	کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت گذار ہیں، اور ان کو بالآخر اسی کی طرف

دراصل اسی نظام اطاعت اور سر رشتۂ اجتماعیت سے اس عالم کا بناؤ سنگار اور حسن بہار آفرین قائم ہے، بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے، اور جو چیز اس آفاقی گیر نظام سے کٹ جاتی ہے اس کا انجام بہرحال خسران و نامرادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن	جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو تلاش

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم   (اقبالؒ)

اس لئے انسان کا تصورِ حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرارِ فطرت کی ٹوہ لگائے اور حقائقِ کائنات کی طلب و جستجو میں اپنی علمی اور عملی قوتیں صرف کرے، بلکہ اس کا مقصدِ وجود یہ ہے کہ وہ اسرارِ فطرت کی دریافت اور حقائقِ اشیاء کے اکتشاف سے اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیائے عالم اور قوانینِ فطرت میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو، اور خلاقِ عالم کے زیرِ اثر اپنے علم و عمل کو کام میں لائے، لہٰذا خلافتِ آدم کے معنی یہ ہوئے، کہ خدائے قدوس نے انسان کو یہ حق دیا ہے، کہ وہ اپنے شعور و ارادہ اور قواتِ علم و عمل سے کائنات میں تصرف کرے، ... یہ حق علی الاطلاق انسان کو حاصل ہے کسی خاص گروہِ انسانی سے مخصوص نہیں ہے لیکن یہ مسلّم ہے، کہ قدرت کے اس کارخانہ میں حق یونہی مفت تقسیم نہیں ہوا کرتا، بلکہ اس کے لئے علم و عمل کی مخصوص صلاحیتیں ضروری قرار دی گئی ہیں،

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا   اور ہر ایک کے مرتبے اس کے اعمال کے مطابق ہوتے ہیں،

مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، اور زیادہ سے زیادہ دولت کمائے لیکن اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس حق سے محروم ہیں محض اس لئے کہ اس مقصد کے لئے جس طرز کی کوشش و سعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اس کو وہ کام میں نہیں لاتے، بالکل یہی حال خلافت کا ہے، کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں وا کر دی گئی ہیں لیکن اس کو علم و عمل کی صلاحیتوں سے مشروط کر دیا گیا ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم نے ایک جگہ ذکرِ خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا،   خدا نے آدم کو حقائقِ اشیاء کا علم عطا کیا،

(بقرہ)

کی حقیقت خود بخود ہی انکشاف ہو کر سامنے آجائے گی،

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا، تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا جو اپنی طبعی اور فطری قوت تخلیق سے انواع کائنات میں تصرف کر سکے، اس کا آہنی عزم ویرانوں کو آباد کرے، دریاؤں سے نہریں نکال کر خشک زمینوں کو شاداب کرے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت وصحرا کو کشت گل ولالہ میں تبدیل کرے، خوش منظر اور بارونق شہروں کی بنا ڈالے اور اس کا علمی وتحقیقی جوہر اشیاء کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے، موالید وعناصر کی مدد سے نئے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو مسخر کرے، ہوا پر اپنا تسلط جمائے، یہاں تک کہ ارض وسما کی ناپائدار کنارو سعتیں اس کے سمٹ جائیں اور وہ اپنے علم وعمل سے کائنات پر حکمرانی کرے، اسرار فطرت کی آگہی کیساتھ عالم وجود کی ہر شے کو منشاء قدرت کے مطابق کام میں لائے، اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد واختلال کا باعث ہو، بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی میں پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو اور کوہ وبیابان اس کی بہار آفرینیوں سے مہک اٹھیں،

حاصل یہ ہے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کے ارتقاء کے لئے کچھ قوانین طبعی بنا دیتے ہیں، تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی وجود وتشخص کی حفاظت وصیانت میں مصروف کار رہیں، لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانۂ فطرت میں حسن ودلکشی پیدا کرنے، ان کو خلاق عالم کے منشاء کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور صاحب ارادہ ہستی کی ضرورت تھی، اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسانوں کو پیدا کیا،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی — خیابان وگلزار وباغ آفریدم

انجام دے، جس طرح اس کے منوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے، اور اس ہدایت نامہ سے سرمو انحراف نہ کرے، اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہے تو وہ اصولاً اپنے منصب نیابت کا اہل نہیں رہتا، کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور انتفاء شرط انتفاء مشروط کو مستلزم ہے،

لہذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے، البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے لیکن حکومت و اقتدار خلافت کو مستلزم نہیں ہے، یعنی جس گروہ انسانی کو منصب خلافت عطا ہوگا، حکومت و اقتدار کی مسند بھی اُسے حاصل ہوگی، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو وہ منصب خلافت سے بھی سرفراز ہو، گویا خلافت ایک عظیم القدر مقام حریت ہے، جو اس عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا، بلکہ وہ سپہر نیلگون اور جہانِ انفس و آفاق کو محیط ہے

نکتہ ای گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیاز عبد و حر

عبد گردد یاوہ در لیل و نہار در دلِ حُر یاوہ گردد روزگار (اقبال)

آج اہلِ مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی، عالم انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا، چنانچہ پروفیسر جوڈ اور سید دی النہل نمسفی اسکونٹ سیونل اور دیگر کئی علماء و مفکرین نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے دوامی اور مستقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے، لیکن جس حقیقت کو ہم خلافت کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں، دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تصورات پر مبنی ہے، اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطہ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کافی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے، جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے،

اور ایک دوسرے مقام پر خلافت کو عمل سے مشروط کیا گیا ہے،

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ	پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین
مِنْۢ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ	میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل
(سورۂ یونس)	کرتے ہو

زمانہ حال کے خود ساختہ شارحین اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت واقتدار کی ہم معنی ہے اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ اُن کی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک اعلیٰ و برتر مقام بندگی ہے، شرفِ انسانیت کی معراج ہے، علم وعمل اور فضائل اخلاق کی وہ پاکیزہ تر منزل ہے، جو عصر حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، ؎

با تو چہ گویم کہ تو مجنون تئی !

یعنی خلافت آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتدائے آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے کہ وہ خدائی صفات کمال کا مظہر اتم بن کر کائنات ارض کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لے، اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشائے خداوندی کے مطابق چلائے،

نائبِ حق در جہان بودن خوش است	بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است	ہستی او ظلّ اسم اعظم است
از رموز جزو کل آگاہ بود	در جہان قائم بامر اللہ بود
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است	از جلالِ او نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیر نو

می دہد این خواب را تعبیر نو

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اس طرح

کر دیا گیا تھا لیکن جہاں تک کہ مادی نظریہ ہائے اجتماع کا تعلق ہے وہ انسانوں کی عقل خود بین کی جدت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کی پیداوار ہیں، اور سراسر غیر فطری ہیں لیکن سطور بالا میں جس تصور اجتماع کا ذکر ہوا ہے وہ دینی تصور اجتماع ہے، اور اسکی اساس عالمگیر اور ہمہ گیر اصول حیات ہیں جو کسی محدود نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص نہیں رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماع قبیلہ و نسب قوم و وطن کی حدبندی پر مبنی ہیں اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے نسلی طبقوں اور وطنی قومیتوں میں تقسیم کر دیتے ہیں،

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے، اسے کارگہ عالم میں انسان کو زندگی کے مرحلہ اول پر ہی اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے، تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، اور پھر وہ جس قدر نشو ونما کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر اس کے علائق میں توسیع ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقہ علائق میں جکڑا ہوا پاتا ہے، اور یہاں پہنچکر اس کو گرد و پیش کے اجتماعی اور تمدنی تصورات سے سابقہ پڑتا ہے، اور وہ یا تو ایک ہمہ گیر رشتہ اخوت دینی میں منسلک ہو جاتا ہے اور یا وہ محدود اور سطحی علائق کے تنگ دائرہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے،

انسانوں کے بنائے ہوئے تصور اجتماع کو مختلف ارتقائی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا، اور رفتہ رفتہ تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے مقصود بنا لیا، اور یہاں پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہے اور آج وطنی قومیت نے اس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط جما لیا ہے کہ اس کی نظر میں انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا، ایک قوم دوسری قوم پر درندوں کی طرح چل پڑتی ہے، اس کے گوشت سے شکم پُر کرتی ہے، اس کی ہڈیوں سے اپنے مستقبل کی فلک بوس عمارت تعمیر کرتی، اور اس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے، غرض اس [illegible]

اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اسکی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت مغلوب ہوتی ہے، وہاں اس کا دامن عدل و انصاف وا ہوتا ہے، اور جہاں فسق و بہیمیت کی وبا پھوٹتی ہے وہاں وہ تقدس و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے غرض خلافت کیا ہے؟ سراپا برکت و خیر، سراسر عدل و انصاف اور یہ ہمہ بود اصلاح و تعمیر کی پیامبر۔

اجتماع انسانی کا قرآنی تصور | ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، کہ انسانی اجتماعیت کا حقیقی مؤقف کیا ہے، اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں، جو انسان کے علاوہ جہان ارض و سما میں ہر لحظہ جاری و ساری ہیں، اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں، لیکن ان کی خارجی اور عملی تشکیل کی ابتدا حضرت آدم کی پیدایش سے ہوتی ہے، جب کہ اُن کو پیدا کرنے کے بعد منصب خلافت سے نوازا گیا یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہونا سلسلۂ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے اور خلافت کا مفہوم ہی اس خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کر رہا ہے، کیونکہ خلافت کا لفظ انسانوں کی سیاسی و تمدنی اور اجتماعی ہیئت وحدانی پر دلالت کرتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہو کہ پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کا شعور ہی موجود نہ تھا، اور وہ پہاڑ کے غاروں میں رہتا اور گھاس پھونس کھا کر گذارا کرتا تھا، قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفۂ فطرت ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اول ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے، اور پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ان کی خارجی تشکیلات بڑھتی پھیلتی اور بدلتی رہی ہیں،

غرض قرآن حکیم کے نزدیک وحدت انسانیت یا اجتماعیت کی اساس ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس اخلاقی نصب العین ہے، جو راہ الیقین سے نزار الوری ہے، اور وہ اس تصور و اجتماع کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کو پہلے دن ہی آگاہ

زمین کی پہنیوں میں اپنے آپ کو گم کردے ؟ حضرت اقبال نے اس ضمن میں کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے

یا وطن اہلِ وطن را نسبتے است ۔۔۔ زانکہ از خاکش طلوع ملتے است

اندرین نسبت اگر داری نظر ۔۔۔ نکتہ بینی ز مو باریک تر

گرچہ از مشرق برآید آفتاب ۔۔۔ با تجلیہائے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوز درون ۔۔۔ تا ز قید شرق و غرب آید برون

بردمد از مشرق خود جلوہ مست ۔۔۔ تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

گرچہ او از روے نسبت خاوری است

مملکت کا جدید تصور | اس نئی وطنی شریعت میں قوم اور مملکت ایک ہی مضمون کے دو عنوان ہیں یعنی جب ایک ملک میں بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ کو مملکت کا نام دیا جاتا ہے، اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے گویا مملکت ہو یا قوم اُس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجود وطنیت کا تصور ہے، اور عہد حاضر میں افراد انسانی کے باہم اشتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ ہو، ایک ملک کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں لیکن اس لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطۂ زمین میں اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہیں، اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ سیاسیہ کو مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ ان میں اتحاد وطن کا رشتہ موجود ہے، اس لئے وہ ایک مستقل اور جداگانہ قوم ہیں، رہا عقیدہ اور مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور اُن کی قومیت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا، گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی درجہ دیتا ہے بلکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ہنگاموں سے دور اور گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہوں

کے ہاتھوں آج انسانیت بستر مرگ پر کراہ رہی ہے،

فکر انسان بت پرستے بت گرے	ہر زمان در جستجوے پیکرے
باز طرح آذری انداختہ است	تازہ تر پروردگارے ساختہ است
کاید از خون ریختن اندر طرب	نام او رنگ است ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند	پیش پاے این بت نا ارجمند

مغرب کی نشأۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ قائم کیا، اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا، تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصور زندگی سے پُر کیا جائے، یعنی کوئی ایسا تصور زندگی ڈھونڈھ نکالا جائے، جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقاء کے لئے ایک قوی تر اور مضبوط تر محرک کا کام دے سکے، لیکن اس کا انسانی ذہن گرد و پیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گذر رہا تھا، ان کے تقاضون نے انسان کو تہذیب حاضر کے نو تراشیدہ بت (ملک و وطن) کے آگے سرنگون کر دیا، یہ زمانہ اٹھارتوین صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، جب کہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ اور مستقل تصور مملکت کی حیثیت سے منظر ظہور پر آئی، اور اس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا، اس وقت سے آج تک وطنیت کا زہرناک تصور اقوام حاضرہ کی سیاست و معیشت کی روح روان ہے اور وطنی قومیتون کی موثر کا مضبوط محرک بنا ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس نے انسانی قدرون کو جس طرح رسوا کیا ہے، اس کی چند مثالین گذشتہ عالمگیر جنگون اور تقسیم ہند کے بعد کی وحشتناکیون مین دیکھی جا سکتی ہین،

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے، اسکے ریگ زارون، بیابانون، کہسارون، دریاؤن اور چمنستانون مین اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے، لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ زمین کے کسی خطہ کو جو محض اسکی رہائش و تمتع کے لئے بنایا گیا ہے، اپنا کعبۂ مقصود بنا لے، آخر انسان کو اسی لئے تو نہین پیدا کیا گیا کہ وہ

پایا تھا کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقوں کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت میں نمودار ہوا، اور اب مغرب کے انقلاب پسندوں نے ایک جدید سیاسی جمہوری اور صنعتی انقلاب بپا کرنے کی ٹھان لی، بیشتر مغربی ممالک میں انقلابی تحریکیں اٹھیں ہنگامے بپا ہوئے، اور عوامی طبقوں اور حکمرانوں میں شدید تصادم رونما ہوا، بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان حکمرانوں کو سرنگوں ہونا پڑا، اور انھوں نے ہٹ ہٹا کر مسندِ اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے، جب کہ مغرب میں جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتیں قائم ہوئیں، اور قدیم ملکی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریوں (تھیوریز) نے جنم لیا، چنانچہ وطنی قومیت اور مملکت کا جدید تصور اسی دور کی پیداوار ہے، مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا، وہ اتنا ہی ہے کہ انھوں نے ملک و وطن کی بنیادوں پر جدید فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر رشتۂ اخوتِ انسانی کو تار تار کر کے رکھ دیا، چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و ایمان بن گیا، اور ان کے جینے مرنے صلح و جنگ اور تمام اعمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد پایا،

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد   زیر گردون رسم لادینی نہاد

یعنی جہاں تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے، اس میں میکیاولی کا تصور ہی کار فرما تھا، چنانچہ عہد جدید کے یورپ میں جو علماء و مفکرین پیدا ہوئے، ان میں سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصورِ مملکت کو سراہا، بلکہ ان کے جدید نظریوں نے اس کو اور زیادہ تقویت دی، اور اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا، چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا، کہ اس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا، یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے یہاں تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے، گویا مملکت کسی چیز کی تابع نہیں ہوا کرتی، تمام چیزیں مملکت کی تابع ہیں،

میں محدود دیکھنا چاہتا ہے، اور جہاں تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے، وہ ایک بااقتدار اور معصوم سیاسی ادارہ ہے جو ہر شرکت غیرے سے مستغنی بھی ہے، اور اخلاقی قدروں کا خالق بھی ہے، اس کو کسی مذہب اور ضابطۂ اخلاق کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ بذات خود ایک دین و مذہب ہے، جس چیز کو یہ صواب کہے وہ صواب اور جس کو وہ خطا کہے وہ خطا ہے۔

دین و سیاست اور مذہب و ریاست کی تفریق جدید تصور قومیت سے بہت پہلے سولہویں صدی میں منصۂ شہود پر آچکی تھی، اور اس کا سہرا مشہور فلسفی میکیاولی کے سر ہے، اس شخص نے سب سے پہلے مملکت کو مذہب و اخلاق کی گرفت سے آزاد کیا، اور بالکل ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی یعنی اس نے بتایا کہ مقصود بالذات مملکت کا عروج و ارتقار اور اس کی خوشحالی ہے، اس راہ میں جو چیز بھی حائل ہو، اس کو مٹا دینا چاہئے خواہ وہ مذہب و اخلاق ہی کیوں نہ ہو، ہاں اگر مذہب و اخلاق سے مملکت کی توسیع اور قوت و اقتدار کے حصول میں مدد مل سکتی ہو تو محض اس غرض کے لئے مذہب کے نام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض ایک فریب کارانہ نقطۂ نظر اور سیاسی حکمت عملی (پولیٹیکل سنٹ) کے طور پر ہی ہونا چاہئے، ورنہ مقصود بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے، بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا جرم اور بڑی سے بڑی بداخلاقی بھی عین ثواب ہے، جب کہ اس سے مملکت کو کوئی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو، اور جہاں کسی اخلاقی مقصد کی خاطر مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں یہ اخلاقی مقصد اس کے نزدیک ناقابل معافی گناہ ہے۔

مغرب کی تاریک فضا میں جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی کارستانیوں، غرض پرستیوں اور اوہام طرازیوں سے سخت نالاں تھے، اور کلیسا و شاہی کے باہمی تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے، انھوں نے میکیاولی کے اس نئے دین کو بہت آسانی سے قبول کر لیا، بالخصوص وقت کے بادشاہوں نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، اور کلیسا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا، مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے

نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استحصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ مین ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب سرمایہ دارسے لڑین گے، تو اس جنگ مین جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہین،

غرض زمانۂ حال کا جدید تصور مملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر سے ترکیب پاتا ہے ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہین، وہ اُن کو غلش و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس اتھاہ سمندر کی پہنایون کی طرف لئے جارہا ہے جہان سے اُن کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہین ہے،

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہان ہمہ گیر اصول انسانیت اور آفاق گیر اقدار حیات کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہان احترام آدمیت کا معصوم جذبہ قطعی ناپید ہو، جہان ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزارون ناکردہ گناہ انسانون کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جارہی ہو، جہان وحشت و درندگی کو قابل فخر کارنامہ، اور معصوم بچون، ضعیفون اور عورتون تک کو انتہائی بے دردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو، کیا وہان انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسر آسکتا ہے ؟

بس یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزون غلش اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانون کی وحشت و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنادیا ہے کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوت انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہین ہے،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور انھون
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ	نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ	نہین کیا، اُن کے لئے ہی امن

ہیگل کے تصورِ مملکت نے مذہب، اخلاق کی روحانی برتری پر چوٹ لگائی تھی، وہی کیا کم تھی کہ ڈارون کے نظریۂ کائنات نے اس کے جسدِ نیم جان پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب خدا کا تصور محض عجوبہ روزگار یا دگار بن کے رہ گیا، اور اس کے بعد اس جدید ملکی تصور نے ہمہ گیر نوعیت اختیار کرلی، چنانچہ کارل مارکس اور اینجلز جو دنیائے جدید کے خالق مانے جاتے ہیں، ہیگل اور ڈارون کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی یعنی مارکس کا نظریۂ تاریخ دراصل ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا غماز ہے، اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگل کی جدلیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے، لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمام تر دوسروں کے دماغی کارناموں سے استفادہ کرکے ایک عجیب غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور کیا جاتا ہے، اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا بھکاری ہے۔

بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر بھی وہی ہے جس کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی تھی، لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے اور خدا و مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا، چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مذہب و خدا کا تصور محض ایک فریب ہے، سرمایہ دارانہ ذہن کی اُپج ہے جس کو عوامی طبقوں کی دولت و عزت کا شکار کرنے کے لئے بطور ہتھکنڈے کے استعمال کیا جاتا رہا ہے، اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہر لمحہ بدلنے والی چیز خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار اُن کے نزدیک یہ ہے کہ جو چیز اشتراکی ریاست و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو، وہ خیر اور صواب ہے، اور جو اسکی تخریب و فساد پر منتج ہو وہ شر اور خطا ہے،

لینن کہتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظامِ اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطر ت قوت کا بنایا ہوا ہو، اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظامِ فکر و اخلاق سراسر فریب ہے،

مولینا عبدالملک بنانی محدّث

از

ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی

مولینا سید سلیمان صاحب ندوی نے عرصہ ہوا ہندوستان کے محدثین کرام کے تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن چند کڑیوں کے بعد یہ اہم سلسلہ کسی وجہ سے جاری نہ رکھا جا سکا، اس کے بعد معارف مین ہندوستان کے محدثین پر چند اور مضامین شائع ہوئے، ذیل کی سطرین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہین،

ہندوستان مین گجرات وہ خوش قسمت صوبہ ہے جہان علم حدیث کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی، عام طور سے ہندوستان مین علم حدیث کی اشاعت کی ابتدا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، حضرت موصوف کی جلالت شان اور حدیث نبوی کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ہندوستان مین یہ علم شریف پہلے پہل صوبۂ گجرات مین اشاعت پذیر ہوا، چنانچہ علامہ سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی (متوفی ۹۲۹ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بحرق (متوفی ۹۳۰ھ) شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے دو شاگرد شیخ عبدالمعطی بن الحسن باکثیر المکی (متوفی ۹۸۲ھ) اور شیخ شہاب الدین احمد العباسی المصری (متوفی ۹۹۲ھ) علامہ ابن حجر کے دو شاگرد شیخ محمد ابن عبداللہ الفاکہی الحنبلی اور شیخ سعید شافعی اور دیگر کئی محدثین کرام نے صوبۂ گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، اور احمد آباد مین مدارس کھولے، اس کے علاوہ خود گجرات کے بے شمار علماء کو احادیث نبویہ کا بڑا ذوق تھا، حضرات صوفیہ نے اس کی تحصیل مین والہانہ انہماک کا ثبوت دیا، اور دربار کے اعلیٰ

مُهْتَدُوْنَ ۰ کی زندگی ہے، اور وہی لوگ ہدایت

(الانعام) پانے والے ہیں،

ان ہمہ گیر اصولِ انسانیت کے سوا جو کچھ ہے، وہ ظن و تخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے، اور اس

کارحیات کی الجھنیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائیں گی، ؎

ع :- راہبر ہو ظن و تخمین تو زبون کارحیات

جب مشہور مصری عالم شیخ بدرالدین دمامینی احمد آباد مین قیام پذیر تھے، اس وقت ان مین اور شیخ منہاج مین چند نحوی مسلون کے متعلق بحث چھڑ گئی اور دمامینی کو اُن کے رد مین ایک کتاب الفتح الربانی فی الرد علی البنبانی لکھنی پڑی، اُن کی تصانیف کی تعداد ۰۰ سے متجاوز تھی، لیکن حدیث کی تالیفات مین سے صرف بخاری اور مسلم کی شرحون کے نام ہم تک پہنچے ہین،

شیخ فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی کا ذکر گذر چکا ہو گا کہ مجمع النوادر سے اکثر حالات ماخوذ ہین، شیخ فیض اللہ گجرات کے مشہور سلطان محمود بیگڑے (۸۶۳ ۔ ۹۱۷ھ) کے خزانچی تھے، شیخ نے قرآن مجید کی تفسیر دستور الحفاظ اسی سلطان کے نام سے معنون کی ہے،

اس کے علاوہ اُن کی تاریخ صدر جہان[۱] اور مجمع النوادر[۲] نہایت مفید تصانیف ہین، اتفاق سے یہ تینون نوادر دست بُرد زمانہ کے ہاتھون برباد ہونے سے بچ گئے ہین،

اسی خاندان کی ایک مایۂ ناز ہستی شیخ عبد العزیز المعروف بہ عبد الملک بنبانی ہے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت عبد اللہ بن عباس سے ملتا ہے جس کی چند کڑیان حسب ذیل ہین،

شیخ عبد الملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیر الدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ عیسیٰ بن شیخ حسن بن شیخ الیاس،

شیخ عبد الملک زین البلاد احمد آباد مین پیدا ہوئے، اور وہین ۹۷۰ھ کے قریب انتقال فرمایا، خاندان کے اور بزرگون کی طرح شیخ عبد الملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالبًا اُنہی کی خانقاہ مین تعلیم پائی ہو گی، حدیث اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین بنبانی سے پڑھی جن کو

---

[۱] مختصر نوٹ کے لئے دیکھو روئداد کل ہند تاریخ کانفرنس اجلاس بمبئی گجرات کی چند تاریخی کتابون کی تعیین

[۲] اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے ایک پر مغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو لاہور کے اورنٹیل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۹ء مین شائع ہوا ہے،

عہدہ داروں نے اس علم شریف کے حصول کے لئے بوریا نشینوں کا تلمذ اپنے لئے باعث نجات سمجھا علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے ایک نبیانیوں کا خاندان ہے، اس خاندان نے بہت سے علماء پیدا کئے، جو آسمانِ علم کے درخشاں ستارے ثابت ہوئے، اور افتا و قضائے جلیل القدر مناصب پشتوں تک اُن کے خاندان میں رہے، اور اس خاندان کے باکمال وزراء نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا، بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی، علماء کی قدردانی صلحاء و اتقیاء سے عقیدت و نیازمندی اور اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا، نبیانیوں کی اصل کے متعلق جمعات شاہیہ جلد چہارم (قلمی) میں اس طرح لکھا ہے:۔

"نبان ولایتی ست مابین خراسان و ملتان و این جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ نبیانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از حضرت عبداللہ بن عباس اند"

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس خاندان کے بزرگوں نے کس زمانہ سے گجرات میں سکونت اختیار کی لیکن اس کے علماء میں شیخ صدر الدین کا زمانہ سب سے مقدم معلوم ہوتا ہے، شیخ صدر الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کو انھوں نے شاہانِ گجرات کے نام سے معنون کیا، شیخ مذکور کو عربی ادب اور صرف و نحو سے خاص لگاؤ تھا،

قصیدۂ البردہ، قصیدہ کعب ابن زہیر قصیدہ لامیہ (قاضی عبد المقتدر) وغیرہ پر انھوں نے حواشی لکھے ہیں، نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی انہی کی ہے، ہندوستان میں غالباً اس کتاب کی سب سے پہلی شرح یہی ہے، شیخ نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام تفسیر بحر المعانی رکھا، وہ غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بقید حیات تھے،

شیخ منہاج الدین نبیانی غالباً شیخ صدر الدین کے بیٹے تھے، انھیں علم حدیث تصوف اور صرف و نحو سے بہت دلچسپی تھی، علم النحو میں اُن کے مرتبہ کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

کے کتب خانہ میں موجود ہے، چونکہ سلسلۂ اسناد میں زیادہ تر نام ہی ہیں، اس لئے ہم عربی متن کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں،

صحیح بخاری | انہ یروی من الشیخ محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز عن شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمد الھاشمی عن قاضی القضاۃ محب الدین محمد بن محمد بن محمد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شہاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعمۃ بن حسن بن علی بن بیان بن شحمۃ الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبد اللہ الحسین بن المبارک بن محمد بن یحیی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسی بن شعیب بن اسحاق بن ابراھیم الصوفی السجزی ثم الہروی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفر بن محمد بن داؤد بن احمد بن معاذ بن اسھل بن الحکم الداؤدی عن ابی محمد عبد اللہ بن احمد بن حمویہ بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبد اللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر بن ابراھیم البخاری الفربری عن محمد بن اسمعیل البخاری رحمھم اللہ۔

صحیح مسلم | انہ یروی من محمد المدعو بجار اللہ عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانہ یروی عن محمد بن ابی السعادۃ الحامی قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن محمد بن اسحق بن مندۃ الاصفھانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد اللہ الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد اللہ التمیمی قال اخبرا الامام ابو الحسین مسلم رحمہ اللہ،

مشہور مصری عالم شیخ شمس الدین سخاوی سے سند حاصل تھی، حدیث مین مولانا عبد الملک کے ممتاز شاگردون مین مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، شیخ عبد الملک نے تفسیر و حدیث مین کمال حاصل کیا، اور استاذ زمانہ کے رتبۂ عالی پر فائز ہوئے، انھین صحیح بخاری ازبر تھی، ہمیشہ مسجد اور حجرے مین ورد اوراد مین مشغول رہتے، توکل اور تجرید مین آپ کی مثال نہ تھی تمام علوم کا زبانی درس دیا کرتے تھے' افسوس ہے کہ مولانا جیسے باکمال محدث کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہین، اُن کے ایک فرزند شیخ عبد اللطیف (متوفی ۹۱۰ھ) نے مشارق الانوار کی شرح مبارق الازھار لکھی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی صاحب سید نور الدین احمد حسین کے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھا[1] شیخ خلیل محمد عباسی شیخ عبد اللطیف کے صاحبزادے ہین' والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریون کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید محمد مقبول عالم[2] انہی سے روایت کرتے ہین، چنانچہ علامہ نور الدین (متوفی ۱۱۵۵ھ) نور القاری فی شرح البخاری مین فرماتے ہین :-

" وبہ قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی والدی عبد اللطیف حدثنی والدی عبد الملک حدثنی محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ" الخ

ذیل مین ہم شیخ عبد الملک بنانی محدث گجراتی کی اسناد حدیث پیش کرتے ہین، یہ اسناد شیخ رشید الدین چشتی کی کتاب مخبر الاولیاء سے لی گئی ہین، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی

---

[1] ہم قاضی سید نور الدین صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہین، انھون نے ازراہ کرم مبارق الازہار اور نور القاری کے چند اقتباسات نقل کرکے ارسال فرمائے

[2] مختصر ترجمہ کے لئے دیکھو مرأت احمدی خاتمہ ص ۲۰، طبع بمبئی،

ابراہیم بن محمد الدمشقی المؤذن سماعاً قال اخبرنا مسند الدنیا شہاب ابوالعباس احمد بن ابی طالب، قال أخبرنا ابوطالب عبدُاللطیف بن محمد قال اخبرنی ابوذرعہ طاہر بن محمد بن طاہر المقدسی سماعاً قال اخبرنا محمد عبد الرحمٰن سماعاً قال أخبرنا ابوالنصر احمد بن الحسین بن محمد الدینوری قال حدثنی ابو بکر احمد بن محمد بن اسحٰق السنی قال حدثنی ابوعبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی،

سنن ابن ماجہ | انہ یروی محمد المدعو بجار الله عن والدہ عزالدین عبد العزیز قال أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدین محمد علوی المکی وقاضی القضاۃ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر اذناً قال البرہان ابراہیم بن صدیق الدمشقی سماعاً، قال اخبرنا مسند الدنیا ابوالعباس احمد بن ابی طالب الصالحی اذناً قال اخبرنا ابو محمد عبد اللطیف بن محمد بن علی قال اخبرنا ابو منصور محمد بن الحسین القزوینی سماعاً قال اخبرنا ابو طلحہ القاسم بن المنذر الخطیب قال اخبرنا ابوالحسن علی بن ابراہیم بن العطار قال اخبرنا الامام ابوعبد الله محمد بن یزید القزوینی المعروف بابن ماجہ۔

موطا امام مالک | یرویہ بن محمد المدعو بجار الله عن والدہ عزالدین عبد العزیز عن شہاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر قال اخبرنا العلامہ برہان ابراہیم بن احمد بن الواحد قال أخبرنا المسند ابوعبد الله محمد بن جابر بن محمد بن القاسم وادی آشی تونسی قال اخبرنا ابو محمد ...... عبد الله بن ہارون القرطبی الطائی سماعاً قال اخبرنا القاضی ابوالقاسم

سنن ابی داؤد | انہ یروی من محمد الصد عو بجار اللہ قال اخبرنی والدی عز الدین عبد العزیز سماعًا قال اخبرنا ابو العباس بن ابی بکر الواسطی و ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن کامل الترمذی عن ... ابی الفتح محمد بن محمد العندری قال اخبرنا ابو الفضل عبد الرحمن بن یوسف بن یحیٰی الموصلی سماعًا قال اخبرنا ابو الفتح المفلح الدین بن احمد الدومی و ابو النصر ابراھیم بن محمد الکرخی سماعًا عن المسند ابی طاھر محمد بن محمد بن عبد اللطیف قال انبأتنا ام عبد زینب ابنۃ احمد بن عبد الرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب قال حدثنی الحافظ ابو طاھر احمد بن محمد السلفی اذنًا قال کتب ابو جعفر العبادانی من [illegible] اخبرنی القاضی ابو عمر القاسم بن جعفر بن عبد الواحد الھاشمی قال اخبرنا ابو علی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال اخبرنا الامام ابو داؤد السجستانی رحمھم اللہ تعالیٰ

سنن الترمذی | انہ یروی من الشیخ محمد الصد عو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز قال اخبرنی شیخ الحنفیہ ... بن الدین یحیٰی بن محمد القاھری قال اخبرتنا الاصلیۃ ام محمد سارۃ ابنۃ عمر الحسوی قال انبأنا الصلاح عمر بن الحسین المراغی قال اخبرنا الفخر ابو الحسن علی بن احمد البخاری المقدسی قال اخبرنا ابو الفتح عبد الملک بن عبد اللہ الکرخی سماعًا قال اخبرنا ابو عامر محمود بن قاسم الازدی قال اخبرنا ابو العباس احمد بن محمد بن احمد بن محبوب المحبوبی قال اخبرنا الامام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمھم اللہ،

سنن نسائی | انہ یروی من محمد الصد عوا بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز قال اخبرنا الحافظ تقی الدین محمد بن علوی المالکی اذنًا قال اخبرنا قاضی القضاۃ ابن زین الدین ابی بکر بن الحسین المراغی المدنی قال اخبرنا المسند برھان الدین

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

(بسلسلہ ماہ مئی سنہ ۳۰ء)

فارسٹر نے جس کتبہ میں اپنے زورِ تحریف سے حضرت ہودؑ کا نام پڑھکر اس مین نصرانیت کے جراثیم دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کا چربہ دیکھئے،

احمد بن زید بن عبد الرحمن بن تقی قال اخبرنا ابو عبد اللہ بن فرخ الفقیہ
مولی محمد بن الطلاع قال اخبرنا ابو ولید یونس بن عبد اللہ بن مغیث
عن ابی عیسیٰ یحییٰ بن عبد اللہ عن ابیہ عبید اللہ بن یحییٰ عن ابیہ الامام
یحییٰ بن یحییٰ للیثی عن الامام مالک،

وَمنقل.. کِـتِّ صِن.. وَذِہْ..
وَکَلَّ ذکِ

وذُ نوش رضَا حَبشَنا. بشِرِی

وشہٰ ذ شٰن وَذَرَق تنوٗ، ذکرُ ذِ وَحِمیَرُ ما کَھَرَلَ،

وَملکُ وَحِمیَرِ مَا.. شُقّ.. لہ.. وشح مرنو.. شَرَحَ ذَو.. رخث..

وَنَخلُ تَنوُذُ وشر ذ.. یا..

ستا د شـتو وخرق تحر،

اس کو نظم کی صورت مین لکھنے کی غرض سے ہم نے سطر سطر کا اتباع نہین کیا، اصل کتبہ کی سطر جس لفظ سے شروع ہوتی ہے، اس پر نمبر لگا دیا گیا ہے، قرأت مین کوئی نقش محذوف نہین ہے، تشدید، تنوین اور تطویل حرکت کے علاوہ کوئی حرف زائد نہین ہے، فادستر اور وینڈ جہ دونون کی قرأت کے برخلاف یہ قرأت حذف و اضافہ سے پاک ہے،

وزن و قافیہ | یہ نظم ۲۸ مصرعون کا مجموعہ ہے جن مین سے ۲۰ مصرعے تو فعولن فعولن فعولن فعو کے وزن پر ہین، اکیسوان مصرعہ فعولن فعو کے وزن پر ہے، یہ حیرتناک امر ہے، قوافی کا عجب انداز ہے،

مصرعہ نمبر ۱ و نمبر ۲ مصرعہ نمبر ۳ و نمبر ۴ مصرعہ نمبر ۷ و نمبر ۹ مصرعہ نمبر ۱۸ و نمبر ۱۹ و نمبر ۲۰ مصرعہ نمبر ۲۵ و نمبر ۲۶	ہم قافیہ ہین، باقی مصرعون مین قافیہ کی پابندی نہین کی گئی ہے،

زبان کتبہ | اس کتبہ کے اکثر الفاظ متداول عربی کی کتب لغت مین ملین گے، اس لئے زبان کتبہ

میری قرأت کے مطابق یہ ایک نظم[1] ہے جو حسب ذیل ہے،

سمیق . السمس ... وذ یمن ...

وشرح ذاکلہ یکملا .

اکرذ ذوی .. قراذ نذل ل

حبت بحرخمسیل ھتاکن

نو .. ذیت شنیہ .. لدن ما ... مثلنہ ... قنا .. حب ما .. یمن ..

یسر ما .. برذع .. مکر ذما ...

قھتا .. ذرشینا .. یلل ذو ..

لیمنی .. یصذع .. لذحمی ..

یذ .. ینا .. کرذنا .. رمیتا ..

لرذنا .. قذلنا .. شرلیا .. ذنی ولمحر .. شش .. ذحمر .. و .. خلتا .

شلھنا .. سلقنا .. ذیقیہ ..

رنحما .. رکفنا .. مطلن نا

سکاکلنا .. زکرذا .. کذ .. را ..

مھرلوس یذنون نصقاسطن .

وذنامرزنذ نوذرنامر ..

یتوکث .. ذلا . ولنشیہ ..

وخلقہ .. ومسللتہ ..

---

[1] اسے نظم کی صورت دیکر پڑھنے میں کاتب حروف اپنے محترم دوست مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مشوروں کا ممنون ہے،

(۵) نسقا سطر = نسقا سطر = قاف کے پہلے کی سین عموماً صاد سے بدل جاتی ہے، تاج العروس مین ہو کہ ابن عباد نے کہا

"نسقان فلک کے قریب دو ستارے ہین، ایک یمانی ہے، ایک شامی (ن س ق) فلکہ چند دائرہ نما تارے ہین، سماک رامح کے پیچھے بنات النعش کے سامنے جن کو بچے قصعۃ المساکین کہتے ہین (ق ک ک)"

لفظ نسقا کی سطر کی طرف اضافت بتاتی ہے، سطر سے مراد ستارون کی وہ جھرمٹ مراد ہے جن مین نسقان واقع ہین،

(۶) ذکی = ذکی، ذہین، تیز فہم،

ذیل کے الفاظ کا ترجمہ عبرانی لغت کی مدد سے کیا گیا ہے

(۷) کلہ = تباہ کاری

(۸) کزر = سخت دلی

(۹) ثلہنا = ہم نے نکال دیا،

(۱۰) نحل = فرمان روا ہوا،

(۱۱) کستہ = عرش

ذیل کے الفاظ نہ عربی لغت مین ملے، نہ عبرانی لغت مین، مگر اُن کے مطالب قرینہ سے معلوم ہوتے ہین

(۱۲) اکر = ذوی کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ لفظ نباتات سے متعلق ہے، مواکرت کے معنی ہین مزارعت، اکر بمعنی زراعت،

(۱۳) ہتاکل = اکال وصول کیا، عربی مین اس چیز کو اکال کہتے تھے، جو امرار اور حکام کو رعایا سے ملتا تھا، عربی افتعل عبرانی مین انفعل اور ہتفعل ہو،

عربی سمجھنا چاہئے، عبارت کو متداول عربی کے قواعد پر ڈھال کے ہم نے پڑھا ہے، مگر چند مقامات پر عربی نحو کے خلاف جانا پڑا،

(۱) نوین مصرعہ مین لیمنا اور لن حما کے الفاظ مین عربی قاعدہ سے لیمن اور لن حمی ہونا چاہئے، عربی کی نحو سے تطبیق کی غرض سے ہم نے ان دونون لفظون کے آخری الفون کو ی سے لکھا، عربی مین ایسے الفاظ کی بکثرت مثالین ہین،

(۲) گیارھوین مصرعہ مین ثمر لیا کا لفظ ہے، جسے قاعدہ سے ثمر لئے ہونا چاہئے لیکن ہمدانی نے اکلیل مین لکھا ہے کہ اہل حمیر خذ بعیریک کی جگہ خذ بعیراک کہتے تھے،

(۳) مصرعہ دوم مین عربی قاعدہ سے اکملا نہین تو یکلان ہونا چاہئے، مگر ضرورت شعری یا زمانہ کتبہ کے جواز نے اسے یکلا کر دیا،

لغات | کتبہ کے اکثر الفاظ لغت کی متداول کتابون مین ملتے ہین جن الفاظ کو عام ناظرین باسانی تلاش کر سکتے ہین، اُن کو چھوڑ کر باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے،

مکرذما، ذحمی، ذحم، ذنی، نیذ نون اور شمر ذ مین ذال کو دال بنا دینے پر یہ الفاظ لغت مین مل جائین گے، وذہ کو ودہ پڑھکر استیدہ کا مرادف قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح ذیل کے الفاظ کو بھی ذرا تغیر کے ساتھ ناظرین لغت مین پا سکتے ہین،

۱- حَیت = حوت (منڈلانا) سے فعل کے وزن پر

۲- ذبیت شنہ = ذات سنتہ

۳- یصندء = یصادی (مقابلہ کرتا ہے)

۴- ینَاءَ = دنی (عربی کی مثال داوی عبری مین مثال یائی ہوتا ہے اور ہمزہ آخر بکثرت ی سے بدل جاتا ہے)

یسار (آفیتن ڈھانے لگا یکجا کر کے

قلعہ سینا کے نہات کو۔ یالل دو

یمن کی طرف سے مقابلہ کرنے لگا، مدافعت سے

ایک بازو عاجز ہو گیا، ہماری سنگ دلی بڑھ گئی

اپنی سنگ اندازی سے کمینہ کی پشت سر ہم نے زخمی کر دی، شاس اور حاکہ کے باشندہ نے

مدافعت کی،

ہم نے نکال دیا، اذیت دی، ذو یقۃ

ریاح کو ہم نے لاتین مار کر اپنے دیار سے بھگا دیا

ہمارے دشمن ہماری کے تھیلے بن گئے ایسا دیکھ کر

بہادر سرہ فکہ کے دونوں ستاروں تک پہنچے

اور زندنوذ کے مغنی نے ترانہ گایا،

... یہ شخص اور اپنی وُرّہ بازی

اور طور طریقہ اور شمشیر بازی

اور صین کی حکومت کے نکل جانے سے مغلوب ہو گیا،

اور عاجز ہو گیا تیز فہم

اور ذو نوش نے حبش کو راضی کیا، وہ خدمت گار بن گئے،

اور صورت بگڑ گئی، بدحال کرنے والے کی اور نیزے مارنے کر ذ کے تنوذ نے اور حمیر... جیسا ہو گیا،

اور بادشاہ اور حمیر کو اس کا دکھ ہوا

وشیع سخت اور ذو شرح کمزور ہو گیا

۱۴- ذرز = غالباً ایرانی دز (قلعہ)

۱۵- لرونا = غالباً لرونیا (ہماری سنگ اندازی سے)

۱۶- شرلیا = سابق لفظ قذلن بتاتا ہے کہ یہ قذالین کا مرادف ہے، پشت سر کے یمینی یسا کو قذالین کہتے ہیں،

۱۷- نطلق = م = من
طلن = دیار } محض قیاساً

۱۸- سکاکل = دشمن محض قیاساً

۱۹- یتوکت = ؟؟؟

۲۰- شسی = خادم بن گیا، (مصری "حرشسو" کا ترجمہ کیا جاتا ہے ، اتباع حور)

۲۱- ہرل = ؟؟؟

۲۲- ستام = غالباً مجرم

ترجمۂ نظم: ان الفاظ کے علاوہ اور جتنے الفاظ ہیں، یا تو اسماء و القاب ہیں یا ذرا سی توجہ پر ناظرین ان کو کتب لغت میں تلاش کر لیں گے، اس لئے اب ترجمہ بہ یہ ناظرین کیا جاتا ہے،

سمیق نے بنیاد ڈالی اور ذو یمین نے،

اور ذو شرح نے تباہ کاری کی حد کر دی

کھیتی مرجھا گئی اور گاؤن کا ذن بن گیا کینہ

منڈلانے والا گدھ سیل محصول لینے کو

ارادہ کیا اوس نے ایک بھولی بھالی کا پانی کے پاس، اس کی ناک اور کان کاٹ لئے ہمارے آقا کے دشمنوں نے، کیا... خوب ہے یمن کا پانی،

سے ایک قصاص شاعر ایک تبع کی زبان سے یون ذکر کرتا ہے کہ

وعلی بنی حام غدوت بطوة بالصین حتی بد دوا تبدید

صین مین بنو حام پر مین نے حملہ کیا، اور اُن کو پراگندہ کر دیا، زبور مین ارض حام مصر کا نام ہے

توراۃ مین حام کو مصر و کنعان اور کوش و فوط کا مورث بتایا گیا ہے، اس کتبہ کے اندر صین کے نام سے اسی

علاقہ بنو حام کا ذکر ہے جو طور و مصر کے درمیان ہو، اس کتبہ کے مطابق اس کے اندر مذکور واقعہ سے پہلے

تک صین پر ملوک یمن کی حکومت تھی، مگر انہی دنون وہ وہان سے محروم اور بے دخل ہوگئے۔

شیا | مراد سینا طور سے مشرق کا علاقہ

حاکہ | معجم البلدان مین ہے کہ حاکہ بلاد عذرہ کی ایک وادی کا نام ہے، بنو عذرہ کی شان مین

نابغہ نے کہا،

عظام اللھی ابناء عذرۃ انھم لھامیم یستلھونھا فی الحناجر

ھم منعوا وادی القری من عدوھم بجمع شدید للعدو والمکابر

(یعنی)

"بنو عذرہ بڑے کھاؤ بیر ہین، انھون نے اپنے دشمن سے وادی القریٰ کی حفاظت کی تھی"

"بلاد عذرہ وادی القریٰ مین تھے، اس لئے حاکہ بھی وادی القریٰ کے اندر واقع تھا"

شش | شش سے مراد ایک مقام شاس ہے، "ابن موسیٰ نے کہا کہ یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک

راستہ کا نام ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کو چلے، تو شاس کی راہ چھوڑ کر مرحب کی

راہ سے چلے (معجم البلدان)

ین | مدینہ منورہ سے ایک برید کے فاصلہ پر صاحک اور صویحک نام دو پہاڑون کے درمیان ایک وادی

کا نام یین ہے، حضرت اہبان الاسلمی یہین کے باشندہ تھے، یہان بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم رہتی تھی

اور تنوذ حاکم ہوا، اور خدا نے پراگندہ کیا،

بدزبانی کے مجرم کو اور پاش پاش کر دیا، ۔۔ ختم

اماکن | اس نظم میں نام اماکن کے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

صین | عربی روایات میں کئی کہانیاں ہیں جن میں تبابعۂ یمن کو صین پر حکمران بتایا گیا ہے، ان تبابعہ میں سے ایک شمر الصباح تھا، جس کی بابت شاعر کہتا ہے کہ

من بعد ملک الصین اصبح هالکا

اکرم به من هالک محتاج

عام طور پر اس صین کو چین کا معرب سمجھا جاتا ہے، بعض کہانیاں بھی اس کی تائید کرتی ہیں، مگر ایک صین وہ ہے جس کی بابت شمردل بن شریک نے کہا،

حیث یقال للرّیاح اسفین	ہواؤں کو بہنے کا حکم ہوتا ہے، تو زور
ہوج یصبحن فلا ینبین،	زور سے بہنے لگتی ہیں، اور ہر سمت بہنے
و کل وجہہ للسری لیسرین	لگتی ہیں، یبرین اور حضرموت سے چل
بلغن اقصی الرمل من یبرین	کر ریگ زار کی حد اور صین تک
وحضرموت و بلغن الصین	پہونچتی ہیں،

(جزیرۃ العرب ھمدانی ص۳۰۲)

ان اشعار کے صین کو بھی چین ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن شاعر صریحاً اس ہوا کا ذکر کرتا ہے، جو یبرین اور حضرموت سے شمال کو روانہ ہوتی، اور ریگ زار عرب کی آخری حد اور صین تک پہنچ جاتی ہے، اب توراۃ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کوہ طور کے مشرق میں جو علاقہ ہے، توراۃ میں اس کا نام سینی (عربی سینا) ہے اور اس کے مغرب میں مصر سے ملا ہوا جو علاقہ ہے اس کا نام دشت سین ہے، اسی سین کا صین کے نام

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کے عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو آج کل ہمارے جمہوریۂ ہند کے صدر ہین، ۱۹۴۷ء عیسوی مین ایک کتاب "India Divided" لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب تک اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہین، اس کے ابتدائی حصہ مین ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کی مذہبی سیاسی اور علمی رواداری پر بھی تبصرہ ہے، جس کے خاص خاص حصے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہین، آج جب کہ ایک خاص حلقہ مین یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت بہت ہی جابرانہ اور متعصبانہ تھی، ذیل کی تحریر پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی باتین عدم واقفیت اور محض تعصب کا نتیجہ ہین،

ڈاکٹر راجندر پرشاد رقمطراز ہین :-

"عملی طور پر ایسی بہت سی مثالین ملین گی کہ مسلمان بادشاہون نے مندرون اور مٹھون کیلئے جائدادین وقف کین، اور عبادت گذار اور صاحب علم و کمال پنڈتون کو جاگیرین دین، یہ بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہون نے ہندوؤن کے کتنے مندرون اور عبادت گاہون کو منہدم کیا، لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیرون کی فہرست تیار کر دے، جو مسلمان حکمرانون

سیرت ابن ہشام میں دونوں کا ذکر آیا ہے، غزوۂ بدر کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تربان، ملل، عمیس الحمام اور مرین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے اور غزوۂ بنو لحیان کے سفر میں غراب جبل مخیض، البتراء پھر یین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے،

یمنی | یمن کے مقام میں سیلن نام ایک سرکاری محصل کی توہین کی گئی، یسار نام ایک حاکم معات کی فوج نے کرب سینا سے انتقام کو چلا جس کا مقابلہ حاکہ اور شاس والون نے کیا، یمن کی طرف سے ذوبابیل نے یمن پر چڑھائی کی، اس لئے سینا، حاکہ اور شاس کے ساتھ کتبہ میں یمن کا ذکر بھی آیا ہے،

حبش | اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمن والے غالب رہے، یسار اور ذوبابیل کی فوجون نے شکست کھائی، مجبوراً ذو نوش نے جو غالباً ان دونون یمن کا بادشاہ ہوگا، اہل حبش کو خوشامد کرکے اپنی فوج میں داخل کیا، اس حیثیت سے کتبہ کے اندر حبش کا ذکر آیا ہے، (باقی)

حیدرآباد نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کی ہے بعض مسلمانوں نے ہندو متولی کو علٰحدہ کرنا چاہا، مگر نظام نے نہیں ہونے دیا، حیدرآباد شہر کے اندر سیتارام کا ایک مندر ہے ایک اور مندر ماہور (عادل آباد) میں ہے ان دونوں مندروں کے لئے حکومتِ نظام کی طرف سے جائداد وقف ہے جس کی سالانہ آمدنی پچاس ساٹھ ہزار ہے، ناندیر میں سکھوں کے ایک گردوارے کے لئے بھی نظام نے ایک جاگیر عطا کی ہے، جسکی سالانہ آمدنی بیس ہزار ہے،

۱۱۶۶ھ میں احمد شاہ بہادر غازی نے ایک سند عطا کی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

ضلع اکبرآباد کے قصبہ اجنیرا کے زمینداروں اور کاشتکاروں کو معلوم ہو کہ شتیل داس بیراگی کو بینارتھ کے طور پر شری ٹھاکر جی کے بھوگ اور نذر کے لئے سترہ بگھے کھیت کی معافی دیجاتی ہے تاکہ اُن کی آمدنی سے شری ٹھاکر جی کے اخراجات پورے ہوسکیں اور پوجا پاٹ ہوتا رہے، اجنیرا کے بازار کے چودھری کو معلوم ہو کہ وہ شری ٹھاکر جی کے لئے بیس سیر غلہ ادا کرے، بیراگی کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے، تاریخ ۳ رمضان ۱۱۶۹ھ ف

ایک اور سند شہاب الدین خان کی ہے جو اُس نے چنچواد کے مشہور گنیش مندر کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی اس سند کے لئے قول نامہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے:۔

"یہ قول نامہ چنچواد کے سدریہ گوشائین کے لئے پرگنہ پونا کے بارہ میں ہے جس کے لئے خان حکمت نہاد خان نے اطلاع دے کر جاگیر کے ایک قول کی درخواست کی ہے، اس لئے یہ تحریر دیجاتی ہے کہ وہ اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ رہے، اور اسکی زمین کو زرخیز اور بہتر بنائے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچے، لکھا فی پڑھٹی اس تولیت نامہ کی تاریخ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۲۲ھ ہے"،

الٰہ آباد میں اسی طرح کے دو فرامین ہیں، ایک مشہور مندر سمیشور ناتھ کے پجاریوں کے نام ہے جسکو اورنگزیب نے ... کیا تھا

کی طرف سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو دی گئی ہیں، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہوں نے برہمنوں کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپیے ہے، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اُس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے مہنت لال گیر گوسٹی پورتارا ڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے، یہ اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو دی تھی، جو زہد و فضل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیریں وقف کیں، ان جاگیروں کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، شیر شاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ میں مقبول تھا، کشمیر کا حکمران سلطان زین العابدین امرنا تھ اور شاردا دیوی کے مندروں میں گیا، تو وہاں کے زائرین کے آرام و آسایش کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ۱۸۰۷ء میں سردار نجیب آباد کے پٹھانوں کے زیر نگین تھا، نجیب آباد کے نواب نے ہردوار کے جاتریوں کے لئے بڑے بڑے مکانات بنوائے، جو آج تک موجود اور ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں،

عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان رائے خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے کہ "دیپالپور میں جو کالانور کے پاس واقع ہے شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اُن سے بڑی عقیدت تھی لیکن ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر اُن کے مزار کا متولی بنایا، چند سال کے بعد کچھ مسلمانوں نے شورش کر کے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کر دینا چاہا، لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جا رہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

حیدرآباد دکن میں ایک مشہور درگاہ کی تولیت کا سلسلہ ایک برہمن خاندان میں چلا آتا ہے، نظام

پر مامور کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب عطا کرتے تھے" اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوؤن کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم کو ادا کرنے میں بالکل آزاد تھے اور مسلمان ہندوؤن کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے،

سر الفرڈ لائل ایشیاٹک اسٹڈیز میں رقمطراز ہیں کہ مسلمان حکمران ہندوستان کو اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے تخیل سے اتنے دور تھے کہ کبھی مسلمانون نے بھی اسکی کوشش نہیں کی کہ ملکی نظم و نسق کے بڑے بڑے عہدے صرف مسلمانون ہی کے لئے مخصوص رہیں،

اورنگزیب نے بہت سے لائق ہندوؤن کی ملازمت کے لئے شاہجہان کے پاس سفارش لکھی ایک دیوان کی جگہ خالی ہوئی، تو اورنگزیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی بعض اسباب کی بنا پر شاہجہان نے اس سفارش کو قبول نہیں کیا، تو اورنگزیب نے پھر شاہجہان کو لکھا کہ اس جگہ کے لئے کوئی اس سے بہتر آدمی مل نہیں سکتا، اورنگزیب کی سفارشون کی اور مثالیں بھی رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری میں مل سکتی ہیں عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤن سے زبردستی اسلام قبول کرایا لیکن ہم یہان پر ایک عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس سے اورنگزیب کے رجحانات کا اندازہ ہوگا، شاہجہان نے ونددھیرا کے راجہ اندرامن کو عدول حکمی کی بنا پر قید کر دیا جب اورنگزیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے راجہ کی رہائی کے لئے شاہجہان سے سفارش کی لیکن شاہجہان اندرامن سے بہت زیادہ برہم اور ناخوش تھا، اس لئے اورنگزیب کی سفارش قبول نہیں کی اور اس کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے بار بار تکلیف پہنچائی ہے وہ صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرلے اس پر اورنگزیب نے سخت احتجاج کیا اور شاہجہان کو لکھا کہ اس شرط پر عمل نہیں کیا جا سکتا، یہ بہت ہی غیر مدبرانہ اور کرنا اندیشانہ فعل ہوگا، اسکی رہائی خود اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے اس سلسلہ میں اس نے شاہجہان کے وزیر اعظم کو ایک رقعہ لکھا جو آداب عالمگیری میں موجود ہے،

"ص ع"

اورنگزیب نے جلجیون کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی، ضلع بنارس جد و مشرا ساکن ہیش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر مسرا، کو بھی جاگیریں دیں، یہ سب کے سب مندروں کے پجاری تھے، اورنگزیب نے ملتان کے مندر توت لامئی کے لئے مشرا کلیان داس کو سو روپیہ کا وظیفہ عطا کیا، یہ مندر اب تک موجود ہے،

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۰۵۳ھ میں حکم دیا کہ اوجین کے گدام سے مہاکل کے مندر کی روشنی کے لئے چار سیر گھی روزانہ دیا جائے،

بہت سے مسلمان حکمراں علوم و فنون کے سرپرست رہے ہیں جنھوں نے صرف فارسی اور عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی، انھوں نے ہندستان میں علوم و فنون کو جو ترقی دی، اُن کو یہاں مختصراً بھی لکھنا ممکن نہیں، شاہانہ سرپرستی میں سنسکرت کی متعدد کتابیں فارسی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں، بہت سے مسلمان حکمرانوں نے خود سنسکرت زبان کی تحصیل اور اُن میں سے بعض نے سنسکرت کی کتابوں کو ترجمہ بھی اس غرض سے کیا کہ ہندوؤں کے علوم کے خزانے مسلمانوں تک بھی پہنچ جائیں، انھوں نے دوسروں کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دی، ہندو طلبہ کے تعلیمی نصاب میں سنسکرت زبان بھی ہوتی تھی، غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی، ڈاکٹر جیمز ایچ کرانس نے اسلامی ہند میں تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

"مسلمان بادشاہ اور شہزادے ہندو کلچر کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، مسلمانوں کی تعلیم میں ادب کا اختلاط اسی طرح ہوگیا تھا جس طرح مغل مصوری راجپوتوں کی مصوری سے مل جل گئی تھی، ہندو کے ادب انشائیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اور رفتہ رفتہ فارسی کلچر سے ہندو کلچر متاثر ہوتا گیا"

بنگالی مورخ فارسی سوزا لکھتا ہے کہ

"ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے، مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدن

بجھانے دی یقین کو عقل کی افسردہ شمعیں سب   طلوع مہر کا مژدہ ہے تاروں کی تنک تابی

تری تخئیل پر ہو باز دروازہ فطرت کا
عطا تجھکو کرے خالقِ دل مومن کی بے تابی

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن ولی ڈپٹی کلکٹر آرہ

عقل الجھ کے رہ گئی وہم کے تار و پود مین   حسن کی دیکھ لی جھلک عشق نے ہر وجود مین
کعبہ ہو یا کہ بتکدہ جھک گئی خود جبین شوق   کس کو دماغ امتیاز بے خودی سجود مین
ڈھونڈھ چکا ہون جو بجو دشت بہ دشت کو بہ کو   ایک بھی ہم نفس نہین کارگہ وجود مین
جن کے ہین دل جنون بہ دوش کان ہین جن کے حق نیوش   پاتے ہین کیف سرمدی نغمۂ چنگ و عود مین
کافر عشق کے لئے عین حرم ہے دیر بھی   گو ہے در بتان پہ سر محو ہے دل درود مین
کاکل عطر بیز کی دوش پہ چھا گئی گھٹا   ڈوب گئی فضاے جان نکہتِ مشک و عود مین
جان ہو وقفِ جستجو دل ہو شہید آرزو   امن و سکون نہ کر تلاش معرکۂ وجود مین
کعبۂ آرزو ہوا ہر نفسِ حیاتِ عشق   مل گیا نافۂ مراد کاکل مشک سود مین
مرگ بھی عین زیست ہے گرم سفر ہے گر حیات   زیست بھی عین مرگ ہے منزلِ رفت و بود مین
عشق ہے حسن کا جواب حسن ہے عشق کا جواب   حسن ازل کی ہے نمود عشق کی ہر نمود مین

مسلکِ عشق مین ولی یاس و امید ہے حرام
دل کو رہین غم نہ کر فکرِ زیان و سود مین

ادبیات

فطرت اور مومن

از

جناب شہزور کاشمیری

لحد کے خواب کا ہے سلسلہ اسکی گران خوابی | جو فطرت کے تقاضوں سے کرے دانستہ بیتابی
ہے فطرت ایک مجموعہ قوانینِ الٰہی کا | ازل سے جن کا پیرو ہے جہانِ خاکی و آبی
بصارت ہے تو فطرت کا صحیفہ پڑھ کبھی تو بھی | بصیرت کے لیے کافی ہے اک جگنو کی شب تابی
صلاحیت ہے ہر ذرہ میں صحراؤں پہ چھانے کی | ہر اک قطرہ کی فطرت میں ہے طغیانی و سیلابی
دلِ ظلمت میں پوشیدہ ہیں صدہا چاند اور سورج | نہاں ہر خار کے دامن میں ہے جنت کی شادابی
کتابِ فطرتِ رنگین کے اوراق پریشان ہیں | دلِ رومی، دماغِ طوسی و چشمانِ فارابی
ہے فطرت ایک دستور العمل مردِ مجاہد کا | ہے جس کا مقصدِ ہستی جہان بانی جہان تابی
ہے فطرت کی سی گیرائی نگاہِ مردِ مومن میں | ملی ہے اس کے دل کو فطرۃً تقدیرِ سیمابی
ہے گر نغمات سے معمور اک سازِ ازل فطرت | تو مومن کی نظر اس کے لئے ہے ضربِ مضرابی
ہے مومن ایک بحرِ بیکرانِ رحمتِ یزدان | مسلمانی ہے صلح و امن کے تشنوں کی سیرابی
بجز علم یقین ممکن نہیں ادراک فطرت کا | انہی انوار کی ہو تیرے دل میں بھی ضیاتابی

٥٣٧ھ تسلیم کرنے میں زیادہ تامل نہین ہوتا ہے اب اگر ہم حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ٥٣٠ھ قرار دیتے ہین، تو ٥٦١ھ مین ہندوستان آنیکے وقت اُن کی عمر اکتیس سال کی ہوتی ہے اور اگر ٥٣٧ھ کو صحیح سمجھتے ہین، تو ہندوستان مین اُن نے ورود مسعود کے وقت ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے، قیاس کہتا ہے کہ اکتیس یا چوبیس سال کی اتنی کم عمری مین ہندوستان آکر مستقل سکونت اختیار نہ فرمائی ہو، خصوصًا جب یہ معلوم ہو کہ مرشد کی خدمت اور پھر سیاحت مین کافی مدت گذاری، ایک اور چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اگر ٥٦١ھ مین اجمیر آئے، تو گویا اجمیر کے ہندو حکمران سے ٥٨٨ھ یعنی شہاب الدین غوری کے حملہ تک متصادم رہے، بعض تذکرہ نویسون نے لکھا ہے ٥٦١ھ مین اجمیر آئے تو پرتھوی راج کو اجمیر مین اُن کا قیام گران گذرا، لیکن یہ صحیح نہین معلوم ہوتا کیونکہ تاریخون میں پرتھوی راج کی تخت نشینی کی تاریخ ٥٧١ھ ہے[۵]، اور تھوڑی دیر کیلئے اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ کے اجمیر مین آنے کے دس برس کے بعد پرتھوی راج گدی پر بیٹھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد سے حضرت خواجہ کے قیام مین مزاحمت شروع کی، تو اس کی مطلق العنانی سے یہ توقع نہین ہو سکتی تھی کہ ٥٧١ھ سے ٥٨٨ھ یعنی سترہ برس تک اُن کے تصادم کو اپنی راجدھانی مین برداشت کرتا رہا

---

[۵] عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ مین تذکرہ نویسون پر بھروسہ کرکے یہ لکھ دیا ہے کہ

"دہلی سے اجمیر گئے، اجمیر میں دسوین محرم ٥٦١ھ مین نزول اجلال فرمایا، اور یہین آخر وقت تک قیام رہا۔ اس زمانہ مین اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا"

ایسی تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہوگیا ہے، بزم صوفیہ مین ایک اور تسامح ہوگیا ہے، ص ۱۸ پر محمد یادگار کو صفاہان کا حاکم لکھ دیا گیا ہے، اس سلسلہ مین بھی تذکرہ نویسون مین کچھ اختلاف ہے، خزینۃ الاصفیاء (جلد ۱ ص ۲۵۶) مین ہے کہ محمد یادگار ہرات کا حاکم تھا لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسون نے اسکو سبزوار کا حاکم بتایا ہے اور یہی صحیح ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے علیگ رفیق دار المصنفین

(۲)

اب ایک علیحدہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام تذکرہ نویسوں کے لکھنے کے بموجب یہ تسلیم کر لیا جا کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت ان کا سن شریف کیا تھا؟

معین الارواح کے فاضل مولف نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۰ھ قرار دیا ہے لیکن اس سنہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کچھ تامل اس لئے ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے حضرت خواجہ کے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا سال ولادت ۵۲۶ھ لکھا ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۲ جلد اول)

گمان ہوتا ہے کہ مرشد و مرید میں سن و سال کا تفاوت کچھ اور زیادہ ہوگا، فاضل مولف لکھتے ہیں کہ اکثر مورخین نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۷ھ لکھا ہے (ص ۵) اگر حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی تاریخ ولادت ۵۲۶ھ صحیح تسلیم کر لی جائے، تو ان کے مرید حضرت خواجہ کا سال ولادت

ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے، حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں سلطان التمش کا ذکر بار بار آتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو حضرت بختیار کاکی سے ارادت تھی، چنانچہ ایک موقع پر حضرت بختیار کاکی فرماتے ہیں :-

"ایک رات وہ یعنی التمش میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھکو کیا تکلیف پہنچاتے ہو گے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اس نے کہا رب العزت مجھ کو مملکت تو دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی اور اس کا حساب دینا ہوگا، تو اس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں، وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اس کی بات قبول نہ کر لی۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان التمش حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید تھا تو چشتیہ سلسلہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ سلطان التمش کو اپنے مرشد کے مرید سے والہانہ عقیدت ہوگئی تھی، خزینۃ الاصفیا کے مؤلف نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ

بادشاہ یعنی سلطان التمش رحم دل و عادل وسلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار در مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیار است" (جلد اول ص ۲۷۶)

لیکن ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین کی ایک تصنیف گنجِ اسرار کی سند پر سلطان التمش کو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید بتایا ہے (ص ۰۰) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا گنج اسرار یا اور دوسری کتابیں جن کو فاضل مؤلف نے حضرت خواجہ کی طرف منسوب کیا ہے، ان کی تصانیف تسلیم بھی کی جا سکتی ہیں ؟

خواجگانِ چشت کی تصانیف کے متعلق حضرت خواجہ نصیر الدین کا بیان خیر المجالس میں اس طرح ہے :-

اب یا تو ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر لوٹ گئے، لیکن جب اس کے لئے کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ۵۶۱ھ کی تاریخ غلط لکھی ہے، انھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے کچھ ہی پہلے یعنی ۵۸۰ھ میں اجمیر میں نزول اجلال فرمایا ہو، پرتھوی راج نے اُن کو تکلیف پہنچائی تو اُن کی دعاؤں سے شہاب الدین غوری ۵۸۸ھ میں حملہ آور ہوا، اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تاریخ خود معین الارواح کے فاضل مؤلف نے ۵۸۳ھ بتائی ہو، ابھی ذکر آچکا ہو کہ حضرت خواجہ قطب الدین اپنے مرشد کے ساتھ اجمیر آئے،

اب یہ مان لیا جائے کہ حضرت خواجہ اجمیر پہلی دفعہ ۵۸۰ھ میں آئے تو اُن کے ۵۳۰ھ کے سنہ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں، حضرت خواجہ کو جب اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے خرقۂ خلافت ملا تو اس وقت ان کا سن شریف باون برس کا تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۸۲ھ میں اجمیر آکر پھر اپنے مرشد کے پاس گئے، لیکن ابھی بحث ہو چکی ہے کہ یہ ایک متنازعہ فیہ واقعہ ہے، اب اگر حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۲۳ھ میں مان لیں تو ۵۸۰ھ میں اجمیر آنے کے وقت اُن کی عمر ستاون برس کی ہوتی ہے یعنی وہ اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت لے کر اجمیر تشریف لائے،

لیکن یہ ساری بحث گنجلک ہوتی جا رہی ہے، اور ہم کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں، حضرت خواجہ کے حالات قلمبند کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کچھ ایسی مبہم، غیر واضح اور متضاد باتیں لکھی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے، تو ایک لامتناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اور کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا ہے،

ایک آدھ مثال اور ملاحظہ ہو، سلطان شمس الدین التمش کو کسی تذکرہ نویس نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین کا اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بنایا ہے

کے مناسب نہیں ہیں، نیز ان حضرات کی کوئی تصنیف نہیں، مگر افضل الفوائد جس میں حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات مرتبہ حضرت امیر خسرو ہیں مرقوم ہے کہ خواجہ بزرگ اور حضرت سلطان المشائخ جو کچھ اپنے پیر و مرشد سے سنتے تھے، وہ لکھ لیتے تھے، ان دونوں روایات کے اختلاف میں اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک یہ رسالے بہ شکل رسالہ جات ظاہر نہیں ہوئے تھے، بلکہ تبرکاً شجرہ کے ساتھ تھے، اور جزو شجرہ سمجھے جاتے تھے، نہ کہ رسالہ جات، علاوہ ازیں کسی دوسرے شخص کو ان حضرات کے ملفوظات مرتب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی، غیر متعلق شخص اتنی محنت کرکے یہ رسالے کیوں مرتب کرتا، پھر حضرت امیر خسرو کے بیان کو کسی طرح غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، (صفحہ ۲۲)

ماجد راقم کے سامنے اس وقت افضل الفوائد نہیں، فاضل مؤلف اگر امیر خسرو کی وہ فارسی عبارت نقل کر دیتے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے مرشد کے ملفوظات لکھ لیتے تھے، تو بہتر ہوتا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے جانشین تھے، اس لئے ان کے قول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کی رائے تو صرف اپنے مرشد کے متعلق ہے، اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے مرشد اور دوسرے خواجگان چشت نے کتابیں لکھیں اور ان کی جو متعدد تصانیف بازاروں میں بکتی ہیں، وہ انہی کی ہیں،

فاضل مؤلف نے گنج اسرار کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصانیف میں حدیث المعارف اور رسالہ موجودیہ (شاید رسالہ وجودیہ مراد ہو) کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں کسی کی نظر سے نہیں گذریں، صرف ان کے نام سے منسوب ہیں، علمی دنیا میں ایسی مثالیں سینکڑوں ملیں گی کہ ایک تصنیف مالی فوائد اور دنیاوی اغراض کی خاطر دوسرے کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے، حضرت خواجہ کی عظیم المرتبت شخصیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مجاوروں نے کوئی تصنیف ان کے نام سے منسوب کر دی ہو تو

"میرے حضرت پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز فرماتے تھے میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فریدالدین اور شیخ الاسلام حضرت مولینا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرہ میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی ہے، میں (یعنی مرتب خیرالمجالس) نے عرض کی کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت میں عرض کی، میں نے ایک معتبر سے سُنا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی تصنیف سے ایک کتاب دیکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس نے غلطی کی، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے اس واسطے کہ ہمارے خواجگان نے کوئی تصنیف نہیں کی، یہ سن کر حضرت خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر نے ارشاد کیا کہ واقعی ہمارے حضرت سلطان الاولیاء نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، پھر میں (یعنی مرتب خیرالمجالس) نے عرض کی کہ یہ جو رسالے اس وقت میں دستیاب ہوتے ہیں ملفوظات حضرت شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ملفوظات حضرت شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کے وقت میں ظاہر نہ ہوئے تھے، خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ تھے اگر ان حضرات کی تصنیف سے ہوتے، تو بڑے حضرت ذکر اُن کا فرماتے، اور دستیاب ہوتے"

(اردو ترجمہ سیرالمجالس ص ۳۴-۳۵۔ ترجمہ کی عبارت ہو بہو نقل کر دی گئی ہے)

خیرالمجالس کی مذکورۂ بالا روایت ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری کی نظر سے گذری ہے لیکن ان کو اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ہر چند کہ ان ملفوظات سے مولانا حمید قلندر نے انکار کیا ہے، اور خیرالمجالس (ملفوظات حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی مرتبہ مولانا حمید قلندر) میں صاف لکھا ہے کہ یہ ملفوظات آنحضرت کے نہیں ہیں، کیونکہ اُن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو آنحضرت کے علم و ارشاد

زیادہ شیرین کلام شاعر ثابت کیا تھا، پروفیسر موصوف کی اس کتاب پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۲۳ء میں بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کر دیا، بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ہے

آرزو خوب است اما این قدر ہا خوب نیست

پروفیسر عبدالغنی نے اس تنقید کا جواب دینے کی کوشش کی، اور اپنا جواب ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کے ٹائٹل پر انھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر ضمیمہ رسالہ معارف لکھ دیا ہے حالانکہ ان کا یہ لکھنا بالکل درست نہ تھا، اس رسالہ میں انھوں نے حضرت خواجہ کو بعض تذکرہ نویسوں کے حوالے سے شاعر تو ثابت کر دیا، لیکن ان کے صاحبِ دیوان ہونے پر اصرار نہیں کیا ہے، اس رسالہ کا جواب گجرات اورینٹل کالج میگزین کے ۴۹ء و ۵۰ء کے مختلف شماروں میں پروفیسر ابراہیم ڈار اسماعیل کالج بمبئی نے دیا، اور پھر اگست ۵۰ء کے رسالہ اردو میں بھی ان کا ایک مقالہ دیوان خواجہ معین الدین چشتی کے عنوان سے شائع ہوا، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا، کہ مولانا معین الدین فراہی چشتی نہیں، کی تصانیف معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں، جو دیوان معین میں پائی جاتی ہیں، اس لئے دیوان معین دراصل مولانا معین الدین فراہی کے کلام کا انتخاب ہے، معین الارواح کے فاضل مؤلف اگر ان تحقیقات سے باخبر ہوتے تو دیوان معین کو حضرت خواجہ کا دیوان تسلیم کرنے پر اصرار نہ کرتے، اور یہ اصرار اس لئے بھی بے جا ہے کہ حضرت خواجہ کا صاحبِ دیوان ہونا ان کا کوئی وصف یا کمال نہیں، اور نہ اُن کی شاعری اُن کے لئے وجہ امتیاز ہے،

معین الارواح کے حصہ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن یہاں مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش

کوئی تعجب انگیز بات نہیں،

فاضل مؤلف کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان معین جو عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے، وہ حضرت خواجہ ہی کا دیوان ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہر چند کہ ایک گروہ دیوان معین کو معین الدین کاشفی کی تصنیف کہتا ہے آپ کا نتیجۂ فکر نہیں مانتا، مگر شوکتِ کلام زبان حال سے کہہ رہی ہے یہ معمولی عارف کا کلام نہیں، بلکہ اس میں جن اعلیٰ مقامات معرفت نکات تصوف اور فنائے تامہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ آپ ہی جیسے عالی مرتبت اہل اللہ فرما سکتے ہیں" (ص ۹۴)

آگے چل کر پھر رقمطراز ہیں :-

"ہماری رائے میں موجودہ دیوان آپ ہی کے جذبات صادقہ، فکر بلند اور اعلیٰ ترین سیر جبروتی و ملکوتی اور لاہوتی کا نتیجہ مبارکہ ہے، منکرین دیوان نے بلا کسی دلیل کے صرف آپ کا ہمنام ہونے کی وجہ سے اس دیوان کو معین الدین کاشفی کا دیوان بتایا ہے، مگر اس کی تائید میں کوئی قابلِ قبول ثبوت کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے ہم اس دیوان کو غریب نواز کی نسبت سے محروم نہیں کر سکتے" (صفحہ ۹۵)

شاید فاضل مؤلف کی نظر سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مقالہ "دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری" جو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا نہیں گذرا، اگر یہ محققانہ اور مدلل مضمون اُن کی نظر سے گذرا ہوتا، تو وہ ہرگز یہ تحریر نہ فرماتے کہ کوئی قابلِ قبول ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا، ابھی چند سال پہلے پروفیسر عبدالغنی کی ایک انگریزی کتاب "پری مغل پرشین اِن ہندوستان" شائع ہوئی ہے، اس میں پروفیسر موصوف نے غالباً حضرت خواجہ معین الدین کی ذات سے غایت عقیدتمندی کے اظہار میں دیوان معین کو انہی کا دیوان سمجھکر اُن کو حافظ سے زیادہ بہتر اور

اس تاویل کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورہ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لیں، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے:

ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود دہلی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے آپ نے جواب میں فرمایا کہ بالکل غلط ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے، حاشا للہ یہ کلام ان کا نہیں ہے، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہیں جو جا بجا درج کئے ہیں کسی طرح قطب صاحب قدس سرہٗ کے حال و اعمال کے مواقف نہیں ہیں، (جلد ۲ ص ۶۲)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے بعض ملفوظات الحاقی ہیں، جو اُن کی عملی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہیں،

کتاب کے حصہ سوم میں حضرت خواجہ کی درگاہ اور اُن کے عُرس کے مراسم کی تفصیلات درج ہیں، حصہ چہارم میں حلقہ ارادت کے عنوان سے گذشتہ اور موجودہ عہد کے ان اکابر کا ذکر ہے جن کو حضرت خواجہ سے عقیدت رہی، حصہ پنجم میں حضرت خواجہ کی درگاہ شریف کے گذشتہ اور موجودہ درباریوں کا ذکر ہے، حصہ ششم میں اجمیر کی مختصر تاریخ ہے، کتاب کے آخری تین حصے اجمیر شریف کے زائرین کے مطالعہ کے لئے مفید ہیں،

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کہ اس میں حضرت خواجہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر اکٹھا کر دیا گیا ہے، اور آیندہ جب کوئی اہلِ قلم حضرت خواجہ کی سوانحمری سلیقہ سے مرتب کرنے کی کوشش کریگا تو یہ کتاب بلاشبہہ بہت مفید اور مددگار ثابت ہوگی،

تصوّفِ اسلام

اسلامی تصوف کا عطر، قدماء صوفیہ کی تعلیمات کا لُب لباب، اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ،

قیمت:- عہ/

"منیجر"

کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا، کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگانِ دین کے ہرگز نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظ ملاحظہ ہو جس کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے،

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر تھا، اور اہلِ صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے عالم میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ چشتی رسول اللہ چونکہ وہ صحیح العقیدہ تھا، اس نے فوراً اس طرح کہا، غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا"

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مجموعہ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے، لیکن یہ روایت کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے کہ

اگرچہ یہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورہ بالا الفاظ شرعاً قابلِ اعتراض معلوم ہوتے ہیں، مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابلِ اعتراض نہیں، نیز صاحبانِ حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید البغدادی اور حضرت بایزید بسطامی وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالم نے بھی طائف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقع پر ارشاد فرمایا، "میں نے اُن سے سرگوشی نہیں کی، بلکہ خدا نے کی" نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا"

سنہ ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتی ہے اور کانگریسی وزارتوں کے قیام کے زمانہ ۱۹۳۷ء تک ختم ہوتی ہے، اس درمیان میں کونسل کے ممبر، صوبے کے وزیر، ہوم ممبر اور گورنر ہوئے، اور وقتاً فوقتاً قومی معاملات میں بھی حصہ لیتے رہے، اس لیے حکومت اور ملکی سیاست دونوں سے انکا واسطہ رہا، یہی زمانہ ہندوستانی سیاست کے طوفان کا تھا، ہمارے قومی، ملکی اور سیاسی مسائل اسی زمانہ میں پیدا ہوئے، ان کو اپریشن اور خلافت کی تحریکیں شروع اور ختم ہوئیں، گورنمنٹ کے ساتھ آئینی اور غیر آئینی معرکے ہوئے، اسی زمانہ میں کانگریس اور لیگ کے اختلافات شروع ہوئے، ہندو مسلم مسائل نے شدت اختیار کی، زمینداروں اور کاشتکاروں میں کشمکش پیدا ہوئی، غرض ایوان حکومت کے اندر اور باہر دونوں میں بہت سے معاملات و مسائل چھڑے، مصنف کو چونکہ حکومت اور قومی سیاست دونوں سے تعلق تھا، اس لیے ان کو ان تمام معاملات سے سابقہ رہا، اس لیے اس کتاب میں مصنف کے سوانح کے سلسلہ میں اس دور کی عموماً اور صوبہ متحدہ کی خصوصاً پندرہ سالہ سیاسی سرگذشت آگئی ہے، یہ سارے واقعات ہم میں سے اکثروں کی نگاہوں کے سامنے گذرے ہیں، اس لیے اس کتاب کے مطالعہ سے وہ دور نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والا ان کو لطف و دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس تاریخی سرگذشت کے ضمن میں اس دور کے ارکان حکومت اور قومی رہنماؤں کے حالات اور مختلف النوع دلچسپ واقعات بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں، غرض کتاب گوناگوں معلومات اور دلچسپیوں کا مجموعہ ہے، انداز تحریر دلکش اور شگفتہ ہے، کتاب بلکہ مصنف کا نمایاں وصف جو اس کے صفحہ صفحہ سے نمایاں ہے، انکی متانت و سنجیدگی، اعتدال و میانہ روی، اور تحریر کی شائستگی ہے، جس دور کے یہ حالات ہیں وہ حکومت اور عوام کی کشمکش اور ہندو مسلم اختلافات کا دور تھا، اور بہت سے معاملات میں مصنف کی حیثیت فریق کی تھی، اس لیے اس کتاب میں جا بجا اختلافی مسائل بھی آئے ہیں، لیکن ان کا قلم کہیں بھی اعتدال و متانت کے جادہ سے نہیں ہٹا ہے، اور مصنف کی شگفتگی تحریر، اور لطائف کی آمیزش نے ان خشک واقعات میں خاصی ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے یہ خیال میں بھی نہ تھا کہ مصنف کا ادبی مذاق اتنا ستھرا ہے، اور وہ ایسی اچھی کتاب لکھ سکتے ہیں، یہ کتاب اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ

مطبوعات جدیدہ

یادِ ایام از نواب سر حافظ محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت چار روپیہ پتہ غالباً راحت منزل علی گڈھ سے ملے گی۔

ہمارے صوبہ کے رؤسا میں خاندانی امارت و وجاہت، ذاتی قابلیت وصلاحیت، تدبر و ہوشمندی
اخلاق وسیرت اور دینداری میں نواب سر محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری کا ممتاز درجہ ہے، اُن کی
صلاحیت و سلامت روی کی بدولت کونسل کی ممبری سے لے کر وزارت، ہوم ممبری، گورنری اور ریاست
حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ تک کے اعزاز ان کو حاصل ہوئے، قومی اور سیاسی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہا ہے،
جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، زیرِ نظر کتاب سے اُن کی تصنیفی صلاحیت کا علم ہوا، آپ بیتی جگ بیتی
سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہے، لیکن اردو میں خود نوشت سوانح عمریوں کا بالکل رواج نہیں
ہے، اور سر سید رضا علی مرحوم کے اعمالنامہ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمری
موجود نہیں ہے، یادِ ایام اردو میں دوسری کتاب ہے، اُس کے دو پہلو یا دو حصے ہیں، ایک صاحبِ
سوانح کے نجی اور ذاتی حالات، دوسرا اُن کی قومی و سیاسی زندگی، ذاتی حالات میں خاندان، بچپن، تعلیم
تربیت، انتظامِ ریاست اور حکام کے تعلقات وغیرہ کے حالات ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن دلچسپی سے خالی
نہیں، اور اُن سے اس دور کے رؤسا کی سوسائٹی اور اُن کے مذاق و مشاغل پر روشنی پڑتی ہے، کتاب
کا اصل حصہ مصنف کی سیاسی و قومی زندگی کا ہے، اُن کی سیاسی زندگی چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ یعنی

سلسلہ مین آگے چل کر قصیدہ بردہ کے متعلق لکھتے ہین" بلاشبہ اس مین کہین کہین مقام نبوت سے تجاوز ہوگیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز مین ڈوبا ہے، راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا" (ص ۱۴۱) مصنف مین دین کی سچی تڑپ ہے، اس لیے یقین ہے کہ انشاء اللہ آئندہ چلکر ان کی وہابیت کی خشکی مین محبت و روحانیت کی تری بھی پیدا ہو جائے گی، سفرنامہ اپنے مفید علمی و مذہبی معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ } از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت: عہ پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنو،

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ دین کے لیے وقف تھا، انکے تمام افکار و تصورات اور اعمال و اقوال کا مرکز تبلیغ تھا، ان کی کوئی مجلس اور کوئی گفتگو اس مقصد سے خالی نہ ہوتی تھی، اور انکی زبان فیض ترجمان سے ہر وقت مسلمانون مین دینی روح کی تجدید، اور اس کے احکام کی تبلیغ اس کے علمی و عملی طریقون اور اس کے جملہ متعلقات کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا، مولانا منظور صاحب نعمانی مولانا مرحوم کی زندگی ہی مین ان کی دینی دعوت کے سرگرم مبلغ تھے، اور اس سلسلہ مین ان کو وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت مین حاضری اور قیام کا اتفاق ہوتا تھا، اور وہ مسلمانون کی دینی تجدید اور دعوت و تبلیغ کے متعلق مولاناؒ کے ملفوظات قلم بند کرتے جاتے تھے، اب ان کو انھون نے افادۂ عام کی غرض سے شائع کر دیا ہے، ان ملفوظات مین اسلامی تعلیمات، اور اسلامی زندگی کے حصول کی پوری روح آگئی ہے، اور وہ اپنے گوناگون مذہبی و روحانی فوائد کے اعتبار سے مسلمانون کے ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہین،

تردید حاضر و ناظر از مولانا عبد الرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ

کے لائق ہے۔

دیارِ عرب مین چند ماہ از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۰۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت للعہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، نمبر ۹ نوٹیا منگ رام باغ روڈ، کراچی،

مصنف نے اسلامی جماعت کی تبلیغ واشاعت کے لیے گذشتہ سال عراق ونجد وحجاز کا سفر کیا تھا، اور اس سلسلہ مین ان ملکون کے تمام بڑے بڑے شہرون کی سیاحت کی، اور حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے، مذکورہ بالا کتاب اس سفر کی علمی سوغات ہے، یہ سفرنامہ عام سفرنامون سے کسی قدر مختلف ہے، مصنف کا ذوق خالص دینی اور علمی ہے، اور انھون نے ایک مذہبی مقصد کے لیے سفر کیا تھا، اس لیے سیر وتفریح کے بجائے خصوصیت کے ساتھ وہان ہر مقام کے علماء اور دینی حلقہ سے زیادہ ملے، ان سے مذہبی معاملات ومسائل پر تبادلہ خیال کیا، مذہبی اور علمی اداروں کو دیکھا، مذہبی نقطۂ نظر سے عقائد وخیالات واعمال کا جائزہ لیا، اسلیے اس سفرنامہ مین زیادہ تر ان ملکون کے علمی ومذہبی حالات ہین، اور مصنف نے بڑے درد لیکن بڑی سچائی اور جرأت کے ساتھ ان اسلامی ممالک کے مذہبی تساہل وتفریح پر تنقید کی ہے، اور جلالۃ الملک ملک حجاز کی شریعت پناہی کی حقیقت بھی پوری طرح واضح کی ہے، یہ اس سفرنامہ کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو ہے، اس سے ان ملکون کی مذہبی وعلمی حالات کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، ضمناً ان مقامات کے دوسرے حالات اور سفر کے مشاہدات وتجربات بھی آگئے ہین، مصنف کا سنجیدہ علمی ومذہبی ذوق اور قلم کی پختگی پورے سفرنامہ مین نمایان ہے، البتہ ان کے قدر شناسون اور ہواخواہون مین انہی کے بقول ان کی "خشک وہابیت" ہمیشہ کھٹکتی ہے، جو اس سفرنامہ مین بھی موجود ہے، لیکن ان مین دین کا سچا جذبہ ہے، اس لیے ان کا دل باطنی کیفیتون سے خالی نہین ہے، اور اس کے اثرات اس سفرنامے مین بھی کہین کہین نظر آتے ہین، مثلاً مدینہ طیبہ کی حاضری کے سلسلہ مین لکھتے ہین "وہابیت کی خشکی کے باوجود دل بہے رہا ہے" (ص ۱۳۰) اسی

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس مین اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے اور سوانح حیات کے بعد پہلے اُن کی اردو شاعری پھر فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملت، تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت) فنونِ لطیفہ اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے،

قیمت:- عہ/

منیجر

بزمِ تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم، اے)

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایون نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہان نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر مین تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشاپردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہون نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادون اور شہزادیون نے بھی علم و ادب کی محفلین سجائین، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی مین گوناگون کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب مین ملاحظہ فرمایئے،

ضخامت:- ۵۰۴ صفحے،

قیمت:- معہ/

منیجر

کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۱۲؍ پتہ: مدرسہ جھنڈے نگر، ڈاک ملدیت گنج، ضلع بستی،

بریلوی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق حاضر وناظر اور عالم الغیب مانتی ہے، مولوی عتیق الرحمن صاحب بریلوی نے اسکے اثبات مین کوئی رسالہ خیر الانبیاء لکھا تھا، مذکورہ بالا کتاب اس کی تردید مین لکھی گئی ہے، اس مین خیر الانبیاء کے تمام دلائل کا رد کیا گیا ہے، یہ جھگڑا بہت پرانا ہے، اس پر دونون جانب سے ہزارون صفحات لکھے جا چکے ہین، اور اب اسکا کوئی پہلو تشنہ باقی نہین ہے، اور اس پر کوئی نیا اضافہ نہین کیا جا سکتا، اس لیے ان مسائل پر لکھنا محض اضاعتِ وقت ہے، اسکے علاوہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے، نئے نئے سیاسی ومعاشی کلامی مسائل درپیش ہین، ہر طرف الحاد ودہریت کا طوفان بپا ہے، کفر واسلام کا معرکہ چھڑا ہوا ہے، نام کے مسلمانون کا ایک طبقہ سرے سے اسلام ہی سے منحرف ہو رہا ہے، ایسی حالت مین اسکو چھوڑ کر پرانے دقیانوسی مسائل مین اپنی قوت اور وقت ضائع کرنا اسلام کی کوئی مفید خدمت نہین ہے، افسوس ہے کہ ہمارے علماء کا ایک طبقہ خواہ بریلوی ہون یا اہل حدیث، وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو چھوڑ کر انھی غیر ضروری مسائل مین الجھا ہوا ہے، جنکی جانب اس زمانہ مین کسی کو توجہ کرنے کی بھی فرصت نہین ہے، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ انکو چھوڑ کر ساری قوت الحاد اور کفر والحاد کے مقابلہ مین اسلام کی نصرت وحمایت مین صرف کی جائے، تاہم مصنف کی نیت نیک اور انکا مقصد صحیح ہے، اسلیے انکا دینی جذبہ قابل قدر ہے، اور اس کا اجر انشاء اللہ ان کو ملے گا،

آسان قرآنی کورس کے بیس سبق

از جناب مولوی عبد السبحان صاحب اعظمی ربانی منشی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۹؍ پتہ: بزم قرآن مسجد عیدیہ کوبہ معروف شاہ سپاری کلنڈ جونسٹ روڈ، مدراس۔

خاص قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا ترجمہ سمجھنے کیلیے اردو مین عربی قواعد کے متعدد قرآنی نصاب مرتب کیے گئے ہین، ان مین سب سے زیادہ مشہور ومفید ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنؤ کا نصاب ہے، مصنف نے بھی اسی مقصد کے لیے یہ رسالہ لکھا ہے، اس مین ادارہ تعلیمات اسلامی کی کتابون سے بھی انھون نے فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنے تجربہ سے نئے اضافے بھی کیے ہین، اس رسالہ مین بیس سبق ہین، اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق کے لیے مفید ہین

"م"

رجسٹرڈ نمبر ۱۵۱ نومبر ۱۹۵۵ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت : چھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزمِ صوفیہ

جس میں عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابو الحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو دراز کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ ملکگشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- ـــے

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے،

مینجر (طابع و ناشر صدیق احمد)

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریبًا اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۳۵۵ صفحے قیمت: عے

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- سے

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت عہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۴۳۲ صفحے

قیمت :- ہر

"منیجر"

علم و فن کی روشنی سے منور کیا تھا، یورپین قومین اپنے دورِ جہالت تک تو اُن کی دشمنی پر قائم رہین لیکن علم کی روشنی پھیلنے کے بعد جب اُن کی آنکھون سے تعصب کا پردہ ہٹا اور اُن کو مشرقی دنیا اور خود اپنے ملکون مین مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامے نظر آئے تو انھون نے اُس کا پورا اعتراف اور احساس شناسی کا حق ادا کیا گو استعماری اغراض کی بنا پر ان کا ایک طبقہ مسلمانون کے خلاف زہر بھی اگلتا رہا، لیکن اُس کے مقابلہ مین مسلمانون کے مداحون اور حامیون کی جماعت ہر دور مین زیادہ رہی اور یورپ کے ہر ملک کے علما و محققین نے مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامون پر سیکڑون کتابین لکھین، چنانچہ آج یورپ کی کوئی علمی اور بڑی زبان اس قسم کی تصانیف سے خالی نہین ہے، اس کے ساتھ انھون نے اسلامی علوم و فنون کو زندہ کیا اور عربی و فارسی کی ہر فن کی سیکڑون نادر و نایاب کتابون کو تلاش کرکے بڑی محنت و قابلیت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنی اپنی زبانون مین بہت سی اہم کتابون کے ترجمے کئے اور آج مسلمانون کے قدیم علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ انھی کے بدولت زندہ ہے، اس کے علاوہ طب، طبعیات، نباتات، حساب، ہندسہ، ہیئت و جغرافیہ وغیرہ کی مسلمان مصنفین کی کتابین اور ان کے لاتینی ترجمے کئی صدی تک یورپ کی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل رہے، یورپ کے قرونِ مظلمہ مین ان کے ہاتھون مسلمانون کے جو آثار مٹ چکے تھے وہ مٹ چکے تھے، لیکن جو باقی رہ گئے تھے، اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جس کا مشاہدہ آج بھی اسپین مین کیا جا سکتا ہے، غرض یورپین قومون نے علم و روشنی کے دور مین مذہبی و سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانون کے آثار کو مٹایا نہین بلکہ اُن کو زندہ رکھکر اُن سے فائدہ اٹھایا، ورنہ وہ آج تک جہالت کی تاریکی مین بھٹکتی رہتین، یا کم از کم ترقی کی منزلین اتنی جلد طے نہ کرتین،

اس کے مقابلہ مین ہندو و مسلمانون مین ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا تعلق رہا، گو مسلمان ہندوستان کے حاکم تھے لیکن وہ اجنبی حکمرانون کی طرح نہین رہے، بلکہ انھون نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہین شادی بیاہ کرکے رہ بس گئے، یہان کی بہتیری رسمین تک اختیار کرلین، اور مسلمانون اور یورپین قومون کے مقابلہ مین ہندو مسلمان مختلف حیثیتون سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، دونون مشرقی ہین، ہندوستانی مسلمانون کی بڑی تعداد نسلاً بھی ایک ہی، انھین

ہندوستان کے فرقہ پرستون کی تنگ دلی اور تنگ نظری اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کے دشمن بن گئے ہین جس کو مسلمانون کے ساتھ کسی قسم کی نسبت ہو، وہ اُن کی کسی یادگار کو دیکھنا گوارا نہین کرتے اور ہندوستان مین اُن کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتے ہین، جو ایک متمدن قوم کی شان سے فروتر ہے، اُس کا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم و فن کی ہر متاع اور تہذیب و تمدن کے ہر نقش کو خواہ اُن کا تعلق کسی فرقہ یا قوم سے ہو باقی رکھکر اپنی تعمیر و ترقی مین اُس سے مدد لے، اور جدید ہندوستان اور ہندو مسلمانون کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے،
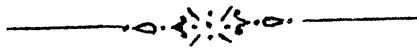
اس بارہ مین ہم کو یورپ کی قومون سے سبق حاصل کرنا چاہئے، عیسائی دنیا مسلمانون کی پُرانی حریف ہے، ان دونون مین بڑے سخت مذہبی اختلافات اور سیاسی معرکے برپا رہ چکے ہین، مسلمانون نے اُن کے مذہبی مرکز بیت المقدس پر جو مسلمانون کا بھی مقدس شہر اور اُن کا قبلہ رہ چکا تھا حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین قبضہ کر لیا تھا، پھر ایک صدی کے اندر اُن کے سارے مشرقی مقبوضات چھین لئے، اور خود یورپ کے ملکون مین اسپین، سسلی یونان، قسطنطنیہ، بلقانی ریاستون بحرِ روم کے بڑے بڑے جزیرون، اور فرانس، پرتگال اور اٹلی کے بعض حصون پر قبضہ کر لیا، اور صدیون یہان کے حکمران رہے، دونون مین مدتون جنگ صلیبی کا خونریز سلسلہ جاری رہا جس مین سارا یورپ مسلمانون کے خلاف صف آرا تھا غرض مذہبی و سیاسی دونون حیثیتون سے مخالفت اور دشمنی کا کوئی دقیقہ باقی نہین لیکن مسلمانون نے اپنے دورِ حکومت مین اپنے تمام مقبوضہ ملکون کو تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ اور

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۲)

گذشتہ نمبر مین معجزۂ قرآنی کی جو خصوصیات بیان کی گئین اُن سے ثابت ہوگیا کہ وہ کوئی دنیوی احسان یا مادی طاقت نہین ہی، بلکہ خالص روحانی طاقت ہے، جو جن وانس دونون کو نیک کامون کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب اس نمبر مین یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ روحانی طاقت کوئی وقتی چیز نہین تھی، بلکہ ایک ابدی دولت ہی جو مسلمانون کے دینی خزانے مین ہمیشہ محفوظ رہیگی اور ان پر قیامت تک اپنا اثر ڈالتی رہیگی کیونکہ،

معجزات کی دو قسمین ہین حسّی اور عقلی، حسّی معجزات کا اثر محدود ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جو لوگ اُن کو دیکھتے ہین، صرف انہی پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جب انکا زمانہ ختم ہو جاتا ہے، تو یہ معجزات بھی ختم ہو جاتے ہین، اور ان کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے لیکن عقلی معجزات کی حالت اُن سے مختلف ہوتی ہے، وہ دل کی آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جب تک دنیا مین صاحبِ عقل و صاحبِ بصیرت لوگ موجود ہین، اُن کا معجزانہ اثر باقی رہتا ہے اور وہ ہر زمانہ مین پیغمبر کی صداقت

بہت سے تہذیبی اور کلچرل پہلو مشترک ہیں، ہندوستان کی ترقی میں دونوں کا حصہ ہے، چنانچہ اسلامی ہند کے بہت سے علمی و تمدنی کارنامے دونوں کے مشترکہ ہیں، لیکن اس کے باوجود محض اس جرم میں کہ وہ اسلامی دور کی یادگار ہیں، فرقہ پرست ان کو برداشت نہیں کر سکتے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی عہد کا باب ہی خارج کر دینا چاہتے ہیں، جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی شان سے بعید ہے، اسلامی یادگاروں کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہئے بلکہ ان کے جو نقش دھندلے ہو گئے ہوں، ان کو اجاگر کرنا چاہئے کہ درحقیقت یہ دونوں کے مشترک کارنامے دونوں کے لئے باعث فخر اور ہندوستان کی تمدنی عظمت کا نشان ہیں، ع:- یہ ٹوٹے آئینے ہیں زیب و زینت ان کی محفل کے

اس لئے ان کا جو نقش بھی مٹے گا اس سے تنہا اسلامی عہد کا نہیں بلکہ ہندوستان کی عظمت کا ایک نشان مٹ جائے گا،

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما ـــــ گلستان می پرد اگر میریم ما

ان حالات میں یہ سن کر حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ نولکشور پریس نے جس نے اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور اردو زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، اپنی پرانی روایات و خصوصیات کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس مطبع سے حسب سابق تینوں زبانوں کی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا، فرقہ پرستی کے اس دور میں یہ فیصلہ قابل ستائش اور نمونۂ تقلید ہے، حقیقت علم و فن کی خدمت کو مذہب و فرقہ کی قید سے بلند رکھنا چاہئے، ورنہ

تو ہماری مسرت دو چند ہو جاتی اگر مطبع کے کارکن اودھ اخبار کو بھی دوبارہ جاری کر دیتے تو ایک پرانی یادگار زندہ ہو جاتی،

مسلمانوں میں زبانی تو اردو زبان کی محبت کا بڑا دعویٰ ہے، ہندوستان میں اس کے زوال کا ماتم بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان کی جانب سے اس کی خدمت و بے توجہی کا حال یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم اور ضروری اخباروں اور رسالوں کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صدق جیسا اہم اور مفید اخبار جس کی قیمت بھی بہت کم ہے، مالی دشواریوں کی بنا پر چند دنوں سے بند ہو گیا تھا، اس کے فاضل اڈیٹر مولانا عبد الماجد صاحب مد ظلہ نے دوبارہ اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور آئندہ مہینہ سے وہ نکلنے لگے گا، اگر مسلمانوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو ان کو صدق کا خریدار بن کر اس کی زندگی کا سامان فراہم کرنا چاہئے،

معجزانہ حیثیت قائم رہے گی، اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہین آئے گا جس مین کوئی واقعہ جس کے ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے ظاہر نہ ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صحت کی دلیل نہ ہو، اس حدیث کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہین کہ گذشتہ پیغمبرون کے معجزات حسی ہوتے تھے، جو آنکھون سے دیکھے جاتے تھے، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، لیکن قرآن مجید کا معجزہ چشم بصیرت سے نظر آتا ہے، اس لئے آپکے پیرو اور پیغمبرون سے زیادہ ہون گے، کیونکہ جو معجزہ آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ دیکھنے والون کے فنا ہونے کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے، اور جو معجزہ عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور یکے بعد دیگرے اس کو لوگ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

افلا یتدبرون القرآن، (نساء - ۱۱)	تو کیا پھر لوگ قرآن مین غور نہین کرتے،

اور یہی وجہ ہے کہ دور نبوت مین جو لوگ صاحب فہم و بصیرت تھے، قرآن مجید کا اثر ان پر سب سے زیادہ پڑتا تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت جبیر بن مطعمؓ نے جب سورہ طور کی یہ آتیین ام خلقوا من غیر شئی الخ سنین تو ان کا دل اڑنے لگا، لیکن یہ اثر صرف ان کے فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

قال الخطابی کانہ انزعج عند سماع ھذہ الآیۃ لفھمہ معناھا و معرفتہ بما تضمنتہ ففھم الحجۃ	خطابی کہتے ہین کہ چونکہ وہ اس آیت کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گئے، اس لئے اس کو سُن کر بیساختہ متاثر ہو گئے، غرض انھون نے اس دلیل کو سمجھ لیا

کی شہادت دیتے ہیں، انبیائے بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسّی ہوتے تھے جن کا اثر اُن کے زمانہ تک محدود تھا، اور اب ان معجزات کا نہ وجود ہے، اور نہ اُن کا اثر باقی ہے، اب عصائے موسیٰ، لحن داؤد، دم عیسیٰ اور ناقۂ صالح کا نہ وجود ہے، اور نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں، اس کے علاوہ اس قسم کے معجزے ان انبیاء کے لئے موزوں ہوتے ہیں جن کی شریعت خود دائمی اور ابدی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق ایک محدود زمانے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے جو پیغمبر اس قسم کی محدود الوقت شریعت کو لے کر آتے ہیں، اُن کو اسی قسم کے محدود الوقت معجزے بھی عطا کئے جاتے ہیں،

لیکن اسلام ایک ابدی مذہب تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی صورت میں ایک عقلی معجزہ عطا کیا گیا، جو اب تک موجود ہے اور ہر صاحب عقل و بصیرت کو اسلام کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من	ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے جن
الآیات ما مثلہ آمن علیہ	پر لوگ ایمان لائے لیکن مجھ کو جو
البشر، وانما کان الذی اوتیتہ	معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے، اس لئے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجوان اکون	مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن
اکثرھم تابعا یوم القیامۃ،	میرے پیرو اور پیغمبروں سے زیادہ
(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن	ہوں گے،
باب کیف نزل الوحی واوّل ما نزل)	

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے زمانہ کے ساتھ ختم ہوگئے، اور ان کو انہی لوگوں نے دیکھا جو اس وقت موجود تھے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک موجود رہے گا، اور اسلوب بیان، بلاغت، اور غیبی خبروں کے دینے کی وجہ سے اس کی

خالی ہون، تو وہ ایک لغو کلام ٹھہرے گا اور یہ محال ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید لفظاً اور معنی، دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، آگے چل کر ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ گذشتہ کتابین معجزہ تھین یا نہین ؟ اور اس عنوان کے تحت مین لکھا ہے کہ گذشتہ کتابین اس معنی مین معجزہ تھین کہ وہ خدا کا کلام ہین، اور قرآن مجید بھی خدا کا کلام ہے، تو جب اس حیثیت سے قرآن مجید معجزہ ہے، تو اور کتابین اور صحیفے بھی لازمی طور پر معجزہ قرار پائین گے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام گذشتہ کتابین اور صحیفے بھی اگرچہ خدا ہی کا کلام تھے لیکن وہ معجزہ نہین تھے، کیونکہ خود خداوند تعالی نے فرمایا ہے کہ لوگ ان کتابون اور صحیفون مین تحریف کیا کرتے تھے لیکن اگر وہ معجزہ ہوتین، تو اُن مین تحریف نہین کی جاسکتی تھی، اور تمام کتابین خدا کا کلام تو ضرور ہین لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ مین اور ایک شخص کے لئے تو معجزہ ہو لیکن دوسرے زمانہ اور دوسرے شخص کے لئے معجزہ نہ ہو، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے ہاتھ اور اُن کے زمانہ مین تو معجزہ تھا لیکن اُن کے زمانہ کے بعد معجزہ نہین رہا، یہی حالت اُن کی کتابون کی بھی ہے[۱]،

قاضی ابوبکر باقلانی اعجاز القرآن مین لکھتے ہین، اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ کیا خداوند تعالیٰ کا دوسرا کلام مثلاً توراۃ انجیل اور صحیفے بھی تمھارے نزدیک معجزے ہین ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان مین جو غیبی خبرین ہین، ان کے لحاظ سے وہ بھی قرآن مجید کی طرح معجزے ہین لیکن نظم و تالیف کے لحاظ سے ان مین کوئی کتاب معجزہ نہین، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ان مین کسی کتاب کے وہ اوصاف نہین بیان کئے، جو قرآن مجید کے بیان کئے ہین، نیز یہ کہ اُن کے متعلق تحدی نہین کی گئی ہے جیساکہ قرآن مجید کے متعلق کی گئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابون کی زبان مین فصاحت کے ایسے وجوہ نہین پائے جاتے، جن کی وجہ سے کلام مین مقابلۃً ایسے محاسن پیدا ہوجائین، جو حد اعجاز

---

[۱] تمہید ابوشکور سالمی صفحہ ۶۲،

فاستدل دکھا بالطیف طبعہ اور اپنی طبیعت کی لطافت کی وجہ سے

اس کو پاگئے،

حضرت انیسؓ خود شاعر تھے، وہ مکہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور واپس جاکر اپنے بھائی حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس کی اطلاع دی، تو انھون نے پوچھا کہ لوگ آپ کے بارے مین کیا کہتے ہین"؟ انھون نے جواب دیا، کہ لوگ آپ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہین"؟ لیکن مین نے کاہنون کی باتین سُنی ہین، لیکن محمد جو کچھ کہتے ہین وہ کاہنون کی بولی نہین، مین نے اُن کی باتون کو اوزان واصناف شعر کے مقابلہ مین رکھا تو وہ شعر بھی نہین، خدا کی قسم آپ سچے اور لوگ جھوٹے ہین[۵۱]

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات احادیث وسیر کی کتابون مین مذکور ہین، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہین،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کو گذشتہ انبیار کے مادی معجزات پر ہر حیثیت سے تفوق اور فضیلت حاصل ہے، لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ مین تورات وانجیل کا کیا درجہ ہے؟ ہمارے علماء نے چونکہ قرآن مجید کو فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ مانا ہے اور تورات وانجیل مین یہ فصاحت وبلاغت موجود نہین ہے، اس لئے وہ ان دونون کتابون کو معجزہ تسلیم نہین کرتے، چنانچہ تمہید ابوشکور سالمی مین جہان اعجاز قرآنی پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہین کہ قرآن مجید صرف اپنے الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے، اور بعض لوگ اس کو معنی کی بنا پر معجزہ کہتے ہین لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ لفظا ومعنی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، کیونکہ اگر ہم اسکو صرف معنی کی وجہ سے معجزہ تسلیم کرین تو اس سے گذشتہ انبیار کی کتابون کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ صحیح نہین ہے، اور اگر صرف لفظ کی وجہ سے معجزہ تسلیم کرین تو ایسی حالت مین اگر الفاظ معنی سے

---

[۵۱] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب اسلام ابی ذرؓ

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ قوموں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ بالمعنی بیان کئے گئے ہیں، یعنی خداوند تعالیٰ نے اُن کے معانی کو عربی زبان میں بیان کر دیا ہے، کیونکہ عجمی زبانوں میں یہ فصاحت نہیں پیدا ہو سکتی تھی،[1]

لیکن خداوند تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کو کہیں قرآن مجید کا وصف نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے یہ اوصاف بتائے ہیں،

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ، (بقرہ - ۱۲)	وہ رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے، ایمان والوں کو،
يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا، (نساء - ۲۴)	اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمھارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے،
فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ، (الانعام - ۲۰)	سو اب تمھارے پاس تمھارے رب کے پاس سے ایک کتاب واضح اور رہنمائی کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے،

اور قرآن مجید میں بعینہٖ یہی اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی بیان کئے گئے ہیں، مثلاً:-

وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ، (آل عمران - ۱)	اور اسی طرح بھیجا تھا توریت و انجیل کو اسکے قبل کے لوگوں کی ہدایت کے واسطے،

---

[1] اتقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵،

تک پہنچ جائین، ان زبانون مین جو کلام موجود ہے، وہ تقریبًا یکسان ہے، ہمارے اصحاب تمام زبانون کی یہی خصوصیت بیان کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ ان مین باہم وہ فرق و امتیاز نہین پیدا ہو سکتا جو عجیب و غریب طریقہ پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے، اس کو یون بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہان تک ہم کو ان زبانون کا علم ہے ان مین ایک چیز کے اس قدر متعدد نام نہین پائے جاتے، جس قدر عربی زبان مین پائے جاتے ہین (یعنی ان مین مترادف الفاظ موجود نہین) اس طرح ان مین ایک لفظ بہت سے معانی پر دلالت نہین کرتا، جس طرح عربی زبان مین ایک ہی لفظ بہت سے معانی پر دلالت کرتا ہے، (یعنی ان زبانون مین مشترک الفاظ موجود نہین) استعارات، اشارات اور استعمالات کے نادر طریقے بھی ان زبانون مین نہین پائے جاتے؛

اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ عربی مبین کی زبان مین ہے، اس کی یہ خصوصیت بہت سے مقامات مین بیان کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید کا درجہ اس سے بلند ہے کہ اس کو عجمی زبان مین نازل کیا جائے، اس لئے اگر اہل عجم کی زبان مین اسی قسم کی فصاحت پیدا ہو سکتی، تو خداوند تعالیٰ قرآن مجید کو اس سے بالاتر نہ سمجھتا اگرچہ عربی زبان مین قرآن مجید کے نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اہل عرب اس کو خود سمجھ سکین، اور اس کی تفسیر مین دوسرون کے محتاج نہ ہون، تاہم ہم نے جو فائدہ بیان کیا ہے وہ بھی ممکن ہے،

بہت سے مسلمان جو عربی زبان کے ساتھ ان زبانون کے بھی ماہر ہین، ان کے نزدیک ان زبانون مین وہ فرق و امتیاز اور وہ فصاحت نہین پائی جاتی جو عربی زبان مین پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ نہ تو خود توراۃ و انجیل کے ماننے والے اور نہ خود مسلمان ان کتابون کے معجز ہونے کا دعوی کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اعجاز قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے[1]۔

---

[1] اعجاز القرآن بر حاشیہ اتقان جلد اول ص۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹ ،

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ مِنْ	اور ہم نے موسیٰ کو اگلی امتون کے ہلاک کئے
بَعْدِ مَا اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى	پیچھے کتاب دی تھی، جو لوگون کے لئے دانشمندیون
بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً	کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ، (قصص - ۵)	حاصل کرین،
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدٰى وَ	اور ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ دے چکے ہین، اور
اَوْرَثْنَا بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ الْكِتٰبَ ○	ہم نے وہ کتاب بنو اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ
هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ، (مؤمن)	وہ ہدایت اور نصیحت تھی اہل عقل کے لئے،

غرض قرآن مجید کے جس قدر اوصاف قرآن مجید مین مذکور ہین، بعینہ وہی اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی مذکور ہین، اس لئے اگر ان اوصاف کی بنا پر جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا، قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کیا جائے تو توراۃ و انجیل کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور بعض محققین نے اس حیثیت سے ان کو معجزہ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ توراۃ یا انجیل یا زبور اس لئے معجزہ ہین کہ اُن مین علوم، غیبی خبرین اور امر و نہی وغیرہ موجود ہین، تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہین بلکہ یہ اُن پیغمبرون کی نبوت کی اور اس پیغمبر کی نبوت کی جس کی نبوت کی انھون نے خبر دی ہے، دلیل ہے، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہین کہ یہ کتابین معجزہ نہین ہین، اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح لفظ و نظم کی وجہ سے معجزہ نہین ہین، تو یہ ممکن ہے اور اس کا تعلق عبرانی زبان کے جاننے والون سے ہے، لیکن معانی یعنی غیبی خبرون اور امر و نہی کی وجہ سے توراۃ کے معجزہ ہونے مین کوئی شک نہین ہے، اور انبیاء کی کتابون کے معجزہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی آپ کی بعثت سے بہت پہلے خبر دیگئی ہے، اور بغیر خداوند تعالیٰ کی اطلاع دینے کے اس کا علم نہین ہو سکتا، [1]

---

[1] کتاب النبوات ص ۱۱۳،

إنا أنزلنا التوراة فيها هدى و نور- (مائدہ ۷-)

ہم نے توراۃ نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا،

وقفينا على آثارهم بعيسى ابن مريم مصدقا لما بين يديه من التوراة وآتيناه الإنجيل فيه هدى ونور ومصدقا لما بين يديه من التورىة وهدى وموعظة للمتقين (مائدہ ۷)

اور ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق فرماتے تھے، اور ہم نے اُن کو انجیل دی تھی جن میں ہدایت تھی اور وضوح تھا، اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے،

قل من أنزل الكتب الذى جاء به موسى نورا وهدى (الانعام-۱۱)

آپ کہئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے،

ثم آتينا موسى الكتب تماما على الذى أحسن وتفصيلا لكل شىء وهدى ورحمة، (الانعام-۲۰)

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو، اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے، اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو،

ومن قبله كتب موسى إماما ورحمة (ھود-۲)

اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے)

مستدل اس کے ساتھ استدلال کرے، یا نہ کرے، جو لوگ یہ کہتے ہین کہ نبوت کی دلیل اس وقت تک دلیل نہین ہو سکتی، جب تک دعویٰ نبوت کے ساتھ پیغمبر اس کے ساتھ استدلال نہ کرے یعنی جو لوگ دعویٰ نبوت، پیغمبر کے استدلال اور معارضہ کے مطالبہ سب کو دلیل کا جزو قرار دیتے ہین، وہ بہت غلطی پر ہین، بلکہ ان باتون سے سکوت اختیار کرنا بہتر ہے، اور ان باتون سے دلیل مین کوئی قوت نہین پیدا ہوتی، خداوند تعالیٰ نے

فلیاتوا بحدیث مثلہٖ، تو وہ لوگ بھی اس کے مثل ایسی ہی ایک بات بھی لائین،

اس وقت کہا جب کفار نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن مجید ایک بنائی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس قول کو دلیل کی شرط قرار نہین دیا، بلکہ جب وہ اُس کے معارضہ سے عاجز ہو گئے، تو اُس سے یہ دلیل مکمل ہو گئی،[۱]

دوسری جگہ لکھتے ہین کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام معجزات کے ساتھ تحدّی نہین کی گئی، آپ نے قرآن مجید کے ساتھ بھی ابتدائً تحدّی نہین کی، بلکہ اس وقت تحدّی کی جب کفار نے کہا کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے"[۲]

اس بنا پر اگر توراۃ و انجیل کے ساتھ تحدّی نہین کی گئی تو اس سے اُن کے معجزہ ہونے مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، لیکن اگر تحدّی ضروری سمجھی جائے، تو گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے ساتھ تحدّی نہین کی تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ توراۃ کو بھی تحدّی مین شامل کر لیا ہے،

---

[۱] کتاب النبوت ص ۱۴۲ [۲] ایضاً ص ۱۹۶

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ

"قرآن مجید کے معانی میں اس کے الفاظ سے زیادہ اعجاز ہے، اور توراۃ و انجیل میں جو معانی ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مثل ہیں، تو اس سے مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کی کتاب ہیں، اور اگر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے معجزہ کے مثل کوئی معجزہ لائے تو یہ ناممکن نہیں ہے[۵]"

توراۃ و انجیل کے ساتھ قرآن مجید کی طرح بے شبہہ تحدی نہیں کی گئی، لیکن معجزات کے لئے تحدی کوئی ضروری چیز نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "دلائل نبوت کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے کہ وہ دعویٰ نبوت کے ساتھ ساتھ ہوں، ان کو بطور حجت کے پیش کیا جائے، ان کے مثل لانے کی تحدی کیجائے، اور اس پر مخالفین کو آمادہ کیا جائے، اس قسم کی باتیں بعض معجزات کے ساتھ تو ضرور پیش آتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جن معجزات کے ساتھ یہ باتیں پیش نہ آئیں، وہ معجزہ ہی نہ ہوں، بلکہ اس سے انبیاء کے اکثر معجزات باطل ہو جائیں گے، کیونکہ ان میں یہ شرط موجود نہیں ہے، اور یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ دلیل کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ مدلول علیہ کا وجود لازمی طور پر پایا جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی مساوی یا راجح دلیل اس کی معارض نہ ہو، لیکن اگر کوئی دلیل ایسی موجود ہے، جس کی معارض کوئی مساوی اور راجح دلیل نہیں ہے، تو اس کو دلیل ماننا پڑے گا، چاہے مستدل یہ کہے کہ اس کے مثل پیش کرو "تم لوگ اس کے مثل پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے" یا نہ کہے، کیونکہ جب وہ دلیل فی نفسہ ایسی ہے جس کے مثل لانے پر لوگ قادر نہیں ہیں، تو مستدل کا یہ کہنا، اور نہ کہنا برابر ہے، نہ اس کے کہنے سے وہ دلیل بن سکتی، اور نہ اس کے نہ کہنے سے اس کی دلالت باطل ہوتی، دلیل بہرحال دلیل ہے، خواہ

---

[۵] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۷۷

مسلمانون کی حکومت مین غیر مسلم اقوام[۱]

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم مین مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانون کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک مین دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہین" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہین کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت مین بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر مین وہ مدتون گھومتے رہے ہین، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہین، یہ وہ زمانہ ہے جس مین سارے علوم و فنون جو غیر قومون سے منتقل ہو کر مسلمانون مین رواج پذیر ہوئے تھے، اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ مین بڑے بڑے نامور ہستیان چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھین، اس لیے نہین کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ

---

[۱] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی مین اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف مین بھیجدی تھی، لیکن گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۵۰ء مین شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر پڑا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر مین روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک مین ضائع ہو گیا، دل بیٹھ گیا، لیکن معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا دشوار کام کچھ نہین کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ — آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ

هُوَ اَهْدٰی مِنْهُمَا (قصص - ۵) — جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ و انجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ و انجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں لیکن قرآن مجید لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ و انجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ و انجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے، اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں ستاروں کی مقدار، اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اُس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[۱]۔"

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحابِ صورت را بہ بوار بابِ معنی را

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح [illegible]

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے جس دین کی طرف تنگ نظریوں، کوتاہ فکریوں کو منسوب کرنے کے لئے زور دیا جاتا ہے منسوب کر رہے ہیں، کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا، تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قوموں کے ساتھ ساری فراخ چشمیاں اور رواداریاں جن کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں کیا جاتا ہے ان کی ضمانت خود مسلمانوں کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی طرز عمل میں پوشیدہ ہے،

اس قسم کے چھوٹے موٹے ناقابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں جیسی کہ چاہیے گفتگو نہیں کر سکتے تھے، تو تاریخ خمیس وغیرہ میں لکھا ہے کہ

طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
ترجمانا وکان فی المدینۃ یہودی	ترجمان کو مدینہ میں ایک یہودی تھا، جو عربی
عارفا بالعربی والفارسی (ص ۳۵۲ خمیس ج ۱)	اور فارسی زبان سے واقف تھا،

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا،[۱]

---

[۱] غیر قوموں کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونوں کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرام جب عرب سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانوں کو بھی انھوں نے سیکھا، اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہؓ میں امام المحدثین سمجھے جاتے ہیں، خطیب نے تاریخ بغداد میں مشہور محدث ابراہیم حربی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابو ھریرۃ یکلم صبیانہ واھلہ بالنبطیۃ (ص ۲۰۶ ج ۵) یعنی ابو ہریرۃ اپنے بچوں اور اپنے گھر کے لوگوں سے نبطی زبان میں گفتگو کرتے تھے، عراق کے سواد دیہاتی علاقہ میں جو زبان بولی جاتی تھی اور فارسی و عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ میں صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابوں میں ملتے ہیں، بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجۂ بالا روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلؑ نے فارسی زبان سکھائی ۱۲

مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے، گویا یہ صورت حال اضطراری یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً یہ دعویٰ غلط ہوگا،

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانوں کے دینی احساسات میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے،

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غزالی مانا کہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہیں لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ غزالی سے سینکڑوں سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے نصف میں پیدا ہونے والے امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابوں میں یہ شہادت منسوب کی گئی ہے، یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصوں میں ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے،[1] اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے،

ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و — علم کے تہائی حصہ کو مسلمانوں نے یہود و

النصاریٰ (توالی التاسیس لابن حجر ؒ) — نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے،

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان میں پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری میں بھی اگر اس سے وہ خالی ہو چکے تھے تو اسکا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیوں کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ بجز ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ما لکم کیف تحکمون،

---

[1] بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس میں امام شافعی تھے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادبیات، ان ہی تین علوم کو اہمیت دیجاتی تھی، خود امام شافعی نے علم کی ان تینوں قسموں میں کمال پیدا کیا تھا، علم الادیان اور علم اللسان میں ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کا گو عام شہرت نہیں ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم میں بھی ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابیں مصر کے بعض اطباء نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی، (دیکھو توالی التاسیس ص ۶۶)

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال مین مسلمانون کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہین،

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہین، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبون سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک مین موجود تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا، ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے وہ یمن پہنچا، جہان اس زمانہ مین ایرانیون کی حکومت قائم تھی، لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب مین حارث نے یمن ہی مین حاصل کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیون سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جند سابور مین باضابطہ علاج و معالجہ مین حذاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا، طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا، اور عرب ہی مین عوام و خواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا،

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین موجود تھا، لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ مین نقل کیا ہے،

لا یصح اسلامہ (ص ۳۰۲ ج ۱) حارث کا مسلمان ہونا درست نہین ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مین اس نے اسلام قبول نہین کیا، اور جیسا کہ طبقات الاطباء مین لکھا ہے:

حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین بھی تھا، اور آیندہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا (ص ۱۱۰ ج ۱)

اس نے چارون راشدین خلفا اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا، مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف مین بلکہ ایام حج مین مکہ معظمہ پہنچکر علاج

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے، بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ

استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے
وابوبکر رجلا من بنی الدیل ھادیا	قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کر مدینہ کا
خریتا وھو علی دین قریش	راستہ بتائے گا، اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا یعنی
(بخاری ج ۱ ص ۳۰۱)	مسلمان نہ تھا۔

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں

عامل النبی صلی اللہ علیہ وسلم	خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ
یھود خیبر	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی، در اصل یہ اسی قوم سے نبوی معاملوں کو پیش نظر رکھکر جیسا کہ شارح بخاری (ابن بطال) کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

الفقھاء یجیزون استیجارھم	علمائے اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ
عند الضرورۃ وغیرھا	دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ
(حاشیہ بخاری)	ضرورت ہو یا نہ ہو،

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی حارث کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت مین حاصل ہوئے، کتابون مین لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حارث سے بسا اوقات طبی مسائل مین گفتگو بھی فرماتے، اور یہی طریقہ امیر معاویہؓ کا بھی تھا، سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانون پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک مین مسلمان جب پہنچے، اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتون کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہین کہ عمرو بن عاصؓ صحابی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچکر عمرو بن عاص کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تامسطیوس[1] تھا، لیکن مسلمانون مین یحیی نحوی کے نام سے مشہور ہوا، علاوہ طب و فلسفہ وہ دیکے دین مسیحی مین اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی دربار مین بڑا رسوخ اسے حاصل تھا، اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت مین رہا تھا، قیصر کی ذات سے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلو نیوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان مین فیلو نیوس مجتہد کو کہتے ہین، خالکدونیہ نامی مقام مین صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علماے دین مسیحی کی جو مجلسین ہوتی رہین، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جسمین (۳۴۶) اسقف یعنی پادریون نے نمایندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا،

مگر باوجود ان تمام باتون کے حضرت عمرو بن عاصؓ کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاصؓ نے بلایا،

واکرمه وری له موضعا اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اسکی

---

[1] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین پہلے نام کو اور تاریخ الحکما مین قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے، غیر عربی نامون کے متعلق عربون مین اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جانا محل تعجب نہین ہو سکتا، مسلمانون کے نام کو آج یورپ والے کن کن شکلون مین بگاڑ رہے ہین اسی پر قیاس کر لیجیے،

معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا، اور کیون جاری نہ رکھتا، معمولی تاریخی کتابون مین نہین بلکہ حدیث کی مستند کتابون مین ہم پڑھتے ہین کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے، تو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعد کو مشورہ دیا،

ایت الحارث بن کلدۃ اخا ثقیف — ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کیطرف

فانہ متطبب (ابوداؤد) — رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے،

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

عالج سعدا مما بہ (اصابہ ج اص ۲) — سعد جس مرض مین مبتلا ہین تم اسکا علاج کرو،

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانون نے آئندہ مسلسل قائم رکھا، ان مین خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کرکے صحابہؓ کو آپ نے دکھایا تھا،

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو مسلمانون کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے، خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر مین بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا، لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ، اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجایش اس مسئلہ مین باقی رہتی ہے کہ آئندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانون کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشا، خود مسلمانون کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا،

کے عہدِ آغاز یعنی عہد صحابہ ہی مین یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانون مین ان غیر مسلم طبیبون کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی،

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لیکر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیون کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانون کے عام علاقے غیر مسلم طبیبون سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورۂ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ دین سے بُعد یا طول امد کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا،

مین تو کہتا ہون کہ تاریخون مین یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دوا ساز ابو الحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم مین مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیون کے زمانہ مین اسی ابو الحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی، کہ کے عباسی گورنر عبد الصمد بن علی نے اپنے علاج کیلئے مکہ بلوایا[۵]، اور مسلمانون کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہین ہوا، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حارث بن کلدہ مکہ معظمہ مین مسلمانون کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انجام دے چکا تھا،

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات مین کیا ہے، یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبد الرحمٰن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہین اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہین کہ

کان عبد الرحمٰن ابو داؤد نصرانیا	عبد الرحمٰن جس کی کنیت ابو داؤد تھی ایک عیسائی تھا،
وکان رجلا من اھل الشام وکان	شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ
یتطبب فقدم مکۃ فنزلھا (ج ۵ ص ۳۶)	آیا، اور وہین رہ پڑا،

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبد الرحمٰن الطبیب النصرانی کے تذکرہ مین اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے

۵؎ دیکھیے طبقات الاطبا، ج ۱ ص ۱۱۹

(ص ۱۰۴) ان کی نظر میں قائم ہوگئی،

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

فلازمہ وکان لا یکاد یفارقہ اور اسکو عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھ رکھ لیا

(ص ۲۳۲) اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے،

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے،

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے، اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے عینوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطباء کے ہاتھوں میں ہے، جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابو الحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ میں مشہور تھا، اور ابو الحکم دواسازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ

جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن آثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح و شام اس سے گفتگو کرتے" (ص ۱۱۶ ج ۱)

اسی طرح ابو الحکم کے متعلق یہ لکھکر کہ کان طبیبا نصرانیا دینی وہ ایک عیسائی طبیب تھا لکھا ہے کہ

طبی امداد امیر معاویہؓ اس سے بھی حاصل کرتے تھے، اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے، (ص)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھکر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کی اسلام

ہی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل مین تنگی نہین محسوس کرتے تھے،

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانون کے گذشتہ آباء و اجداد جن تنگ نظری اور قومی و ملی عصبیت کے بعض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہین، کاش! اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہوکر مسلمانون کی تاریخ کا مطالعہ کرتے، تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ جن گذرے ہوئے بزرگون کو طعن و تشنیع کا آج نشانہ بنایا جارہا ہے، ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہین اتنی وسیع تھین، اور اسی بنا پر ایسی باتین وہ کر گذرتے تھے، کہ جن کو کرنا تو کرنا شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہین لا سکتے،

دور کیون جایئے، اسی طب و طبابت کے قصہ مین ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بختیشوع کے تذکرے مین یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار مین بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کرکے کہا کہ

"تم جانتے ہو میرے دل مین تمھاری کتنی جگہ ہے"

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانون سے بھرے ہوئے دربار مین کہنا شروع کیا کہ

"خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہان کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہین ہوتا اسی موقف مین) ہے، جبرئیل مین نے تیرے لیے دعائین کین، اور بہت زیادہ دعائین کین" (طبقات الاطباء، ج ا ص ۱۲۰)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانون مین جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہین، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہین کرسکتے کہ ہارون اس وقت کیا کہہ رہا تھا، اور غیر قومون کے ساتھ مسلمانون کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبۂ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جسے عمل کرکے ہارون نے دکھایا، مسلمانون پر جنھون نے احسان کیا ان کو وہ کہین نہین

کہ مکہ معظمہ مین اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہان قائم کیا تھا، ابن سعد کا بیان ہے کہ

عبد الرحمن یجلس فی اصل منارة المسجد الحرام من قبل الصفا (۸)	کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو منارہ تھا عبد الرحمن اسی منارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھا،

جیسا کہ مین نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجئے مسلمانون کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر مین آکر قیام کرتا ہے، جہان ان کی نمازون کا قبلہ اور بیت اللہ ہے جس کا وہ حج کرتے ہین، اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے منارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے، لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفائے قریش مین آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی، ابن سعد ہی مین ہے

ووالی آل جبیر بن مطعم بن عدی	موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے خاندان والون سے عبد الرحمن نے قائم کیا تھا،

آج دنیا مین ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہین، جہان اس لیے کہ مسلمانون کی آبادی اتفاقاً قلت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والون نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد اقتدار مین غیر قومون کے ساتھ موجودہ مسلمانون کے باپ دادون نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلہ مین تاریخ کی شہادتین کیا ہین ؟ یا جرم کی سزا ان لوگون کو دینی جنھون نے خود کوئی جرم نہین کیا ہے، مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمھارے باپ دادون نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً وعقلاً کس حد تک غیر مجرمون سے بدلہ لینا درست ہو سکتا ہے، ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے مین صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہون، اور پوچھتا ہون کہ مسلمانون کے ان ہی باپ دادون کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، جو اپنے مقدس ترین شہر مین بھی اپنی سب سے

و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی،

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبد العزیزؓ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ مین اطبا کے ساتھ مروانی حکمرانون کے جو تعلقات تھے، ان مین صرف یہی نہین کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابون مین لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان مین جو کیا تھا، اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالون کا بھی اضافہ اس کتاب مین اس کی طرف سے عمل مین آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبد العزیزؓ نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ مین رکھا، اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانون مین کتاب پھیلا دی جائے، (طبقات الاطبا، ص ۱۶۳ ج ۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ مین حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے مین یہودی اور عیسائی اطبا تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس مین سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات مین ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر بن عبد العزیزؓ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق مین بجائے مردہ سانپ کے نہ ڈالا جائے۔

الا حیة ذکیة (ص ۲۰۵ - ج ۵) مگر ذبح کیا ہوا سانپ،

حالانکہ سانپ خواہ میتہ (مردہ) ہو، یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال مین حرام ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا خیال بھی وہی تھا، جو بہت سے دوسرے ائمۂ اسلام کا ہے کہ حرام چیزون کا استعمال بھی جائز ہو جاتا ہے[۵]، مین خود طبیب نہین ہون، مجھے معلوم نہین ہے کہ تریاق مین

---

[۵] حرام چیزون سے دوا استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہین، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی اس باب مین یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطبا رصحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کرین، اس وقت تک ان کا استعمال

بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں، اور عدیہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان، اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نامقبول نہیں ہوتی، دربار سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ

"میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے،

اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے"

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا

صدقت یا امیر المومنین (رر) آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینیا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محل وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں باسانی اس علاقے کو بھی شریک کر لے سکتے تھے، مگر اسی جذبۂ امتنان و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشور کشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقوں میں گھستے چلے گئے، لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اس لیے نگاہ غلط انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی، حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے۔

کچھ بھی ہو، میرا ناچیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے تجربات سے استفادہ کے سلسلہ کو آئندہ جو جاری رکھا، اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت

مگر باوجود اس کے ہم اطبا کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خواب گاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ یہ مروانی حکمران عبدالملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا، تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابوالحکم رکھدی تھی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو حجاز بھیجا تھا، اسی ابوالحکم کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلالیا، اسکی روایت کے الفاظ ہیں :-

فانی لجالس وعنده بناته (ج ۱ ص ۱۱۶) — ترجمہ — میں عبدالملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبدالملک کی لڑکیاں بھی وہاں

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا، یا برقع اوڑھکر باپ کے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیاں آئی تھیں[۵۱]

میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جا سکتا ہے؟[۵۲]

---

۵۱ آگے جو قصہ ابوالحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبدالملک کا ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبدالملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے، عبدالملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

"ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے، اور چاہ رہا ہے کہ میں مرجاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں"

۵۲ صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطباء ہی میں ابوسہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابوسہل پیش ہوا، تو نام پوچھنے پر اس نے اپنا اصلی ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام "خرخشاذ ماہ طیماذاہ ماذرباد خسرو ابہشاذ" ہے اس طویل لمبے نام کو سنکر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمہارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہے اب وہی صورت، ان تمام الفاظ میں سے "طیماذاہ" کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں اُسی نام سے تم کو موسوم کیا جائیگا، یا جی چاہے تو اپنی کنیت "ابوسہل"

سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے، آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤں میں مسلمانوں کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آگئی ہے، ارباب علم و فتوی چاہیں تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس "اثر" سے سہولت کی راہ پا سکتے ہیں،

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار آیا، تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان زمانہ میں بھڑک اٹھے تھے، جس اسلامی نظام میں ایران کا نومسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج میں دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں[۱]،

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام میں بنی امیہ کے فرمانرواؤں نے عربی و عجمی موالی و غیر موالی کے سوال کو اٹھایا، اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، اس کلمہ منتنہ[۲] (بدبودار) سے نفع اٹھانے میں کمی نہ کی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) جائز نہ ہوگا یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے، تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہیے، لیکن دوسرے ائمہ کا فتوی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دواءً حرام چیزوں کا استعمال حرام ہی ہے، تفصیل کے لئے فقہ کے مطولات کا مطالعہ کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ میں لیا جاتا ہے یعنی دواءً حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر الدمیری نے حیات الحیوان میں نقل کیا ہے کہ جس تریاق میں سانپ ڈالا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے، جس میں قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے (ج ۱ ص ۲۴۵ حیات الحیوان دمیری) ۱۲، [۱] میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف ہے، ۱۲۔

[۲] عہد نبوت و رسالت میں نسلی وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی، دعوھا فانھا کلمۃ منتنہ (اسکو چھوڑو بھی بدبو بات ہے)

الوافر لا، ولا قتصاد الکثیر — کے ہاں سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی، اور یوں بھی اس کی بہت زیادہ خبر گیری کرتا تھا، (ص ۱۲۱ ج ۱)

یہ بھی لکھا ہو کہ جب تیاذوق مرض موت میں مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لئے براہ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ

لما حضرته الوفاة دخلت علیہ اعودہ، (ص ۱۲۳) — جب تیاذوق مرض الموت میں مبتلا ہوا تو میں اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لئے،

آج ان انعامات کے وزن کو ہم محسوس نہیں کر سکتے تھے لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا، اور نخوت و کبر میں اس کا جو حال تھا، ان امور سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ

"بقائے صحت کے متعلق تیاذوق کے بعض مشورہ کو میں نے اپنے تجربہ میں بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا"[لہ]

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیوں سے حجاج کے دل میں غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا، اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات میں گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں لوگوں نے تیاذوق کے متعدد لطیفوں کا ذکر کیا ہے جن میں اُس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر

لہ اگر یہ واقعہ ہو جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ بعضوں نے حجاج کو دسترخوان پر کھاتے ہوئے پایا جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انھیں وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی میں ایک کف دست

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم تھا، حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں جو اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارہ چشم بدل دیا تھا، اس کے لئے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطبار کو اپنے ارد گرد جمع کر لیتا، خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطبار کا ذکر لوگوں نے کیا ہے، یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا، اور اس کو بھی جانے دیجئے، حجاج کے لئے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ چند سال کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لئے عربی النسل اطبار کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی سب سے زیادہ سربرآوردہ اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی ہی تھا، نام اس کا لوگ تیا ذوق بتاتے ہیں، لفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل شکل ہو، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب "اخبار الحجاج" گذر چکی تھی، جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کئے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کے تیا ذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ

کان یعتمد علیہ ویثق بمداواتہ	حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا، اور
وکان لہ منہ الجامکیۃ	اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا، حجاج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) رکھ لو، ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا، اور بعد کو "ابوسہل" کے نام سے مشہور ہوا جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی، ۱۲

خاقان بھی[۵]"

سوچا جا سکتا ہے کہ اپنی ہمرشتہ قومون کے افراد کے ساتھ حسن سلوک مین اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگون سے وہ آگے بڑھ گئے ہون، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے،

افسوس ہے کہ مروانیون کے اسی سال کے دورِ حکومت مین دربار سے جن جن اطباء کا تعلق رہا، لوگون نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابون مین نہین کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی مین پاتے ہین کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لئے تیاذوق نے "کناش کبیر" بھی لکھی تھی، اور کتاب الادویہ بھی جس مین بیان کیا ہے کہ

کیفیۃ دقھا وایقاعھا وذابتھا	دواؤن کے کوٹنے اور اُن کے ڈالنے
وشیء من تفسیر الادویۃ،	گھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کئے
	گئے تھے، اور بعض دواؤن کے نام کی
(صفحہ ۱۳۲)	بھی تشریح کی تھی،

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردون کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی جن مین ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطباء مین لکھا ہے کہ

کان تیاذوق المتطبب یقدمہ	تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن
علی جمیع تلامذتہ،	شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردون

---

[۵] عام تاریخون مین یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ کہا کرتا تھا،

انا ابن کسری وابی مروان   وقیصر جدی وجدی خاقان

مسعودی ص ۲، ابن کامل اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے ہین کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام سادیہ بنت فیروز تھا، کہتے ہین کہ اس مین واقعی ایران کے کسریٰ روم کے قیصر ترکون کے خاقان کا خون شریک تھا، ۱۲

میں درد تھا، تیاذوق بلایا گیا، اُس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤں پر گرم پانی ڈالا جائے اور تیل کی مالش کی جائے
ایک خواجہ سرا جو عموماً خصی ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر میں ہے
اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤں دھویا جائے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعوی کی
دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمھارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہاں تھی؟
ڈاڑھی تمھارے چہرے سے غائب ہو گئی، خواجہ سرا شرمندہ ہو گیا،

بہرحال عبدالملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہونچے تھے، بداوت کے یا دھقانیت سے زیادہ دور نہیں ہوئے تھے، جب اُن کے درباروں میں غیر مسلم اطبا کو عزت و جاہ کی ان بلندیوں پر ہم پا رہے ہیں، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ ان مروانی حکمرانوں کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبوں کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہونچ گئی ہو گی، جنھوں نے شاہی خانوادہ میں پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانوں میں جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جو فخر کرتے تھے کہ میں کسریٰ کا بیٹا ہوں، اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہوا ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) لگن بھرتا اور گھٹتا جاتا تھا، اس طرح (۸۰) لقمے میں نے اس کے گنے غالباً تیاذوق کی دواؤں نے اس کے معدے میں ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو ابن عساکر ج ۵ ص ۲۰) طبقات الاطبا میں ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجئے، اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے، حجاج نے درباریوں سے کہا کہ بھنے ہوئے پستوں کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے، کہتے ہیں کہ مختلف درباریوں کے گھر سے بھنے ہوئے پستوں کے خوان کے خوان نازل ہونے لگے، حجاج نے بھی مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا، اور اتنا کھا گیا کہ بدہضمی ہو گئی، تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! میں نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کرکے اسے چکھئے گا، آپ نے تو پھانکنا شروع کیا، حجاج شرمندہ ہو گیا، پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہو گئی

نہین پایا جاتا، لیکن جب عباسیون نے اپنے ہاتھ مین مسلمانون کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ مین پیش آیا، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

عباسیون نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین زیادہ تر کامیابی غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرتًا ان کا دربار عجمیون سے بھر گیا، عمومًا مالی کاروبار کا عباسیون کے زمانہ مین یہودی جھبذون یا موجودہ اصطلاح مین یہودی بنیک کارون سے تعلق تھا،

عباسیون کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطبار اور معالجین کا قصہ ہے، آیئے پہلے اس کو سُن لیجئے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے "جہابذہ" کی داستان بھی سُنائی جائیگی، اگر "اجل مسمی" نے فرصت نہ دی تو مین دوسرے ارباب علم و قلم سے درخواست کرتا ہون کہ آیندہ اس مضمون کی تکمیل فرما دین گے،

سچ پوچھئے تو غیر مسلم اطبار کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیون ہی کا عہد ہے، ان کے دربار مین یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اطبار کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبون کا بھی داخل ہو گیا تھا، کہتے ہین کہ عباسیون کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور ضعف معدہ مین مبتلا تھا، اچھا نہ ہوتا تھا، ایک ہندوستانی طبیب نے پھنکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی، اور اُس کے دل مین ہندی طریقۂ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندی علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیون کے دربار مین "ہندی طب" بلکہ دوسرے ہندی علوم و فنون کی روشناسی مین بہت دخل ہے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہون، ہندوستانی اطبار کی کافی تعداد مختلف زمانہ مین بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابون کا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، اردو زبان مین کافی مواد اس مسئلہ مین جمع ہو چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطبار، اور ہندی طب کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین ان کی فہرست درج کی ہے، جس مین دلچسپ بات یہ ہے، کہ منجملہ اور

پر ترجیح دیتا تھا، (جلد ۱ صفحہ ۱۶۱)

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

خدم الحجاج بن یوسف و هو حدث — اُس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ میں خدمت کی تھی، جب یہ یہودی طبیب جوان تھا، (ج ۱ ص ۱۶۱)

فرات نے کافی عمر پائی، مروانیون کا دور بھی ختم ہوگیا، اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار میں فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسٰی بن موسیٰ نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسٰی کا وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسٰی کہا کرتا تھا کہ

فرات! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہوکر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہیں، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا، (صفحہ ۱۶۳)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشوروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں، افسوس ہے کہ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ان کے پڑھنے سے ایک طرف جہاں اس کا پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبوں پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانوں کے سلاطین و امراء کرتے تھے، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدر شناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیوں پر مبنی تھے،

جیسا کہ میں نے عرض کیا، مروانی حکمرانوں کے دربار کے ان طبیبوں کا تفصیلی تذکرہ کتابوں میں

نام و نسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہین تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے، کہ مرتزقہ کے سوا

رُبّما اجتمعوا فی مجلسہ منھو	بسا اوقات، (غیر تنخواہ دار اطبا) میں
عشرون رجلاً	بیس بیس آدمی اس کی مجلس مین جمع ہو جاتے تھے،

افسوس ہے کہ لوگون نے مفصل فہرست ان طبیبون کی نہین دی ہے، جو مختلف عباسی خلفاء کے دربار سے تعلق رکھتے تھے لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل مین ایسی چیزین مل جاتی ہین، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، جس مین اُس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان بیان کی ہے، اسی رسالہ مین حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطبا رجو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہین، اور خلفار کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے، ان کی تعداد،

ستۃ وخمسون رجلاً کلھو	چھپن ہے، اور سب ہمارے ہم
من اھل المذھب، (صلـ۱۹۳)	مذہب ہین،

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہون گے، جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہین کہا جا سکتا کہ اُن کے مددگارون، دواسازون وغیرہ کی تعداد کیا ہوگی،

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتون کی بنا پر میرا خیال ہے کہ طب اور علاج معالجہ کی راہ سے عباسی دور مین غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والون نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہوگی، ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت و فراخی کا تصور کیجئے، اور سوچئے کہ اس وسیع علاقے کے باشندون

کتابوں کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام علاجات النساء تھا، یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

کتاب روسی الهندیہ فی علاجات النساء، (ج ۱ صفحہ ۳۲) — روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتوں کے علاج کے متعلق ہے،

میں نہیں جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اس نے انجام دی تھی، دوسروں نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہیں، اور اس زمانے میں اس کے متعلق لوگوں کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو، مسلمانوں کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے حوالہ کرکے میں اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں،

سب سے پہلے تو اس سلسلہ میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطباء کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی عہد کے امراء بھی اپنے ہاں طبیبوں کی ٹولیوں کو ملازم رکھتے تھے طبقات الاطباء میں مشہور عباسی امیر ابودلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان مجلس ابی دلف مجمعا للمتطببین، — ابودلف کی مجلس میں طبیبوں کا مجمع رہتا تھا،

طبیبوں کے اس مجمع میں جو لوگ شریک تھے، ان میں بعضوں کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان معہ من المرتزقۃ جماعۃ منھم یوسف بن صلیبا و سلیمان بن داؤد بن بابان و یوسف القصیر و یونس بن حنون، (ج ۱ ص ۱۶۸) — امیر ابودلف کیساتھ تنخواہ یاب اطباء کا ایک گروہ تھا، جن میں یوسف بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان، یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے،

خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ

از

حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبون کی طرح علم و فن کے شعبہ مین بھی خواتین کے کارنامون کا بہت کم سراغ ملتا ہے، خاص طور سے عرب مین تو اس صنف کی حالت اور زار و زبون تھی، پورے ملک مین مشکل سے دو چار عورتین پڑھی لکھی مل سکتی تھین لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ مین مردون کی طرح عورتون مین بھی اُس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ان کی دنیا بدل گئی، اور زندگی کے مختلف شعبون کے ساتھ علم و فن مین بھی انھون نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، اور اسلام کا یہ چشمۂ فیض عرب ہی تک محدود نہین رہا بلکہ ساری دنیا اس سے سیراب ہوئی،

لیکن سوءِ اتفاق سے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ مین پردہ کی وجہ سے مسلم خواتین زندگی کے کسی شعبہ اور خاص طور سے علم و فن مین کوئی خاص حصہ نہین لے سکین، اور نہ انھون نے کوئی قابلِ ذکر یادگار چھوڑی، اور اس زمانہ مین بھی اُن کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، پھر اسی وہم و خیال کے ماتحت یہ نتیجہ نکالا جاتا ہو کہ پردہ مین رہ کر مسلم خواتین کی ترقی ممکن نہین ہو، اس لئے ضرورت ہو کہ ان کو اس قید سے آزاد کر کے میدانِ عمل مین آنے کی اجازت دیجائے، کہ وہ بھی مردون کے دوش بدوش زندگی کی جد و جہد مین حصہ لے سکین، اس وقت اس پر بحث کرنا مقصود نہین ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور مسلم خواتین کی واقعی ترقی پردہ میں رہ کر ہو سکتی ہے، یا اس قید سے آزاد ہو کر، لیکن تاریخ سے مذکورۂ بالا خیال کی تائید نہین ہوتی

کی طبی ضرورتون کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیون کی ضرورت تھی، چونکہ اس پیشہ کو مسلمانون نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا، اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیون کے زمانہ مین طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والون کی تعداد لاکھون سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتون کو ترک کر کے یا ان سے لاپروائی اختیار کر کے مسلمانون کے دلون مین ان لوگون نے جگہ پیدا کی تھی،

(باقی)

جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے لئے زیادتی شوق کا سبب بن جاتی ہے، مثلاً غسل جمعہ کے سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس دن غسل کرنا چاہئے، اول الذکر دو صحابی صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کا غسل ضروری ہے، مگر حضرت عائشہؓ نے اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دی ہے، فرماتی ہیں :

كان الناس ينتابون من منازلهم	لوگ اپنے اپنے گھروں اور مدینہ کے باہر
والعوالي فيأتون في الغبار تصيبهم	کی آبادیوں سے نماز کے لئے آتے تھے، اُن
الغبار والعرق تخرج منهم العرق	گرد و غبار اور پسینہ میں شرابور ہوتے تھے
فاتى رسول الله صلى الله عليه وسلم انسان	ایک دفعہ ایک صاحب آپ کے پاس آئے
منهم وهو عندي فقال النبي صلى الله	وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے، آپ نے ان
عليه وسلم لو انكم تطهرتم ليومكم هذا	سے فرمایا کہ اگر تم آج کے دن غسل کر لیتے
(بخاری کتاب الجمعہ)	تو کیا بہتر ہوتا،

ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ نے اسے دائمی حکم سمجھا، حضرت عائشہؓ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ یہ حکم واجب اور دائمی نہیں، بلکہ مستحب ہے، اس حکم سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ قربانی کا گوشت لوگ جمع نہ کریں، بلکہ دوسروں کو کھلا پلا دیا کریں۔[1]

بعض مرتبہ راوی کو پوری حدیث محفوظ نہیں ہوتی تھی، صرف حدیث کا ایک ٹکڑا یاد رہ جاتا تھا یا روایت کے مغز سخن تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جب وہ حدیث روایت کی جاتی تھی تو روایت کا پورا مفہوم سامنے نہیں آتا تھا، بلکہ بسا اوقات معنی بھی بدل جاتے تھے، حضرت عائشہؓ جب بھی ایسی حدیث سنتی تھیں، تو اُن کی تصحیح یا

---

[1] سیرت عائشہ ص۱۴۳۔

بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک سیکڑوں ہزاروں پردہ نشین مسلم خواتین نے حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے گوشۂ علم و فن سے لیکر میدانِ جہاد تک ہر شعبۂ زندگی میں حصہ لیا، اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں اپنا پورا حق ادا کیا، اس مضمون میں صرف اُن کی علمی کوششوں کے ایک گوشہ یعنی علمِ حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے،

خواتین نے علمِ حدیث کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی سب سے پہلی نمائندگی صحابیات پھر تابعیات کرتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے انہی کے کارناموں کا اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

صحابہ کی طرح صحابیات بھی اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ کی نہیں تھیں، اور نہ سب کو یکساں طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لئے اُن کی خدمات بھی اسی کے اعتبار سے کم و بیش ہوں گی، کیونکہ حدیث کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبت اور فہم و فراست ہی کی تھی، صحابیات میں ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر لحاظ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی، اس لیے اس سلسلہ میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، اُن میں بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے کارنامے سب سے زیادہ ہیں،

حضرت عائشہؓ مکثرین رواۃ صحابہ (یعنی وہ صحابہ جن کی روایات .... کثرت سے موجود ہیں) میں ہیں، ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جن میں ۲۰۰ حدیثیں بخاری و مسلم میں موجود ہیں ، مرویات کی کثرت کے لحاظ سے صحابہ میں ان کا چھٹا نمبر ہے،

روایت کی کثرت کے ساتھ احادیث سے استدلال اور استنباطِ مسائل اُن کے علل و اسباب کی تلاش و تحقیق میں بھی اُن کو خاص امتیاز حاصل تھا اور انکی اس صفت میں بہت کم صحابہ اُن کے شریک تھے، کتبِ حدیث میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت متعدد صحابہ سے مروی ہوتی ہے، وہ حضرت عائشہؓ بھی وہی روایت کرتی ہیں، لیکن وہ اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت کا بھی تذکرہ کر دیتی ہیں

روایت کرنے والوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے،

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ ممتاز نظر آتی ہیں، محمد بن لبید کا قول ہے،

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ازواج مطہرات کو کثرت سے احادیث یاد تھیں،
یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ	لیکن حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سب سے زیادہ
وسلم کثیرا ولا مثلا لعائشۃ وام سلمۃ[۱]	ممتاز تھیں،

انھیں حدیث سننے کا بیحد شوق تھا، ایک مرتبہ گھر میں بال گندھوا رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے زبان مبارک سے جون ہی ایھا الناس (اے لوگو) نکلا آپ نے مشاطہ سے کہا کہ بال باندھ دو، اس نے کہا جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایھا الناس ہی کہا ہے، بولیں کیا خوب ہم آدمیوں میں نہیں ہیں؟ اس کے بعد خود بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اور پورا خطبہ سنا،[۲]

حضرت عائشہؓ حدیث میں گو خود بلند درجہ رکھتی تھیں لیکن بعض مرتبہ انھیں بھی ام سلمہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے، بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، حضرت عائشہ کے پاس تصدیق کے لیے آدمی بھیجا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث ام سلمہؓ نے پہنچی ہے، حضرت ام سلمہؓ کے پاس آدمی گیا، اور قول نقل کیا، تو فرمایا کہ" اللہ تعالیٰ عائشہ کی مغفرت کرے، انھوں نے بات نہیں سمجھی، کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے[۳]"،

حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد (۳۷۸) ہے، ان کے فتاوے بھی کثرت سے ہیں، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے (ص ۱۳ ج ۱) ان کا شمار محدثین کے تیسرے طبقہ میں ہے، حضرت ام سلمہؓ کے تلامذہ حدیث میں بے شمار تابعین، اور بعض

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶ [۲] مسند ج ۶ ص ۳۰۲ [۳] بخاری ج ۲ ص ۶۲۶

تردید کر دیتی تھین، اس سلسلہ مین انھون نے اکابر صحابہؓ تک سے اختلاف یا ان کی روایات پر استدراک کیا ہے، تقریباً ایسی چالیس احادیث ہین جن مین انھون نے صحابہ پر استدراک کیا ہے، امام سیوطی نے ان روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کا نام عین الاصابہ ہے، اس کے دیکھنے سے احادیث میں ان کی دقت نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، توضیح کے لیے دو ایک مثالے پیش کیے جاتے ہین، ایک دفعہ لوگون نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین کہ تین چیزون مین بدشگونی ہے، عورت مین، سواری مین، اور گھر مین، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہؓ نے پوری حدیث نہین سنی، پوری حدیث یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے وہ کہتے ہین کہ بدشگونی تین چیزون مین ہے، عورت مین، گھوڑے مین اور گھر مین، ابوہریرہ نے حدیث کا آخری ٹکڑا تو سنا اور پہلا نہین سنا[۵]،

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والون کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے کبھی یہ نہین فرمایا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن ایک یہود کے جنازہ پر سے گذرے، اس کے گھر والے اس کا ماتم کر رہے تھے آپ نے فرمایا یہ روتے ہین اور اس پر عذاب ہو رہا ہے" یعنی مقصود یہ ہے کہ یہ تو رو رہے ہین، اور مردہ اپنے اعمال کی سزا مین مبتلا ہے پھر فرمایا کہ ہر شخص اپنے فعل کا جواب دہ ہے، اور استدلال مین یہ آیت تلاوت کی،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی — اور کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہین اٹھائیگا"

عین الاصابہ مین اس کی اور بہت سی مثالین ہین، حضرت عائشہؓ سے جن بزرگون نے حدیث مین استفادہ کیا ہے، ان مین بہت سے صحابہ اور کبار تابعین ہین مثلاً عروہ بن زبیر، سعید بن المسیب، عبداللہ ابن عامر، مسروق، عمرو بن میمون، اجدع، عکرمہ، علقمہ، صفیہ بنت عبید، عطا بن یسار، یہ چند نام لکھ دیے گئے ہین، ورنہ ان سے

---

۵ عین الاصابہ

سے (۱۱) حدیثیں حضرت مسند میں مروی ہیں، علمی اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس
اور امام زین العابدین ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان بزرگوں کے علاوہ عائشہ بنت انس سلیمان
ابن یسار، ابو سلمہ، نافع مولی ابن عمر، وغیرہ ان کے رواۃ میں ہیں[۱] حضرت ام ہانی گو قدیم الاسلام نہیں تھیں۔ لیکن
ان کی روایت سے (۴۶) حدیثیں مسند میں موجود ہیں، ان کے رواۃ کی تعداد بیس کے قریب ہے ان میں
عبد اللہ بن عباس کے علاوہ متعدد کبار تابعین مثلاً امام شعبی، عروہ بن زبیر، مجاہد، ابن ابی لیلی، عطاء بن
یسار، کریب، محمد بن عقبہ وغیرہ ہیں،

خانوادۂ صدیقی میں حضرت اسماء بنت عمیس حضرت صدیق کی زوجہ محترمہ، اور حضرت اسماء
آپ کی صاحبزادی روایت حدیث میں ممتاز تھیں، بلکہ عام صحابیات میں کثرت روایت کے اعتبار
سے ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اسماء بنت عمیس سے (۶۰) حدیثیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکر
سے (۵۶) حدیثیں مروی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، جن میں حضرت
عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن زبیر جیسے صحابہ اور سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر
فاطمہ بنت علی، ام عون، عبد اللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ جیسے تابعین اور تابعات شامل ہیں، ان کے
علاوہ فاطمہ بنت قیس، شفاء بنت عبد اللہ، زینب بنت ابی معاویہ، اسماء بنت یزید، زینب بنت ابی سلمہ و
سبیعہ بنت الحارث وغیرہ بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہیں،

مسانید صحابیات | صحابیات کی کثرت روایت اور ان کی خدمت حدیث کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے
امام احمد بن حنبل نے ایک سو چھتیس صحابیات کی مسانید جمع کی ہیں، جن کی مجموعی ضخامت ۲۴۶ صفحات
ہیں ان میں کئی ہزار حدیثیں ہیں، حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں ۳۰۸ صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے،
اسی طرح اسد الغابہ اور اصابہ میں ۵۰۰ سے زائد صحابیات کے تراجم موجود ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی صحابیہ

---

[۱] اصابہ و مسند۔ [۲] اسد الغابہ ج ۵ اور تہذیب ج ۱۲

صحابہ شامل ہین، چند مشاہیر کے نام یہ ہین :-

اسامہ بن زید، سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب، عبداللہ بن رافع، نافع مولی ابن عمر، عروہ بن زبیر، عکرمہ، ابوسلمہ، ابوعثمان النہدی، ہند بنت الحارث، خیرۃ والدۂ حسن بصری، زینب آپ کی صاحبزادی

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات نے بھی حدیث کی روایت اور اشاعت مین حصہ لیا، حضرت حفصہؓ سے مسند مین (۶۰) حدیثین مروی ہین، حدیث مین ان سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ روایت کرتے ہین، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ حدیثین مروی ہین اور انکے تلامذۂ حدیث بھی کچھ کم نہین ہین، مثلاً عروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، ابو صالح السمان وغیرہ، حضرت میمونہؓ سے (۴۶) حدیثین منقول ہین، ان سے روایت کرنے والون مین حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبدالرحمن بن سائب، یزید بن عاصم، عطاء ابن یسار وغیرہ ہین، آنحضرت صلعم کی صاحبزادیون مین حضرت فاطمہؓ سے بھی متعدد روایتین مروی ہین،

عام صحابیات مین مشکل ہی سے کوئی صحابیہ ایسی ہونگی جن سے کوئی نہ کوئی روایت موجود نہ ہو، جن سے متعدد روایتین موجود ہین، ان کے نام مع تعداد حدیث یہ ہین،

حضرت ام الفضلؓ ان سے (۳۰) حدیثین مروی ہین، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہین، حضرت ام رومانؓ اور ام سلیمؓ سے بھی چند حدیثین مروی ہین، ام سلیمؓ سے بڑے بڑے صحابہ مسائل دریافت کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ مین حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ مین اختلاف ہوا، تو دونون بزرگون نے ان ہی کو حکم مانا[۱]، ان دونون بزرگون کے علاوہ متعدد صحابہ اور تابعین نے ان سے روایت کی ہے، حضرت ام عمارہؓ اور حضرت ام عطیہؓ سے بھی متعدد روایتین منقول ہین، حضرت ام عطیہؓ سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت انسؓ، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، صحابہ و تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے[۲]، حضرت ربیع بنت مسعودؓ

---

[۱] مسند ج ۶ ص ۴۳۰ [۲] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۵

ثقہ اور حجۃ کہا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے، جن احادیث کا انھیں علم تھا ان پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں، ابوقتیبہ بیان کرتے ہین کہ ایک بار مین ان کی خدمت مین حاضر ہوا، ان کے پیٹ مین درد تھا، انھون نے مجھ سے درد کا حال بتایا، بعض لوگون نے مشورہ دیا کہ کچے گھڑے مین رکھی ہوئی نبیذ ان کو استعمال کرائی جائے (اس مین نشہ آجاتا ہے) چنانچہ مین نے ایک پیالہ نبیذ لاکر ان کے سامنے پیش کیا، انھون نے نبیذ دیکھکر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا، اللہ کی پناہ! تم کو معلوم نہین کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے نبیذ جر سے منع فرمایا ہے، خیر تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ کافی ہے، خدا کی شان کہ وہ پیالہ الٹ گیا، اور نبیذ زمین پر گر پڑی اور ان کو افاقہ بھی ہوگیا[1]

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص۔ مشہور صحابی حضرت سعدؓ کی صاحبزادی تھیں، چھ امہات المومنین کو دیکھا تھا، اپنے والد حضرت سعدؓ اور ام ذرہؓ سے روایت کی ہے، ان سے روایت کرنے والون مین تابعین ہین، امام ذہبی نے ان کا شمار حفاظ حدیث مین کیا ہے، اور تابعین کے تیسرے طبقہ مین ان کو جگہ دی ہے[2] یہ تنہا خاتون ہین جن سے امام مالک نے روایت کی ہے[3] ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے ۱۱۷ھ مین وفات پائی،

صفیہ بنت ابی عبید۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ تھیں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، قاسم بن محمد وغیرہ سے روایت کرتی ہین، ان سے متعدد کبار تابعین مثلاً سالم بن عبداللہ، نافع، عبداللہ بن صفوان وغیرہ نے روایت کی ہے، عجلی نے ان کو تابعیہ ثقہ لکھا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[4]

عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت ابوبکرؓ کی نواسی تھیں، اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہین، ان سے جلہ تابعین نے روایت کی ہے، ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، عجلی مدنیۃ تابعیۃ

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۷ [2] ایضاً ج، ق ۱ ص ۳۰۹ [3] ایضاً ج ۱۲ ص ۴۳۶ [4] ایضاً ص ۴۳۰

ہون گی جن سے کوئی روایت نہ موجود ہو، تہذیب میں ۳۳۲ عورتوں کا تذکرہ ہے، جن میں بیشتر صحابیات ہیں،
اگر ان تمام صحابیات کی روایتیں جمع کی جائیں تو ان کی مسانید کے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی، کاش اللہ تعالیٰ
کسی کو اس کی توفیق دیتا کہ وہ ان کی مسانید کتب احادیث سے چھانٹ کر ایک جگہ جمع کر دیتا تو بڑا مبارک
اور مفید کام انجام پا جاتا،

تابعات | صحابیات کی صحبت میں جن خواتین نے پرورش پائی یا ان سے استفادہ کیا ان کو تابعات کہا
جاتا ہے، صحابیات کی طرح تابعات نے بھی فن حدیث کی حفاظت و اشاعت اور اس کی روایت اور
درس و تدریس میں کافی حصہ لیا، اور بعض نے تو اس فن میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ بہت سے کبار تابعین نے
ان سے اکتسابِ فیض کیا، چند مشہور تابعات کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

حفصہ بنت سیرین، انھوں نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے جن میں انس بن مالک،
ام عطیہ، ام الرائح، خیرۃ ام الحسن البصری، ابو العالیہ، ربیع بن زیاد وغیرہ ہیں، ان سے روایت کرنے والوں
میں ابن عون، خالد الحذاء، قتادہ، ہشام بن حسان وغیرہ تابعین شامل ہیں، جرح و تعدیل کے امام
یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ حجۃ فرمایا ہے۔ ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ ما ادرکت احداً افضلہ
من حفصۃ میں نے حفصہ سے زیادہ فضیلت والا کسی کو نہیں پایا، ان کے اس فضل کا اندازہ اس سے
ہوتا ہے کہ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے قرآن و حدیث پڑھ لیا تھا،
امام بخاری اور ابو داؤد نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے، [1] سنہ ۱۰۱ھ
میں وفات پائی، امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے، [2]

حا ذقہ بنت عبد اللہ۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور ام عمرو سے اور ان سے
ابو قلابہ، قتادہ، یزید الرشک، ابو عاصم حسن بصری کی والدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، یحییٰ بن معین نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۹ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

ان سے روایت کرنے والون مین امام شعبی، محمد بن سیرین، مقدام بن شریح اور عبد اللہ بن شبرمہ وغیرہ کبار تابعین

ہین، ابو داؤد اور نسائی مین ان کی روایات موجود ہین عجلی نے تابعیہ ثقہ لکھا ہے، [۱]

ام الدرداء صغریٰؓ۔ حضرت ابو درداءؓ کی بیوی تھین، اور عمر مین ان سے بہت چھوٹی تھین، یہ

یتیم تھین، حضرت ابو درداءؓ نے ان کی پرورش کی تھی، اور وہ چھوٹی ہی عمر سے ہر وقت حضرت ابو درداءؓ

کے ساتھ رہتی تھین، اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسون مین شریک ہوتی تھین، ان ہی کی تربیت کا

فیض تھا کہ تابعین کے دوسرے طبقہ مین شمار کی جاتی ہین، انھون نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ

فضالہ بن عبید اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے علاوہ ام الدرداء الکبریٰ صحابیہؓ سے کثرت سے روایت

کرتی ہین، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وھی تروی عنھا الحدیث الکثیر [۲] یہ ام الدرداء کبریٰ سے بہت کثرت سے حدیثین

(تہذیب ج ۲ ص ۴۶۶) روایت کرتی ہین

ان سے روایت کرنے والون مین تقریباً بیس تابعین ہین جن مین زید بن اسلم، مکحول الشامی، مرزوق

التیمی اور عون بن عبد اللہ وغیرہ ہین،

خیرہؓ حضرت حسن بصری کی والدہ ہین، یہ حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھین، اور ان ہی سے استفادۂ

حدیث بھی کیا تھا، حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کرتی ہین، ان سے ان کے دونون صاحبزادے

حسن اور سعید اور علی بن زید، حفصہ بنت سیرین وغیرہ روایت کرتے ہین،

ان مذکورۂ بالا تابعات کے علاوہ بے شمار تابعات ہین، جنھون نے اس فن کی ترقی واشاعت

مین حصہ لیا ہے، چند نام یہان درج کیے جاتے ہین،

جبلہ بنت مصفح، جسرہ بنت دجاجہ، جمیلہ بنت واثلہ، حبابہ بنت عجلان، حبیبہ بنت میسرہ

---

[۱] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۴ [۲] ایضاً

ثقہ لکھتے ہیں، ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ ان کے فضل کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، اور اہل علم ان کا ادب کرتے تھے[۱]۔

عمرۃ بنت عبد الرحمن۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خاص تربیت یافتہ اور ان کی احادیث کی امین تھیں، ابن حبان کا قول ہے کہ کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ (حضرت عائشہؓ کی احادیث کی سب سے بڑی جاننے والی تھیں) ابن المدینی فرماتے ہیں حضرت عائشہؓ کی حدیثوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرۃ، قاسم اور عروہ کی ہیں[۲]۔ عمرہ کے بھائی محمد بن عبد الرحمن فرماتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ ما بقی احد اعلم بحدیث عائشۃ (اس وقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے بڑا جاننے والا کوئی موجود نہیں ہے) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ابن حزم کو خاص طور سے لکھا تھا کہ عمرۃ کی تمام احادیث ان کے لیے لکھ لیں، ابن سعد نے انکو "عالمۃ" لکھا ہے[۳]، امام ذہبی نے ان کو تابعین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[۴] اور ان کو "فقیہۃ" لکھا ہے، ابن معین نے انکی شان میں ثقۃ حجۃ اور عجلی نے تابعیۃ ثقۃ اور ابن المدینی نے احد الثقات العلماء[۵] کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی انھوں نے روایتیں کی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں ۱۳ سے زیادہ کبار تابعین ہیں، ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی[۶]۔

فاطمہ بنت المنذر۔ حضرت زبیر بن العوامؓ کی پوتی مشہور تابعی ہشام بن عروہ کی بیوی تھیں، انھوں نے متعدد صحابیات و تابعات مثلاً حضرت اسماء، حضرت ام سلمہؓ ام المومنین اور عمرۃ بنت عبد الرحمن وغیرہ سے روایت کی ہے، اپنے علم و فضل کے باعث ہشام بن عروہ نے ان سے روایت کی ہے، عجلی نے انکے بارے میں مدینۃ تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[۷]۔

قمیر بنت عمرو۔ مشہور محدث مسروق بن الاجدع کی بیوی ہیں، انھوں نے حضرت عائشہؓ اور اپنے شوہر مسروق سے روایت کی

۱؎ تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۴ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳ ۵؎ تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸

۶؎ ایضاً ۷؎ ایضاً ص ۴۴۴

آپ خطبہ دے رہے تھے، اور بلند آواز سے لوگون کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے کہ لوگو! تم نے میرے اور عثمان بن عفان کے بارے مین عجیب عجیب باتین مشہور کر رکھی ہین، لیکن ہمارا اور ان کا حال بالکل وہی ہے جو نقشہ قرآن نے اہل جنت کا کھینچا ہے، پھر یہ آیت پڑھی،

ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍ اخواناً علی سرر متقابلین[۱]	اور ان کے دلون مین جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کر دین گے، اور سب بھائی بھائی کی طرح تختون پر آمنے سامنے بیٹھے ہون گے،

امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین ام عمر کے بارے میں فرماتے ہین کہ دار معاذ مین مین نے ان سے سماع کیا ہے، ان مین کوئی خاص بات نہین ہو، مگر میرے بہت سے اصحاب ان سے روایت کرتے ہین[۲]،

زینب بنت سلیمان الہاشمیہ، یہ اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھین جس کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی، یعنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی پر پوتی تھین، ان کے والد سلیمان کا شمار حفاظ حدیث مین تھا، انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زینب کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا، ان سے متعدد اتباع تابعین نے روایت کی ہے، مثلاً قاضی جعفر بن عبداللہ، عاصم بن علی، احمد بن خلیل وغیرہ خطیب ان کی روایت سے متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین،

من افاضل النساء (جلد ۱۴ ص ۴۳۴)	خواتین مین نہایت فاضلہ تھین،

خلفا تک ان کا احترام اور ان کی عظمت کرتے تھے، چنانچہ مامون جس کا معمول تھا کہ پردۂ شاہی کے اوٹ سے گفتگو کرتا تھا لیکن جب زینب پہنچتی تھین تو پردہ ہٹا دیا جاتا تھا[۳]،

ان کے علاوہ اسی خانوادہ کی انہی کی ہم نام ایک دوسری زینب بھی تھین جنسے کوئی مرفوع حدیث تو مروی نہین ہے لیکن اپنے والد کی سند سے عبداللہ بن عباس کے دو ایک اثر کی روایت کرتی ہین،

---

۱ تاریخ بغداد جلد ۱۴ ص ۴۳۳، ۲ ایضاً ج ۱۴ ص ۴۳۴، ۳ ایضاً ص ۴۳۴،

حفصہ مخزومیہ، زینب بنت ابوسعید خدریؓ، صفیہ بنت الحارث، صفیہ بنت شیبہ، الرباب، حفصہ بنت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، نزفرہ، رمیثہ، فاطمہ بنت حسین، فاطمہ بنت علی، ام بلال، کریمہ بنت الحسحاس وغیرہ، یہ وہ تابعات ہیں جنھوں نے متعدد صحابہ سے روایتیں کی ہیں، اور ان سے صحاح میں روایات موجود ہیں، اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے،

ہم نے زیادہ تر ان تابعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تذکرہ تہذیب یا تذکرۃ الحفاظ میں ہے، ورنہ ان تابعات کی تعداد جنھوں نے روایت حدیث میں حصہ لیا، اس سے بہت زیادہ ہے، صرف ابن سعد نے ۳۰ تابعات کا تذکرہ کیا ہے، اصابہ میں تیسری اور چوتھی قسم میں جن خواتین کا تذکرہ ہے تقریباً ان سب کا شمار تابعات میں ہے، اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ ہے،

تابعات کے بعد دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی بے شمار خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترقی واشاعت میں حصہ لیا لیکن افسوس ہے کہ ان صدیوں میں خواتین کے کارناموں کے سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب ناپید ہیں، مثلاً ابن مندہ متوفی ۳۹۵ھ، ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ، ابوموسیٰ اصفہانی متوفی ۵۸۱ھ کی کتابیں اور خصوصیت سے ابن اثیر جزری کی تاریخ النساء وغیرہ، تاہم جن کا تذکرہ متداول کتابوں میں ملتا ہے ان کا ذکر کیا جاتا ہے،

دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی جن خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اسکی ترویج واشاعت میں حصہ لیا ان کے نام اور کارنامے حسب ذیل ہیں،

ام عمر۔ حسان بن زید تابعی کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے اپنے والد اور اپنے شوہر یحییٰ بن سعید سے متعدد روایتیں کی ہیں، اور ان سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابوابراہیم محمد بن الصباح، ابراہیم بن عبداللہ، علی بن مسلم وغیرہ ہیں، ان کے والد نے حضرت علیؓ کو دیکھا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے والد کی روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ ایک

حدثنا عبد اللہ بن احمد قال حدثتنی خدیجۃ ام محمد سنۃ ست وعشرین

ومائتین قالت حدثنا اسحاق الازرق حدثنا المسعودی عن عون بن

عبد اللہ، قال کنا نجلس الی ام الدرداء فنذکر اللہ عندھا فقالوا لعلنا قد

امللناک؟ قالت تزعمون انکم قد امللتمونی فقد طلبت العبادۃ فی کل

شیئ فما وجدت شیئا اشفی لصدری ولا احری ان اصیب بہ الذی ارید

من مجالس الذکر (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۶)

۲۲۶ھ کے بعد تک زندہ ہیں،

یہ ذوق صرف آزاد خواتین ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس میں لونڈیاں اور باندیاں بھی شریک تھیں

امام محاملی کے پاس متعدد لونڈیاں رات کے وقت آکر تحصیل حدیث کرتی تھیں ابراہیم بن سعد ایک حافظ

حدیث گذرے ہیں، اُن سے ایک بار مسند ابوبکر کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھون نے اپنی لونڈی سے فرمایا کہ

مسند ابوبکر کی ۲۳ وین جلد نکال لاؤ، اس سے ان کے علم حدیث کی واقفیت اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

سمانۃ بنت حمدان، تیسری صدی کے اخیر مین وضاح بن حسان ایک محدث گذرے ہین، جنھون نے

حدیث مین ایک تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے، سمانہ انہی کی نواسی ہین، وہ اپنے نانا سے روایت کرتی ہین

اُن سے روایت کرنے والون مین ابوبکر الشافعی اور ابو القاسم طبرانی ہین خطیب نے اُن سے متعدد روایتین

نقل کی ہین،[1]

اسی صدی کے آخر مین ایک خاتون فاطمہ بنت محمد بھی تھین جنھون نے حدیث کی خدمت مین حصہ

لیا، اُن کی زندگی نہایت ہی زاہدانہ تھی، وہ مصلے ہی پر سوتی تھین ۳۱۲ھ مین وفات پائی،

(باقی)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴،

عبدہ بنت خالد بن معدان حمص کی رہنے والی تھیں خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی ہیں، اپنے والد سے روایت کرتی ہیں، افسوس ہے کہ اُن کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے، تہذیب میں اُن کے والد کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ امام اوزاعی خالد بن معدان کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا کہ ان کی اولاد میں کوئی ہے؟ لوگوں نے عبدہ کا نام لیا، انھوں نے کہا کہ جاکر ان سے خالد کے حالات دریافت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[1]

عبدہ بنت عبدالرحمن بغدادیہ ان کا نسبی تعلق ابوقتادہ انصاریؓ کے خانوادہ سے تھا، یہ حضرت ابوقتادہ کی پرپوتی ہیں، اپنے والد عبدالرحمن سے روایت کرتی ہیں، اُن سے روایت کرنے والوں میں محمد بن مخلد، سلیمان بن احمد وغیرہ شامل ہیں، ابوالقاسم طبرانی نے اُن سے چند مرفوع احادیث نقل کی ہیں، اُن کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ احادیث حضرت ابوقتادہؓ کی اولاد ہی سے مروی ہیں، اور میں نے ان احادیث کو عبدہ کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:-

وكانت امرأة عاقلة فصيحة متدينة (بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۴) — یہ ایک عاقل، فصیح البیان اور حدیث کی روایت میں متدین تھیں،

خدیجہ ام محمد، انھوں نے امام احمد بن حنبل سے سماع کیا تھا، اور ان سے روایت بھی کرتی ہیں، امام احمد کے علاوہ یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف اور ہاشم بن القاسم سے روایت کرتی ہیں، امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اُن سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

كانت تجيء الى ابي تسمع — میرے والد (امام احمد) کے پاس سماع کے لئے آتی تھیں۔

خطیب نے ام محمد کی سند سے ام درداء کا ایک اثر نقل کیا ہے، جس کے ایک راوی عبداللہ ہیں، وہ اثر یہ ہے،

---

[1] تہذیب ج ۳ ص ۱۱۶،

نقشہ میں آیا ہے نود توراۃ کے مطابق بنو قین کا علاقہ ہے ارض نود کے مقام کی تعیین طویل بحث کی مقتضی ہے لیکن مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مدین کا علاقہ دراصل علاقہ بنو قین تھا، یہود مدینہ میں سے ایک گروہ بنو قینقاع تھا، یہ نام قاعہ قین کا مقلوب ہے، اس لئے نوذ کو مین اور شاس اور حاکہ کے علاقہ سے تطبیق دینا بے جا نہ ہوگا، ننذ نوذ اسی علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کا نام ہے، عدنان کے نسب نامہ میں ایک نام زندین مری ابن اعراق الثری کا نام آتا ہے (تاج العروس) زند نود سے مراد اطراف یمن میں بسنے والے بنو عدنان

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے کان کاٹ لئے جس کے انتقام کے لئے حبشہ سے بیاراؤ یمن سے ذو یزن فوجیں لے کر چڑھے لیکن ان دونوں فوجوں نے شکست کھائی، تب شاہ یمن نے اہل حبش کو خوش کیا اور حبش والوں نے شاہ ان کی نوکری کر لی لیکن کرد نے جن کے سردار کا نام نوذ تھا، نیز بنو واشح نے جنگ کی، اور اہل حبش کی امداد سے ذو نوش اور ذو شرح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، حکومت یمن پر نوذ نے قبضہ کر لیا،

کرد ایک عجمی قوم کا نام ہے جن کے کچھ افراد یمن میں بستے تھے، ان یمنی کردوں کی بابت نشوان نے لکھا ہے، کہ

يقال انهم من الازد ۔ قال	کہتے ہیں کہ وہ بنو ازد میں سے ہیں شاعر
لعمرك ما كرد من ابناء فارس	نے کہا قسم ہے کرد فارس کے بیٹے نہیں
ولكنه كرد بن عمرو بن عامر	بلکہ عمرو بن عامر کی اولاد ہیں نیز کہا شاعر نے:
وقال لعمرك ما كرد بن عمرو بن عامر	قسم ہے عمرو بن عامر کا بیٹا کرد عجمی نہیں تھا،
بعجم ولكن خالط العجم وأعجم	البتہ اہل عجم کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے عجمی ہو گیا تھا،

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال ندوی

(۲)

اقوام | یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کتبہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون کے اماکن میں سے ایک مقام کا بھی ذکر اس میں نہیں ہے، یہ تحریر یقینی طور پر یمن کے باشندوں اور ان کے حلفاء اور اقرباء میں سے کسی ایک کی ہے

اس میں جن قوموں کے نام ہیں، وہ یہ ہیں،

حمیر | حمیر ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے، کتبہ کے ایام تحریر میں اسی قبیلہ کی حکومت تھی، کتبہ اس قوم کے نائبین کا ہے

قہات | بنو اسرائیل کے ایک سبط کا نام لاوی ہے، اس سبط کی ایک شاخ کا نام قہات ہے، حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اسی خاندان کے افراد تھے، اس کتبہ میں قہات کا ذکر سینا کے باشندوں، یسار کے معاونوں اور باشندگان یمن کے دشمنوں کی حیثیت سے آیا ہے،

نہرہ | بنو قضاعہ کی ایک شاخ کا نام جو یمن میں رہتی تھی، اس قوم کو اس کتبہ کے اندر ند کور جنگ کے انجام سے بہت خوشی ہوئی تھی، خاکہ کی تشریح سے ظاہر ہے کہ وہاں کے باشندے بنو عذرہ تھے، یہ نہرہ کی طرح بنو قضاعہ کی ایک شاخ ہیں، نہرہ کو جنگ کے انجام کی جو خوشی ہوئی تھی، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ بنو عذرہ کے ہم خاندان تھے،

نوذنوذ | نوذنوذ دو ناموں کا مجموعہ ہے نوذ سے مراد وہی ارض نود ہے جس کا ذکر فرزندان آدم کے توراتی

اس مصرع مین ذو شرح کو "قیل" کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ مین نہین تھا البتہ کسی تبع کے ماتحت امیرون مین سے ایک امیر تھا، عربی مین ذو شرح مشہور ہے، اس کتبہ مین ذو کا لفظ شرح سے موخر ہے تاج العروس مین ہو کہ

قال ابو عمرو الشارح الحافظ وهو	ابو عمرو نے کہا شارح حافظ کو کہتے ہین اہل
فی کلام اهل الیمن حافظ الزرع	یمن کی بولی مین شارح وہ ہے جو کھیتون
من الطیور	سے چڑیون کو اڑاتا ہے،

شرح کے معنی ہین اُس نے زراعت کی رکھوالی کی "ذو شرح" کے معنی ہین محکمہ زراعت کا رئیس اعلیٰ" اس لقب کے بہتیرے افراد گذرے ہون گے، عربی روایات کے مطابق یہ ملکہ بلقیس کے باپ دادا کا یا اس کے دادا کا لقب تھا، اس کتبہ کا سنہ تحریر پچھلے مضمون مین ۳۳۰ء بتایا جا چکا ہے، یہ سنہ ہم کو بتاتا ہے کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہمعصر ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا سے اس ذو شرح کو تطبیق دینا چاہئے،

یسل | اس کتبہ کی اہم ترین شخصیت کا نام ہے، تاج العروس مین ہے،

الیسر اهمله الجوهری وصاحب	جوہری صاحب صحاح اور صاحب لسان
اللسان وقال الزبیر بن بکار هو	نے یسل کا ذکر نہین کیا، مگر زبیر بن بکار
یسل من قریش الظواهر قال و	کا کہنا ہے کہ یسل اور یسل قریش ظواہر کے
بالباء الموحدة الید الاخری	دو بازو تھے، بنو عامر بن لوی کو بسل (ب سے)
اعنی بنی عامر بن لوی هکذا	کہا جاتا تھا، اس کی خبر مجھے (زبیر کو)
حدثنی محمد بن الحسن کما فی العباب	محمد بن حسن نے دی جیسا کہ العباب مین ہے
وقد تقدم ذکر الیسل فی موضعه،	(ج ۷ ص ۲۴)

نسبتهم الشعراء الی الیمن ثم الی الازد، — شعراء ان کو یمن پھر ازد کی طرف منسوب کرتے ہیں،

یعنی کرد تھے تو نیز غیر عرب مگر بنوازد میں شمار ہوتے تھے، ذیل ہونے کی حیثیت سے یہ انصار مدینہ کو نیز بنو خزاعہ کو جن کی ایک شاخ یمن میں بستی تھی، اپنا ہم نسب بتاتے ہونگے،

واشح | بنو داشح بن الحرث، یہ بنوازد کی ایک شاخ تھے،

رجال کتبہ | اماکن واقوام کے بعد ایک نظر رجال کتبہ پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد کتبہ کا مضمون آئینہ ہو جائے گا،

ہمیق | پہلا نام اس کتبہ میں ہمیق کا ہے، اس کی بابت ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سموق درخت اور نبات کے طویل ہونے کو کہتے ہیں، ہمیق کا مفہوم طویل ہے، یہ شخص کون تھا اس کا عہد کیا تھا، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے،

ذو نین | حصن غراب کے سہ سطری مختصر کتبہ کے نیچے اس شخص کا سامانی دستخط موجود ہے، معارف مئی ۱۹۵۰ء میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ شخص ذو شرح کا چچا تھا، ذو کے معنی ہیں صاحب اور نن ایک مصری لفظ ہے جس کا مطلب پانی دینا ہے، لفظی مفہوم اس لقب کا ہے "رئیس محکمۂ آب رسانی" اس لقب کے اور معانی بھی ہو سکتے ہیں مثلاً ذو نن (مچھلی والا) ذو نون (صاحب لیت) ذو نون (صاحب الدواۃ) لیکن کتبہ کے اندر چونکہ زراعت کے مرجھانے کی ذمہ داری ہمیق، ذو نین اور ذو شرح کی تباہ کاری پر عائد کی گئی ہے اس لئے اس لقب کا مناسب تر مفہوم رئیس محکمۂ آب رسانی ہی ہو سکتا ہے،

شرح ذو | یہ نام کتبہ میں دو بار آیا ہے، یہی عربی روایات کا ذو شرح ہے سیف بن ذو یزن سے امیہ بن ابی الصلت نے غمدان کی بابت کہا،

قصر بناہ ابوک القیل ذو شرح

پر ایک دوسرا قتبانی شاعر اعتراض کرتا ہے،

ازنیتم عجوزکم وضانت قد یغالا یشم لها خمار

کیا اپنی مورثہ کو بدکار بتاتے ہو جس کی اوڑھنی سونگھی نہیں جاتی تھی،

عجوز لو دنا منها یمان لاقی مثل ما لاقی یسار

ایسی بڑھیا کہ اگر کوئی یمنی اس کے پاس جاتا تو اس کا انجام یسار کا سا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتبہ جو الزام سیل پر لگاتا ہے اور اس کا جو مآل بتاتا ہے تقریباً وہی الزام دوسری روایت سیل کی بجائے اس کے معین دوسرے کا دیسر ما پر لگا کر اس کا وہی انجام بتاتی ہے جو کتبہ میں مذکور ہے

ذو یالیل | جوہری نے لکھا ہے کہ یالیل ایک شخص کا نام ہے سید مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، یالیل ایک بت کا نام تھا، جیسا کہ عبد یالیل کے نام سے ظاہر ہے، ذو یالیل ایک مذہبی لقب معلوم ہوتا ہے، یالیل نام کے دیوتا کے مندر کا محافظ ذو یالیل تھا،

یمن والوں پر سیل کی توہین کا بدلا لینے کے لئے دو شخصوں نے چڑھائی کی، ایک نے جنوب سے ایک نے شمال سے، جنوبی حملہ آور ذو یالیل کا نام بتاتا ہے کہ یہ ایک بت پرست رئیس تھا، شمال کی فوج کا رئیس علی یسرما تھا، اور اسکی فوج میں قہات یعنی یہود کا مذہبی گروہ شامل تھا، گویا یمن والوں کے برخلاف موحدین اور مشرکین کے دو گروہ متحد ہوگئے، خود یمن والوں کا مذہب ان دونوں کیا تھا، اس کا اس کتبہ سے پتہ نہیں چلتا،

ریاح | ذو یالیل کے بعد ایک نام ریحا ملتا ہے حمیرما اور یسرما کے ناموں کی طرح ما کے حذف کے بعد یہ نام ریح رہ جاتا ہے جو عربی کے متداول لہجہ میں بنو ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ ابن تمیم کے مورث یا اس کے ہم نام کسی شخص کا علم ہو، ایک یربوعی شاعر کہتا ہے

ولکن لی علیاک تدیو محبد وعالی منخر صعب السلوک

البیسل لقب بنی عامر بن لوی
هکذا ابدی عجون وکانوا ابادی تین
والبیل الاخری البسل بالمثناة
تحت قاله الزبیر بن بکار عن
محمد بن الحسن هکذا هو فی العباب
ونقله الحافظ فی التبصیر ولکنه
عکس القضیة، (ب س ل) فقال
البیسل بالتحتیة بنو عامر بن لوی
والباقون بسوحله (بس ل)

بسل بنو عامر بن لوی کا لقب ہے، ان کا یہی
دعوی ہے وہ دو بازو تھے، دوسرے بازو
کو بیسل (ی ت) کہتے تھے، زبیر بن بکار نے
محمد بن الحسن سے اس کی روایت کی، العباب
میں یونہی وارد ہے، حافظ نے تبصیر میں یہ قول
نقل کرتے ہوئے بات الٹ دی ہے، بیسل
کو بنو عامر اور ان کے غیر کو بسل بنا دیا،

اس سے معلوم ہوا کہ بنو عامر بن لوی یا اُن کے ہم جد کسی خاندان قریش اور اس کے مورث کو بیسل کہا جاتا تھا، اس کتبہ میں اسی قرشی کا ذکر ہے، جو بیسل کہلاتا تھا:

یسار   اس کتبہ میں بیسل پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اُس نے یمن کے مقام میں ایک پاکباز بھولی بھالی لڑکی کی آبرو لینی چاہی جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ یمن کی عورتوں نے اس کی ناک اور کان کاٹ لئے اور اس پر برہم ہو کر یمن کی سمت سے ذویابیل نے اپصین اور سینا سے ایک شخص یسرما نے یمن دونوں پر چڑھائی کی
یسرما کے نام میں جو ما لگا ہوا ہے اس کی حقیقت براشدما کے تذکرہ (معارف مئی ۱۹۵۰ء) میں بتا جا چکی ہے، اصلی نام یسر رہ گیا ہے یا سر اور یسار کا مخفف قرار دیا جا سکتا ہے ہم نے اسے یاسر کے بجائے یسار سے تطبیق دی جس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے بیسل کی توہین کا انتقام لینے والوں سے جنگ کی، ان میں بنو عمرو اور باشندگان حاکم بھی تھے جو کہ بنو قضاعہ میں سے تھے، بنو قضاعہ کا ایک گروہ اپنے کو قریش کا ہم جد یعنی بنو عدنان میں خیال کرتا تھا، ایک گروہ قضاعہ کو بنو حمیر میں گنتا تھا اور ان کو حمیری بتانے والے بنو قضاعہ

شاہی فوجون نے شکست کھائی، تو حضرموت والون نے بھی شاہ وقت کے ردیف یا قدیم تر لفظون مین ذویقنہ ریاح کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، ذویقنہ ریاح جس بادشاہ کا ردیف تھا، غالباً اسی کا ذکر ذونوش کے لقب سے آیا ہے، یعنی ذونوش ذوشرح وغیرہ کا بھی بادشاہ ہوگا، جہانتک میرے علم کی رسائی ہے ذونوش لقب رکھنے والے کسی شاہ یمن کا عربی لٹریچر مین ذکر نہین ملتا، البتہ بلقیس بنت ہداد بن (ذو) شرح بن شہر حبیل بن ذوسحر کے خاندان مین ایک بادشاہ ذویوس بن ذوسحر کا نشوان نے ذکر کیا ہے، مگر اس کا زمانہ اس کتبہ کے زمانہ سے بہت پیشتر گذرا ہے لیکن ہوسکتا ہے ذویوس دراصل ذونوش ہی کی تصحیف ہو، اور اس کتبہ مین ذویوس اول کے کسی جانشین کا ذکر ہو، بہرحال ریاح جس کا ذکر اس کتبہ مین ہے، ذونوش ہی کا ذویقنہ یعنی ردف اور قائم مقام نظر آتا ہے، ذونوش نے جب دیکھا کہ یمن کا راج جا رہا ہے، یمن والون کی بغاوت نے حجاز کو بھی آزاد کرا دیا، حضرموت والون نے ریاح کو لات مار کر اپنے علاقہ سے نکال دیا، تو

ذونوش رضا حبشتا تشسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا اور وہ خادم ہو گیا

تنوذ | آخری نام اس کتبہ مین ایک شخص تنوذ کا ہے جو اس قوم کرد کا ایک فرد تھا، جو ازد کے خاندان بنو عمرو بن عامر مین دخیل ہو گئے تھے، اس سے زیادہ اس شخص کا حال معلوم نہین، اس کتبہ کے مطابق ذونوش نے حبشیون کی امداد حاصل کی تپر بھی بغاوت فرو نہین ہوئی، بلکہ کرد اور بنو شارح نے مقابلہ کیا، جس مین کردون اور بنوشارح کو فتح حاصل ہوئی،

مضمون کتبہ | اماکن، اقوام، اور رجال سب کو پہچان لینے کے بعد اب ایک بار پھر کتبہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۳۳۰ء کے ایام مین جب کہ شاہ یمن حضرموت سے لے کر یمن یعنی سرحد مصر تک حکومت کرتا تھا، بادشاہ وقت کہین غائب تھا، اسکی جگہ ریاح اس کے فرائض انجام دیتا تھا سمیق، ذویقنہ اور

بیریبوع وغلب بنی بنیہ لھم کانت ردافات الملوک

یعنی یریبوع اور اس کے فرزندون کی بدولت بنی کو ردافت ملوک کا شرف حاصل تھا، مجھ

تجھ پہ بزرگی حاصل ہوا، اس کتبہ مین نبو یریبوع ہی جیسی عظمت رکھنے والے ایک ریاح کا ذکر ہے،

الردف جلیس الملک عن یمینہ	ردف بادشاہ کے ہمنشین راست کو کہتے
اذا شرب شرب بعدہ قبل	تھے، بادشاہ جب شراب پیتا تو بادشاہ
الناس و یخلفہ علی الناس اذا	کے بعد اور سب سے پہلے ردف پیتا، اور
غزا ویقعد موضع الملک حتی	بادشاہ جب خود باہر جاتا تو وہ اس
ینصرف واذا عادت کتیبۃ الملک	کی جگہ قائم مقامی کرتا یہان تک کہ بادشاہ
اخذ الردف المرباع،	واپس آجاتا تھا، بادشاہ کی فوج جب واپس
	آجاتی تو ردف چوتھ وصول کرتا تھا،

ردف کا جو کام تھا وہی اس کتبہ مین ریاح کا نظر آتا ہے جس کا لقب ہے ذو یقتہ، یہ لفظ دو لفظون

سے مرکب ہے (۱) ذو بمعنی وہ شخص (۲) یقتہ بمعنی یقتوا الملوک یعنی بادشاہون کی خدمت کرتا ہے،

اس کتبہ کے اندر مذکور ریاح کو کتبہ نویس کی قوم نے اس وقت نہایت ذلیل کرکے اپنے علاقہ

سے نکال دیا، جب کہ حاکہ، شاس اور یمن مین یسار اور ذو یالیل کی فوجون نے شکست کھائی اور ریاح

کے اس انجام کو دیکھ کر قوم مہرہ اور زندنود کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی،

ذو نوش سمیق، ذو نین، ذو شرح، ذو یالیل، یسار اور تسیل مین سے کوئی بھی یمن کا بادشاہ نظر

نہین آتا، یہ سب کے سب بادشاہ کے ماتحت امراء نظر آتے ہین، کتبہ کے بیان کے مطابق جب یمن کے باشندون

اور اُن کے معاونون نے بغاوت کردی تو اس وقت ایک ذو یقتہ جس کا نام ریاح تھا حضرموت مین بادشاہ

وقت کی نیابت یا بالفاظ قدیم ردافت کے فرائض انجام دے رہا تھا، یمن یعنی مدینہ منورہ کے پاس جب

لیا ہے کہ اصل کتبہ سے عرصہ بعد کی ہے خود اپنی بنائی ہوئی آواز ان کے مطابق انھین پڑھا یا ہے تھا،

ھر ب سام ای سب ن

لیکن ان نقوش کو انھون نے پڑھا ہے،

Harelk or Hare Ikah the Sabean

ع: دخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است

صحیح قرات | ہمدانی نے اکلیل مین سین کی ایک صورت ایسی بتائی ہے دائین طرف کے نقش اول اور بائین طرف کا نقش دوم اسی کی بدلی ہوئی صورتین ہین، دائین طرف کا نقش دوم اور بائین طرف کا نقش چہارم نشوانی طاء کی بدلی ہوئی صورت ہے دائین طرف کے نقش سوم اور بائین طرف کے نقش پنجم کو فاضل مستشرق کے علاوہ سب علماے مندث کا ت خیال کیا ہے،

دائین طرف کے چوتھے اور بائین طرف کے چھٹے نقش کو پادری صاحب نے ہا اور ہا مین تحلیل کیا ہے، درحقیقت یہ نقش ایک میٹکی پر رکھے ہوئے تین چراغون کے فتیلہ سوز کی صورت ہے جو روشنی کا مفہوم اور شین کی آواز دیتا ہے، بائین طرف کے پہلے اور تیسرے نقش کو ایک بار پادری صاحب نے کی صورت میں اور دوسری بار کی صورت مین حل کیا ہے، دراصل ایک مادر نقش زاید کے اضافہ کیا ہے جس کی آواز ہوز کی سی ہے، میرے نزدیک تحریر کی صحیح قرات حسب ذیل ہے،

سط کش

ذشَ ذطُ لوش

سوط کے معنی ہین کوڑا، اس سے سواط مشتق ہے، صاحب لسان نے لکھا ہے کہ حدیث مین ہے کہ جنت میں سب سے پہلے سواط داخل ہون گے سواط سے مراد وہ سرہنگ ہین جو لوگون کو کوڑے مارتے ہین"،

کوش ایک قوم کا نام ہے جس کا ذکر بائبل مین کثرت سے آیا ہے، انگریزی بائبل مین اس نام کو عموماً

ذوشرح کی بد انتظامی کی بدولت زراعت مرجھا گئی تھی، ان دنون یسل نام ایک امیر جو کہ قریش ظواہر کی ایک شاخ کا مورث تھا، اکال وصول کرنیکے لئے مدینہ کے پاس یمن نام ایک وادی مین پہنچا، یہان اُس نے ایک عورت کی آبروریزی کرنی چاہی، عورتون نے اُس کی ناک اور کان کاٹ لئے، اس پر برہم ہو کر سینا سے یہودیون کی ایک فوج لیکر یسار نے اور یمن کی طرف سے ذویایل نے یمن والون پر حملہ کر دیا، لیکن باغیون کو کامیابی ہوئی، یمین کے علاقہ اور بحاز سے اہل یمن کی حکومت اٹھ گئی، حضرموت والون نے بھی ریاح کو اپنے دیار سے نکال دیا، ذونوش نے جوان دنون شاہ یمن تھا، اہل حبش کو راضی کر کے ان کو نوکر رکھا تا کہ کھوئی ہوئی حکومت حاصل ہو، مگر بنو واشح، بنو صرہ، اور کردون نے اُن کا مقابلہ کیا، اور یہ کامیاب رہے، اور تنوذکر ذحاکم یمن ہوا،

نقوش زیرین | اس کتبہ کے نیچے دائین طرف دو نقوش ہین، ان کے نیچے دو اور نقوش ہین، جن کے بالمقابل بائین طرف چھ نقوش ہین، ان پر بھی غور کر لینا ضروری ہے نقوش کی کشش اور گہرائی شاہد ہے کہ نقوش زیرین دو مختلف شخصون نے کندہ کئے، جو دہ سطری نقوش کے کندہ کار نہین تھے،

فارسٹر کا ادعا | فارسٹر کے نزدیک دائین طرف کے نقوش لایعنی ہین، بائین طرف کے چھ نقوش کو طغراء قرار دے کر انھین گیارہ نقوش مین تحلیل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے

[illegible]

ہ ر س ا ہ ا ی س ب س

تشریح کتبہ کے محل (ج ۲ ص ۱۸۱) پہان نقوش مین سے کسی کی آواز نہین بتائی ہے لیکن، ج ۲ صفحہ ۲۰۲ و صفحہ ۲۰۳ سے ہم نے دس نقوش کی آوازین نقل کی ہین، ۴ کی آواز نہین معلوم پادری صاحب کے ذہن مین کیا تھی، اس نقش کو ج ۲ ص ۱۸۳ کے حاشیہ پر حبشی نقش بتایا ہے، اور اس سے اس تحریر کے زمانہ پر استدلال

لمن ملک ذمار	ملک ذمار کس کا
للحبشة الاشرار	شریر الطبع اہل حبش کا
لمن ملک ذمار	ملک ذمار کس کا
لفارس الاحرار	شریف طینت اہل فارس کا
لمن ملک ذمار	ملک ذمار کس کا
لقریش التجار	تجارت پیشہ قریش کا

یہ تمام اور کلیس کی روایتیں یہیں ختم ہو جاتی ہیں، یاقوت نے معجم البلدان ذکر ذمار میں اس تحریر کی بابت لکھا ہے کہ جس سال قریش نے کعبہ کی عمارت کو (سنہ ... میں) ڈھایا، اس کی بنیاد سے ایک پتھر نکلا جس پر یہی عبارت منقوش تھی آخر میں یہ بھی تھا کہ

ثم حار محار	پھر اپنی جگہ لوٹ گیا

ظفار کے تذکرہ میں اسی کو ذکر قریش کے حذف اور ذمار کی بجائے ظفار کی بابت نقل کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ عبارت ظفار کی ایک دیوار پر لکھی تھی، اور (ثم حار محار) کی بجائے یہ منقوش تھا کہ

لحمیر ستحار	عنقریب حمیر کے پاس لوٹے گا،

یہ تینوں روایتیں کچھ نہ کچھ اصلیت رکھتی ہیں، ظفار کا کتبہ خانہ کعبہ والے پتھر سے قدیم تھا، یہ (ستحار) اور (ثم حار) کے فرق سے ظاہر ہے، منبر ہود والے کتبہ کی روایت میں صرف اتنی بات درست ہے کہ اس تحریر کا تعلق، عمرو ذو الاذعار کے زمانہ سے ہے، جو کہ ابرہہ ذو المنار کی نسل سے ... بنت ... کا حریف تھا، جو کہ حبش کے بادشاہ اذینہ الصباح کی ہم عصر تھی، عمرو ذو الاذعار غالباً انہی حبشیوں ... کی ... ذو نواس نے بغاوتیں فرو کرنے کے لئے حاصل کی تھیں،

اس قدیم کتبہ سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں ملک ذمار پر قبضہ کرنے کی جد و جہد چار قومیں کر رہی تھیں

ایتھوپیا (حبش) سے بدل دیا گیا ہے، کیونکہ جن دنون یونانی مین بائبل کا ترجمہ ہوا، صرف اہلِ حبش خود کوش کہتے تھے، اس تحریر مین کوش کو اہلِ حبش کا مرادف سمجھنا چاہیے،

پچھلے مضمون مین بتایا گیا ہے کہ یہ تحریر ۳۳۰ئ کی ہے، ۳۲۵ئ سے ۳۷۸ئ تک یمن اور حضر موت پر اہلِ حبش نے حکومت کی، اہلِ حبش کو ذونوش نے اپنی امداد کے لئے نوکر رکھا تھا، مگر بعد مین وہ خود حاکم بن بیٹھے، ۳۳۰ئ اور ۳۷۵ئ کے درمیان کسی نے دہ سطری کتبہ کے اس مصرعہ کی بنا پر کہ

ذونوش رضا حبشا شسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا انھون نے نوکری کر لی .

دائین طرف کا دو لفظی فقرہ لکھ کر بتایا کہ

کوش نے باغیون کو کوڑے مارے،

نوش عربی مین ذلیل غلام کا مرادف تھا، زیاط کے معنی ہین شور مچانا جھگڑا کرنا، بائین طرف کے تین لفظ دہ سطری کتبہ لکھنے والی قوم کے کسی فرد نے اہل حبش کی توہین کے لئے بعد مین کندہ کئے اس کا مطلب یہ ہے،

کوش ایک جھگڑالو ذلیل غلام ہے

ایک قدیم کتبہ | اس کتبہ کی تشریح پر اب مزید لکھنے کی ضرورت نہین رہی لیکن اس سے ایک قدیم روایتی کتبہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو بھی اسی جگہ ذکر کر دیا جائے،

تیجان اور اکلیل مین ہے کہ ہنبر ہود علیہ السلام کے پاس سے عمرو ذوالاذ عار کے زمانہ مین ایک لوح برآمد ہوئی تھی جس پر منقوش تھا،

لمن ملک ذمار؟	لملک ذمار کسرا کا
لحمیر الاخیار	نیک نش حمیر کا

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولفہ جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ رتبہ :- انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی،

نئے اور ترقی پسند ادب کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن اب تک کسی صاحب نظر ادیب نے اس کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا، اور غیر جانبدارانہ محاکمہ نہیں کیا تھا، اس کام کو اردو کے نامور ادیب پنڈت کشن پرشاد کول نے انجام دیا ہے، اور اس کتاب میں انھوں نے نئے ادب کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ کرکے اس کے محاسن و معائب ظاہر کئے ہیں، ابتدا میں ترقی پسند ادب کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس کے خیالات و نظریوں پر تبصرہ ہے، پھر اس کے افسانوں پر اجمالی، اس کے بعد مشہور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ناولوں پر تفصیلی تنقید کرکے ان کی خوبیاں اور نقائص دکھائے ہیں، اور آخر میں مشہور ترقی پسند شعراء کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے، اردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع اور بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، لائق مصنف نے بڑے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ ترقی پسند ادب کے محاسن و معائب دونوں دکھائے ہیں جس سے اس کا ہر رخ، سارے خط و خال اور عیب و ہنر سامنے آجاتے ہیں، پوری کتاب مصنف کے بلند ادبی ذوق، نکتہ سنجی، دقت نظر اور تیز تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار اور تنقیدی و ادبی حیثیت سے اصحاب ذوق خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ

(۱) حمیر اخیار یعنی خود یمن کا قدیم شاہی گھرانا،

(۲) حبشہ اشرار جن کی بابت زیر بحث کتبہ میں ہے کہ ذونوش نے حبش والون کو راضی کیا، اور وہ خادم ہوگئے، اور نقوش زیرین کے کندہ کارون نے جن کا ذکر کوشش کے نام سے کیا ہے، اور ان کو ذیس جھگڑا لو نام مرتبا یا ہو اب تک کی معلومات کے مطابق اہل حبش نے ۳۴۰ء اور ۵۲۵ء میں یمن پر حکومت کی قدیم کتبہ کی رو سے یمن پہلی بار کے قبضہ اہل حبش کا ذکر ہونا چاہئے، کیونکہ سنہ ۶۰۰ء میں جو کتبہ خانہ کعبہ کے پاس ملا تھا اس میں مذکور تھا کہ ملک ذمار اپنی جگہ لوٹ گیا، یعنی حمیر نے اس پر حکومت قائم کرلی، ملک ذمار ملک یمن ہی کا ایک نام ہے،

(۳) فارس احرار زیر بحث کتبہ کی تشریح سے پہلے تک کے معلومات کے مطابق فارس والون نے یمن پر ۵۷۲ء یا ۶۰۰ء سے لیکر ۶۳۲ء تک حکومت کی تھی، اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ قدیم کتبہ میں فارس احرار کے ذکر سے یہی دور مراد ہے جب کہ یمن مرزبان ہرمز (یا ہرمز) کے ذریعہ حکومت کرتے تھے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ ۶۰۰ء میں خانہ کعبہ میں جو کتبہ ملا تھا اس کے مطابق تو اس زمانہ سے پہلے حمیر، حبشہ، فارس اور قریش کی چوتھی بار ختم ہوکر حکومت ذمار اپنے اصلی محور پر لوٹ گئی تھی، یعنی تیسری حکومت قائم ہوگئی تھی، زیر بحث کتبہ میں تو ذونواس کے تذکرہ نے حل کر دشواری حل کردی، اسی زمانہ (۵۲۳ء تا ۵۲۵ء) میں حمیر اخیار، حبشہ اشرار اور فارس احرار تینون گروہ حکومت یمن کے حصول کی کوشش کرتے تھے،

(باقی)

فراغ علی وغیرہ کی تصانیف اس کا ثبوت ہین، بلکہ خالص ادب وافسانون مین بھی واقعیت ومقصدیت پیدا ہو گئی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی راشد الخیری کے صلاحی افسانے اس کے شاہد ہین، اور ترقی پسندی کی یہ رفتار برابر قائم رہی اور حالات وضروریات کے مطابق اردو ادب کا رنگ بدلتا اور ہر قسم کا لٹریچر پیدا ہوتا گیا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بعد سے اس وقت تک اردو مین اچھا خاصہ سیاسی لٹریچر بھی پیدا ہو گیا ہے،

اسی قسم کے تغیرات نظم مین بھی ہوئے، غدر کے بعد ہی سے اردو شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا، سب سے پہلے غالب نے نیا رنگ چھیڑا، اور خیالات اور طرز ادا دونون مین وسعت وتغیر پیدا کیا، اُن کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، انھون نے اردو شاعری کو اُس کے قدیم تنگ کوچہ سے نکال کر نئے خیالات وتصورات سے آشنا کیا، مولانا حالی نے اس سے پسماندہ کاروان ملت کے لئے حدی کا کام لیا جس کا نمونہ مسدس حالی اور اُن کی دوسری نظمین ہین، اور پرانی شاعری کی عام اصلاح کے لئے مقدمہ شعر وشاعری لکھا، اُن کے بعد اکبر الہ آبادی نے شاعری کے مقاصد مین اور زیادہ وسعت پیدا کی، اور اس سے گوناگون اصلاحی وتنقیدی کام لئے، اور اقبال نے اس کو محشرستان حیات کا صور اور جہاد زندگی کا تکبیر بنا دیا، قومون کے عروج وزوال ترقی وتنزل اور موت وحیات کا وہ کونسا اصول وفلسفہ ہے، جو اُن مین نہین، اور بعد کے سارے واقعی ترقی پسند شعرا، درحقیقت اُنھی کے خوشہ چین ہین، غرض غدر کے بعد اردو نظم ونثر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے اس مین ترقی پذیری حقیقت پسندی اور مقصدیت نظر آئے گی، اس لئے انجمن ترقی پسندی موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء اور ادیبون کا کارنامہ ہے سراسر غلط ہے، البتہ زمانہ کے حالات وضروریات کے لحاظ سے ترقی پسندی کا رُخ بدلتا رہتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ مین سیاسی ومعاشی ومعاجی مسائل کے متعلق بھی اردو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، ترقی پسندی کو محض اشتراکی ادب کی نقالی یت گوئی اور جنسی جھوک مین محدود کر دینا درحقیقت ترقی پسندی نہین بلکہ تنزل ہے، اس کے علاوہ

کے لائق ہے۔

درحقیقت ترقی پسند ادب کے بارہ میں اس کے حامی اور مخالف دونوں تنگ نظری اور افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، سوویت زدہ ترقی پسندوں کے نزدیک محض اشتراکی خیالات اور روسی ادب کی نقالی ترقی پسندی کی معراج ہے، انھوں نے محض بھوک، پیٹ، روٹی، کسان، مزدور، غریب، سرمایہ دار، انقلاب، آگ اور خون کے الفاظ اور فرائیڈ کے جنسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت، فحاشی، و عریاں نگاری اور شعر و ادب میں بے لگام آزادی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، اس کے علاوہ ہر ادب اُن کے نزدیک غیر صحت مند، اور مجموعۂ خرافات ہے، اُن کے مقابلہ میں پرانے ادب کے پرستاروں کا طبقہ جو اب بہت کم باقی رہ گیا ہے، پرانے ڈھرے سے ذرا بھی الگ ہونا بارگاہ ادب میں سوء ادب سمجھتا ہے، یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں۔

ترقی پسندی اور نیا ادب اگرچہ اصطلاحیں نئی ہیں، لیکن نیا ادب اس زمانہ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ ہر زمانہ کے حالات اور ذوق و رجحانات کے تغیر کا فطری نتیجہ ہے جس سے کسی زبان و ادب کی بھی تاریخ خالی نہیں ہے، اگر اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو تحسین کی دہ مجلس، میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل، اور میر امن کے قصہ چہار درویش سے لیکر موجودہ ترقی پسند ادب تک، ہر زمانہ میں ترقی پسندی اور نئے ادب کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، اس کے ابتدائی دور میں ادب محض مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی اور خیالی افسانہ طرازی تک محدود تھا، اس کے بعد جب ترقی کا قدم آگے بڑھا تو افسانہ طرازی باقی رہی لیکن عبارت میں سلاست و سادگی آنے لگی، جس کا نمونہ چہار درویش ہے، اور کم و بیش ۵۷ء کے انقلاب تک یہ طرز قائم رہا، اس کے بعد جب حکومت کے ساتھ پرانی تہذیب کی بساط الٹی اور جدید تعلیم و تہذیب سے مذاق و خیالات میں تغیر پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ادب بھی بدلنا شروع ہوا، اور خیالی افسانہ طرازی کی جگہ حقیقت پسندی، ذہنی تفریحی ادب کے بجائے مفید سنجیدہ علمی و اصلاحی لٹریچر اور عبارت آرائی کے بجائے سادگی شروع ہوگئی، اور ادب محض ذہنی تفریح کے بجائے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کا کام لیا جانے لگا، سرسید، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور مولوی

کے لئے برج بھاشا مین بہت سی کتابین قصے اور کہانیان موجود تھین اور جن کتابون کے نام لکھے گئے ہین ان
مین نورتن سنگاسن بتیسی بتیال پچیسی قصہ نل ودمن وغیرہ اور دوسری بہت سی کتابین برج بھاشا مین بھی ہین
اُن کے علاوہ ہنس جواہر، اسلام کھنڈ، آلہا اودل کا قصہ، بارہ ماسے اور بہت سی داستانین اور حکایات موجود
ہین، جو آج بھی دیہاتون مین بڑے ذوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی ہین،

ان کے مقابلہ مین آج بھی دیہاتی عوام، عوامی حصہ نئے ادب کے فیض سے محروم بلکہ اس کے نام تک سے واقف
نہین، پُرانے ادب کی تفریحی کتابون سے کم از کم وہ ذہنی تفریح تو حاصل کر لیتے تھے، نئے ادب نے تو اُن کو اس سے
بھی محروم رکھا ہے، اور وہ محض شہری تعلیم یافتہ نوجوانون کی مشق سخن اور تفریح کا ذریعہ ہے، البتہ زبانون پر
عوامی ادب کی فیض بخشی کا شور ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ادب مین دیہاتی زندگی کی عکاسی نہین ہے، اسکی
وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دور مین اُن کی اتنی اہمیت نہین تھی، دیہاتون مین تعلیم نہ تھی، لکھنے والے
سب شہری تھے، مختصر افسانون کا رواج نہ ہوا تھا، اور اس زمانہ مین اردو کی عمر ہی کیا تھی، کہ اس مین ہر قسم کا
لٹریچر موجود ہوتا، اس قسم کے مختصر افسانے تو مغربی زبانون مین بھی ان کے انتہائی عروج، بلکہ زمانۂ حال
مین پیدا ہوئے، ایسی حالت مین اردو مین ان کا وجود کہان سے ہو سکتا تھا، لیکن اسکی ترقی کے ساتھ سب چیزین
رفتہ رفتہ آرہی ہین، اس کے علاوہ ان معترضین سے یہ سوال ہے کہ اُن کے عوامی ادب اور عوامی زندگی کی عکاسی
سے خوان غریب دیہاتی عوام کو کیا فائدہ پہنچا، وہ اس کے علمی و عملی فوائد دونون سے محروم ہین، ان مین اتنی استعداد و
صلاحیت نہین کہ وہ کم سے کم انھین پڑھکر ذہنی تفریح ہی حاصل کر سکین، اُن کی پر محن زندگی جیسے پہلے تھی اب
بھی ہے، ان کو جو فائدہ پہنچا بھی ہے، وہ سیاسی حالات نے پہنچایا ہے، عوامی نئے ادب کو اس مین کوئی دخل
نہین، وہ ویسے ہی محض تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہے، جیسے پرانا ادب ہے، روس مین عوامی
ادب اس وقت پیدا ہوا جب عوام کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہو گیا، یہان حال یہ ہے کہ دیہاتی
آبادی کا بڑا حصہ تقریباً کل کا کل جاہل مطلق ہے، اور اس کی ضیافت کے لئے عوامی ادب کے خوان موجود

بھی زندگی کے بہت سے مسائل ہین، جو اُن سے کم اہم نہین،

پرانے ادب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی سے دور ہے، اسمین ان کی زندگی کی عکاسی اور اُن کے مذاق کی چیزین نہین ہین، اور وہ محض ذہنی و دماغی تفریح کا ذریعہ ہے، اس مین زندگی کے مشکلات و مسائل کا حل نہین ہے، ان اعتراضات کے جوابات کے لئے ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ پرانا ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس کا سبب یہ ہو کہ اس زمانہ مین عوام کی اتنی اہمیت ہی نہین تھی، اور نہ عوامی مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کا بڑا حصہ تعلیم سے بیگانہ تھا، اور وہ زیادہ تر خواص تک محدود تھی، اس لئے پرانا ادب خواص کے طبقہ مین محدود رہا۔ اور انہی کے اثرات بھی اس مین آئے لیکن اس سے مراد اردو ادب ہے، اردو زبان نہین،

لیکن اس کے باوجود کہ اردو ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس مین ان کے ذوق اور اُن کی ذہنی تفریح کا پورا سامان موجود تھا خصوصاً شہری عوام کے لطف و تفریح کا بڑا ذخیرہ ہے. قصہ چہار درویش، آرایش محفل، الف لیلہ، قصہ لیلیٰ مجنون، نل دمن، گل بکاولی، نورتن، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی قصہ مادھول، اور اندرسبھا امانت وغیرہ بیسیون کتابین موجود تھین جن سے عوام ایسی ہی لطف و تفریح حاصل کرتے تھے جیسی موجودہ زمانہ کا ایک تعلیم یافتہ شخص اچھے سے اچھے ناولوں کے مطالعہ سے حاصل کرتا ہے،

فرصت کے اوقات مین چند ہم سن و ہم مذاق ایک جگہ جمع ہو جاتے، حقہ کا دور چلتا، ایک خواندہ شخص ان مین سے کوئی کتاب پڑھتا، اور تمام سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے، آج بھی لکھنؤ کے زردوزون، سادہ کارون اور دوسرے اہل حرفہ مین اس قسم کے ادبی اجتماع عام ہین، بلکہ ان مجلسون مین فسانۂ آزاد اور داستان امیر حمزہ تک کا دور چلتا ہے، شہرون کے علاوہ بڑے قصبات تک مین اس قسم کے تفریحی اجتماع ہوتے ہین،

البتہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ کسانون کی تفریح کا سامان اردو ادب مین موجود نہین ہے، یہ طبقہ اردو کی ادبی زبان ہی نہین سمجھ سکتا تھا تو اس کے لئے لٹریچر کہان سے پیدا ہوتا، لیکن اُن کے ذوق و دلچسپی اور لطف و تفریح

ضروریات کے ساتھ کچھ لطیف جذبات و احساسات اور پاکیزہ تصورات بھی رکھتا ہے، زندگی مشقتون
اور جد وجہد کے بعد اس کو سکون کے کچھ لمحات اور دماغی و ذہنی لطف و تفریح کا سامان بھی درکار ہے، علمی
سے علمی آدمی کو بھی ایسے لمحات کی ضرورت ہوتی ہے، دیہات کے کسان بھی اس سے خالی نہیں ہیں، دن
بھر کی محنت و مشقت کی تکان کے بعد اُن کو بھی ذہنی و دماغی سکون و تفریح کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ
وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات مین دیہاتی قصص و حکایات و افسانون کو سن کر لطف و تفریح حاصل کرتے ہین
اور جس قدر تہذیب و کلچر بڑھتا جاتا ہو تی اس قسم کے لٹریچر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، دل و دماغ کی تفریح
و جلا کے لئے ادب برائے ادب ضروری اور تھکے ہوئے دماغ کی غذا ہے جس سے دماغ تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا
ہے اس کے بغیر دماغ کند اور ذہن غبی ہو جاتا اور زندگی کی بہت سی لطافتین اور رعنائیان ختم ہو جاتی ہین
اس لئے انسانی زندگی کے لئے ادب برائے ادب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ادب برائے زندگی،
اگر ادب و شاعری کا حصہ زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو وہ یکسر بے رنگ و بو ہو جائے،

نئے ادب کے بعض اصلاحی پہلوؤن کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہین، ترقی پسند ادیبون مین ایسے اصحاب
قلم بھی ہین جن کی کوششین، ادبی و اصلاحی دونون حیثیتون سے قابل قدر ہین، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے،
تم غفیر ان نو آموزون کا ہے جن کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہین ہے، اور وہ ترقی پسند محض اس لئے کہلاتے
ہین کہ الٹے سیدھے اشتراکی خیالات کی نقالی کر لیتے ہین، اُن کا سب سے بڑا عیب عریان نگاری ہے، بلکہ
پختہ کار ترقی پسند افسانہ نگارون کے افسانے بھی اس سے یکسر پاک نہین، سماجی اصلاح کی ضرورت مسلم ہے، لیکن
کیا اس کا طریقہ صرف عریان نگاری ہے، اگر بالفرض کسی خاص صورت مین کسی درجہ مین اس کی ضرورت
تسلیم بھی کر لیجائے، تو اس کو فرسے فرسے لیکر بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خود ان ادیبون
جنسی بیماری کا پتہ چلتا ہے، انھون نے فحاشی اور عریان نگاری کو نوجوانون مین اپنی شہرت و مقبولیت اور
تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہے، ورنہ یہ کام شائستہ طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے، پرانے ادیبون نے بھی اس موضوع پر

جس کی خبر بھی ان بیچاروں کو نہیں ہے، یہ تو ویسی ہی ستم ظریفی ہے کہ غریب کسانوں کو آج بھی پیٹ بھر کھانا اور تن کا کپڑا میسر نہیں لیکن اُن کی ترقی کے لئے دیہاتوں میں ٹلی اور ریڈیو رائج کرنے کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی ادب سے عوام کو عملاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ایسی حالت میں اس کا نام محض عوامی ادب رکھ دینے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا،

ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا ابھی نہایت مہمل ہے، یہ دونوں قسمیں ہر زمانہ اور ہر زبان میں موجود رہی ہیں، گو یہ اصطلاحیں نہ رہی ہوں، البتہ اب ادب برائے زندگی کا تصور محدود ہو گیا ہے پہلے زندگی نام تھا اس کے مادی، اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا اور اب وہ سمٹ کر محض پیٹ اور جنسی بھوک میں محدود ہو گئی ہے، زندگی کے صحیح اور جامع تصور کے مطابق اس کے ہر پہلو کی ہدایت و رہنمائی کے لئے عربی فارسی سنسکرت اور ہندی وغیرہ ہندوستان کی تمام رائج زبانوں میں حکیمانہ و فلسفیانہ کتابیں سبق آموز حکایات، حکیمانہ مقولے، اور ضرب الامثال موجود ہیں، اردو ایک نئی زبان ہے، اس لئے اس موضوع پر اس میں کم کتابیں لکھی گئیں، لیکن دوسری زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، سنسکرت اور ہندی کے ترجموں کا راقم کو پورا علم نہیں ہے، لیکن انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ، گلستان سعدی، بہار دانش، اخوان الصفا، کیمیائے سعادت مثنوی مولانا روم اور دوسری بہت سی حکیمانہ کتابوں کے جن سے زندگی کے ہر شعبہ میں سبق حاصل ہوتا ہے، ترجمے ہو چکے ہیں، اور یہ سب کتابیں تو ہمارے پرانے نصاب میں داخل تھیں، یعنی زندگی کے جملہ مادی، روحانی و اخلاقی معاملات و مسائل کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، ایسی حالت میں پرانے ادب کو محض ادب برائے ادب میں محدود سمجھنا ناواقفیت کا ثبوت ہے،

خالص ادب یعنی ادب برائے ادب بھی زندگی کی ضروریات میں اور تہذیب و کلچر کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ دہقانی زندگی بھی اس سے خالی نہیں، انسان محض جانور یا مشین نہیں ہے، کہ وہ محض مادی ضروریات فراہم کرنے کا آلہ ہو یا اس کی ضرورت محض پیٹ اور بھوک تک محدود ہو، بلکہ وہ مادی حوائج کے

سے بلاشبہ اردو شاعری کا گلہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن وہ دوسرے جذبات وخیالات سے یکسر خالی نہیں ہے، خود غزل میں بھی جو اس حیثیت سے سب سے زیادہ مطعون سمجھی جاتی ہے، بہت سے اخلاقی وحکیمانہ خیالات پائے جاتے ہیں، بلکہ رباعی کے بعد غزل کے فرد اشعار ہی اس کے لئے موزوں ہیں جس سے کسی غزل گو کا کلام بھی خالی نہیں ہے، رباعی اور قطعات حکیمانہ خیالات کے لئے مخصوص ہیں، جن کا بڑا ذخیرہ اردو میں ہے، مسلسل نظم کے لئے مثنوی ہے جس میں ہر قسم کے واقعات اور خیالات وجذبات نظم کئے جا سکتے ہیں، اور اردو مثنویوں میں اس کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں، اس لحاظ سے مراثی کا دامن بھی جن کا موضوع اگرچہ محدود ہے ہر قسم کے جذبات وخیالات، مناظر اور واقعہ نگاری کے لئے نہایت وسیع ہے، اور اس کی بہتر سے بہتر مثالیں انیس و دبیر کے مراثی میں موجود ہیں جن کی نظیر جدید اردو شاعری میں اب تک نہیں مل سکتی، یہ تو پرانی شاعری کا حال ہے، جدید دور کی شاعری میں ہر قسم کی نظمیں اس کثرت سے ہو گئی ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے، البتہ یہ جدید نقطۂ نظر سے قدیم شاعری زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے خالی ہے، لیکن ایسے دور میں جبکہ شاعری میں اس کا نشو و نما حکومت کی تباہی، سوسائٹی کے فساد اور لکھنؤ کے گہوارۂ تعیش میں ہوا ہو زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار میں ہمایوں اور بابر کی تلوار کے جوہر، یا محمد شاہ رنگیلے کی محفل میں خون جگر تلاش کرنا، لیکن جب سے اردو شاعری کا قدیم رنگ بدلا ہے، اس میں قومی، ملی، معاشی اور سیاسی مضمون کا بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جدید شاعری کے سرگروہ حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خان، اکبر اور اقبال سب کے سب پرانے قدیم شاعری کی پیداوار تھے، انہی نے جدید شاعری کا آغاز کیا، اور اس کو کمال کے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، خود ترقی پسند شعراء کے امام جوش ملیح آبادی بھی شاعری کے پرانے اسکول کی پیداوار ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پسندی کے رائج الوقت سکہ کا ٹھپہ لگا دیا ہے لیکن وہ اسی پرانی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے، اسی لئے اس میں کھوٹ نہیں ہے، اور کمال فن اور محاسن شاعری کے اعتبار سے استادانہ ہے، اس لئے پرانی شاعری کا دفتر بالکل پارینہ نہیں ہے، البتہ اس کے بعض پہلو قابل اصلاح ضرور ہیں جن کی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

پر لکھا ہے، مرزا رسوا اور قاری سرفراز حسین نے طوائفون تک کی سرگزشت بیان کی ہے لیکن کس شائستگی کے ساتھ، خود قاضی عبدالغفار صاحب جو پرانے اور نئے دونون ادب کے مجمع البحرین پرانے ادب کے نامور ادیب اور ترقی پسند ادیبون کے مقتدا ہین، ان کی کتابین لیلی کے خطوط اور مجنون کی ڈائری اصلاحی ترقی پسند ادب کا اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ ہین لیکن اس کے لئے بڑے سلیقہ، حسن مذاق اور اس سے بھی بڑھ کر حسن نیت کی ضرورت ہے جس کا نئے ادیبون مین عموماً فقدان ہے،

یہ تو نئے اور پرانے ادب کے ایک حصہ یعنی نثر کا تجزیہ تھا، نظم کا حال بھی یہی ہے نہ ترقی پسند شاعری سراسر خیر ہے، اور نہ پرانی شاعری محض دفتر پارینہ، شاعری ہی نے اردو جیسی نومولود بولی کو مستقل زبان بنایا، اور شعراء اور ادیبون کو زبان و بیان کے جوہر عطا کئے، ورنہ وہ ع

اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے انکار نہین کہ اردو کی قدیم شاعری کا بڑا حصہ عشق و عاشقی کے جذبات اور ہجر و وصال و گل و بلبل کی داستان پر مشتمل ہے لیکن حسن مذاق اور لطافت کے ساتھ یہ چیزین شاعری کا عیب نہین، بلکہ ہنر ہین کس زبان کی شاعری اس سے خالی ہے، بلکہ شاعری کا آغاز ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا، اسکو خارج کر دینے کے بعد شاعری مین رہ کیا جاتا ہے، البتہ اعتدال و سلامت مذاق ضروری شرط ہے، یہ صحیح ہے کہ آخری دور کے شعراء خصوصاً لکھنؤ کے شعراء نے شاعری مین بڑا ابتذال و رکاکت پیدا کر دی اور اس کو سفلہ جذبات کا چٹکلہ اور الفاظ کا کھیل بنا دیا لیکن یہ اس دور کی زوال پذیر سوسائٹی کا قصور ہے، تاہم کوئی دور بھی بلند پایہ شعراء سے خالی نہین رہا، ان مین میر، مومن، ذوق، غالب، آتش اور انیس و دبیر بھی تھے جن کا کلام اردو شاعری کا لائق فخر سرمایہ ہے، خصوصاً انیس و دبیر نے اردو شاعری کا دامن نہایت وسیع کر دیا، انیس نے بالکل صحیح کہا ہے،

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر   مگر مین نے پلہ گران کر دیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری کا دامن محض عشق و محبت کی واردات سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس کا

قوانین کی پابندی کی ضرورت نہیں جن سے شاعری محض صنعت گری بن جائے لیکن موٹی موٹی باتوں مثلاً بحر و وزن اور قوافی کا لحاظ جن سے شعر کا قالب بنتا ہے ضروری ہے، ورنہ وہ شعر شعر نہیں رہ جائے گا، ایسا تو نہ ہو کہ ایک نظم کا ہر مصرع دوسرے سے مختلف ہو، اور نثر و نظم میں امتیاز کرنا دشوار ہو جائے، بلکہ نظم منثور کے فقرے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں، انگریزی کے بلینک ورس کی شوق سے تقلید کی جائے لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ، ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو دوسری زبانوں کی بعینہٖ نقل و تقلید کا متحمل نہیں ہو سکتا، ایک ماہر و مبصر ادیب کا یہ کام ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کی نقل یا ترجمہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، ورنہ ایک کی روح دوسرے کے قالب میں بالکل اجنبی نظر آئے گی، اس قسم کے تصرفات خود عربی فارسی اور اردو کی بحروں میں جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کئے گئے ہیں، اس لئے کہ بجنسہٖ ایک زبان کے قوانین شاعری دوسری زبان کی شاعری کیلئے موزوں نہیں تھے، ایسی حالت میں انگریزی جیسی اجنبی زبان کی شاعری کی نقل و تقلید میں تو ترمیم اور تصرفات بھی زیادہ ضروری ہے،

دوسرا عیب ابہامیت یا رمز و کنایہ ہے، اردو شاعری میں بھی استعارہ و کنایہ ہے لیکن اس کا استعمال خاص خاص مواقع پر اس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کلام کے حسن و اثر دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور شاعر کا مفہوم و مقصد، تصریح سے زیادہ بلیغ طریقہ سے ادا ہو جاتا ہے، الکنایۃ ابلغ من التصریح مشہور مقولہ ہے، لیکن جدید شاعری کی ابہامیت ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا

کی مصداق ہے اور اس کا مفہوم و مقصد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، ترقی پسند شاعری کا بڑا مقصد خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور اس قسم کی ابہامیت اس کے بالکل منافی ہے، اس لئے سنجیدہ ترقی پسندوں کو ان نقائص کی اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ترقی پسند ادب کا اصل منشا پورا نہیں ہو سکتا اور اس کی زندگی بھی بہت تھوڑی ہوگی،

اس کے مقابلہ مین ترقی پسند شاعری کی ابھی کوئی حیثیت ہی قائم نہیں ہوئی ہے، اور ترقی پسند شعرا مین جوش، مجاز، علی جواد زیدی، فراق اور اس قسم کے دو چار شعرا کو چھوڑ کر جن کی شاعری کا قالب وہی پرانا ہے، اور جو در حقیقت شاعری کہی جا سکتی ہے، باقی نظم منثور لکھنے والے کسی شمار مین نہیں ہین، اور اُن کی حیثیت اشتراکی ادب کے بھونڈو نقالوں سے زیادہ نہیں، اگر پرانی شاعری محض عشق و محبت، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے افسانون تک محدود تھی تو جدید ترقی پسند شاعری محض پیٹ، روٹی، انقلاب، مزدور، سرمایہ دار اور فرائیڈ کی جنسیات تک محدود ہے،

ترقی پسند نثر اور نظم دونون کے عیوب و نقائص قریب قریب یکسان ہین، نظم مین دو عیب مزید ہین، ایک شاعری کے قواعد سے آزادی، دوسرے ابہامیت یا رمز و کنایہ قواعد سے آزادی کے لئے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ وہ خیالات کے تنوع اور وسعت کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے اُن کا توڑنا ضروری ہے، لیکن یہ محض عذر لنگ اور عجز بیان کا ثبوت ہے، رامائن، مہابھارت، شاہنامہ، مثنوی مولانا روم وغیرہ دنیا کی بہت سی غیر فانی کتابین پابند نظم مین لکھی گئی ہین، اور ان مین مختلف النوع جذبات و خیالات، افکار و تصورات، واقعات و حالات، فلسفہ و حکمت، اخلاق و روحانیات وغیرہ کا ایک عالم موجود ہے، اور اُن کے نظم کرنے مین شاعری کی پابندیان حائل نہ ہو سکین، خود اردو جیسی تو عمر زبان مین غالب، انیس و دبیر اور اقبال کے کلام مین کیا کچھ نہین ہے، اقبال سے زیادہ بلند و دقیق کس کے خیالات ہونگے لیکن اُن کو کبھی قواعد شاعری کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑی، خود ترقی پسند شعرا مین جوش، مجاز، فراق، علی جواد زیدی جان نثار اختر کو جن کا کلام در حقیقت شاعری کہلانے کا مستحق ہے، شاعری کے قواعد کی تنگ دامانی کا شکوہ کبھی نہیں ہوا، خصوصاً جوش کا کلام تو قادر الکلامی کا نمونہ ہے، اور اسی لئے اُن کے کلام مین جان ہے کہ اس کا قالب پرانا ہے،

بحر، ردیف اور قافیے کی پابندیان محض لایعنی نہیں ہین، بلکہ اُن سے کلام مین حسن و اثر پیدا ہوتا ہے، ایک ڈھلا ہوا شعر سامعہ اور ذوق دونون کو متاثر کرتا ہے، قوت حافظہ بھی اسے جلد اور آسانی کے ساتھ محفوظ کر لیتی ہے، اس لئے تبلیغی مقصد کے لئے بھی پابند شاعری زیادہ مفید ہے، اس حد تک تو تسلیم ہے کہ ان تمام

مطبوعات جدیدہ

مسدس بے نظیر مصنفہ جان صاحب مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:- خسرو باغ روڈ ریاست رامپور

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علما نواز اور علم وفن کے بڑے قدردان ومربی تھے اُنکے دور کے بہت سے نامور علماء و شعراء اور ادبا، دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ مین بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اسی سلسلہ مین انھون نے اپنی تخت نشینی کی یادگار مین ۱۲۸۳ھ مین ایک میلہ قائم کیا تھا، یہ میلہ بڑا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام مین باغ بے نظیر مین لگتا تھا، نواب موصوف خود نفس نفیس اس مین شریک ہوتے تھے ہر فن کے باکمال اس میلہ مین اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعروادب کی محفل بھی جمتی تھی، چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے متوسل شعراء نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف مین اشعار کہے تھے، مشہور رنگین گو جان صاحب نے ایک مستقل مسدس مسدس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہین چھپا ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ مین موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو مبسوط مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے، مسدس تو کل ۳۲ صفحون کا ہے لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے، اس مین لائق مصنف نے بڑی تلاش وجستجو سے تاریخی وادبی ماخذون شعراء کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگون کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہین، اور جان صاحب کے مسدس اور دوسرے شعراء کے کلام مین جن لوگون کے نام یا جو اشارات آئے ہین، اُن کے مختصر حالات اور اُن کی تشریحات تحریر کی ہین، اس طرح اس مقدمہ مین اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے جس کا اب صرف تاریخون مین ذکر ملے گا،

"م"

جلد نمبر ۱۸۱

دسمبر ۱۹۵۵ء

معارف

مجلسِ دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

سید سلیمان ندوی

و

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت:- چھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

۱۹۴۹ء کی نئی کتاب

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوجکشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے یہ بوریہ نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو ان کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی، اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا لیکن انہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں،

قیمت :- عہ

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے،

(طابع و ناشر صدیق احمد) "منیجر"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۰ عیسوی عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

آثارِ علمیہ و ادبیہ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دار المصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کے
اس کی قدردانی کی، بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کر لیا، اس نے
برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہو گئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح ترمیم،
اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے ز
جامع اور مکمل ہو گیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اول

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے
اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی
اور علمی تاریخ، ضخامت ۲۹۵ صفحے قیمت: [illegible]

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی،
تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت:- ۳۶۳ صفحے

قیمت:- [illegible]

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اول)

یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحا
متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیا
تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم
تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تا

ضخامت:- ۳۳۲ صفحے

قیمت:- [illegible]

"منیجر"

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار مین سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، مین نے مرحوم کی زندگی ہی مین اُن کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین مین رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر مین بتاریخ ۱۱ اگست سنہ ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہین کہا جا سکتا کہ اس کو کہان سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، مین نے موصوف کو سب سے پہلے سنہ ۱۹ء مین نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس مین نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھین اُٹھ جاتین انگلیان اشارہ کرتین، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح مین نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

شذرات

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہین نکلا لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہین کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہوجاتا ہے، انہی مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف وخصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے مین نہ آئین گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ مین بھی ان اوصاف مین منفرد تھے، اُن کی ذات سے فضل وکمال، علم دوستی وعلما نوازی، تقویٰ ودیانت، تہذیب وشرافت، سیرت کی استواری ووضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف وکمالات اور علم وفن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دارالمصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط وتعلق اُن کی یادگار دارالمصنفین کی جانب منتقل ہوگیا، چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان، ہواخواہ، مجلس دارالمصنفین کے رکن رکین اور اس کے صدر نشین تھے اسلئے دارالمصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل مین ادا کرسکتا تھا،

اس نمبر مین اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور اُن کی نمایان خصوصیات سامنے آجائین، چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحاب علم وقلم کے ہین جن کو برسون مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو نزدیک تر سے مسلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا، لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو سرمقالہ رکھنا ضروری تھا اس سے صرف چند ابتدائی صفحون کے ہندسے مکرر ہوگئے ہین، باقی اور کوئی فرق نہین آیا، ہم ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور اُن کی علمی یادگار ناظرینِ معارف کی خدمت مین پیش ہے

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستون سے بزرگداشت کا تعلق رکھون اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھون، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین اُنھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے، دار المصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دار المصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط وکتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انھی کے تھے، مین نے جب اُنھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم وجدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی وعربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم وفن اور دین وتقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے، اور ہر ایک سے حسبِ استعداد کسبِ فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سندِ حدیث حاصل کی، قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر پر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۹ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف ہے

کے ایک رئیس عالم ہیں،

۱۹۰۱ء میں جب میں ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے، اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسے کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے، ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے عمامہ اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ میں مولانا شروانی شریک تھے تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولینا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں، ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدت تعلق کی بنا پر جو اُن دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے"، ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا، جب تک اُن کی قوت حافظہ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، میں نے دیکھا کہ اُن کا سر سا قد نیم کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ

کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور دوسری دفعہ لکھنؤ میں مرحوم کو قومی اداروں میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دارالمصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۵ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہرالعلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں میں نے ان کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرادیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا ساز گار آیا، اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، میں نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا، اور نہ میں نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابیں خریدا کرتے، لکھنؤ میں عبدالحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو ان کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کرلے جاتے، یوں بھی کتابیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں اور بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی

اور دوسرے کا نام نابینا علما، یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں، ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا، تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں ان کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۴ء میں الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوئے، تو اغلاق پر ان کے مضامین نکلے،

[illegible] کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں الصدیق لکھ کر شبلی کی [illegible] کی، میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے، ان میں سیرۃ پر مختلف رسالے لکھے جو چھپے اور چھپتے، [illegible] مضامین اور ان کی غزلیں اکثر زیب اوراق رہیں،

شعر و شاعری کا ذوق ان کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتے تھے، اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے،

ان کے اخلاقی فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے، اور تمام عمر میں کبھی اس میں فرق نہیں آیا، پھر اس قیام میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جا کر ملتے، اور آخر دیر تک بیٹھتے، لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ میں ضرور جاتے، ان کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے نسبت رکھتی تھی، یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے ان کو قلبی تعلق تھا، اس لئے وہ ندوہ کے ان اصلی ارکان میں تھے، جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے، اور یہیں اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی، جس کے بعد ان کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح میں ان کی مساعی مشکور رہیں، حیدرآباد

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اوکی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا،
حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار
سے تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے کہین بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابو الکلام
سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست
کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین جن مین سیاست بھی ہے، مگر کبھی کسی خط مین
نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا
بھی تو اوڑا دیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ کنایہ مین کہتے
کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر
اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۳ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دار المصنفین آئے
تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے اُن
کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا
مُلا جی یہ تو پٹھانون کا مال ہے ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کر دیا کہ شاہان بشاہان می زیبند،
فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس مین بیان
فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ
تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پر تاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی
کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری، تصنع سے خالی، اور آورد سے پاک، بزرگون

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڑھ میں بھیکم پور میں تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤن آباد کیا تھا، وہین زنانہ اور مردانہ مکانات مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ مین ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ مین سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ مین تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک مین مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا۔ تو جواب مین لکھا کہ کیا رمضان مسلمانون کے کام مین مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ مین وہ چائے کے بجائے اوولٹین پیتے تھے، مین کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری مین یہ تینون شراب الصالحین لائی جاتین اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتون مین اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب فرقت اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینیرنگ مین بنی، مرحوم دونون کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڑھ مین حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھون نے جو مشورہ دیا اس مین سے سامنے کی روکار عمارت ہے، فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتین عجیب تھین، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کو تعلق ہوتا وہ

تفصیلات اب معلوم ہوئین، مین نے انھین لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۸ء مین) دو نو جوان عراق کے سفر کو نکلے تھے جن مین سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابو الکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابو الکلام نہیں بلکہ حافظ عبد الرحمن امرتسری تھے، اور اوس وقت مولانا ابو الکلام امرتسر مین وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق مین انتقال کیا، چند ہفتون بعد یہ خبر آئی، تو مولانا ابو الکلام نے وکیل مین اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا، اخیر مین لکھا کہ آپ کو اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہین دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہین چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگون کی یادگارون سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین غالباً حاجی شاہ [illegible] دیشنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ مین ایک شاندار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ مین ایک ایسا عظمت جوش علما، مشائخ، صلحا اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھون سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے،

ان کے اخیر دور کی یادگارون مین استاذ العلما مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف مین چھپے ہین، اور الگ بھی شائع ہوئے، انھون نے

کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوتی تھی، لہجہ میں سختی اور آواز میں کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق میں بڑے نرم مرنج و مرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علٰحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انھوں نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہباز ہمتم در بطے بدست شاہ داشت

دست دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابن رئیس ہونے کے اور حکامِ ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونوں سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب کے آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا، اور کہ قوی میں سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں اُن کا یہ بیان پڑھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ارگن اور مجلہ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوہ کی ترتیب وادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، راجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہمقدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دیکھا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو "ظلِ پدر" یا "پدری شفقت" کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری چیز سمجھ مین نہین آتی، آہ! سہ

ع قفا نبك من ذکری حبیب ومنزل

مقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچا یا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچا یا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومتِ آصفیہ کی جدید

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ مین فقیر کی تصنیف عرب وہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو مین نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتون مین سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف مین شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ مین مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ مین اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم مین اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپ کا سامان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبد اللطیف کی قیامگاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے مین نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ مین ہوائین اور سمت کی چل رہی ہین، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سیرۃ عائشہ

اُم المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنف نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان اور معترضین کے جوابات، قیمت: ۔ صہر

منیجر

میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"

اسی کے بعد جو مقدر تھا، وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا، اور جب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ "ناظم" کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر بارگاہ خسروی سے جب تصریح ہو گئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام ہو گا، جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، چھٹ کر صاف ہو گیا، "ناظم امور مذہبی" کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختریار جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہو گئے،

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب "باب حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو باب حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور اراکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہو گیا،[1]

---

[1] قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) اور ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا جو کسی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزرا کو معین المہام کہتے تھے، باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدر الصدور کی حیثیت کیا ہو گی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی جن کا رتبہ صدر اعظم اور وزراے کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہیں بنایا گیا، اور محکمۂ مذہبی کی نمایندگی کے لئے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہوگئی، ملک کے طول و عرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایان شان بہمہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڈہ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا استاذ العلما مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی اُن کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، دُرباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ،

الغرض حکومت آصفیہ کے وزیر مذہبی کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

ابًا عن جد پشتہا پشت سے جسکے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے، تلغرافی پیام حیدرآباد سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے تار میں غالبًا ناظم امور مذہبی کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا، ناظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے کس قسم کی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، اور اختیارات جو ملتے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے "نوکری" کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعًا منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجوم خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ اُٹھا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمین ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہیں

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت و عطوفت کے ساتھ فرمانے لگے، کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے تکلفوں کی ضرورت نہیں، جب آنا ہو، بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"۔

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ میں حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی میں قیام فرما تھے، خلد آباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع میں استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں وطن (اعظم گڈھ) جا رہا ہوں خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہوں، مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی، حضرۃ الاستاذ وہیں سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہو گئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اُتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے، اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دار الامارہ میں مقیم تھا حکم دیا گیا، کہ شہر میں گھوم گھوم کر قلمی کتابوں کا پتہ چلاؤں، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشا کو پا کر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی، اس سفر میں بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت میں حیدرآباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی میں فقیر بھی اُن سے مانوس ہو گیا، اور اُن کے لطف و کرم کی موسلادھار بارشوں کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا ہی رہا، [illegible]انت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ و نور ضریحہ۔

کم و بیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدرآباد کی زندگی گذری، اس عرصہ میں سرکاری غیر سرکاری شعبوں میں اُن کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہاں سرسری طور پر بعض نمایاں خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہیں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں،

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہوگیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہوچکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی، اس لئے سن و سال وضع و قطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا، لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ درِ دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریزی کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی میں مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں اونچے نیچے سرکاری غیرسرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے اُن کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے:-

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہوگیا پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ضم کر دی گئی، ابتدا میں اس عجیب و غریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، " تلك امة قد خلت لها ما كسبت و لكم ما كسبتم يغفر الله لنا ولهم اجمعين "، ۱۲،

نہین جاسکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم وانتظام فرش و فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین اکتا جانے کی کیفیت کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون جھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دلآویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرون کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت وآرام کی زندگی کے قدرتہً عادی تھے، لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بارہ بجے تک کبھی واپسی ہوتی لیکن مین نے کبھی ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[۱]

---

[۱] خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریبًا لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپ کے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے، شرم سے گردن جھک گئی،

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسون کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانون کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جا رہا ہے، کچھ ایسے لب ولہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے، کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب، لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی۔

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے، جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق ان کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات ان کے نکھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوؤن پر مسلسل پر مغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ یہ ہے کہ بھلائے

اور اُن کے خلفا و جانشینوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشوں مین ایک بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون سے اُن کی راہ و رسم لوگون کے لئے باعثِ حیرت کبھی بن جاتی ہے مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب و غریب خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اُسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان اُن کے علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی چھینٹے اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سُنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی، کہتے ہین کہ جامعہ کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر تک اتنی طاقت کسی مین نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد جب شیروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدرالصدور کے توسط اور معائنہ

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریرون سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہین ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا، لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہین ہوئی، فہمایش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا، جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہین ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے فیصلوں پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلوں کے حدود سے سر مو متجاوز نہ ہوتے تھے، مگر یہ طرزِ بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی انکی باتون سے کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امورِ مذہبی کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے آثار کے ساتھ ہندوؤن، عیسائیون، پارسیون کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت مین حاضر ہوتے، اپنے درد دکھ کے قصے سُناتے، ہر ایک کی بات سنتے، اور حُسنِ سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے، کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے پیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ

گیا تھا، اسی لئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے تصور میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی انکی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کام میں ایک جگہ یا قرن میں اور ادر کیا کیا قصے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر غایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو سر زدتع پر اُن کے قدم کا رُخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے لوازمون کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے، مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابو حنیفہ "ابتلیت بہ فصبرت" انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں "نہیں" کا جواب سُن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مختص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے مجلس کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحب نے عجیب بات پوچھی،

کے بعد پیش ہون،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ مین بلیغ کوشش کی، اور مولانا انوار اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار والاتبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ مین کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا؛ اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا مین تو ان لوگون کو جو "جدید یونیورسٹی" کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیتہً مشرق مین مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہین، اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دین گے، بلکہ ایکٹ مین حصہ بھی لین گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہو گیا، چارٹر ہی مین شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرا لیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو و نما کا کام بھی اس "جامعہ" سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہین عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کرکے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ وار ی نصاب جب بننے لگا تو لوگون کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی اُن کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ مضمون کی حیثیت سے نصاب مین دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالبہ کے لئے کچھ کتابون کی سفارش بھی کر دی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسون مین اس کی تعلیم نہین دیجا سکتی، خدا خدا کرکے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون مین طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک جبری عنصر جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب مین باہر سے بزور داخل کرادیا

قدامت و جدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب و غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائین باغ مین ورد و وظائف و تلاوت مین بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ مین مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہین تھے لیکن کریم النفس، فیاض، امیر اور بازل ہونے مین بھی شک نہ تھا، حیدرآباد مین اُن کو دو ہزار ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی، لیکن جہان تک نظر جاتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتون کا سلسلہ موسم سرما مین مہینون جاری رہتا، ہر شب مین ایک ایک ٹولی ہم مذاقون کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی دعوتون کا ذکر کام و دہن مین یارون کے چہل پیدا کر دیتا ہے،

مین اس سلسلہ مین دوسرون کا ذکر کیا کرون ملازمت کے ابتدائی سالون مین مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی مین تھا، مین تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صورت، میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب مین صرف استمزاج کا خط ہی نہین آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی، خط مین میرے بھائی کو انھون نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج مین مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے روپیے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمد اللہ نہ ہوئی، لیکن اُن کے شریفانہ برتاؤ کی یاد دل مین جب کبھی آجاتی ہے چشم تر آب ہو جاتا ہون، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگون کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہان پائین گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت مین خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ مین رچ گئے، انھون نے انسانی زندگی

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دیئے جاتے تھے ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دلچسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ "نیرو مائنڈڈ" کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں

مگر ایک پہلو اُن کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے لیکن اُن کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے، اور آپ کے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی، اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہیں ہوتی تھی نیز سرکاری دفاتر میں بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون سائنس کے مساوی کر دی جائے، بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم و امتحان تینوں شعبوں کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے، مگر نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کوٹے کر کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،

اُن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

وہ بڑے صاف ستھرے اجلی زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدرآباد میں کوئی دوسرا آدمی اُن کا مدمقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سوا جی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں میں اُن کے اس طرزِ عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر میں تھا، باطن میں اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفرِ حج کا عزم جب فرمالیا گیا، تو فقیر کو علی گڈھ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہاں حضرت مولینا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجھک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شیروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہاں خانہ میں گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے :۔

"بارالٰہا! یہ حبیب الرحمن خان شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

بارالٰہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے،

بارالٰہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، الٰہی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدریوں کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور ہے رو رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپکے امام ابو حنیفہ جیل میں کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلاوطنی کی سزا کیا ان ہی دنوں میں بھگتنی نہیں پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانوں ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگوں نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہیں رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہولے، مولویوں کے لئے بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کے دروازے کھل جائیں، تب کام کریں گے، اس دن کچھ ایسے انداز میں تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں میں نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدرآباد کی مسجد چوک میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ میں تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجددؒ کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلوں کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجدد کے بعد شاہجہان و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر میں کیا بتاؤں کہ اس سلسلہ میں انھوں نے معلومات کے کن خزینوں کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلیس بھی علم و ادب کی مجلسیں تھیں، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے میں محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا گویا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو اُن سے مجھے نہیں ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہیں، مجھے اس پر فخر ہے

قلم ہاتھ میں آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرأ القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ؎

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر میں اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں،

"مجلس مذاکراتِ علمیہ" اُن ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی جس میں شہر کے ممتاز اہلِ علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس میں اپنی زبانِ مبارک سے اردو کی یہ غزل سُنائی تھی، اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر سے کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھوں نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رُخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کرکے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری	خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری
رہینِ صحنِ گلستان نہیں دل افزائی	شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

"اس کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہاں آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے، انھوں نے ہمارے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

گور کے خلوت خانہ مین حبیب الرحمن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائین اور غریب وہان تنہا رہ جائے

تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال وجواب مین یہ بیچارہ

ثابت قدم رہے،،

بارالہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگون کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے

ہون، تو اس بیچارے حبیب الرحمن حکیم پیر والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہون کو بخش دے اور

بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائین،،

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ اُن کے الفاظ تھے، لیکن

بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے اس مین محفوظ ہین، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد

نہین، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤن سے تر تھی، سارا مجمع مجسّم گریہ و بکا بنا ہوا تھا آخر

مین فرمایا کہ

"اے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن شہر در تدن کی تصویر مرد عاقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے

سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم مین ہین جہان نہ اُن کے

اعزہ ہین نہ اقربا، نہ احباب ہین، اور نہ دوست نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہون گے، نئے حالات ہون گے

آدمی خواب مین بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا مین پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق

ہوکر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) مین کچھ یہی صورت اُن لوگون کے سامنے

پیش آتی ہے، جو اس دنیا والون سے تو الگ ہو جاتے ہین، لیکن نئی دنیا مین نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے

فاللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہٗ کن اللّٰھم انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء و

الاولیاء رفیقا،

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر میں معارف کے صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اوّل تو جو خلوص مجکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جاسکتی، چنانچہ جو کچھ ہوسکتا ہے مختصراً حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئے گا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان بنظر درگذر دیکھی جائین گی، کیونکہ مین اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو اوپر نظر آرہا ہے،

آغاز واقفیت جن دنون مین استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چند ہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پاگئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہورہا ہوتا یا فوراً ہوچکا ہوتا، الغرض مجکو ان کے متعلق اس طور پر معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجھکو اس سے زیادہ نہ

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین
بوقت مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا،

خیال لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین
سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا "شنیدہ" انشاء اللہ الملک الکریم الجواد "دیدہ" بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانه وطاب ثراہ،

---

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والون سے پہلی بات پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھٰذا الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، حسن بیکا فسانہ سارا سانہ وسامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ کیا اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت:- ۲۱۴ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

زمانے، اسی زمانہ میں اورینٹل کانفرنس کا جلسہ لاہور میں تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو تشریف لے گئے تھے، اور میں انٹرمیڈیٹ کالج کے نمائندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ میں بھی، ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہوکر مجھسے باتیں کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہوجانے پر مجھے آگے بڑھاکر نماز پڑھ

تعلقات میں استحکام | غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، میں جب شہر کی سکونت چھوڑ کر یونیورسٹی کے احاطے میں قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی میں قیام مبارک ہو"۔ اس احاطے میں مقیم ہوکر حسب اپنے میں نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولوی صاحب میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہوجانے کے بعد اکثر میری آمد و رفت ان کے یہاں ہونے لگی تھی، اب پڑوس میں آکر روزانہ عصر و مغرب کے درمیان میں نے وہاں حاضری کا معمول مقرر کرلیا، یہ سلسلہ بھی بے غرض اور خلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلا گیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم برسر مطلب۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڈھ میں قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں تشریف لاتے، علمی و دینی مسائل، بزرگوں کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ میں نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر میں، بعد میں یہی ترتیب مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہاں اور حبیب منزل میں بھی قائم رہی کہ وسط میں نواب صاحب ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر میں،

استاد سے عشق | نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز میں اس عنوان سے کر رہا ہوں جو کہ مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس میں استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماءؒ کی شاگردی پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے، میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہوچکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

جانتے ہون گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہین کہ معذوری کی حالت مین بھی اس کو پڑھا رہے ہین، اس دوران مین کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمن خانصاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ مین کلام لطف کے مقدمہ مین لکھ چکا ہون، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوئے تو مین نے خود دیکھا کہ جس مکان مین حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی مین کھڑے ہو کر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہوگئے کہ رونے مین آواز بلند ہوگئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط وکتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تاآنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی مین نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلماء کے سوانح حیات کا معارف مین شائع فرمایا جو بعد مین بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا، اس مین میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت مین مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے مین ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو مین اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ مین نقل کر چکا ہون، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دہراتا ہون،

"میان مولوی بدرالدین جب پڑھنے آجاتے ہین تو مین اپنی تکلیفین بھول جاتا ہون اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہون ہائے بلے سے نجات مل جاتی ہے"،

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ مین ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب مین شرح المختار پر کام کر رہا تھا، جس وقت مین پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کر کے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد و رفت قائم نہین ہوا، تاہم جب اور جہان ملاقات ہوتی، بہت شفقت

(۳) پلکھنہ وہ معمور لطفِ لدنی　　　منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پلکھنے میں برسے ہیں انوارِ حکمت　　　درخشاں وہاں پر ہے نورِ تجلی

مرشد سے عقیدت | مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی، پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہانپور کے شاہ عبدالغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان میں کبھی کسی کا نام رحمان پر نہیں ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونوں ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمن اور خلیل الرحمن کے ناموں سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو"، عرض کیا "جانتا ہوں"، فرمایا "خدمت کرتے ہو"، عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہیں"، اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمن صاحب سے بیعت کی، آخر میں استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقتِ بزرگانہ | جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد میں اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں، استحکام کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی جو آغاز میں کارفرما تھی، علمی و ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر یہ بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیوں اور حکام سے دور رہنا مجھ کو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کردیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمہ اللہ کی خدمت میں، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہوجانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت میں بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں یہ جملہ زبان پر لاتے، حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہان سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا، جب ادھر سے گذر ہوتا فرماتے تھے کہ استاد سے تعلق پلکھنہ کی طرف جاذب توجہ ہو جاتا، وہان تقریبات مین شریک ہونا اور علما کے مجمعون کا سمان نگاہ کے سامنے آ جاتا، ادھر آخر مین کئی بار اس مقام پر پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہو جاتے تھے، جو کبھی حبیب گنج سے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پر لکھ کر مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحریرین موجود ہین، جنکو مین یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہون،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نور شمس معارف　　　کیا جس نے پر نور عالم سراسر
پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے　　　لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے" مبالغہ نہین، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان تقریب شادی مین علماء کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہوں کا، ایک عالم سرحد نے کہا کہ ایک بار ایک اہل علم کے جلسے مین صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے، تو تین سو شمار مین آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالبعلم اقلاً رکھے جائین تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی گنجائش کہان ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا اب بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ" ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہون، فیض پلکھنہ فی البداہتہ

پلکھنے کا ہو وصف کب ہم سے امکان　　　یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان
وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم　　　وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ نومبر ۱۹۴۷ء

اور نواب مزمل اللہ خانصاحب حکام سے ملے، جائے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خانصاحب نے جو میرے چچازاد بھائی اور عمر میں بڑے تھے، ذرا تیز ہو کر پوچھا "کہاں چلے گئے تھے"، جواب سننے پر انھوں نے پھر تیز ہو کر کہا کہ "ان لوگوں سے ملنے اُئے ہو یا دربار کے لیے"، اس کا جواب یہ تھا، کیا کیا جائے ایک خبط ہے"۔ اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خانصاحب نے گرم ہو کر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہاں شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہاں"۔ اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے"۔ یہاں ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی، لائبریری میں ممبران کورٹ اور ممبران اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھتے جارہے تھے۔ اسٹاف کے سلسلہ میں میں بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر اُدھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھکر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہاں ان کی جگہ نہ تھی جب تک لائبریری میں اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے اور برابر باتیں کرتے رہے،

درویشی اور تواضع | باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج میں درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر ہر شخص نے دیکھے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شانِ درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہرگز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوتی، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی | نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم میں کمزوری پیدا نہ کرسکا، شاید ہی کوئی شخص تنہا ساؤں میں ایسا ہو جس کے خیال میں اس کی مثالیں نہ ہوں۔ وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی، نہ مانۂ قیام علی گڈھ، روزانہ عصر کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب کے یہاں جو معمول آنے کا تھا اس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھیے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ میں نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کرتا ہون، میرے یہان تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جارہے ہین، شریک نہ ہون گے ہین فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائین، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے، تو مخصوص جلسہ مین تبلا کہ جب مین روکنے کے لیے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب کہان تھی کہ شرکت نہ کرتے، اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو اسکا ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف خدمت زبدۃ العلما، مولوی بدرالدین بدر سماء کمال مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات اہل علم سے بہت رغبت تھی، محض علمی فضل کی بنا پر لوگون سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ مین اچھے اچھے علما کو یونیورسٹی مین جمع کر دیا، اہل علم کے ساتھ ہمنشینی کا خاص ذوق تھا جس کا ایک منظر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہان روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لاکر گھنٹون بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسین بڑی پاکیزہ ہوتی تھین، جن مین معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہین، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو رہتی تھی، یہان یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعون پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرتا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچ کر لازم تھا، ایک بار وہان کوئی دربار تھا، نواب مزمل اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونون صاحب مقیم ہوئے، دوسرے دن صبح کو ضروریات سے فارغ ہو کر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہان گئے

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خانصاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ | اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا جن میں سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کر کے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شروانی" میں معارف سے منقول ہو کر درج ہے،

"ان کے لڑکپن میں ایک کتاب فروش بچوں کی کتابیں بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابیں فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانہ کتبخانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بنا کر کتابیں بیچا کرتے ہویاں اس کھیل کو دیکھ کر ہنستیں اور تعجب کرتیں، بچپن میں کتابیں بیچنے کا شوق آئندہ کتابیں خریدنے میں تبدیل ہو گیا، پہلے اردو دیوانوں کے نسخے خریدے، جو صندوقوں میں پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہاں قلمی کتابیں خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجہ پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفروں میں قلمی کتابوں کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد میں بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابوں کا فراہم ہوا جن میں ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبدالحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابوں کی بلکہ نایاب چیزوں کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابیں ہی نہیں ہر قسم کے نوادر جمع کر لیے جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہیں، کتبخانہ کی چند خاص باتیں قابل ذکر ہیں، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہیں کی جتنی کتابیں فراہم کیں سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہو کر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف و تالیف | علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف و تالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہوجاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

ومن مذہبی حب الدیار لاہلہا ۔۔۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہوگئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، پیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات | بھیکم پور عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز با جماعت کے لیے مسجد میں جانا اور وروود وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہوکر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بار گراں مجھ کو سپرد ہوگیا تھا،

حیدرآباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمت اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دوران قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے ۔۔۔ سچی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا۔

علمی ذوق | نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھرانا میں پیدا ہوکر پورے ماحول سے جداگانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبدالشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور درویشانہ زندگی بسر کرتے، لیکن

دلفریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو اثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹوں کے غور کے بعد بے اختیار تضمین ہوگئی، جو درج ذیل ہے۔

بناء عظیم للحبیب بکوئل عن النقص والاخلال صار بمعزل

فیبقی علی الایام ذکری کلیھما فیا حبذا ذکری حبیب و منزل

اسی دن یا دوسرے دن مین نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت مین پیش کر دیا، جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہون

"مصرعے بلیغ ہین، کوئل کا قافیہ غنیمت بارد ہے، امرأ القیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعہ اولیٰ کے پایہ کا نہین، آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپان اور ہمپایہ ہے"

اسی خط مین مولوی عبید الرحمٰن خانصاحب کی سفر حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، مین نے اس پر عربی مین مصرعے لگا کر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے یہ تاریخ کہی ہے نظم مین ظاہر کر دیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجہ ذیل کلمات مین فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے کمی پوری ہوگئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کر لیتا ہے"

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریرون مین انتہا درجے کے بلیغ ہین، مثلاً "خزینۃ المعانی کے مقدمہ مین اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہین" جو حال ہوا فیض استاد سے ہوا جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے"۔ رسالہ استاذ العلماء مین مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہین، "باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہین، پڑھا اور پڑھایا" مقدمۂ دیوان درد مین لکھتے ہین" شہروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے"۔ یہ تین نمونے اس وقت دماغ مین موجود تھے جن کو پیش کر دیا، بیسیون جملے اسی قسم کے انکی تحریرون مین موجود ہین،

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ مین حیدر آباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بابر پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جو اب علحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کین، مضامین لکھے، سارے ملک مین علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال مین شائع ہو چکا ہے، جس کے ۴۰۰ صفحات ہین، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ مین المامون پر ریویو نہین شامل ہو سکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف مین "سیرۃ الصدیق" انگریزی مین بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس ۳۰ سے متجاوز ہین،

ایثار اور وقار ملک مین جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۲۳ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسون کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک مین حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رکن رکین سرسید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیٹو کاؤنسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق اب مین نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہون، جس زمانہ مین حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بہ تقریب شادی میرا اور نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلاؤن"، حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حرفون مین امرء القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یون کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیا حبتنا ذکری حبیب و منزل

اس تصرف کو مین نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہو کر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، مین ان دنون شہر مین رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کر دو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیام گاہ

از بدخشان لعل و از عمان گہر — جوہرِ طبعم ز کانے دیگر است

منتِ رائحۂ نافہ و غنچہ نہ کشند — سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند

شاہبازِ ہمتم ربطے بدست شاہ داشت — خوش نہ کردہ بندِ دست دیگران پرواز کرد

ز چشمِ مست تو مستم شراب را چہ کنم — ز تابِ حسن تو سوزم کباب را چہ کنم

نکرد جلوہ بتِ شوخ باختم دل و دیں — اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

درحریمِ وصل جانانم وطن خواہد شدن — شمع بزم انس آن ماہ ختن خواہد شدن

نگاہ شوخ بہ چشم سیہ بداں ماند — کہ مست ناز خرامد بتے بہ بت خانہ

اے کہ از غایتِ لطافتِ طبع — سحرِ نو بہار رعنائی

ربودہ ہوش و قرارم غزال رعنائے — نگار مست خرامے بلند بالائے

مداوائے مریض عشق قانونِ دگر خواہد — طبیب درد دل آن نرگس بیمار بایستے

مجموعی حیثیت سے ایک نظر | خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سیدھے اور سچے آدمی تھے، ایچ پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پُر تھی، اس زمانہ مین ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایاں ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجۂ اتم تھی، گفتگو مین وہ لطف تھا کہ مجلس کے مقررہ وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کامون کو چھوڑ اس مین شرکت کے لیے مستعد ہوجایا کرتا، کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ مین مفقود ہین، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت برین مین بلند درجات پر فائز کرے، ویرحم اللہ عبدا قال آمینا

اب مین اس تحریر کو متمم بن نویرہ کے دو حسب حال بیتون پر ختم کرتا ہون،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو بہ تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہوتی ہو جس مین ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہون، جب مین حاضر ہوتا اس قسم کی گفتگو مین روے سخن میری طرف کر دیتے اردو اور فارسی دونون زبانون کے دیوان طبع ہو چکے ہین، کبھی خود اپنے اشعار سنا کر حاضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی استادون کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا ہوتی اسکو احاطۂ تحریر مین لانا ممکن نہین، یہان مین اس تحریر مین جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہون

اردو

جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستان ہو گیا — تو نے ذرا منہ پھیر کر گلشن بیابان ہو گیا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلین آنکھین اپنی — بزم یاران جسے سمجھے تھے وہ زندان نکلا

پھول فرقت مین تری خار ہوئے جاتے ہین — ہلکے پھلکے ہین مگر بار ہوئے جاتے ہین

کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہان فرصت کہ بیٹھون چاک کرنے مین گریبان کو

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل — تمھارے بھی ہین پاسبان کیسے کیسے

تاب نظارہ تو جب ہو کہ رہین ہوش بجا — پھر کہان ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی

دل بری مئے اگر برد ز من نیست عجب — اہرمن برد ز کف مہر سلیمانے را

ہمتِ ما سر نمی آرد بہ مال و زر فرود — دولتِ ما بس بود آن شوخ سیم اندام ما

دلم با ساغر و مینا نمی کشد حسرت — کہ برد نرگس مستانہ ز خود ما را

فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد — نثار دردِ تو سازم ہزار درمان را

در مقام مملکت عشق دیار نیست غریب — کہ شہہ غازیِ محمود غلام است اینجا

ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگارم نیست — جدا ز کوے تو ذوقے بہ نوبہارم نیست

باد چمن علاج تپ دل نمی کند — عیسیٰ دمے ز گوشۂ دامانم آرزوست

از بن ہر موے حسرت نالہا سر می زند — نغمہ ہاے دلکشا در بند چوب تار نیست

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند
در گلستان مشتِ خاشے دا شتم نگذا شتند

لے دے کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہین کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالبعلمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابین ہاتھ مین لیے ساتھ ہوتا کیسی ہی لو، دھوپ یا بارش ہوتی، ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت مین پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابین اپنی بغل مین لیتے اور استاد کی خدمت مین ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روز نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذرا اور بعد فراغت، مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان مین قدم رکھا، استعداد پختہ تھی نتیجہ یہ کہ تحریر مین وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطالب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر مین وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریرین سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور، ایک بار پٹنہ مین ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہو گا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام جسٹس شرف الدین حسن امام صاحب وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہو گیا خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھون نے انجام دیا وہ انکا کتبخانہ ہے، شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یو پی کے اندر نہین، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھون نے پورے یو پی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمین جمع کیے گئے ہین،

فلما تفرقنا كأنى ومالكا لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہاں موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبد اللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائیں کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی، لیکن انھوں نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہیں، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیث دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتیں مجھے بتلا دیں جنکو میں لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر میں شامل کر دوں، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا وہ درج ذیل ہے لیکن قبل اس کے یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم، مفتی صاحب اور میں تینوں ایک ایسے لازوال رشتے میں منسلک ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، اور جس کی طرف میں نے اپنی ایک عربی تحریر میں بایں الفاظ اشارہ کیا تھا

وليعلم أننا أغصان شجر واحد و تلاميذ لأستاذ ماجد

سنہ ۱۳۰۸ھ میں مفتی صاحب استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی مرحوم بھی درس میں شریک ہوئے، اور اس طرح پر کئی سال تک دونوں صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات میں شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالبعلمی میں ساتھ رہا، ندوۃ العلماء میں ساتھ رہا، حیدرآباد میں ساتھ رہا، اور آخر میں علی گڈھ میں ساتھ رہا، سفروں میں بھی بارہا رفاقت رہی غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر میں اوپر گذر چکا ہے، مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اب اکثر یہ شعر انکے ورد زبان رہتا ہے،

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بہ کس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیساکہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھون نے آج سے ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد مین معارف مین اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہین آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار مین کام آئے۔ اسلیے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر مین شائع کیا جاتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے مین نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدۂ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امور مذہبی پر کام کر چکنے کے بعد مین اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی عینی شہادت بطور وصیت کے تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤن جس ذات گرامی کے متعلق یہ اعتراف مین نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ درد انگیز خیال تھا کہ قاعدۂ قدرت کے موافق وہ ذات گرامی ایک دن اس دار فانی سے اٹھ جائیگی، اور مین بھی نہ رہون گا۔ پس اس ذات گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

علم کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی، مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج مین کجروی بالکل نہ تھی اور غلطیات ہرگز نہ مانتے تھے، مفتی صاحب سے استادبھائی ہونے کے علاوہ پیربھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طریق پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بےچینی مین کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے، صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہو گئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے، جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبد الشکور خان صاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہین لیا، آمدنی مین خدا نے ایسی برکت دی کہ امور خیر بھی جاری تھے اور لاکھوں روپیے کی جائداد خریدی، برادری مین اس طور پر لوگون کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہو جاتا وہ اپنی جائداد ان کے ہاتھ مین دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کرکے جائداد واپس کر دیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلون کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک بار خطاب کی سفارش گورنمنٹ مین گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا، سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کرکے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلون کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتین ہین، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات مین بے نظیر تھے،

آخر مین یہ شعر پڑھا،

اندکے با تو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۲ جون ۱۹۲۰ء مطابق ۸ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب مین اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھون جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہون گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو، میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلدون مین یہ پہلو برابر قلمبند کیے ہون،

اب مین چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف مین نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہون کہ مین نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا، لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہون کہ چونکہ مین شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہون اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ مین نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق مین سب سے زیادہ سخت جج وہی ہون گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین وہی کرین گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق مین آگے لکھتا ہون مین ان کو ایسا ہی جانتا ہون، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع شکل و صورت | صحیح مسلمانہ وضع قطع مشرقی، حسن صورت ہزارون مین ایک، حیدرآباد کے عظیم الشان جلسون مین مین نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر انھین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی اجمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس، سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی کسی سرکاری تقریب مین بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی مین مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشا | شروانی صاحب کی انشا مین ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گران پایہ شاعر ہین،

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ میں دکھایا نہ جاسکے، میں نے اس اعتراف کی تمہید میں لکھا تھا میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ میں یہ اعتراف لکھ رہا ہون نہ اس ذات گرامی سے میرا کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہان لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاء اللہ پاک ہو۔

لیکن ان پچھلے چار سال مین حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہان کیا ہو رہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال مین ایک ہی کوٹھی مین رہ چکا تھا! مدجس کا مین سب سے بڑا سر رشتہ دار تھا کسی قسم کی خط و کتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفیٰ کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدرآباد سے تعلق قطع کر لیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جبکہ مین زندہ ہون، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کر دون، میرا مدعائے اصلی اس طرح پورا ہو جائے گا، یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی تو معارف ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذاتِ گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کی ہے، جس سے اس اعتراف مین مجھے بحث کرنی ہے، مین اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دون گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس مین باہمی ربط و قدر دانیون نے کیا منزلین طے کین، اس لئے اصل مدعا کی طرف آتا ہون،

انتیس ۲۹ برس سر رشتۂ تعلیمات مین کام کرنے کے بعد مین نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکریٹری ہوا، ڈیلی کالج اندور مین نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے مین پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ مین شروانی صاحب حیدرآباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہوئے، مین باؤنی مین دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدرآباد مین اپنے دفتر پیشی کا، سرکار آصفیہ

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے
اور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہو کر چائے پیتے اور خطوط لکھنے شروع
کر دیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آ جاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک
مثل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند
آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی؛ نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ
چائے پیتے تھے، حیدرآباد مین نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیون سے
ملاقات ہوتی یا موٹر مین سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے، عموماً مین ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی
رنی بہار پر ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے، لیکن اگر کوئی اور صاحبِ عبا و عمامہ موجود ہوتے
تو انہین کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز مین اور اس نماز مین جو وہ سنت یا نفل کی صورت مین
تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قرأت مختصر اور ارکان نہایت معتدل
ہوتے، مقتدیون پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے صحت ارکان
کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جانماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، بس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب
کو نماز پڑھتے ہوے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک
لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت مین بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیون کے بعد مسجد سے باہر آتے،
مغرب کی نماز کے بعد حیدرآباد مین وہ ملاقات کے کمرہ مین بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ
اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہین کہا جا سکتا
کہ کب تک ہوتا رہتا، انھین اوقات مین کمیٹیون کی شرکت، مدارس مین دینیات کے معاینے، تقریبات
دعوتون، تقریرون، وعظون غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ | مین نے حیدرآباد مین اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہین کرتے، اس لیے نثر مین شاعرانہ تخئیل داخل ہوکر نثر کا پایہ نہایت بلند کر دیتی ہے، جملے چھوٹے چھوٹے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک لیکن آمد مضامین کی رو مین کبھی توالی کا واقعہ ہو جاتا یا کہین پر خفیف عرقِ ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، مین نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہین، ان کی نثر کا اسلوب مین جانتا ہون، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی مین نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا انھون نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھون نے قبول کر لیا، اگر مین غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہوگئی، ان کے انشا مین بیکار اور زائد باتون کا دخل نہین،

تقریر | مین نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدر آباد مین سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلون سے استغاثہ کرنے والا، مذہبی تقریرین رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر مین اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی، وہ تقریر کا منتہائے کمال یہی ہے، اعلیحضرت سلطانِ دکن مدظلہ العالی کی موجودگی مین بھی مین نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور مین فرق نہین آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات | روزانہ واہیات اشغال مین اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے مین نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج مین فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیون اور مسافرون کو رقمین دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پہ تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزاپوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ مین ضرور ہوتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی حتیٰ کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ مین لے جاتے، حیدرآباد مین بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا، لیکن یہان مسافرون اور پردیسیون کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہو جاتی تھی،

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لائق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے مین نے بہت دفعہ کتابین لین، کھولین اور بہت سی پڑھین بھی لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس مین پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہون، ان کی معیت مین چھ سات سال کے دوران مین ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر مین ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزانہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانۂ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر مین برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی | حیدرآباد مین سرکاری کام مستثنیٰ کر کے اپنے خانگی اور نجی کام مین شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر مین کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا۔

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب مین جہان رقص و سرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہان ایسا احتمال ہوتا وہان دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہین ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امرا، کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایسی تقاریب مین جہان یہ خرافات ہوتے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنرون، دعوتون اور جلسون سے جہان کوٹ پتلون، لیڈیان، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، مین نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتون سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علما سے ملاقات مین آیا کرتا تھا

کرہے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سر رشتۂ تعلیمات سے تعلق تھا، ان میں ایسے
بھی تھے کہ ولایت مین انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بے غم مغرب کی جماعت مین شریک
ہونے کے بجائے کرسیون پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن مین نے شروانی صاحب سے
کہا کہ آپ ان مسلمانون کو ہدایت کیون نہین فرماتے کہ نماز کا احترام کرین، اور جماعت مین شریک
ہوا کرین"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگون کو ابھی ٹھوکر نہین لگی
ہے، ایک ٹھوکر مین یہ سیدھے ہو جائین گے کسی کی ہدایت کی ضرورت نہین"، اس کی تصدیق بہت جلد
ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد مین نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل مین بھی ان کی تسبیح اور جا نماز کا
پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے،

کثرت مشاغل | شروانی صاحب کی تحریرون کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا، ہر ایک مثل وہ خود
پڑھتے اور سب احکام اور تجویزین اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے
کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات مین ججون کے افسر بنائے جاتے
تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبون کے وہ رکن تھے، کتب خانہ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ شعبۂ تالیف
و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر
اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، امکنۂ مذہبی کی جانچ پڑتال
وغیرہ، مذہبی جلسون مین وعظ، ادھر ہندوستان مین وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس،
مسلم یونیورسٹی کے شعبون کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے
اہم امور مین عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت
سلسلۂ تالیف، دیوانون، تذکرون اور مثنویون پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے
بنا دینا، رسالون مین مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابون کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام مین

نظم صاحب، یہ کتابیں میری چالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہیں"

تمام عمر میں شیروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہیں، خانۂ خدا ہے، حبیب گنج میں جاکر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو، خصوصاً جبکہ بھادوں کی بھرن برس رہی ہو، اور کالی گھٹائیں چڑھی ہوں، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات میں،

رمضان المبارک میں شیروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ میں ہمیشہ بہترین حافظوں سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظوں کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت میں ان سے بائیں ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر میں ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز حس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو چھینکیں آنے لگتیں، یہی حالت افطار کے موقعوں پر ہوتی، اور افطار کے جلسہ میں سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ تمباکو کھاتے ہیں نہ حقہ پیتے ہیں،

ربیع الاول شریف میں مجالسِ عید میلاد شروع ہوتیں، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدر آباد میں جاری رہتا اور جن پیمانوں پر یہ مجالس ہوتیں حیدر آباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، شیروانی صاحب ان جلسوں کے صدر ہوتے، ان جلسوں میں انھوں نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کیے، اعلیٰحضرت بھی بعض جلسوں میں شرکت فرماتے، شیروانی صاحب ان ایام میں حیدر آباد کے مسلموں میں محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین میں راتوں کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانوں سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا، بعض مجالس کے حالات میں نے منظوم کیے ہیں، اور اکثر وعظوں کے نوٹ میرے روزنامچوں میں محفوظ ہیں،

حیدر آباد میں خدمات کا مختصر کارنامہ | جن لوگوں نے شیروانی صاحب سے پہلے حیدر آباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہیں اور حالاتِ مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدر آباد کو شیروانی صاحب کی صدر الصدوری

بزرگانِ دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، اور گلبرگہ شریف مین حضرت بابا گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور بہاری شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلدآباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہو جاتے، جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نمازِ جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے، پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھر جانے پر وہ مسجد مین پہنچتے تو پھر مصلیوں کو چیر اور پھاند کر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہو جاتے کہ مسافر، نومسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بناتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو برائے گفتن پرانے کہے جاتے، تقسیم کر دیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالمون کے وہ سب سے بڑے قدردان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب، پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کر کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

دار الکین سلطنت عید کی نماز کو یہان حاضر ہونے لگے، اضلاع مین دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنین قائم کی گئین، انگریزی مدرسون مین دینی تعلیم کو خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے، جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، امکنۂ مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ کے ساتھ لوگون کو دی گئین یا نگرانی سرکار مین لی گئین، مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے، درگاہون کی آمدنیا خائن متولیون سے نکالی گئین، ماہ صیام مین چائے خانے، آبدار خانے اور ہوٹل دن مین بند کر دیے گئے، مسلمانون مین مذہب کی نگرانی کی گئی، حاجیون کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا اور سہولتین بہم پہنچائی گئین، غیر آباد مساجد بند کرکے بے حرمتی سے بچائی گئین، مختصر یہ کہ شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے جج اور حکیمون نے جج کے فیصلون اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد مین خوب خوب تقریرین کین،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ مین جیسا یہ زمانہ ہے تمام مذاہب کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ مین لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت | مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت مین ایک خاص فلسفیت کا بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہین، کسی فوری جذبہ سے ان مین تبدیلی نہین ہوتی، اکثر باتین وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ مزاج کی پرواز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، یا درچی خانہ، روزمرہ کا دسترخوان، وہ تمام حیدرآباد کے خانگی انتظامون مین چیخ پکار، غصہ، غضب، اعتراض اپنی

کے زمانہ مین دیکھین اور دونون حالتون کا مقابلہ کرین اگر صدالمہام فینانس جو ایک مسلمان ہے، مسٹر گلانسی عیسائی انگریز سابق صدرالمہام فینانس کی طرح مالی معاملات مین صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتا تو مین بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ مین اسی امور مذہبی کے صیغہ کا سب سے بڑا سر رشتہ دار تھا، اور ہر بات میرے ہی ہاتھون سے ہوتی تھی، لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت مین شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانون کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا، تاڑی سیندھی کے نشہ مین چور، ہجوم و ہنگامہ آرائیان اور بدمستیان کرنا، عورتون کی اس بدمستی مین بے حرمتی کر ڈالنا وغیرہ ایسی سب باتون کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتون کا عود کرنا قطعی ناممکن ہوگیا، تاڑی او سیندھی پیتے جانا، و اسی حالت مین میلاد خوانی کرنا، دکھنی بھونڈی ارد و مین نعت خوانی، بانی مجلس کا تاڑی او سیندھی دیگران بدبخت میلاد خوانون کو رات بھر تنہا الگ چھوڑ دینا او خود گھر مین جا کر سو رہنا، عدم کر دیا گیا، یہ اصلاح کیا گیا کہ ان میلاد خوانون کے طائفے صدارت العالیہ مین طلب کیے گئے، انکی جانچ کی گئی، اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دی گئی، اور نااہلون کو قطعی ممانعت کر دی گئی، سیندھی، تاڑی، شراب وغیرہ کی دکانین شہر پناہ سے باہر نکالدی گئین، اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گئین

اہالیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندین دی گئین، ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد مین بھیجے اور دارالاقامہ مین رکھے گئے، قاضیون کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا، مسجدون مین تنخواہ دار امامون کی تعداد مین اضافہ کیا گیا، مؤذن، جاروب کش، جانمازون، بتی، منکھو پانی کے ملون، حوضون، طہارت خانون، غسل خانون، بڑی مسجد مین تنخواہ دار خطیبون وغیرہ کا اضافہ کیا گیا، عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہان اب بیس بیس ہزار مصلیون کا عید کی نماز مین ہجوم ہونے لگا، اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلیحضرت نظام دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ نے عید کے دوگانے اسی عیدگاہ مین ادا کرنے شروع کیے، اور امراء

سے امن مین نہین ہے،

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی | حیدرآباد مین مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ چاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز مین انھون نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججون کے اصرار پر کہ ایک فقرے مین ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "رائے ایک دفعہ دیجاتی ہے. تجویز اعلیٰحضرت معظم کے ملاحظہ مین بھیج دیجائے" اور اپنی رائے مین جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، الیا تار حبیب گنج سے حیدرآباد کے ججون کو حسب الحکم مین نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین مین ایک طرف تو اعلیٰحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے. یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق مین اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہین، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے لیکن اب وہ بیوائی اور بھاری مثل اعلیٰحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہین، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہین، اور بصیغۂ اشد راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے مین اسے صاف کرتا ہون اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سربمہر لفافہ مین یہ تجویز مع مثل کے اعلیٰحضرت معظم کو بھیجدیتا ہون، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسون فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیون نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے، بیوہ کے حق مین ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف مین حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے، آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے، آیندہ اختیار سلطانی" بعد کو معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین" لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابل التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہو گئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرون اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) احمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوان مطلق یقین کرتے۔

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا ہے اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑا ہے، ہمارا روے سخن ایسے مسلم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زجر و توبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور درازدستی

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنادیتی ہے، خود داری اس سے معدوم کر دیتی، اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنادیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو مین نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے مین جاتے ہین، مین ساتھ ہون، بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ مین تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہین، راہ مین ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہین، آخر مین جب ہم بڑی بلندی پر پہنچتے ہین شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف مین پانی بھرا پاتے ہین جس مین نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہین، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی پھر یہان پانی، پانی مین نیلوفر، نیلوفر کی شادابی پر حیرت مین ڈوب جاتے ہین ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب مؤثر پیرایہ مین گفتگو کرتے ہین،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن مین وہ ٹہل رہے ہین، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب کیا کھلا ہوا ہے، کہ چمن مین گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگون اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال مین غرق ہو جاتے ہین، پھر مجھکو ایک ایک باریکی اور مصورِ قدرت کی قلم کاری سمجھاتے ہین، اور اسی حال مین مین سودا کا یہ شعر پڑھتا ہون ؎

رنگِ گل بے طرح دھکے ہے سن لے ابر بہار
آشیان میرا چھڑک، لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل مین بس فوراً صانع حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

کا کام نہین، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار عالی مین شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرما دیا، لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین لیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لایق عالم تقریظ نگار کو بلا کر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

درد کی صنعت کاری کا اثر | اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حسَن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

اس سے اخلاقِ حسَن کی کیا توقع کیجیے، شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آئے ہی

شعر بھی نیچر کی سحر کاریون مین سے ایک سحرکاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ٹول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو

کر دی، سرکار آصفیہ کے خطاب " نواب صدر یار جنگ " کی انھون نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا، حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہین احسان کرکے نہ احسان جتاتے ہین نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے ہین تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث مین شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھون نے بے کار مطالعہ نہین کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس مین ریا اور نمایش کو دخل نہین اور اس زمانہ مین سب سے بڑی اور سچی ہی تعریف ہے جو کسی کی جا سکتی ہے، ان کی نیکیون مین ایسی قوت ہے کہ " اہل " ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہین اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر مین یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہین، فرشتہ نہین، دنیا مین جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہین اٹھتی ہین اور اس گروہ مین ایک بھی انسان ایسا مشکل سے تاریخ مین نہین ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہمیت رکھنے والے، اور بے غرض، لوگ اچھا کہین، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک وحسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے، جس سے نورانی چیزین صاف نظر نہین آتین بلکہ دھندھلی اور گرد آلود نظر آتی ہین، پس خطا نورانی چیزون کی نہین ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف مین جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت وراستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے، اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر، کبیر مسلمانون سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہون شروانی صاحب کا مقابلہ کرین اور اگر یہ مقابلہ وموازنہ کرنے والے انصاف

ہم کو سرسون کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرما رہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے حاطہ مین عزیزی عبد الوحید خان نے چھرّے سے ایک دفعہ ایک چڑیا مار دی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان مین نہین ہوتی، اس شہید بے گنا کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا" وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹا دے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبد الوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا، لیکن میرا جاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالباً ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کر دون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور تو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کہ غریب بچون کو حبیب گنج کی گڑھی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین، یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق

شروانی صاحب کو رواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبید الرحمن خان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین نے نہ دیکھا، شمس العلماء کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتدا ہی مین نا منظور

مولینا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ مین

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم و تہذیب کے اُن نمونون مین تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی، اُن مین علم و عمل دین و تقوی اخلاق و شرافت وقار و متانت وغیرہ قدیم تعلیم و تہذیب کی تمام خوبیان اور وضعداریان جمع تھین،

وہ صاحب علم، علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی و تعلیمی خدمات و مشاغل مین گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانون کی تمام مفید علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکون کے حامی و مددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی علمی و اخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے اُن کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل ایک مضمون مین سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، یہ مرحوم کے ان رفقاء اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر کچھ بھی نہین لکھ سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریرین برابر نظر سے گذرتی رہین جن مین اُن کے بہت سے خیالات و رجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے، اس مضمون مین اسی آئینہ مین اُن کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

مسلمانون کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی

مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالم باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

فرمائین گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائین گے،

آخر مین نازک خیالون سے میری یہ گذارش ہے کہ مین نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہون، امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہین، لیکن مین امراء سے بہت ڈرتا ہون، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہین، میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھون نے خوب دیکھی ہی، صرف ادائے فرض کو مین نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے، لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیان فرمائی ہین پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے مین نے لکھا ہے کہ کچھ تو ادائے شکرگزاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھین کہ بڑے فضل و علم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے، امراء کو مین اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہون جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے دردِ سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ مین نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھون نے حیدرآباد کی ایک عظیم الشان مجلس مین اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا " صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئین خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

و جماعت باہم کس طرح مخالف ہو گئے،

حق پسندی و راست گوئی۔ حق پسندی حکام کے مقابلہ مین معاصرین و ہم چشمون کے مقابلہ مین اپنے نفس کے مقابلہ مین،

حسنِ معاشرت کسبِ معاش، تجارت، حرفت، تمول، علمار کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ اور ان کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقون کی محبت علمار کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگون کی محبت علمار کے ساتھ، علما کی معاشرت کے بعض اور حالات، لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب مین قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوون علما کی حیثیت ان کے فرائض، ذمہ داریون اور ان کے اصلاح طلب امور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

تعلیم جدید مین دینی روح کی ضرورت مرحوم زمانہ کے حالات و ضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے اور ابتدا سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون و مددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنون تک جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے، لیکن اُن کا دینی جذبہ جدید تعلیم مین بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سرسید احمد خان کی تعلیمی و اصلاحی کوششون کے معترف و مداح اور ان کے معاون و مددگار رہے، لیکن اُن کے مذہبی خیالات سے اُن کو سخت اختلاف تھا، اور علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریرون اور تحریرون سے ملتا ہے، حیاتِ جاوید کے ریویو مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس مین انھون نے سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہین، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۸۴)

اسی ریویو مین کالج مین مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے مولانا حالی نے حیاتِ جاوید مین یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج مین مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظ

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھون نے علمی و عملی دونون حیثیتون سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دار العلوم ندوۃ العلماء کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الٰہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد و ہوا خواہ تھے، مسلمانون کی قدیم تعلیم اور اُس کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس مین مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے تھے:

"ہمارے علماء کی یہ شان رہی ہے، کہ انھون نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھون نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دنیویہ (جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا) اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرین تاریخ کا کارنامہ ہے کہ جب بغداد مین مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، تو وہان علماء کے گران قدر مشاہرے اور طلبہ کے بیش قرار وظائف اور سامان آسائش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہین بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۴)

مسلمان علماء کے حالات مین علمائے سلف اور ہامیا علماء دو کتابین لکھین، اول الذکر مین علمائے سلف کے دینی، تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہین جن کا اندازہ حسب ذیل عنوانون سے ہوگا:

طلب علم، افلاس و تنگدستی، دشواریان، سفر کی مشقتین، کتابون کی نقل و کتابت، توجہ کامل، ادب، شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ مین صرف، مسلمانانِ سلف کا علمی ذوق، اوراد مین علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید (جس مین یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے) اختلاف رائے صحابہ کے زمانہ مین علمائے اہل سنت و جماعت کا برتاؤ، مخالف عقیدہ کے علماء کیسا تھ مختلف مذہب کے علمائے اہل سنت کا آپس مین برتاؤ، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہل سنت

مسلم یونیورسٹی مین اسلامی آرٹ کے سلسلہ مین ایک تحریر مین لکھتے ہین،

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہے، سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے، جو عالم انسانی مین خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن زیبائی پیدا کی حبیب کبریا روحی فداہ کی حیات حسن و جمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اشرف و اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہین، پھر اسلامی تاریخ ہے، جو دلون پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالون سے معمور ہے..... اس کے بعد شاعری ہے پھر عمارت و صنعت ہے پھر خطاطی، سب سے آخر مین مصوری چونکہ تصویر بنانا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کم تر طبیعتین اس کی جانب مائل ہوئین، مگر اہل کمال نے حرفون کے نقوش مین عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنربین کی نگاہ مین وہی ذوق بخشتا ہے، جو ایک کامل مصور کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریرون اور تحریرون مین بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہین، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے اس لئے تفصیل مین نہ پڑین گے،

مسلمانون کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون سے ذوق و شیفتگی اسلامی علوم و فنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر انکی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر مشکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین مسلمانون کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہین :-

"اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانون کے دلون مین ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری مین ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس مین کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی تابعین ہی کے طبقہ مین عرب کی جگہ عجمیون نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث مین ارشاد ہے الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا اخذھا (حکمت مومن کی گمشدہ

پر تحریر فرماتے ہیں،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج میں عہدِ سرسید میں رہی. میں نہیں سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے،...... افسوس ہے کہ سرسید کے عہد ٹرسٹی شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ میں کالج میں جو چیز سب سے زیادہ غیر مہتم بالشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہن نشین ہوتی، اور وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ میں دماغوں میں جاگزین ہوتا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سرسید تحریر و تقریر میں ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے لیکن عالم عمل میں آئے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے"

(مقالات شروانی صفحہ ۶۶)

نان کوآپریشن کے زمانہ میں ٹرسٹیوں کے ایک جلسہ میں کالج کے طلبہ کی مذہبی لاپروائی پر ان الفاظ میں تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات میں علی گڈھ اس خوشی کے خیال کو لے کر آیا تھا کہ حالیہ تحریک (نان کوآپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ میں مذہب کا جلوہ دیکھوں گا، جس کی تمنا برسوں سے دل میں تھی اور جو باوجود گوناگوں کوششوں کے اب تک حاصل نہ ہوسکا لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی ...... رات میں نے عشا کی نماز کالج کی مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھی میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ میں سرایت کر چکی ہے، (نان کوآپریشن کے اثرات مراد ہیں) تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گی، اور کم از کم ایک پوری صف میں طلبہ کو دیکھوں گا، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا میں قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے"۔ (مقالات شروانی ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

ہندوستان مین سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہان مسلمانون کی دولت اور ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، ان کی جاگیرین، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتین بھی فنا ہونا شروع ہوئین، اسی کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مسندِ علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھون نے ان انمول موتیون کی سنگریزون کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہین گذری اہلِ بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ مین شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے، جہان یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمدآباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم و عمل کے ڈساور تھے، جس مین متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت و فلسفہ، اور عربی و فارسی ادب کی کتابین، نامی شعرا کے دواوین، قلمی بے بہا نسخون، مشہور خطاطی کے استادون کے قطعات اور قلمی مرقعون کی شکل مین انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریان اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانون کا یہ عالم تھا کہ جہان آج مکانات کی زینت اور آرائش مین یورپ کی نت نئی اشیا نے جگہ حاصل کی ہے، وہان اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانون کے دیوان خانون امیر گھرون کے معمولی سے دالانون کی آرائش مین جو چیزین دیگر اشیاے نمائش مین نمایان نظر آتی تھین، وہ ان خوش نویس صاحبِ کمال خطاطون کی وصلیان اور طغرے ہوتے تھے، جن مین نہایت پُرمعنی اور پرکیف بیتین پرنصیحت قطعے، پُراخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیت مبارکہ کے پرتاثیر جملے اس خوبی اور کمالِ تحریر کے ساتھ چوکھٹون مین رکھکر آویزان کئے جاتے تھے، جن کے در و دیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی حکمت پژوہی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے مین مصروف

کی تلاش مین مسلمانون نے دنیا کا کوئی گوشہ نہین چھوڑا، جہان سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہین چھوڑی جس کا سرمایہ عربی مین منتقل نہ کیا ہو ..... جن ممالک مین مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراءالنہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ شرق الہند کے جزائر، ہندوستان غرض وہ کون ملک تھا، جہان مسلمان گئے، اور وہ دارالعلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے درکنار گاؤن تک مرکز علوم بن گئے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنو، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہان کہان بکھرے ہوئے ہین، لیکن ان مین سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰۱)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ مین اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہین، خود علمائے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشون پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانون کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم

ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت کے زوال کے ساتھ، اُن کے علم، دولت، اور اعمال واخلاق پر بھی زوال طاری ہوگیا تھا، اور نااہل اخلاف کے ہاتھون اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزارون بیش بہا قلمی اور نادر کتابین کوڑیون کے مول یک کر یورپ پہنچ گئین، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سرسید احمد خان نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی، چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد مین نادر قلمی کتابون کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھون مین آئی، تو انھون نے دوبارہ اُس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۹ء مین قلمی کتابون کی حفاظت کیلئے علمی خزانون کی بربادی کے عنوان سے ایک دردانگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہین،

مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا، ہر چند ان سے زیادہ کارگر نہین ہوئی لیکن انھون نے خود اپنی محنت تلاش سے بڑی دولت صرف کرکے نادر قلمی کتابون کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخون کے اعتبار سے ہندوستان کے بہترین کتب خانون مین ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایان پہلو قدامت و وضعداری ہے وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانون کی تہذیب و معاشرت مین دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریرین اس ذکر جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھین، اُن کے مختلف مضامین مین کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہان ہندوستان کی قدیم اسلامی معاشرت، پرانی وضعداریون یا کسی پہلو سے پرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہان اُن کے قلم کی گلفشانی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریرون مین اگلی صحبتون پُرانے بزرگون کی وضعداریون، قدیم تہذیب و آداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہین، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہون،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ مین تحریر فرماتے ہین:-

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین دکن مین پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے، ہندو مسلم شیعہ سُنّی، سب کے سب ایک رنگ مین رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہین جمعیت و یک جہتی کا گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی نمایش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہین، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ بے رنگی کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو بیتین یہان بر سبیل منزل سبق آموز ہون گی،

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانوں کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلوں تک کی زندگی کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزوں کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامنِ امید میں ان موتیوں کو بھرنا شروع کیا، آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر و نایاب کتابوں کا مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلچسپیوں کا بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیوں کا میدانِ علم کی تلاش و جستجو میں اُن کے پرمغز کارناموں کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا، جب قوم میں قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہوں گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا میں اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم میں رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانوں کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فنِ خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی انشا کے طور و طریق کے نمونوں کو قدیم نوادر کو آیندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہاں تک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل میں نہیں لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جارہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر اکٹھا کیا جائے، اور اس کو درست حالت میں رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے، (مقالات ص ۲۲۲ تا ۲۲۳)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات و سکنات میں عیان نظر آتا، مراتب پذیرائی کے بعد بیٹھے باتیں کرتے، چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹائے، چائے میں زعفران ضرور پڑتی، شام کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف میں وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہیں ہوا، ہاں دوسروں کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے، علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا، ناممکن ہے کہ ان صحبتوں کا ذکر ہو اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسوں گذر جانے کے بعد بھی آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب با اوقات و عبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت ان کے جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیاں ہوتی تھی، مشک آنست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیر چشم تھے، کسی کا بارِ احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے، بعض دفعہ دستی بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک میں بھیجا، باوجود وضع کی پابندی اور شانِ استغناء کے نہایت ملنسار اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب و فرقہ کی قید سے بالاتر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو، سنی شیعہ سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے، محض ظاہری اخلاق نہیں، بلکہ وہ اخلاق جس کا دل پر اثر پڑتا، عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا

پس چنان زی کہ بعد مردنِ تو

ہمہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات میں لکھتے ہیں،

جب اس خاکدانِ سفلی میں اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اس کے فیض سے ایشیا زرخیز تھا

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، موسی و فرعون اندر جنگ شد
چونکہ بے رنگی رسی کان داشتے موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی۔ وہ فضا ہی مٹ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانہ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین،...... اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۱۴۴)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال اشکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو علاوہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنون لطیفہ، خوش نویسی تصویر کشی وغیرہ دائرہ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنؤ کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنؤ کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، میرے لیے لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالا تر

یون کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ مین تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکرگذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا مین نے کیا کرم کیا، مجھ کو دو پہر کہین بسر کرنی تھی، وہین چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤن دُھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آدمِ برہر مطلب مزاج شگفتہ تھا، با مذاق تھا، تکلف سے بَری تھے، خاص صحبتون مین مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتون مین شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیون جاری رہتا اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکسان ذوق تھا،...... گفتگو ہر شخص سے علیٰ قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کر کے محظوظ ہوتا، تعلی یا ادعا کا شائبہ بھی کلام مین نہ پایا جاتا، تقدس نمائی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیے مین فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ مین بھی زبان سے نہ نکلتے (اتباذ العلما ص ۳۱ تا ۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریون سے پاک اور صاف تھے، اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر مین بلندی تھی، مزاج مین استغنا، حوصلے مین عزم تھا، مزاج مین نفاست تھی،.... صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتون سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیان نظر آتین، عقلی پیرا، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کرتے، فضول باتین اُن کی زبان سے مین نے کبھی نہین سنین،.....

اور یورپ تینوں بر اعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے، جن سے شہر خصوصاً دار السلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سُست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سرِ نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں،

اُن کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے :-

" نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے، لیکن خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں

جان پر ور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے، حسبِ عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لیے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اوّل ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو! یہ واقعے اب کہاں دیکھنا درکنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حاجی سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈلوایا، اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے، سبحان اللہ تعالیٰ کا سادہا تھا"،

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپور ہی فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا

نامور و مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات مین دونون کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شایستگی کا لباس مین، کھانے مین، نشست و برخاست مین، معاشرت مین، گفتگو مین پورا جلوہ شایستگی کا نمایان بلکہ تابان تھا لباس مین وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا جاڑون مین شال اور جامہ وار کے جلوے آدم جوہر نظر آتے، گرمیون مین جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہین شال جواہرات وعطر وغیرہ کی شناخت اسکے ماله وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ مین اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خرپزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھرون سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر آتا ہے، جب ایسا موقع ہوتا، تو مین ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پُرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسون دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور زعفرتک اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد سبھی ہوتے، سب کی نشست، مدارات یکسان بلا فرق ہوتی، کھانے مین منشی صاحب کی شگفتگی لطف پر وری جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات مین منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شایستہ اور پختہ وضع، مین نے باون برس کی مسلسل رفاقت مین کبھی کوئی فرق کسی عادت مین نہین پایا، بے تکلف و مخلصانہ صاف گوئی، کلام مین بھی، راے مین پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع، یا خاطر داری سے مرعوب و اثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد مین مستحکم یہ اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا"

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر بہ سوز دلگیری کے ساتھ کیا، دوسرے بھائی (مولوی اسحق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج و الم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں میں اور وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں میں ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہو کہ مجھکو حیرت ہو گئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے، نمک کھانے میں تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام ہوتے ہیں ع

سخن ہائے شیرین بہ از قند ہاست،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی، فرماتے تھے، میں نے یہیں ہتھیار ڈالے ہیں،...... نیز پانی تیز و سرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے یادگار رہیں گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی" (مقالات ص ۱۷۷ و ۱۷۸)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

"میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور

ذوق ادب وانشا،

فطرۃً لطیف الطبع، نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون کے شعر و ادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین حسن انشا، کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریر متین اور باوقار ہوتی تھی لیکن اس مین ادب و انشا، کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین :-

"ایامِ طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول بلاغت مین پڑھا تھا، کمالِ بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون" اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہذا میدان تنگ ہے، اور افسانہ و خیالی مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ و مضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا، لکھنے کا شوق واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خودستائی معیوب ہے تاہم بعض نکتہ سنج اربابِ ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مین بحمد اللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھایئے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصاً شعر و ادب کے مضامین مین جوہر بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون و لیلی کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید و تصحیح کے ساتھ ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین لیکن یہ سب بہت طویل ہین اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدر آباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۷۰ سال

نہایت فیاض تھے، عزیزون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربا و مساکین کی خدمت مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی دوستی اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسّم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اور قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق وضعداری حسن مذاق شایستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۳۹۹ تا ۴۰۲)"

چودھری نور اللہ خان رئیس سہاور کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین،

"چوہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک کارنامہ زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات و حرکات مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بےحد مستحکم اور منضبط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی، اس پر نہی گدا اور تکیہ لگا رہتا، صبح کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہلِ حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو کیسی ہی سردی و گرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۱۵۰)"

"رباعیون کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہونا ضرور، توحید، حکمت یا عشق کا نچوڑ اس مین ہو، ان قیود کے ساتھ چارون مصرعے باہم ایسے مربوط ہون کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیان معلوم ہون، لم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی مین کھپانی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت مثنوی کا تسلسل رباعی مین ہو، اس کے ساتھ بلا کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کر کے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے،

مینا پور کے میخانہ قدیم مین ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام مین حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہو کر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادہ شیراز مین ہے،

از آن افیون کہ ساقی در مے افگند حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جام اول مین بیخود ہو گیا، افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا یعنی میناپوری شراب اردو کے ساغر مین انڈھالی، اس مے دو آتشہ سے نشہ کی رسائی دوبالا ہو گئی، اسی مئے دو آتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالی ہے، مبادا دامن صدارت پر دھبہ لگے (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اوّن ایک شعر سنا دیتا ہون :-

نہ من تنہا درین میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست"

(دیباچہ مئے دو آتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید مین ارقام فرماتے ہین :-

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب ملک عرب کو گئے، اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک مین پھیلا اور سر دونون کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلانے لگی، (مقالات ص ۳۹۵)"

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزان آچکی تھی، کتابی صورت میں شائع ہوا، اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"جون ۱۹۰۸ء سے ستمبر سنہ مذکور تک مضمون بالا رسالہ حسن میں شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۲۲ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدوں کے پھول سے دل و دماغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہٖ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دورِ عزیز کی امانت ہے، اور امانت میں دست اندازی ناروا، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یا در ہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہوں،

"فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس میں بھی تقریباً متحد ہیں لیکن یہاں (اردو غزل) سے وہاں (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے، یعنی خیال اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلووں کی انتہا نہیں، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفتِ روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یا اور ہے،

عربی فارسی میں جس چیز نے شورِ محشر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے۔ فارسی عربی گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے جن کے سینوں میں عشقِ حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی۔ یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے۔" (مقالات ص ۸۶ و ۸۰)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

ع سخنہائے شیرین بہ از قند ہست"

خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور خاموش تھے، ان مین شیرین بیانی نہین تھی، دیکھئے یہ عیب حُسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے۔

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خود ستائی سے کوسون دور اسلئے گفتگو مین خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

ورائے شاعری چیزے دگر بود

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر بھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا"،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریرون مین بکثرت ملتے ہین بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہین جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ مزید مثالین اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہین، درحقیقت دوسرے صاحب طرز ادیبون کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انھی پر ختم ہوگیا؛

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد محمد ناصر عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ گل، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی، خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ مین یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین :۔

"دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا، گلشن نے نامۂ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا، درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است　　　این خانہ تمام آفتاب است،"

الندوہ کی اڈیٹری مین مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے :۔

"جب اس رسالہ کے اجراء کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری مین میرا نام اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکا چوند کو کم کرتی رہے گی اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا، (مقالات ص ۲،۱)"

علی گڈہ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ سے تعبیر کی ہے،

"یہ دونون دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف الالوان نور کی شعاعین باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہین"

مولانا شبلی کو شیرنی بہت مرغوب تھی، کچھ نہین تو شکر کے دانون ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ مین اظہار کیا ہے،

شیرینی گلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتین کرتے جاتے ہین، قند کے دانے منہ مین ڈالتے جاتے ہین، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے ع

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم! —— علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتۂ توافق واتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمٰن سہارنپوری ہملوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگر کسی موقعہ پہ پبلک کی مدد کی ضرورت پڑ ہی تو تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے —— اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا، تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! —— یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پہ شرافت برستی ہوئی، متانت بلائین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغو سی کتاب (لغو نواب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید یا د صفائی مین بہ طور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین نہ تلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور امور مذہبی ہو کر سنئے پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بجا طور پہ رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پہ حیدرآباد

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصے پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلوں میں تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار تھے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے۔ چند ہی روز میں دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنو) کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے ـــــ ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی۔

الندوہ میں شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو بڑے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسوں چھپتا رہا ـــــ کچھ ہمرنگی اس باب میں مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہیں! مضمون شاید چند سال کی مدت ادارت میں ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبروں میں، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن میں خوب جم گیا! ـــــ دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت میں رہنے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہاں تک معاملات ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے

کے ہاں ان کی خیابانی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں نہ فرق آنے پایا، اور علی گڈھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں، ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خاں کا طوطی بول رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خاں ہاتھوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ ۔۔۔ شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسرپیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند مولانا عبد الباری فرنگی محلی، اور علی برادران اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ، ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڈھ دونوں زد پر اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڈھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمٰن" سے "حبیب الشیطان" مشہور ہوئے! ۔۔۔ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴ سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں متدینوں میں تھا،

کے سلسلہ پر یہیں کی نذر مین آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہین اونچے مرتبہ پر، پہلی مرتبہ حاضری کی نوبت اتنے مخالف حالات مین آگیا تو بہت ڈرتے ڈرتے، لیکن پہلی ہی ملاقات مین معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ ہی نہین پڑنے دیا کہ میری بد مذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقتون اور عنایتون کی راہ مین کچھ بھی حائل ہو رہی ہے، —— اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور حیدرآباد مین ہوا، شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا،

اگست مین رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہان سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی مین سر امین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰ حضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہان رہےگا، جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام مین مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت (جس مین تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کر ختگی سے ناآشنا تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا، اور ایک ایک چیز دل مین اتر گئی، اعلحضرت کے یہان باریابی، اور پھر میرے بیٹے ماہوار تفضیلی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلون مین مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،

اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سبھی مسئلے موضوع گفتگو رہے، اور ملاقاتین کبھی لکھنؤ مین ہوتی رہین، کبھی علی گڈھ مین، اور کبھی حیدرآباد ہی مین، —— مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ مین شریک ہوتے، علی گڈھ سے سفر کر کے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی مرحوم

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہیں! ـــــ غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدرآباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ میں خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں علی گڈھ میں کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی میں مولانا شیروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا، انٹرویو کے وقت جب مختلف علماء آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا، کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسی صدارت چھوڑ، اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! میں شرمندگی سے گڑا جاتا تھا، لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ـــــ اور آخر زمانہ میں جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے میں آیا کہ لکھنؤ میں ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہیں!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجئے، اور گھنٹوں اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑوں کے موسم میں شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت میں جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتوں نہ بھولتا ـــــ تحریر میں اد سے بڑھکر انشا پردازی کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر اداے مطلب کے لیے ضروری ہوتے، گویا ہوشیار اور فنکار معمار عمارت میں گڑھی ہوئی اینٹیں چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! ـــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونوں میں، میدان میں خطاب عام ہو تو، اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، ۱۹۲۶ء میں جب حج و زیارت سے واپس آئے ہیں تو حالاتِ سفر خصوصاً مشاہدات

اور مولانا شروانی کے ہاں ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم، اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہاں تھے وہیں قائم ——— ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہیں، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہیں، اور شروانی پٹھانوں ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھوں نے پٹھانوں کو حلم و متانت سے یکسر معریٰ قرار دیا ہے، انھوں نے کلیہ قائم کرنے میں جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال

پاتے ہیں حلم[1] بھی کبھی شروانیوں میں ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش میں ارادہ عرس اجمیر میں شرکت کا کرلیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہوگیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشایخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریاں ہوئیں، شروانی صاحب بھی یہاں آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی، لیکن یہاں اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے تھی، مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھوں ہاتھ لیے جارہے تھے، اور وہ ان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع میں دیکھا، عام لوگوں کی صف میں مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہیں بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جاسکتی تھی، لیکن طبیعت میں یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

---

[1] اصل شعر میں بجائے "حلم" کے "عقل" ہے

کی خدمت میں عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی، ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہاں سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۱۹۳۳ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی، جس کے صدر موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوایا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء میں اس کے ڈھائی تین کالموں میں درج ہو چکی ہے، یہاں اس کے چند اقتباسات کافی ہوں گے:-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزینوں میں نہ تھا، اس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندیٔ خیال یا پاکیزگیٔ ادب کی ضامن نہیں ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک پہلو ہے کہ سچا فلسفہ، اخلاق، مذہب سب ہی سے بیزار ہیں، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ میں بہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں نہ بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہاں تین محبوب ہیں، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک غرق شباب قحبہ جو کسی کمرہ پر داد عیش دے رہی ہو، وفا اور پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف میں ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہیں، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث، ننگ انسانیت ہے،

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، اگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہاں کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کو سراہا ہے، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدایش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے ڈرانا رونہ خدا کا خدا بھی پست و بے وقعت

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سمان بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے۔

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، سنہ ۱۹۳۰ء یا ۳۱ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا اسرا شہار کھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ جوں توں کرکے ہو گیا، شروع ۳۲ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پہ مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ آگئی ——— بیچارہ نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا،

اسے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین و شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڈھ میگزین وغیرہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے۔ اور ہم لوگ بھی واد دے دیتے، جس طرح ہر نو مشق اور ہونہار اہل قلم کو اسکی ہمت افزائی کے خیال سے داد دیدی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ ۲۲ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک ناتمام ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا، اور علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کونسی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے بہ ادب تمام یونیورسٹی کے استادوں

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

کے

خاندانی اور ذاتی حالات

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

علی گڈھ کا شروانی خاندان صوبہ متحدہ کا نہایت ممتاز صاحب وجاہت اور تاریخی خاندان ہے، مسلمانوں کی تعلیم جدید کا مرکز بھی علی گڈھ ہی تھا، اس لیے شروع سے اس کی امداد و اعانت مین شروانی خاندان کا بڑا حصہ رہا، نواب سر مزمل اللہ خان مرحوم شروانی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور اس کو لاکھوں روپئے کے عطیے دیے، خود مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مسلم یونیورسٹی کے رکن رکین اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کے علمی و تعلیمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے دنیاوی دولت و وجاہت کے علاوہ اس خاندان نے علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہین، اس لیے مولانا شروانی کی یادگار کے سلسلہ مین اس خاندان کی مختصر تاریخ بھی لکھدینا مناسب معلوم ہوا،

خاندانی حالات ہندوستان مین شروانیون کا ورود بہلول لودھی کے عہد مین ہوا، ۸۵۵ھ ۱۴۵۱ء مین جب اس بادشاہ نے خاندان سادات سے افغانون کے لیے سلطنت ہند کو حاصل کیا، تو اس نے افغانستان کے قبائل کو ہندوستان آنے کے لیے ترغیب آمیز اور تحریص انگیز خطوط لکھے، چنانچہ نوح

ہین، حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتون کی جس طرح اس ڈراما مین شیطان کے مقابلہ مین تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈرامانگار کی فہم و دانش پرسخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، روز جزا مین جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ مین کم فہمی، جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے .... بہرحال میری رائے مین محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور نہ تخیل کا نصب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس مین رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہین رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدردانون نے دو تین لفظون مین بیان فرما دیے ہین، "شعلہ مستعجلہ" تململایا اور جگمگایا" بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا، تململایا، تھوڑی دیر مین شعلہ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا"

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑگئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق مین وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریرین اردو مین ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھین، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہان نظر آئے گی؟ ــــــ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ سیکڑون بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی) قیمت: ۱۲/

"منیجر"

دیہات بریرہ، بھرسولی، علی پور، اتوا، گھنونہ، طالپور، عنایتی وغیرہ مین آباد ہے، اور رکندی کہلاتے ہین، عبدل خان یا عبداللہ خان شروانی خاندان کے ایک بزرگ تھے جنھون نے جہانگیری عہد مین شاہی ملازمت اختیار کی، پھر تارک الدنیا ہو کر حضرت مخدوم ثنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (واقع گنگیری) پر گوشہ نشین ہو گئے، اور وہین سپرد خاک ہوئے، ان کی قبر وہان اس وقت تک موجود ہے، اس زمانہ مین اس خاندان کے مشاہیر مین نواب یوسف خان ساکن راج مئو کنادہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انکی شان و شوکت کے بڑے قصے مشہور ہین، ان کا سال وفات سنہ ۱۶۶۳ء بتایا جاتا ہے، روایات مین یہ بھی مشہور ہے کہ نواب یوسف خان نے عہد شاہجہانی دیکھا تھا، اور شاہجہان کے دربار مین حاضری کا شرف بھی حاصل کیا تھا، اور ان کو شاہجہان آباد بنجبنہ کا موضع عطیۂ شاہی مین ملا تھا، نواب یوسف خان کی والدہ اور بہن یا لڑکی کی قبرین خاص راج مئو مین اب تک موجود ہین، خود نواب یوسف کی قبر جھاڑی گھنکنادہ مین ایک حصار کے اندر واقع ہے، نواب یوسف خان کی شخصیت اپنے زمانہ مین بڑی ممتاز تھی، اور وہ اس وقت مرجع خلائق تھے، ان کے عروج و اقبال کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نواح مین دور دور تک کوئی رئیس ان کے مقابلہ کا نہ تھا،

سنہ ۱۷۴۲ء سے سنہ ۱۷۷۰ء تک جاٹ گردی کے زمانہ مین پرگنہ علاقہ اترولی، سرکار کول کے حلقہ مین بوڑھا گانون، چھموری، قلعہ چھرہ، دھنساری، دتاولی، برلہ وغیرہ کے علاقے تباہ کر دیے گئے، چنانچہ اس جاٹ شاہی عہد مین شروانی خاندان کے افراد اپنی اپنی زمینداریان چھوڑ کر گنگا پار، کٹھیر، اور سہسوان چلے گئے، پھر طوائف الملوکی کا دور ختم ہونے کے بعد گنگا پار سے واپس آکر اپنی اپنی زمینداریو پر قابض و متمکن ہوئے، گنگا پار سے واپس آنے والون کے سرگروہ چھموری کے بازخان صاحب تھے جنھون نے اٹھائیس سال کی جلاوطنی مین بہت ٹھوکرین کھائی تھین، اور زمانہ کا بہت گرم و سرد دیکھا تھا، اس لیے جب وہ دوبارہ واپس آئے تو ایک پختہ کار اور تجربہ کار انسان اور زمیندار تھے

قندھار سے چند سربرآوردہ قبیلے شروانی، غلزئی، لودھی، سوری، لوہانی، اور نیازی ہندوستان وارد ہوئے، ان مین سے شروانی، غلزئی اور لودھی حقیقی بھائیون کی اولاد تھے، لودھیون نے اپنی حکومت کا سکہ ہندوستان پر بٹھایا، اور شروانی خاندان نے مسند وزارت کو زینت دی، اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ کے حقدار قرار پائے، بہلول لودھی کے عہد مین عمر خان شروانی وزارت کے منصب پر متمکن تھے، ان کا خطاب مسند عالی تھا، ان ہی کی کوشش سے سکندر لودھی کو دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، جب ابراہیم لودھی کا زمانہ آیا تو افغانی امرا اس کی بے عنوانیون اور مظالم سے تنگ آکر ملک کی مختلف سمتون مین پھیل گئے، اور افغانی قبائل کا جو شیرازہ بہلول لودھی نے باندھا تھا، وہ منتشر ہو گیا، سنہ ۱۵۴۰ء مین جب شیر شاہ نے ہمایون کو ہندوستان سے باہر نکال دیا، تو اس نے بنگالہ مین افغانی قبائل کی مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ تجویز پیش کی کہ وہ جس کو چاہین اپنی مرضی سے سلطنت ہند کا مالک بنا دین، چنانچہ عمر خان شروانی کے فرزند نے اصرار کر کے خود شیر شاہ کو تخت نشین کرایا، شیر شاہی معرکوں کے بعد جب سلاطین مغلیہ افغانون سے برہم ہو کر ان کا قلع قمع کرنا چاہا تو خاندان شروانی کے مورثون نے شاہی تعلقات کو چھوڑ کر مختلف مضافات مین زمینداریون پر قبضہ کر لیا،

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کی خاندانی روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خاندان شروانی کے دو بزرگ محمد میر خان اور محمد مغیث خان نے لودھیون ہی کے عہد مین سرکار کول (یعنی علی گڈھ) کے نواح مین آکر آباد ہو گئے تھے، محمد میر خان کی اولاد پہلے موضع پر ورہ میر ایاز ہوئی، پھر وہان سے دتاولی، برلہ، سہاولی، سنہرہ، دھناری اور بروٹی کے مواضعات مین پھیل گئی، محمد مغیث خان کے تین بیٹے تھے، سالار الدین، رکن الدین اور بہار الدین، موخر الذکر کی اولاد مین سے اب کوئی باقی نہین ہے، سالار الدین کی اولاد بھموری، بھیکم پور، دادون، اکبرپور، بوڑھا گاؤن، حسن پور، کنوبی، بھاموں، ہنڈولی اور کنادہ وغیرہ مین آباد ہے، محمد مغیث خان کے دوسرے بیٹے رکن الدین کی اولاد

صبح کے وقت بھیکم پور (ضلع علی گڈھ) میں ہوئی لیکن مستقل سکونت حبیب گنج میں رہی، جس کو ان کے والد ماجد نے ان ہی کے نام پر آباد کیا تھا، حبیب گنج بھیکم پور سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے،

تعلیم | کلام پاک ختم ہوا تو تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی، جو قدیم مکتبی طریقہ پر گھر ہی پر دی گئی، فارسی نصاب میں سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور دیوان غنی وغیرہ ختم کرلیا، تو عربی شروع کرائی گئی، اور باقاعدہ طور پر درس نظامی کی تحصیل کرتے رہے، حضرت سید احمد کبیر قدس اللہ سرہٗ کے فرزندوں میں سے ایک عالم سے عربی کے ابتدائی اسباق لیے، نحو (نیز ابتدائی فقہ) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی تلمیذ مولانا لطف اللہ سے پڑھی، لیکن زیادہ فیض مولانا عبدالغنی خان صاحب سے حاصل کیا، مولانا ممدوح سے فقہ میں شرح وقایہ ہدایہ آخرین کتاب الرہن تک پڑھی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین و تفسیر بیضاوی (ابتدائی حصہ) اور علم معانی میں مختصر المعانی پڑھتے رہے، فن منطق کی تکمیل علی گڈھ میں مولانا لطف اللہ سے کی، اور ان ہی سے حمد اللہ، قاضی مبارک، میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحییٰ پڑھا، حدیث میں شمائل ترمذی اور صحیح بخاری (۹ پارے) سبقاً سبقاً شیخ حسین صاحب یمنی بھوپالی سے پڑھی، اور باقی کتابوں کی اجازت و سند بھی لی، حدیث کی دو سندیں سفر حرمین میں حاصل کیں، ایک شیخ حبیب اللہ شنقیتی سے اور دوسری شیخ عمری سے، ایک حدیث مسلسل بالاولیت کی سند میاں سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی حاصل فرمائی، قرأت میں قصیدۂ جزریہ قاری عبدالرحمٰن (مدرس احیاء العلوم الہ آباد) سے پڑھا، شاہ ولی اللہ صاحب کی چہل حدیث قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سے پڑھی،

آگرہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی پائی، اگرچہ انٹرنس کا امتحان نہیں دیا، لیکن یکے بعد دیگرے چار انگریزوں سے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرتے رہے، ... سے واپسی کے بعد علیگڈھ میں محمڈن کالج کے ہڈ ماسٹر مسٹر ہوٹ سے انگریزی لٹریچر پڑھا،

اور انھون نے اپنی آبائی ریاست پر حسن تدبیر سے قبضہ کیا، بہت سے گاؤن بذریعہ بیع و نیلام حاصل کیے،
۱۷۸۰ء مین پٹہ زمینداری مین بھموری کا تعلقہ نامزد ہوا، جس مین داد و ن بھی شامل تھا، مرہٹون کے
استیلاء کے زمانہ مین یہ انتظام برقرار رہا، اس لیے باز خان صاحب کا اثر و اقتدار برابر ترقی کرتا گیا، اور جب
۱۸۳۰ء مین ان کا انتقال ہوا تو انھون نے ایک وسیع علاقہ ترکہ مین چھوڑا جس مین ۵۳ گاؤن تعلقہ بھموری
بزرگ مین، اور ۲۰ گاؤن تعلقہ تاہ اور ۲۵ گاؤن تعلقہ ہردوئی مین، ۱۴ گاؤن کنکتہ مین اور ۹ گاؤن
رہن مین چھوڑے، باز خان خدا ترس بزرگ اور اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے، ۱۷۹۰ء مین انھون
نے اپنے پیر کے حکم سے بھیکم پور کو دوبارہ آباد کیا، اور خود مع اہل و عیال بھموری سے وہان منتقل ہو گئے،
باز خان کی شادی ڈوری مین نصیب خان کی لڑکی سے ہوئی تھی بھموری کے قیام کے زمانہ مین ۱۸۰۵ء
مین ان کو اچھلے اہر سے داد و ن کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا، جس مین خاندان کے لوگون نے بھی
ان کا ساتھ دیا، اس معرکہ مین باز خان صاحب کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے، ان کا انتقال
۱۸۳۰ء مین جب وہ حج کے لیے جا رہے تھے بمقام بروده ہوا، ان کی قبر بھی برودہ ہی مین ہے،
ان کی بی بی جو مدینہ بی بی کے لقب سے موسوم تھین اس سفر مین ساتھ اور بڑی باہمت خاتون تھین، اس
حادثہ کے باوجود انھون نے حج کا سفر ملتوی نہین کیا اور اس فریضہ کو مع الخیر پورا کیا،

باز خان صاحب کے تین بیٹے نام آور ہوئے، خان زمان صاحب جو شاخ بھیکم پور و حبیب گنج
کے مورث اعلیٰ ہین، حاجی محمد داؤد خان صاحب جو شاخ ظفر منزل علی گڈھ کے جد اعلیٰ تھے، اور
حاجی غلام محمد خان جو بعد تقسیم جائداد ۱۸۴۳ء مین بھیکم پور سے داد و ن منتقل ہوئے،

خان زمان صاحب ہی کی اولاد مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، ان کے والد ماجد
کا اسم گرامی محمد تقی خان صاحب تھا،

ولادت | مولانا حبیب الرحمن خان کی ولادت بتاریخ ۲۰ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء

مضمون نگاری | ۱۸۸۳ء سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور لسان العصر سید اکبر حسین مرحوم نے
بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کا اردو ترجمہ مستقبل اسلام کیا، تو اس پر تبصرہ لکھا جو مولوی غلام محمد
خان صاحب تپش کے اخبار شیر قیصر لکھنؤ میں شائع ہوا، یہ غالباً ان کا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد
مختلف اخبارات مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آزاد لکھنؤ، البشیر اٹاوہ، سرمور گزٹ، اکمل الاخبار دہلی،
انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں مضامین لکھتے رہے، ۱۹۰۸ء میں رسالہ حسن (حیدرآباد دکن) میں ایک
انعامی مضمون ظہیر الدین شاہ بابر پر لکھا، اور ادارے کی طرف سے ایک اشرفی انعام ملی، پھر ملک کے
مختلف رسائل دلگداز لکھنؤ، مخزن لاہور، معارف علی گڈھ، زمانہ کانپور، علی گڈھ میگزین، اولڈ بوائے
علی گڈھ، خاتون علی گڈھ، اردوے معلی علی گڈھ، نظام المشائخ دہلی، الندوہ لکھنؤ، اور معارف
اعظم گڈھ کو اپنے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین سے رونق بخشتے رہے، رسالہ الندوہ (لکھنؤ) کی
اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے شریک ادارت تھے، جو ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت اور ادبی ذوق
کا ثبوت ہے، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک جتنے مضامین لکھے ان کا مجموعہ **مقالات شیروانی**
کے نام سے علی گڈھ سے شائع ہوگیا ہے،

تصانیف | تذکرۂ بابر کے علاوہ **ذکر حبیب** اور **ذکر جمیل** کے نام سے میلاد مبارک کے لیے
دو کتابیں تحریر فرمائیں، **علماے سلف** میں علماے اسلام کے حالات ہیں، **نابینا علما** میں
ان علما کا ذکر ہے، جنھوں نے نابینائی کی حالت میں تحصیل علم اور ناموری حاصل کی، **سیرۃ الصدیق**
میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات ہیں، جس کو ابتداءً محمڈن کالج علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے
بطور لکچر پڑھا تھا، ایک رسالہ **اخلاق لکچر** ہے جس میں اخلاق اسلامی کا بیان ہے، یہ لکچر بھی محمڈن
کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھا گیا، اور طلبہ کے نصاب میں داخل ہوا، ۱۹۱۷ء میں امیر خسرو
کی مشہور مثنوی مجنون لیلیٰ کو تصحیح کر کے شائع کیا، جس کے شروع میں ان کے قلم سے ۱۱۵ صفحے

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر صلحا، و علما، مثلاً مولانا امین القضاۃ صاحب لکھنوی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری، مولانا احمد حسن صاحب جونپوری، مولانا عبد المقتدر صاحب بدایونی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا ابو الخیر صاحب مجددی، شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی، خواجہ الطاف حسین حالی، حبیب عبد روس صاحب یمنی حیدرآبادی سے گہرے مراسم قائم رکھے، اور ان بزرگون سے علمی فیض حاصل کرتے رہے، مولانا شبلی مرحوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، اور بہت سے علمی و تعلیمی کامون مین ان کے شریک کار رہے،

بیعت کی سعادت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی قدس سرہ العزیز سے حاصل کی تھی،

علمی ذوق کا نشو ونما | علمی ذوق کا آغاز غالب کی اردوے معلی کے مطالعہ سے ہوا جس کو انھون نے اپنے والد ماجد کے حکم سے پڑھنا شروع کیا تھا، اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد گلزار داغ کا مطالعہ کیا، اگرچہ ان کے چچا صاحب نے اس ذوق پر زجر فرمایا، لیکن طبیعت کی افتاد شوق دلاتی رہی، اور رفتہ رفتہ جب وہ زمانہ آیا کہ اپنی مرضی سے کتابون کا انتخاب کرین تو عربی کی متقدمین کی تصانیف کو زیادہ پسند کیا، اسی زمانہ مین کلام پاک کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے، فارسی مین متاخرین ایران کی سحر آفرینی سے زیادہ مسحور ہوے، اردو مین شعراے دہلی کا کلام زیادہ پسند تھا، شاعری مین امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا، کئی سال تک استاذ سے مراسلت اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن دونون مین ملاقات نہ ہو سکی، فارسی شاعری کے ذوق کا نشو ونما مولانا شبلی، مولانا عبد الغنی خان صاحب تو سنجر طہرانی، خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی اور خواجہ غلام غوث خان صاحب بیخبر الہ آبادی کی صحبت مین ہوا،

پیغام رحمت، شمع ہدایت،

اپنی زندگی کے آخری ایام مین اپنے اردو اور فارسی کلام کے علیحدہ علیحدہ مجموعے بھی شائع کیے تھے،

نادر کتب خانہ ان کے علمی ذوق اور اسلامی علوم و فنون سے ان کے شغف کا یہ بین ثبوت ہے کہ انھون نے اپنی محنت سے زر کثیر صرف کرکے ایک بڑا نادر اور قیمتی کتب خانہ جمع کیا جس مین پانچ ہزار سے زیادہ مطبوعہ اور نایاب قلمی عربی اور فارسی کتابین ہین، اردو اور انگریزی کی کتابون کا بھی ایک حصہ ہے، مولانا شبلی مرحوم کا خیال تھا کہ فارسی کلام کا جیسا اچھا ذخیرہ حبیب گنج کے کتب خانہ مین ہے، رامپور اور بانکی پور کے کتب خانہ مین بھی نہین، "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" کے عنوان سے خود مولانا شروانی مرحوم نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۱ء) مین ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے، اپنی زندگی ہی مین اس کتب خانہ کو مسلم یونیورسٹی پر باضابطہ وقف کر دیا تھا،

قومی مشاغل سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور اس سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، لیکن مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ہمیشہ پیش پیش رہے، ہوش سنبھالا تو علی گڈھ مین سر سید احمد خان کی تحریک کا چرچا سنا، جس مین خود ان کے خاندان کے کئی افراد شریک تھے، مولانا شروانی کو اگرچہ سر سید مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود انھون نے ان کی مفید علمی تحریک مین پورا حصہ لیا، اور سر سید نے ان کو اپنے کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا، محسن الملک مرحوم کی معتمدی کے زمانہ مین وہ اہل سنت و جماعت کے دینیات کی تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ مین میرٹھ کمشنری کی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے، اور اس سلسلہ مین متعدد وفود مین شرکت کی، اور تحریک کی اشاعت مین تقریرین کین، نقد چندہ دیا، اور جب سے مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی برابر کورٹ کے ممبر رہے، اور مختلف اوقات مین یونیورسٹی کی اگزکٹو کانسل، اکیڈیمک کانسل کے ممبر مقرر ہوتے رہے، اور دینیات کی تعلیم کے مستقل نگران مقرر ہوئے، ۱۹۱۲ء مین مسلم

کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے، اس کا انشا پردازانہ مقدمہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے، مثلاً (۱) **اسلامی اخلاق** جس میں اخلاق پر دلنشین بحث کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے (۲) **فقہ حنفی** جس میں فقہ حنفی کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت پر بحث ہے (۳) **تبصرہ**، یہ تاریخ خطیب بغدادی پر عالمانہ ریویو ہے (۴) **عرض اخلاص** یہ ایک تقریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں زمانہ کے مطابق تعلیم ضرور پائیں لیکن اسلامی شعار اور معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں (۵) **سرسید کی یاد**، اس کو ۲۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے (۶) **نقش وفا** میں حقوق و فرائض زوجین پر بہت سی مفید ہدایات ہیں (۷) **استاذ العلما** میں حضرت مفتی محمد لطف اللہ مرحوم کے سوانح ہیں، جن کے ضمن میں مفتی عنایت اللہ صاحب شہید اور استاذ الاساتذہ مولوی بزرگ علی صاحب کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں (۸) **حالات حزین**، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں فارسی کے مشہور شاعر علی حزین پر ایک پر مغز مقالہ پڑھا، اس میں حزین کے کلام کا انتخاب بھی ہے (۹) **ذکر محبوب** میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے حالات ہیں (۱۰) **قرۃ العین** میں حضرت مجدد الف ثانی کے سوانح ہیں (۱۱) **مسلمانوں کی تعلیم قدیم** میں قدیم تعلیم کا نصب العین بتایا ہے (۱۲) **تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر**، اس میں بزرگان دین کی عمر کی درازی کا حال لکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی کما حقہ پابندی قیام صحت کا باعث ہوتی ہے (۱۳) **برق تجلی**، اس میں حسن و عشق کی زندگی پر تبصرہ ہے۔

میلاد النبی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور تقریر فرماتے، اور اس کو قلمبند کر لیتے، بعض ایسے رسائل کے نام یہ ہیں **آفتاب رسالت**، **شان رسالت**، **رسالت عامہ**، **ذکر شریف**،

قیام حیدرآباد دکن | نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ
صدر الصدوری پر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء مین فائز ہوئے، اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے،
صدر الصدوری سے متعلق دو صیغے تھے، صدارت العالیہ اور امور مذہبی، صدارت العالیہ خالص
اسلامی صیغہ تھا، جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا، امور مذہبی ایک عاملانہ صیغہ تھا،
جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے عام مذہبی نظم و نسق سے متعلق تھا، مولانا شروانی نے ان
دونون صیغون کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی، جس کا صلہ ان کو ۱۳۴۱ھ مین
"نواب صدر یار جنگ" کے خطاب کی شکل مین ملا، قیام حیدرآباد کے زمانہ مین یہان کے
باشندون پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا، وہان کی تمام علمی و ادبی تحریکون مین انکا
نمایان حصہ رہا، اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد
ان ہی کے سپرد کر دیے گئے، اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر
مقرر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے، اور اپنے قیام کے دوران مین کتبخانہ
آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر الصدور اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم
کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام ادا [illegible]
متبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن مین تھی، تو مولانا عبد الحق
سے پہلے اس کے بھی سکریٹری تھے،

حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ء مین پنشن پائی، حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ مین غالباً ۱۹۲۶ء
مین حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مکہ معظمہ مین قاری سید عبد الرحیم کو پورا
کلام پاک سنایا، اور مدینہ طیبہ مین قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا، ان سے آخری سبق
مسجد نبوی مین لیا، اور قرأت کی سند حاصل کی،

یونیورسٹی نے ان کے علمی و تعلیمی خدمات کے اعتراف مین ان کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی ڈگری دیکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا،

۱۸۹۰ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے، ۱۹۱۷ء مین جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو مولانا شروانی کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ ختم ہوگیا، جو کانفرنس کا سکریٹری بھی ہوتا تھا تو ۱۹۲۰ء مین مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور اپنی وفات کے کچھ دنون پہلے تک اس عہدہ پر مامور رہے، بالکل آخر مین ضعف پیری کی وجہ سے اس سے مستعفی ہوگئے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسون کی صدارت بھی فرمائی،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع سے تعلق تھا، وہ اس کے رکن رکین اور بڑے معاون و مددگار تھے، اس کے تین سالانہ اجلاسون کی صدارت بھی کی،

دار المصنفین سے بھی ان کو قلبی تعلق تھا، ۱۹۳۱ء سے آخر تک اس کی مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ کے صدر رہے،

کرنال کے وقف کے بھی نگران تھے، اس کا جو معاوضہ ان کو ملتا تھا، وہ اس کو کسی نہ کسی ادارہ کو دیدیتے تھے،

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے بھی ممبر تھے، ۱۹۲۸ء مین اس کا پانچوان اجلاس لاہور مین ہوا، تو اس کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انھون نے پڑھا، اس پر تحسین و آفرین ہوئی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی بھی ۱۹۳۷ء مین صدارت فرمائی، یو، پی ہسٹاریکل سوسائٹی، مسلم گرلز کالج علی گڈھ، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی، آرٹس سوسائٹی لندن سے بھی مختلف شکلون مین وابستہ رہے،

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیبِ شبلی
محوِ آرام ہوئے جا کے قریبِ شبلی

ہر نوا جنکی تھی پیغامِ نقیبِ شبلی
دانش افروزِ کہن، یارِ ادیبِ شبلی

قدر دانِ ادب و فلسفۂ نعمانی
سرپرستِ ہنرِ کہنہ و نوشروانی

آہ تھے بزمِ "معارف" کے وہی صدر نشین
آج قائم تھا انھیں سے شرفِ دانش و دین

جن سے اس دور میں تازہ تھی سلف کی آئین
شکل دیکھو تو زسرتا بہ قدم نورِ یقین

ہو گیا ختم وہ دورِ رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلسِ دوشین افسوس

کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویزِ قلم
کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریزِ قلم

نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیزِ قلم
گہر افشاں، گہر آرا، گہر انگیزِ قلم

جس کے ہر نقش میں رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف میں صد حسن و دل آرائی تھی

اٹھ گیا بزم سے جو ساقیِ صہبائے کہن
آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، دار المصنفین اور ندوۃ العلما کی طرف رہی،

وفات | ۶۰ سال کی عمر میں ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء مطابق ۲۰ شوال المکرم بروز جمعہ بوقت صبح عالم جاودانی کو سدھارے، دوران علالت میں زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتیں کرتے رہے، اور انگلیوں میں پڑی ہوئی تسبیح کے ورد سے غافل نہ ہوتے، طہارت کا برابر خیال رکھتے، روح پرواز ہونے سے پانچ منٹ پہلے تک باتیں کرتے رہے، اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جنازہ ایک فوجی کار میں مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ لان پر لایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، اور شہر کے حکام، رؤسا اور معززین بھی ساتھ تھے، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت علی گڈھ سے ۲۶ میل دور موضع بھوری متصل جیب گنج کے خاندانی قبرستان میں لے جائی گئی جہاں علم و فضل، امارت و حشمت اور وقار و سنجیدگی کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تربت کو ہمیشہ ٹھنڈی رکھے، آمین ثم آمین،

تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی شرح بیان کر دی ہے، اور انکا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات بس اسباق

کا خوب

ہو گیا نذرِ خزان حکمت و عرفان کا چمن ۔ وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھئے جن کو شریکِ غم و ماتم ہین سبھی

مجلسِ علم "بھی" "دانش کدۂ قومی" بھی

آہ تنہا نہین یہ حکمت و فن کا ماتم ۔ آہ تنہا نہین یہ شعر و سخن کا ماتم

ہے حقیقت مین یہ تہذیبِ کہن کا ماتم ۔ سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا

غم ہے سر دفترِ "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہان اٹھتے ہین اس وضع کے اربابِ کمال ۔ اب کہان دولت و تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال

قدِ والا تھا کہ سر تا بہ قدم سروِ جلال ۔ جس مین تھا صورت و معنیٰ کا دلآویز جمال

مظہرِ علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب

جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات ۔ اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات

کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات ۔ صرف اک ذاتِ گرامی کی نہین ہے یہ وفات

کاروانِ حکمت و دانش کا روان ہوتا ہے

قافلہ فضل کا آنکھون سے نہان ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے ۔ ثانیٔ شبلی مرحوم کی رخصت یہ ہے

دفن سر تا قدم اسرار کی دولت یہ ہے ۔ علم کے گنجِ گران مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے

مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ع۲ غیر مجلد ع۲ پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ،

آج مسلمانون کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہین ہے، بلکہ مسلمانون کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے ناآشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہے، اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا، یا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لینے اور روزہ ونماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل مین ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہین رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ واشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب مین کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج وزکوٰۃ، تقویٰ و پرہیز گاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق و فرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت اس کی خدمت ونصرت وحمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت و دوزخ، ذکر اللہ، توبہ و استغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان واحسان اور اسلامی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز مین اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کر دی ہے، اور اسکا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "اس کتاب مین دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن وحدیث سے وہ سب تعلیمات بس اسباق کی شکل مین جمع کر دی گئی ہین جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عامی مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

دل سرتا قدم اسرار کی دولت یہ ہے [illegible]

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

قومون کی سیاسی و اقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیون، مختلف سیاسی نظریون اور تحریکون کی روشنی مین جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیون کا پورا سیاسی مد و جزر اور اسکے اسباب و نتائج سامنے آجاتے ہین، کتاب کے آخر مین مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ مین جو حقیقی آزادی و مساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا مین امن و امان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاست سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۶/۸ پتہ: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ صدیون سے جاری ہے، اور اس مین ہر زمانہ کے نامور شعرا اور ادیبون کی کوششین شریک رہی ہین، اس کتاب مین یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی وغواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھتیس شعرا اور ادیبون کے حالات جنکا اردو کی تعمیر و ترقی مین حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریرون سے لیکر مرتب کیے گئے ہین، لیکن یہ سمجھ مین نہین آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہین، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی خدمت زبان مسلم ہو یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہون، لیکن ان دونون اصولون کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعرا، ادیبون اور اردو کے معمارون کے حالات چھوٹ گئے ہین، پرانے اساتذہ مین مومن، آتش اور ذوق جیسے معماران اردو کے حالات نہین ہین، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہین ہے، حالانکہ ان سب کے حالات ممتاز ادیبون کے قلم سے موجود ہین، یہ صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہین، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعرا خصوصاً نثر نگارون کے حالات نہین لیے گئے ہین، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعرا و ادیب چھوٹ گئے ہین، تاہم اس کتاب مین ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع مین اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے، بلکہ اس میں اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلموں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکیں مترجمہ جناب مولوی عبدالوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے، پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ بینس سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان، صحیح جمہوریت کے علمبردار، انسانی برادری میں حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہیں، اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہے، جمہوریت بلا امتیاز رنگ و نسل تمام انسانوں اور قوموں میں آزادی و مساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ و پاسبان سمجھی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظاموں میں بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن یورپ میں جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس میں ایسے بنیادی نقائص ہیں کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق و برتری، قومی و جغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری، سیاسی کشمکش، اور جنگ و خونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بنا پر اس کے متوازی اشتراکیت، نازی ازم اور آمریت کی تحریکیں پیدا ہو گئیں اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ و جدال کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے انسداد کی جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب بنیادی خرابیوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں اور آج پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب میں انقلاب فرانس سے لیکر جب سے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپ میں

اقبال کامل

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ کثرت سے مضامین رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں اُن کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد اُن کی اردو شاعری پر، فارسی پر اُن کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر اُن کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (یعنی عورت)، تصوف، اور نظامِ اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے،

ضخامت :- ۸۰۰ صفحے،

قیمت :- [illegible]

"منیجر"

بزم تیموریہ

(مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے)

بابر ایک بے مثل اہلِ قلم تھا، ہمایوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے ادب و انشاء کو چمکایا، شاہجہاں نے شعراء اور فضلاء کو سیم و زر میں تلوایا، عالمگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے، تیموری دور کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ ظفر نے عروسِ سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں اور شہزادیوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء نے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے، ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیے،

ضخامت :- ۴۸۸ صفحے،

قیمت :- [illegible]

"منیجر"

حج بیت اللہ از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: شوقی برادران، مالیگاؤن ضلع ناسک،

اردو مین حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابین موجود ہین، حج بیت اللہ اس موضوع پر نئی جامع کتاب ہے، اس مین عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار و مقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار و حکم کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی و تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہین، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے مواقف اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیدیے گئے ہین،

تلقین حق از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۰ صفحے،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۰ر پتہ ادارۂ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفون پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھون نے بچون کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس مین دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیون کے مقابلہ مین اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانون کی ہدایت کے سامان، وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفون کے مقابلہ مین کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین مثلاً دعا، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر و نواہی، حلال و حرام اخلاق حمیدہ و رذیلہ وغیرہ، اسلام کے عقائد و اعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان مین تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچون کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق